سسپنس ڈائجسٹ
مدیراعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ : یمنیٰ احمد

جلد 47 • شمارہ 09 ستمبر 2017 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

بیگانگی

''کیا شام بہت اداس ہے۔ شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام؟''

''ہاں شام بہت اداس ہے۔ شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام۔''

''پر ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے کہ جب مغرب کا افق دہکتا ہے اور دامانِ شفق بھڑکتا ہے جیسے شعلے سے چُنے ہوئے ہوں، جیسے تنور دُھنے ہوئے ہوں اور جب خورشید کا بے کفن جنازہ افق میں تازہ تازہ اترتا ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مل کے جا رہا ہو، جیسے کوئی یاد آ رہا ہو، جیسے کوئی جا کے بھول جائے، وعدہ ہو مگر کبھی نہ آئے اور جب دونوں وقت ملتے ہیں تو ہم پر کبھی کبھی ایسی حالت کیوں گزرتی ہے جیسے ہم خود اپنے آپ سے بچھڑ رہے ہوں۔ اپنے آپ سے بچھڑ گئے ہوں؟''

''تم جاننا چاہتے ہو کہ کبھی کبھی ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ ایسا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دن بھر کی رایگانی کے راستوں سے پلٹ کے جب اپنی تھکن کا اندازہ لگاتے ہیں تو اپنے اندر گھٹتے اور گہناتے چلے جاتے ہیں اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ ایک بیگانگی پاتے ہیں۔''

''بیگانگی...... اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ!''

''ہاں، بیگانگی اور اپنی ذات اور اپنی ہی تھکن کے بیچ اور وہ یوں کہ تمہاری دن بھر کی تھکن جو کچھ کماتی ہے، اسے تمہاری ذات شام کو بیچ اور پوچ پاتی ہے۔ تم صبح کی خوش حالتی اور شام کی خود ملامتی کے بیچ جو کچھ بھی کرتے ہو، اس کا اپنے اندر لحہ لحہ تاوان بھرتے ہو۔ تم اس بیچ جو بھی کر کے دکھاتے ہو، اس پر پچھتاتے ہو۔ جب تم زبان کھولتے ہو اور بولتے ہو تو اپنے سانسوں کی ترازو میں اپنا گھاٹا تولتے ہو۔ اس لیے کہ تم اپنے منہ میں اپنی زبان نہیں کسی اور کی زبان پاتے ہو، تم اپنے ہونٹوں سے اپنی آواز نہیں کسی اور کی آواز لگاتے ہو۔''

''ہاں بھائی تم نے سچ کہا اور شام کی اس اداسی میں اپنی دانست ہی کا دکھ نہیں، میرے دل کا دکھ بھی سہا۔ کوئی بیگانگی سی بیگانگی ہے۔ تم جو ہو تم اور مَیں جو ہوں مَیں۔ ہم اپنی اپنی ذات میں ایک نہیں رہے ہیں۔ ہم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ہمارے احساس کی سمتیں اجڑ گئی ہیں، کرنے والے میں اور اس کی کرت میں بیگانگی، زبان کھولنے والے کے منہ میں اور اس کی زبان میں بیگانگی، ہونٹوں میں اور آواز میں بیگانگی! پھر تو میں زبان کھولنے والا اور بولنے والا، ہاں، مَیں کچھ کر کے دکھانے والا اور اپنی کرت میں پچھتانے والا تو مارا گیا۔ ہاں، میں مارا ہی تو گیا۔''

''میرے بھائی تم ہی نہیں، ہم میں سے جو بھی ہے وہ مارا گیا، اس لیے کہ ہم میں سے جو بھی ہے وہ دوسروں کی مرضی پر وارا گیا۔ ہمارے ہاتھ تو ہمارے ہیں پر انگلیاں کسی اور کی ہیں اور وہ یوں کہ ہماری انگلیوں نے جب بھی کچھ لکھا تو وہی کچھ لکھا جو اُن سے لکھوایا گیا۔ ہماری انگلیوں میں اور ان کی لکھائی میں بیگانگی ہے۔ ہماری پڑھت میں اور ہماری بینائی میں بیگانگی ہے۔ ہم اس چارسو میں زندہ رکھے گئے ہیں جس میں ہمیں دوسروں کے لیے سانس لینے ہیں، سوائے بھائی! اس چارسو کی آرزو کر جس میں تو اپنے سینے سے خود اپنے سانس لے سکے۔ کیا میں تجھے ایک واقعہ سناؤں؟''

''ہاں میرے بھائی ضرور سنا۔''

''کل مجھے اسماعیل کتب فروش نے بتایا کہ میرا بھائی الیاس مصوری کرتا ہے۔ وہ پرسوں کبوتر کی تصویر بنا رہا تھا۔ تصویر بنانے کے بعد اس نے اس کے نیچے بائیں طرف اپنا نام لکھا اور پھر تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ وہ کبوتر کی نہیں، بلی کی تصویر ہے۔''

''ایں! کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کبوتر کو بلی چبا گئی، ہنرمند اور ہنر کی بیگانگی ہنر کو کھا گئی۔''

☆☆☆

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

ستمبر 2017ء کا دلچسپ اور خوبصورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ گزشتہ دنوں یومِ آزادی بڑے جوش و جذبے سے منایا گیا لیکن حکومتی درباروں میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں مگر حکومتی خزانہ جسے ہر دور میں بے دردی سے لوٹا جاتا رہا ہے کیا عوام کی امانت سمجھ کر لوٹایا بھی جائے گا اور تاریخ کو سنہرے حرفوں سے لکھنے کا موقع عنایت کیا جائے گا۔ عوام کے نام پر، عوام کے لیے لڑی جانے والی جنگ کہیں انصاف کا پرچار کرنے والوں کی انا اور فتح و شکست کی بھینٹ تو نہیں چڑھ جائے گی۔ اس سارے منظرنامے میں کیا کسی جگہ پاکستانی قوم کے لیے بھی تھوڑی سی امید اور ترقی کے آثار نظر آتے ہیں یا اس بار بھی جھوٹے دلاسے اور تسلیوں پر ٹرخانے کی رسم ادا کی جائے گی۔ ستمبر کی 6 تاریخ یومِ دفاع اور 7 تاریخ یومِ فضائیہ کے حوالے سے ہمیشہ پاکستانی عوام کے دلوں میں پُرجوش امنگ پیدا کر دیتی ہے لیکن سیاسی بازی گران امنگوں کو بھی اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے چالیں چلتے رہتے ہیں اور بے چارے عوام...... آخر کون ہے جو دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرے...... بہرحال اچھے کی امید تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہنی بھی چاہیے مگر اس درمیانی عرصے میں عوام کی بھلائی کے لیے بھی حقیقتاً کچھ اچھا واقع ہو جانا چاہیے۔ جنہوں نے چند دنوں بعد چلے جانا تھا بھلا ان کے چند دن پہلے چلے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جنگ عوام اور عوامی مفاد میں نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے قارئین...... وقت پر لگا کر اڑتا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سال گزر جاتا ہے۔ لیجیے جناب پھر سے حج کی ادائیگی اور عیدالضحیٰ کی مبارک ساعتیں آ گئی ہیں۔ عازمینِ حج مناسکِ حج ادا کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور عیدالضحیٰ کی رونقیں بھی مویشی منڈیوں کے انعقاد سے عروج پر ہیں۔ نہ صرف رونقیں بلکہ مویشیوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہر سال ان مسائل پر بحث ہوتی ہے مگر نتائج صفر نکلتے ہیں بہرحال اقتدارِ اعلیٰ کچھ سوچے نہ سوچے ہمیں تو لازمی مستحقین کے بارے میں سوچنا ہوگا اور انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا ہوگا کہ یہی اس عید کا مقصد بھی ہے۔ خیالات کی بلند پرواز اپنی جگہ اور زمینی حقائق کی تلخی اپنی جگہ لہٰذا ہم بھی دلکش خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلتے ہیں اپنی بزمِ دوستاں کی طرف۔

✻ ڈاکٹر نائلہ نصر، پشاور سے حاضرِ محفل ہیں۔ ”میں پچھلے تین سال سے سسپنس ڈائجسٹ کو پڑھ رہی ہوں اور اس کی وجہ اسما قادری کی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ بہت عرصے سے خواہش تھی کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں لیکن فراغت نہ ملتی تھی۔ آج کل گرمیوں کی چھٹیاں ہیں سوچا کہ قلم اٹھاؤں (بہت شکریہ)۔ سسپنس ڈائجسٹ میچور لوگوں کا رسالہ ہے اور بہت خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں اکثر کہانیاں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ مجھے ناہید سلطانہ اختر، اسما قادری، ڈاکٹر شیر شاہ، طاہر جاوید مغل، الیاس سیتاپوری، ڈاکٹر ساجد امجد اور منظر امام کی کہانیاں بہت پسند ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں کہانی لکھنے والے کا نام پہلے ضرور پڑھتی ہوں۔ اگست کا نمبر انتہائی بہترین رہا۔ ناہید سلطانہ اختر کی کہانی میں ایک غیر متوقع موڑ آیا اور میں گنگ ہوگئی۔ بہت خوب صورت کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ ہمیشہ بہت مختصر اور بہت جامع لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ جیسے لوگ ہماری قوم کا وہ اثاثہ ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے مگر اللہ کے ہاں ان کے لیے بہت بڑا مقام ہے۔ طاقتور، زنداں، گھمنڈ، مشرق و مغرب بہت خوب صورت کہانیاں تھیں۔ مگر اس عنوان اور ان کہانیوں کو کچھ اور زاویوں سے دیکھتی ہوں۔ ہماری کہانیوں میں صرف اولاد کی غلطیوں کو ہی کیوں موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔ کیا کبھی کسی لکھاری نے گھر سے بھاگنے والی ”کیوں“ کے اور عوامل کو بھی سوچا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ رومان انگیز کہانیاں، ڈرامے وغیرہ بھی عوامل ہیں اور ان پر لکھنا چاہیے لیکن کیا یہی صرف وہ وجوہات ہیں جن پر لکھنا چاہیے۔ میں کتنے ہی پڑھے لکھے خاندانوں کو جانتی ہوں جو صرف لڑکا لڑکی کے بیچ تعلیم کے انیس بیس کے فرق کی وجہ سے ضد اور انا کی اتنی اونچی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں کہ ان کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بے راہ روی کی بڑی وجہ نکاح کے راستے کو دشوار بنانا ہے۔ اسلام نے نکاح کے لیے بڑے آسان اصول بنائے ہیں جن میں دین داری کو سب سے اوپر رکھا گیا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم صرف گناہ گار اور مجرم کو سزا دینا جانتے ہیں جو اس کے ذمے دار ان ہیں ان کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ والدین کا اولاد کو تعلیم دینا، پرورش کرنا بے شک بہت بڑا احسان ہے مگر یہ ان پر فرض بھی ہے اور اس حق کو دینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اولاد کو ساری زندگی اس کے بوجھ تلے دبائیں۔ میری تمام لکھاریوں سے گزارش ہے کہ معاشرے کے ہر کردار کے متعلق ہر زاویے سے سوچا کریں اور ایسی کہانیاں لکھیں کہ پڑھنے والے چاہے والد ہوں یا بھائی یا بیٹا، وہ یہ سوچیں کہ گھر سے بھاگنے والی صرف عورت قصوروار نہیں ہوتی بلکہ وہ باپ، بھائی اور خاندان بھی ہوتے ہیں جو صرف اور صرف اپنی سوچ اور خواہش کو ٹھیک سمجھتے ہیں اور عورت کو صرف عورت سمجھتے ہیں، انسان صرف مرد کو سمجھتے ہیں۔ باغی بڑی دلچسپ کہانی ہے ہم چونکہ چودھرائن سسٹم کو نہ جانتے ہیں اور نہ کبھی دیکھا ہے اس لیے عجیب وحشت ہوتی ہے ان کے متعلق پڑھ کر۔ وقت ایک بالکل مختلف موضوع پر ہے جس میں Zionism کو بھی موضوعِ بحث لایا گیا ہے۔ اچھی کاوش ہے لیکن کچھ باتیں بہت مشکل سے ہضم ہوتی ہیں۔ تاریخی کہانیوں کا سلسلہ اور بزرگانِ دین کے قصے بہت پراثر ہوتے ہیں۔

میری رائے ہے کہ دو صفحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیں جن میں دنیا کی بڑی شخصیات کے متعلق معلومات ہوں یا سسپنس ڈائجسٹ کے لکھاریوں کے متعلق کوئی بائیوگرافی ہو یا برصغیر، پاک و ہند کے ادب کی قدر آور شخصیات کے متعلق کوئی سلسلہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ذات پات، نسل، زبان کے بندھنوں سے آزاد کر کے حقیقت میں ایک پرچم تلے جمع کرے۔ (آمین)۔ (آپ کی رائے کی ہم قدر کرتے ہیں۔ بہت شکریہ کہ آپ نے سسپنس کے لیے وقت نکالا)۔''

✖ محمد زریان سلطان کی اردو بازار کراچی سے آمد۔ ''اگست کا دلچسپ کچھ رنگین کچھ سنگین شمارہ جب ہاتھوں میں آیا تو سرورق پر یوم آزادی کی مبارک باد دیکھ کر احساس ہوا کہ ہمارا ملک جن نظریات، خیالات اور مقاصد کے تحت حاصل کیا گیا اور قربانیاں...... جو صرف اس وقت کے لیے مخصوص نہیں رہ رہیں بلکہ آج تک کسی نہ کسی حوالے سے ان قربانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کبھی ٹارگٹ کلنگ تو کبھی لوٹ مار اور کبھی سیاسی معرکہ آرائیوں کے حوالے سے اور اس سارے چکر میں عوام ہی پستے نظر آئے۔ یہ استحصالی صورتِ حال اللہ جانے کب ختم ہوگی اور کب میری پاک سرزمین پر وہ وقت آئے گا جب قوم اپنی زبان سے شکرِ خداوندی کے ساتھ ساتھ اپنی خوشحالی اور امن کی بحالی کا اقرار کرے گی۔ بہرحال بہت ساری دعائیں اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے دل سے نکل رہی ہیں۔ اللہ میرے ملک کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ (آمین)۔ ملکی صورتِ حال سے ہٹ کر اب آتے ہیں اپنے شمارے کے خدوخال کی جانب۔ سب سے پہلے تو اپنی پیاری سی محفل میں تانکا جھانکی کرتے ہوئے تبصروں کو پڑھا۔ بہت خوب لکھا اور صدر صاحب کو صدارت کی کرسی صرف ایک ماہ کے لیے مبارک ہو۔ ایڈیٹر صاحبہ نے بھی کیا خوب لکھا ہے، جہاں سنجیدہ مسائل اپنی جگہ مگر سسپنس کلاسک کے حوالے سے اگر ہم سے رائے مانگی تو ہم اس کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ واقعی ایسا ہونا چاہیے کیونکہ اچھا مواد اچھی تحریریں صرف ایک خاص دور تک محدود نہیں رہنا چاہئیں بلکہ نئی نسل میں میگزین کے مطالعے کے شوق کو مہمیز کرنے کے لیے اچھی تحریروں کا دوبارہ چھاپنا ایک اچھا قدم بالخصوص ان مرحوم مصنفین کی تحریریں جو ایک زمانے میں قارئین کے دلوں کو برمایا کرتی تھیں اور ان کے سحر سے آزاد ہونا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم مصنفین کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کی تحریروں سے نئی نسل کو بھی واقف کرایا جائے۔ ویلڈن۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی سیوا سے سنبھا تک پڑھی۔ بہت اچھی لگی اور اندازہ ہوا کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے ہر دور میں ہر طبقے نے زور آزمائی کی اور چالیں چلتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کیے جاتے رہے۔ تنویر ریاض کی کہانی دخل درمعقولات نے ثابت کیا کہ اگر انسان اپنی ٹانگ کا سائز اپنے دائرے تک محدود رکھے تو بہت سی پریشانیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی منظر امام نے سہارا لکھ کر احساس دلایا کہ انسان کا اپنے لیے جینا تو ایک فطری عمل ہے ہی مگر دوسروں کے لیے بھی اپنے وجود کو سہارا بنا دیا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔ باغی کا پہلا حصہ پڑھا۔ نئے مصنف ہیں شاید مگر تحریر میں جان ہے۔ اچھا لکھنے والوں میں ایک اور اضافہ ہیں۔ دیکھتے ہیں دھیرے دھیرے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں اور کامران چودھری کی دلیرانہ صلاحیتیں دلچسپی کا باعث بن رہی ہیں۔ ذہانت میں سلیم انور نے انتہائی مختصر انداز میں بڑی بات کہہ دی ہے کہ کام کرنے والوں کے لیے صدیاں درکار نہیں ہوتیں بلکہ کچھ کر گزرنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ زنداں زویا اعجاز کی ایک اور دلچسپ تحریر پڑھی۔ اب تو کافی دلچسپ اندازِ تحریر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے ہو زورِ قلم اور زیادہ...... بہت خوب تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی طاقتور تحریر بھی بہت طاقتور ثابت ہوئی۔ اگر ظلم کے خلاف اور انصاف کی حمایت میں ایسے ہی قدم اٹھائے جاتے رہیں اور ہمت کا مظاہرہ ہوتا رہے تو کوئی شک نہیں کہ میرا ملک بھی ایک مثالی نظام رائج کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عمارہ خان کی تحریر گھمنڈ پڑھ کر احساس ہوا کہ انسان کا پیمانہ بہت چھوٹا ہے، جلد ہی چھلک جاتا ہے۔ جب وہ صفر پر تھا تو دوسروں کو ظالم سمجھتا تھا اور جب تھوڑی سی طاقت پالی تو گھمنڈ کے مارے چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ علی اختر کی احساس نے احساس دلایا کہ انسان جب تک اپنی عزت خود نہیں کرا سکتا، کوئی دوسرا بھی اس کی عزت نہیں کر پاتا۔ حسام بٹ کا نیا سلسلہ وقت جواب دھیرے دھیرے پرانا ہوتا جا رہا ہے، دلچسپی کے تمام پہلوؤں کو ساتھ لیتے ہوئے کامیابی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔''

✖ طاہرہ گلزار پشاور سے شاملِ محفل ہیں۔ ''حسبِ عادت رضوان تنولی نے بتایا کہ آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کیونکہ مجھے مری میں سسپنس لیٹ ملا تھا لیکن شکر ہے کہ پھر بھی میرا خط شائع ہوا مگر سیاست دان کالی قینچی نے میرے خط کو ایسے ایسے کاٹا، وہ حشر کیا جو اگست 1947ء کو ریڈ کلف کمیشن نے پاکستان کے اصلی حصے کاٹ چھانٹ کے پاکستان ہمیں بخش دیا تھا۔ اللہ توبہ اتنی زیادتی (یہ زیادتی کی نہیں...... ذمے داری کی قینچی ہے بھئی دوسروں کے لیے بھی جگہ نکالنا پڑتی ہے جی)۔ سرورق کی حسینہ، ڈرامے کی ولن سے ملتی جلتی تھی۔ البتہ دھنک رنگوں والا دوپٹا اور ہلکے پرپل کلر کی قمیص بہت پیاری لگی۔ اوپر کونے میں ایک طرف سسپنس اور دوسرے کونے میں جشنِ آزادی مبارک لکھا ہوا بہت اچھا اور پیارا لگا۔ تمام دوستوں، ادارے والوں اور تمام پاکستانیوں کو جشنِ آزادی مبارک ہو۔ ادارے والوں سے ایک التجا کہ پلیز انکل معراج رسول کے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ وہ ہمارے اور اردو ادب کے محسنِ اعظم آج کل کس حال میں ہیں۔ اللہ ان کو صحتِ کامل عطا کرے، آمین ثم آمین۔ اس پرچون ایلیا ورنہ ظاہر ہے میں وہ زہر بھرے الفاظ ہمیں مار مار کے کھنگ گئے لیکن ہائے نصیب پاکستانی عوام اللہ میاں کی گائے ہیں۔ جو حکومت تھوڑی بہت عوام کی حالت بہتر کرنے کے لیے میدان میں آتی ہے، ان کا خون کرنا دشمن اپنا حق سمجھتے ہیں۔ مدیرِ اعلیٰ صاحب میں تو اپنے خطوط میں سو دفعہ لکھ چکی ہوں کہ آپ نئی نسل کے لیے سسپنس اور جاسوسی کی 1990ء سے پہلے کی کہانیاں دوبارہ شائع کریں بلکہ اس وقت کے قسط وار سلسلے بھی دوبارہ شروع کریں۔ اس طرح کہ سسپنس اور جاسوسی میں ایک قسط وار کہانی پرانی ہو اور دوسری قسط وار نئی ہو تو یہ نئی نسل پر اور ہم لوگوں پر احسانِ عظیم ہوگا کیونکہ مجھ سمیت بہت سے قاری ایسے ہیں کہ وہ مہنگی مہنگی کتابیں نہیں خرید سکتے (جی بالکل...... ہمیں بھی اس بات کا احساس ہے)۔

محفلِ دوستاں کے دروازے پر دستک دی، عادل عباسی کا محبت نامہ تھا جو بہت پُرامید نظر آرہے تھے۔ ناہید یوسف صاحبہ اللہ آپ کو اس کا اجر و طاقت عطا کرے، آمین۔ مائی ڈیئر سسٹر ہمارے آج کے حکمرانوں کو ایک دوسرے کی عزت اچھالنے اور ملک کی عزت دنیا میں خراب کرنے سے فرصت ملے گی تو وہ عوام اور ایسے فلاحی اداروں کی طرف توجہ دیں گے۔ صفدر معاویہ کا تبصرہ لگتا ہے ڈیوٹی کے دوران جلدی جلدی میں لکھا گیا۔ پشاور میں تو بہت سخت گرمی ہے۔ ابھی جولائی کا یہ ہفتہ بہت اچھا گزرا اور تین بار بارش ہوگئی۔ صفدر بھائی صدر تک جاسکتے ہیں لیکن ایک بہن سے ملنے F.C.W Pesh تک نہیں آسکتے۔ اشفاق شاہین کا تبصرہ لاجواب رہا۔ بھائی امید ہے کہ باغی کی چند قسطوں کے بعد ہمارے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی یا مغل اعظم کا کوئی سلسلہ ہوگا۔ محمد خواجہ بھائی کا تبصرہ بھی بہت لاجواب ہے لیکن مجال ہے جو کبھی اس بہن کو یاد رکھیں۔ رمضان پاشا کا تبصرہ مختصر لیکن کافی جاندار بلکہ جاسوسانہ لگا۔ پائندہ خان کا تبصرہ کافی طویل، لاجواب لیکن جامع رہا۔ اطہر حسین صاحب ویلکم۔ آپ کا تبصرہ بہت جامع اور لاجواب رہا۔ زریان سلطان صاحب آپ شکوہ تو کررہے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ آپ غائب کیوں تھے۔ بھول جانا تو انسانی فطرت ہے۔ میں تو سرکاری جاب کرتی ہوں۔ بیمار بھی ہوں۔ 51 سال کی ہوکر بھی سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کے لیے ہر مہینے تبصرہ کرتی ہوں۔ پرانے تبصرہ نگاروں ہوش میں آجاؤ۔ پلیز ستمبر کے مہینے میں آپ سب حاضر ہو ورنہ پھر مان لو کہ آپ بوڑھے ہوگئے ہو۔ میں تو اپنے لیے کہوں گی ’’ابھی تو میں جوان ہوں۔‘‘ (بہت خوب...... بالکل درست فرمایا)۔ آخر میں مہتاب احمد کا ایک لاجواب تبصرہ بہت ہی شاندار رہا۔ واقعی اگر ادارے کے پاس نواب انکل کی کہانیاں موجود ہیں جو ابھی شائع نہ ہوئی ہوں تو ضرور سسپنس میں شائع کریں۔ منظر امام صاحب اس بار ایک اور انمول تحریر سہارا، ایک اچھوتا خیال۔ واقعی جس کو رونے کے لیے کسی کا کندھا نہ ملے اس سے بڑا بدنصیب اور کوئی نہیں ویلڈن انکل منظر امام...... سلیم انور کی تحریر واقعی ذہانت سے لکھی گئی تحریر ہے۔ سراغ رساں ایجنٹ براؤن نے صرف عقبی آئینے کے ذریعے گولی مارنے والے کو پہچانا۔ عمارہ خان کی گھمنڈ سبق آموز اور اچھی تحریر۔ یہاں تو ہر دوسرا بندہ شاداب بنا جارہا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید اس بار وہ دل کہاں سے لاؤں ایک لازوال تحریر لائے جس میں دلوں کے ٹوٹنے کی کہانی بھی تھی اور نئے کراچی کے حالات سے ٹوٹے ہوئے دلوں کی فریاد بھی تھی۔ کاش کہ کراچی اور پشاور ایک بار پھر پُرامن اور پُرسکون شہر بن جائیں...... آخر ادارے نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور پیغمبروں کا سلسلہ شروع کردیا۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کرتے۔ چلو یہ بھی بہت اچھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے شروع کیا۔ رضوانہ ساجد کے قلم نے حق ادا کردیا۔ بہت ہی پیارا اور خوب صورت انداز تحریر، جزاک اللہ...... سسپنس کے آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی تحریر خواب سراب معاشرے میں ہر وقت تحریک پرور ایک ایسے ناسور پر لکھی گئی یادگار تحریر۔ ابنِ آدم ہر لحہ بنتِ حوا کو ذلیل کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات اس بار طاقتور میں لو برڈز کی کہانی لے کر آئے۔ اولاد تو ہوتی ہے اکثر نافرمان لیکن بہت جگہوں پر غلطی بلکہ سنگین غلطی والدین کرجاتے ہیں۔ کھارا تیلی اگر خاندان میں ان سے کم تر تھا تو اس میں کھارا کا تو قصور نہیں تھا۔ تبھی تو زیبو اور کھارا نے غلط اور سنگین قدم اٹھایا لیکن کم بخت سینڈو نے پیسوں کے لالچ میں ان کی زندگی چھین لی۔ حسام بٹ صاحب کے وقت نے اب صحیح کروٹ لی ہے۔ آخر علی اپنی والدہ کی تلاش میں پاکستان پہنچ گیا لیکن آتے ہی ایکشن واہ اب مزہ آئے گا۔ محمد طاہر عمیر کی تحریر باغی تو بہت تیز بلکہ ایکشن کا تیز گام بنا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں کوئی انگلش ایکشن موویٰ دیکھ رہی ہوں۔ ہیرو کامران بہت ہمت کے ساتھ اپنے والد کے خلاف چل پڑا ہے۔ تنویر ریاض کی تحریر دخل درمعقولات بہت ہی اچھی، سبق آموز تحریر۔ واقعی کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے جیسے اس ڈاکٹر کے ساتھ ہوا...... ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی تحریر سیوا سے سنبھا تک بہت معلوماتی اور دلچسپ تحریر۔ سیوا جی اور اس کے بیٹے سنبھا نے اورنگزیب عالم گیر کو بہت تنگ کیا لیکن فتح آخر مسلمانوں کی ہوئی...... بابر نعیم کی تحریر ناکام کوشش ہی رہی۔ لوسی جیسے لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے...... ثمر عباس کی تحریر دہری خوشی مغربی معاشرے کی عکاس تحریر۔ کافی اچھی کہانی تھی۔ ہنسی بھی آئی کہ مغرب کی پولیس بھی ایسی ہی ہے جیسی ہماری پولیس ہے...... شاکر لطیف کی تحریر مغرب و مشرق بہت زبردست اور سبق آموز کہانی۔ مشرق واقعی مشرق ہے جہاں ہر رشتہ ایک دوسرے سے جڑا ہے۔ افشاں نے بہت صحیح فیصلہ کیا اور اپنے باپ کی عزت کے ساتھ اپنی زندگی بھی اذیتوں سے بچالی...... علی اختر کی تحریر بہت دکھی کرگئی۔ اشعار، کترنیں اور لطائف بھی کافی اچھے لگے۔ تمام پاکستانیوں اور سسپنس کے قارئین کو 14 اگست مبارک ہو۔ (آپ سب کو بھی مبارک ہو)۔‘‘

⌘ زرین آفریدی، حیدرآباد سندھ سے خط لکھ رہی ہیں۔ ’’برتی برسات میں اپنے پیارے سسپنس ڈائجسٹ کے 16 جولائی کو درشن ہوئے۔ سرورق پر میواتی لڑکی نیلے لینز لگا کر جشنِ آزادی کی مبارک باد دے رہی ہے خیر مبارک۔ اللہ سائیں ہمارے ملک کو قائم و دائم رکھے۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی نے ورنہ ظاہر ہے میں پاکستان کے موجودہ حالات پر دل کھول کر رکھ دیا۔ ہم عوام واقعی اللہ میاں کی گائے ہیں جو چارا ڈالتا ہے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ پتا نہیں عوام کے ساتھ مذاق کب تک چلتا رہے گا۔ اداریہ امیدوں بھرا تھا اور ایک اچھے نکتے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ محفل میں انٹری دی تو عادل عباسی نظر آئے، مبارک باد تو دینی پڑے گی۔ محمد صفدر معاویہ، اشفاق شاہین، محمد خواجہ اور رمضان پاشا صاحبان کے تبصرے لاجواب تھے۔ پرویز احمد لانگاہ صاحب یہ سسپنس کی محفل ہے۔ یہاں ٹانگ کھینچنا آسان نہیں۔ کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد محمد زریان سلطان بھی شریک محفل تھے۔ آصف محمود صاحب شیش محل شاندار اور پرفیکٹ داستان تھی۔ پائندہ خان صاحب میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ابتدائی صفحات اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی یہ داستان تو بھوسلہ، سیوا اور سنبھا تک جاتی ہے۔ بہت ہی عبرت اثر واقعات تھے۔ پوری داستان دلچسپی سے بھری ہوئی تھی۔ مرہٹے شروع ہی سے مسلمان حکمرانوں کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ دخل درمعقولات، تنویر ریاض صاحب کی بھرپور رہی۔ دوسرے کے کاموں میں کھوج

رکھنے والے اور حسد کرنے والے ایسے ہی پھنستے ہیں۔ منظر امام صاحب کی سہارا کافی حساس اسٹوری تھی۔ مشکلات اور دکھ میں کسی کا ساتھ دینا ہی عظیم کام ہے۔ ویلڈن۔ زنداں، زویا اعجاز صاحبہ تبصرہ نگار بھی اچھی تھیں اور لکھاری بھی۔ دھن دولت کے پجاری آج بھی بیٹیوں کو زندہ درگور کر رہے ہیں۔ بے چاری شا کتنی زندہ دل لڑکی تھی۔ تعلیم سے دوری بھی کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ گھمنڈ، عمارہ خان صاحبہ نے کم ظرف اور نودولتیوں کی نفسیات پر لکھا، دولت کی فراوانی اور بے جا طاقت سے انسان کے اندر غرور اور اوور اعتماد ہی بندے کو مرواتا ہے جیسا کہ شاداب کے ساتھ ہوا۔ احساس میں مجھے علی اختر صاحب سے تھوڑا اختلاف رہا۔ اس کہانی کا ہیرو یوسف بھی سست اور نکھٹو ٹائپ کا بندہ تھا لیکن اس میں سارا قصور اس کی بیوی اقرا پر ڈالا گیا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ (کبھی کبھی تالی میں ایک کا ہاتھ دوسرے کا گال ہوتا ہے)۔ ملک صفدر حیات صاحب کی طاقت ور، بہت عمدہ رہی۔ والدین کی خودغرضی اور اولاد کی بے لگام خواہشات نے دولو برڈز کو بے وقت اس دنیا سے جانے پر مجبور کر دیا۔ سینڈو نے پیسے کی لالچ میں خود کو سولی چڑھا لیا۔ ملک صاحب کا مجرموں کی کھوج لگانا کمال ہوتا ہے۔ زبردست انداز سے وہ جرم کرنے والوں کو پاتال سے نکال لیتے ہیں۔ ویلڈن۔ سلیم انور صاحب کی ذہانت مختصر لیکن دلچسپی سے بھرپور رہی۔ حضرت یوسفؑ کی سوانح حیات۔ رضوانہ ساجد صاحبہ نے بہترین انداز میں پیش کی۔ جزائے خیر۔ ناکام کوشش میں بابر نعیم صاحب نے ایما کو ایک مضبوط عورت کے روپ میں دکھایا۔ لوسی بہت ہی ضدی اور بدتمیز لڑکی تھی۔ کچھ لوگ ناقابل اصلاح ہوتے ہیں۔ کہانی بہرحال اچھی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی وہ دل کہاں سے لاؤں، واقعی یادگار تحریر ہے۔ دل کے نازک جذبوں کو چھوتی ہوئی، جاوید اور جوزفین کی لازوال محبت۔ محبت تو لاثانی جذبہ ہے جو ذات پات اور مذہب سے مبرا ہوتا ہے۔ پھر جاوید صاحب نے اپنے لفظوں میں ایک پیارا کراچی بھی دکھایا۔ زبردست مزہ آ گیا۔ واہ۔ باغی، ہم قارئین کے لیے دھما کا خیز سرپرائز ہے۔ داستان بھی بہت ہی دھانسو ہے۔ بہت شکریہ۔ کامران چودھری اور آشتی، واللہ غضب کی جوڑی پیش کی ہے، آگے بہت انجوائے کرنے والے ہیں ہم۔ خواب سراب، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی داستان بے حد متاثر کن تھی۔ باہر ملک کمانے والوں کی فیملیز کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن سلطانہ صاحبہ نے معاشرتی بے اعتدالی اور بے راہ روی کو اجاگر کیا ہے۔ کاش ہمارے معاشرے کی بے حسی ختم ہو اور ایسے حادثوں کا سدباب ہو سکے۔ وقت اور حسام بٹ صاحب، ویلڈن اور زورِ قلم اور زیادہ۔ مراسلے بہتر تھے۔"

⌘ اوشا راٹھی کا تبصرہ مٹھی سندھ سے۔ "پہلی بار کسی ماہنامہ میں لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ سسپنس ڈائجسٹ سے تعارف میرے بڑے بھیا نے کروایا۔ وہ اس ڈائجسٹ کے مستقل قاری ہیں۔ میں ان کو اصرار کرتی رہتی تھی کہ آپ اس میں تبصرہ لکھیں مگر انہوں نے کبھی نہیں لکھا۔ میری یونی سے چھٹیاں تھیں، میں لکھنے بیٹھ گئی۔ امید ہے اپنی محفل میں جگہ دیں گے۔ (خوش آمدید...... جگہ تو آپ کو مل گئی مگر جگہ کی بکنگ مستقل بنیاد پر ہونی چاہیے...... اب غائب نہ ہو جانا)۔ ٹائٹل اچھا لگا ساتھ جشنِ آزادی کی مبارک باد بھی۔ جون ایلیا صاحب میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور نثر نگاری بھی کمال کی کرتے ہیں۔ لفظ لفظ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اداریہ پاکستانی حالاتِ حاضرہ کا نچوڑ ہوتا ہے، ویلڈن۔ محفل میں آئے تو عادل عباسی، کبیر عباسی کی تعریف کرتے نظر آئے۔ اقربا پروری لگی ہے۔ (کمال ہے جناب...... آپ سے ذرا سی تعریف برداشت نہ ہو سکی)۔ خیر، ہم آگے بڑھے تو ناہید یوسف آپی کی رحم دلی نظر آئی۔ خدا سب کے دل میں رحم ڈالے۔ پرانے تبصرہ نگار بہت اچھا لکھتے تھے، پڑھ کر بہت مزہ آتا تھا۔ اب کے تبصرے سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ تھوڑا بہت طنز و مزاح ہونا چاہیے۔ (تو لائیے نا طنز اور مزاح منع کس نے کیا ہے)۔ میں سب سے پہلے چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ عمارہ خان کی گھمنڈ بہت اچھی لگی۔ گھمنڈ تو کسی بھی چیز کا ہو مرواتا ہے جیسے شاداب کو حد سے زیادہ اعتماد اور دولت کے نشے اور اکڑ نے مروا دیا۔ طاقتور، ملک صفدر حیات جی، بہت ہی شاندار واقعات ہوتے ہیں۔ ان کی جرم کی کھوج بھی لاجواب ہوتی ہے۔ زیبو اور کھارا کی المناک موت پر دل دکھی ہو گیا۔ سینڈو نے دولت کی خاطر دو جوان انسانوں کا خون کر دیا۔ خود بھی سولی چڑھا۔ علی اختر کی احساس، یوسف اقرا کی گھریلو زندگی پر مبنی بہترین کہانی تھی۔ زویا اعجاز جی کی زنداں، دل کو چھوتی کافی پرانی رسم پر مبنی کہانی تھی۔ بے چاری شا پھر اس رسم کی بھینٹ چڑھ گئی۔ دخل در معقولات، تنویر ریاض جی کی بہت اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ حسد اور دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑانا بہت مہنگا پڑا۔ سیوا سے سنجیا بھی مکمل اور بہترین داستان تھی۔ مرہٹوں کی خرمستیوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر جی ہمیشہ سے لاجواب کر دیتی ہیں۔ ان کی یہ داستان تھی تو پرانی کہ سدا سے ایسا ہوتا آ رہا ہے مگر اس داستان میں جو معاشرتی ناہمواریوں کو نمایاں کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں تاکہ ایسی غلطیاں کوئی اور نہ کرے جو معاشرے میں اس قسم کے جرائم کو جنم دینے کی وجہ بنتی ہیں تاکہ ان وجوہ کا سدباب کیا جا سکے۔ حسام بٹ جی کی وقت ابھی زیرِ مطالعہ ہے، داستان کی سمجھ تو نہیں آ رہی، ہاں امریکا کی سمجھ آ گئی۔ باغی پر تبصرہ اگلے تبصرے میں دوں گی، اشعار کی محفل بھی اچھی سجی ہے (بہت عمدہ تبصرہ رہا)۔"

⌘ اطہر حسین کی کراچی سے شرکت۔ "یوں تو ہمارا بہت دل چاہتا ہے کہ سسپنس کی شاندار محفل میں شرکت کریں مگر چاہ کر بھی تسلسل برقرار نہیں رکھ پاتے اور غیر حاضری ہو ہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ وقت کی کمی کہہ لیں یا اپنی بے پروائی۔ تاہم پچھلے ماہ سے بھرپور کوشش ہے کہ غیر حاضری نہ ہو اور پکا تہیہ کیا ہوا تھا کہ حاضری ضرور لگوائیں گے، امید ہے خط کو شاملِ محفل کر لیا جائے گا۔ سب سے پہلے نئے سلسلے پر تبصرہ حاضر ہے۔ باغی کا آغاز شاندار ہوا ہے۔ امید ہے یہ کہانی اپنا مقام بنا لے گی۔ کہانی میں حقیقت پر مبنی واقعات ہیں اس لیے کہانی مزہ دے رہی ہے۔ ہیروئن بھی مار دھاڑ میں ماہر ہے۔ کہانی زبردست ہے۔ ویسے ہم سوچ رہے تھے کہ شاید نیا سلسلہ طاہر مغل صاحب کا آئے گا۔ دوسرا سلسلہ وقت بھی ٹھیک ہے۔ مگر کہانی کا ٹیمپو سلو ہے۔ شروع میں کافی تیزی نظر آئی۔ بہرحال کہانی بہتر ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی خواب سراب بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ مصنفہ نے ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات کی صحیح منظرکشی کی۔ ایمن نے اپنے ماں باپ کی عزت کو داؤ پر لگا کر غلط راہ کا تعین کیا اور نہ

صرف یہ بلکہ اپنے ہی گھر والوں کے قتل میں ملوث ہوگئی۔ شیطان نے اس کی عقل سمجھ سب اس سے چھین لی تھی۔ بالآخر اس کے ہاتھ پچھتاوے اور سزا کے کچھ نہ آیا اور وہ جب تک زندہ رہے گی اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا رہے گا۔ وہ دنیا و آخرت دونوں سے گئی۔ ویلڈن ناہید صاحبہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سیوا سے سنجا تک میں تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ تاریخی واقعات پڑھ کر مزہ آتا ہے اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی طاقتور پڑھی۔ سچی بات ہے کہ اس طرح کے کیسز پڑھنے میں کہانی کا سا مزہ نہیں آتا۔ بس ایسا لگتا ہے کہ آپ کوئی رونما ہونے والا واقعہ پڑھ رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ لکھاری کی تحریر اچھی نہیں بس ہمیں بورنگ محسوس ہوتا ہے۔ رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام کی سوانح حیات پڑھی۔ یقین جانیے ایسی طمانیت ایسا مزہ آیا کہ مت پوچھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ پڑھتے جائیں اور مکمل کریں مگر ''باقی آئندہ'' پر آ کر مزہ کرکرا ہوگیا۔ کیا ایمان افروز واقعات تھے۔ چھوٹی کہانیوں میں زویا اعجاز کی زنداں زبردست تھی۔ چودھریوں کی وہی روایتی بربریت، یوسف کو محبت کی پاداش میں سزائے موت دی گئی جبکہ اس کا جرم اتنا بڑا نہ تھا۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔ منظر امام صاحب کی کہانیاں مختصر مگر اپنے اندر کوئی نہ کوئی سبق لیے ہوتی ہیں۔ سہارا اچھی کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی دخل در معقولات بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ تک نے ایک قتل کی تحقیقات کرتے ہوئے لاش کی دریافت کی تاہم وہ سب اسی کے کھاتے میں آ گیا۔ شیر شاہ سید کے کیا کہنے۔ بہت بہترین لکھتے ہیں۔ شاکر لطیف کی مغرب و مشرق انتہائی سبق آموز کہانی تھی جس میں مغرب و مشرق کے فرق کو واضح انداز میں اجاگر کیا گیا۔ عمارہ خان کی گھمنڈ کچھ خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ علی اختر کی احساس نے بھی کچھ خاص مزہ نہ دیا۔ ثمر عباس کی دہری خوشی تھوڑی پیچیدہ کہانی تھی۔ بابر نعیم کی ناکام کوشش بہتر رہی۔ سلیم انور کی ذہانت مختصر مگر اچھی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن بہترین رہی۔ مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔ آخر میں گزارش ہے کہ طاہر مغل صاحب کی کوئی طویل کہانی یا ہر ماہ چھوٹی کہانیاں ہی شائع کردیا کریں۔''

✽ ناہید یوسف کا خط اسلام آباد سے۔ ''اف! اس مہینے تو ''معروفیت'' ہے کہ ''فرصت'' تک نہیں پہنچ پا رہی۔ شوہر صاحب اپنی جاب کے سلسلے میں بیرونِ ملک دورے پر جا رہے ہیں اور کم بختی ہماری آئی ہوئی ہے۔ کیا کریں کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے کیا تقریباً سبھی بہنوں کے شوہر چاہتے ہیں کہ انہیں گھر آ کر کچھ نہ کرنا پڑے۔ ہر چیز پرفیکٹ ملے اور بیٹھے بٹھائے تمام کام پلک جھپکتے میں ہوجائیں۔ شوہروں کی یہ خواہش پوری کرنے میں بے چاری اکیلی عورت کا کباڑا ہوجاتا ہے۔ کچن سنبھالے، بچوں کو سنبھالے، اس پر مستزاد بازار سے روزمرہ اشیاء کی خریداری اور دیگر معروفیات...... یہ سب مل کر اچھی بھلی خواتین کو ہلکان کردیتی ہیں۔ خیر مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق شوہر صاحب کی روانگی کے لیے درکار چیزوں کی لسٹ بنائی اور ان کے حصول کے لیے دوڑ پڑے۔ جیسے تیسے انہیں ہر درکار چیز مہیا کی اور اطمینان ہوجانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کردیا۔ تمام کاموں سے فراغت کے بعد نہایت سکون سے سسپنس تھاما۔ محفل میں پہنچے۔ محفل کے تمام دوستوں کو ہماری طرف سے جشنِ آزادی مبارک۔ یہ ملک ہمیں بڑی قربانیوں کے بعد ملا ہے۔ ہماری تمام پاکستانیوں سے گزارش ہے کہ اس پاک وطن کی قدر کیجیے۔ غلامی کا طوق بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ہمارے جو بھائی بہن بیرونِ ملک مقیم ہیں، یقیناً وہ مالی آسودگی تو حاصل کرسکتے ہوں گے، مگر انہیں وہاں اپنایت اور آزادی کا احساس نہ ہوگا۔ وہ یقیناً اپنے وطن کو یاد ضرور کرتے ہوں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے وطن کو سلامت رکھے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے ہم نے تصوف سے پڑھنا شروع کیا۔ کیا ایمان پرور واقعات ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا صبر و استقامت مشعلِ راہ ہے۔ بہت خوب رضوانہ ساجد۔ پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ ''وقت'' کو ہم نے بہت ''وقت'' دیا مگر پھر بھی ہماری تسلی نہیں ہوئی۔ کہانی میں لفاظی زیادہ ہے۔ ایکشن، تھرل وغیرہ کی کمی ہے۔ ہمیں ابھی تک اس میں دلچسپی کا سامان نظر نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے رائٹر صاحب اچانک کہانی کا ٹیمپو تیز کردیں۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ...... کے مصداق پڑھتے جا رہے ہیں کہ شاید کچھ دلچسپی کا سامان مہیا ہوجائے۔ باغی طاہر عمیر صاحب کی بہت اچھی لگی۔ نام نیا نیا لگتا ہے۔ خیر، نام سے کیا...... کام اچھا ہونا چاہیے...... جو کہ ہے۔ پہلی ہی قسط نے اپنے ٹرانس میں جکڑ لیا ہے۔ بہت تیز ٹیمپو ہے۔ کہانی کی رفتار ہی اس کی اٹھان بتادیتی ہے۔ ویلڈن طاہر عمیر صاحب۔ مزہ آ گیا۔ ویسے طاہر مغل اور طاہر عمیر ناموں میں مماثلت ہے اور دونوں کے کام بھی لاجواب ہیں۔ کیا طاہر نام کا اثر ہے؟ یہ ہمارے ذہن میں آنے والا ذاتی خیال ہے۔ امید ہے کہ باغی کی آئندہ اقساط مزید ایکشن سے بھرپور ہوں گی۔ ناہید سلطانہ اختر کی خواب سراب اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی رہی۔ ناہید سلطانہ کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہر تحریر میں پختگی اور واقعات و الفاظوں کا چناؤ بہترین ہوتا ہے۔ خواب سراب نہایت عبرت اثر کہانی رہی۔ آج کل کی نوجوان نسل کے لیے اس میں ''سبق'' پنہاں تھا۔ ایسی تحاریر معاشرے کی درستگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تاریخی کہانی بھی خوب رہی۔ تاریخی کہانی ہم اپنی معلومات کے لیے دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اس سے ہمیں اپنی تاریخ سے آگاہی بھی ہوتی ہے اور اس میں عبرت آمیز واقعات سے سبق بھی حاصل ہوتا ہے۔ چھوٹی کہانی مغرب و مشرق بہت پسند آئی۔ بہت خوب شاکر لطیف۔ آپ نے مشرق و مغرب کی صحیح عکاسی کی ہے۔ منظر امام کی سہارا بھی اپنی مثال آپ رہی۔ انتہائی سادہ الفاظ میں ہمیں ایک سبق دے گئی۔ شیر شاہ سید صاحب کی تو بات ہی نرالی ہے۔ بہت منفرد کہانی لکھتے ہیں۔ ہم ان کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ معروفیت کے باعث زیادہ کہانیاں نہیں پڑھ پائے۔ تبصرہ بھی لکھنا تھا، سو جو جو کہانیاں پڑھیں، ان پر اپنی ناقص رائے بھیج دی۔ اس دفعہ دل کڑا کر کے ملک صفدر حیات کی طاقتور پڑھی۔ وہ یوں کہ یہ کھوج وغیرہ ہمیں الجھادیتی ہے۔ کسی قتل کی تفتیش یا عدالت و پولیس کے واقعات میں ہم یکسوئی نہیں رکھ پاتے۔ بہرحال کہانی پڑھی تو مزہ آیا۔ صفدر صاحب نے زیبو والا معما حل کر کے مجرم کو پکڑ ہی لیا۔ اچھی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ باقی رسالہ زیر

مطالعہ ہے۔''

✠ مہتاب احمد کا تبصرہ حیدرآباد سے۔ ''تمام قارئین کو جشنِ آزادی 14 اگست مبارک ہو۔ اللہ رب العزت ہمارے ملک کو ترقی عطا فرمائے اور دشمن ملک کی سازشوں اور شرپسندوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ پڑھا۔ کیا کہنے جون صاحب کے۔ ان کی یہی خوبی انہیں ممتاز کرتی ہے کہ انہوں نے سالوں پہلے اپنی دانش مندی سے تمام حالات کی صحیح منظرکشی کی ہے۔ انشائیہ کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی تو ناہید سلطانہ کا نام دیکھ کر سب سے پہلے خواب سراب میں جا پہنچے۔ معاشرتی بگاڑ اور اپنی خواہشات کی خاطر خونی رشتوں کی بے حسی پر مبنی کہانی نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ایک بیٹی نے اپنی پسند کی خاطر پہلے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگائی پھر پسند کے حصول کے لیے ان کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ معصوم بھائی کو بھی بھینٹ چڑھا دیا۔ مگر حاصل کیا ہوا؟ سوائے رسوائی، ذلت، ندامت اور پچھتاوے کے۔ زبردست کہانی تھی۔ ایسی بے شمار مثالیں ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ اس طرح کی کہانیاں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ہمیں اپنے اندر بدلاؤ اور راہِ راست پر چلنے کی ضرورت ہے۔ بہت خوب ناہید صاحبہ۔ اس کے بعد ملک صفدر حیات کی طاقتور پڑھی۔ ملک صاحب نے زیبو کے غیاب کا معما احسن طریقے سے حل کیا۔ اچھی کہانی تھی۔ حسام بٹ صاحب کی وقت ہم شوق سے پڑھتے ہیں۔ بٹ صاحب ہمارے فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کی کہانی وقت اپنا رنگ خوب جما رہی ہے۔ نیا سلسلہ باغی واقعی اپنے اندر باغیانہ پن سموئے ہوئے ہے۔ کہانی انتہائی تیز رفتاری سے شروع ہوئی ہے اور اینڈ میں عجیب سی تشنگی دے گئی۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات نے دل ایمان کی روشنی سے منور کر دیا۔ ہمیں اپنے مذہبی لٹریچر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس سے آگہی کے در وا ہوتے ہیں اور زندگی کے معاملات میں راہنمائی بھی ملتی ہے۔ تاریخی کہانی سیوا سے سنبھا تک پڑھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے تاریخی واقعات کو اس قدر خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ چھوٹی کہانیوں میں تنویر ریاض کی دخل در معقولات، منظر امام کی سہارا، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی وہ دل کہاں سے لاؤں اور زویا اعجاز کی زنداں بہت پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بس ٹھیک رہیں۔ محفل شعر و سخن ہمیشہ کی طرح پوری آب و تاب سے جگمگا رہی تھی۔ خطوط میں عادل عباسی بھائی پہلے نمبر پر رہے، مبارکباد۔ ناہید یوسف کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ محترمہ کے تبصرے ہم نہایت یکسوئی سے پڑھتے ہیں کیونکہ ان کا اندازِ بیاں اچھا ہے۔ ویسے تو محفل کے تمام دوستوں کے خطوط اپنی اپنی جگہ لاجواب ہوتے ہیں۔ سسپنس کی محفل میں آ کر احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک فیملی ہیں۔ اللہ اس محفل کو شاد و آباد رکھے، آمین۔ ہماری سسپنس کی انتظامیہ سے درخواست ہے کہ نواب صاحب اور کاشف زبیر مرحوم کی جو کہانیاں شائع نہیں ہوئیں انہیں شائع کریں۔ یہ دونوں رائٹرز اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔''

✠ دوست محمد خان کی پشاور سے شرکت۔ ''ایک عجیب سی وحشت ہے، ہر طرف پریشانی ہے۔ نفسانفسی کا عالم ہے۔ ان سب پریشانیوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے ہم بک اسٹال پر پہنچ گئے اور سسپنس پر نظر پڑتے ہی ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں اور یوں ہمیں سسپنس 18 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے ہماری نظر ٹائٹل پر پڑی اور ہم ایک حسینہ کے حسنِ بے مثال پر اش اش کر اٹھے۔ جیسے شادی سے پہلے دلہن تیار ہوتی ہے۔ جون ایلیا صاحب کی باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ خدا ہمارے وطن کو اور بھی خوب صورت بنائے اور خدا اس کی حفاظت کرے۔ ایڈیٹر صاحب آپ نے بالکل ہمارے دل کی بات کی۔ سسپنس کلاسک کے عنوان سے آپ نے بات کی۔ یہ تو ہم کب سے کہہ رہے ہیں کہ یہ سلسلہ شائع کریں۔ ہم اس کا انتظار کریں گے۔ آگے بڑھے اور دوستوں کی محفل میں چھلانگ لگائی۔ کرسی صدارت پر عادل عباسی صاحب براجمان تھے۔ بھئی بہت بہت مبارک ہو۔ بڑا شاندار تبصرہ تھا آپ کا۔ عادل بھائی ذرا بتائیں بہاولپور کی کیا چیز مشہور ہے؟ ناہید یوسف باجی وزیراعظم کے عہدے پر براجمان تھیں۔ باقی دوستوں میں صفدر معاویہ، اشفاق شاہین، محمد خواجہ، رمضان پاشا، پائندہ خان سلیمان خیل، طاہرہ گلزار، ادریس احمد خان، اطہر حسین اور محمد زریان سلطان کے خطوط بہت شاندار تھے۔ زریان بھئی کیوں خفا ہوتے ہو ہم تم کو یاد کریں گے۔ (یہی تو اپنایت ہے)۔ طاہرہ باجی کو میری طرف سے سلام کیونکہ ہمارا اور ان کا شہر ایک ہے۔ احسان سحر، بلقیس خان، نادر سیال تم لوگ کہاں گم ہو گئے۔ سیوا سے سنبھا تک ڈاکٹر ساجد امجد، سبق آموز کہانی۔ یہ بادشاہت بھی کیا چیز تھی اس کے لیے ہر طرف سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ چلو اچھا ہوا کہ اس وقت ہم نہیں تھے۔ سہارا منظر امام صاحب کی اچھی کہانی، بالکل دنیا کی قیمتی چیز دوسرے کا کندھا ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اگر دیوار کو دوسری دیوار کا سہارا نہ ہو تو یہ دیوار گر جاتی ہے۔ محمد طاہر عمیر کی باغی پڑھی۔ پہلی قسط تھی۔ آگے پتا لگے گا۔ ذہانت سلیم انور کی گزارے لائق تھی۔ زنداں زویا اعجاز کی دیہاتی پس منظر میں لکھی گئی اچھی کاوش تھی۔ ثمر عباس صاحب کی دہری خوشی بھی اچھی کہانی تھی۔ گھمنڈ عمارہ خان کی بہترین کہانی جس میں شاداب خان طاقت کے نشے میں اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا۔ علی اختر کی احساس پڑھی۔ یوسف پر بڑا ترس آیا۔ اقرا جیسی بدمزاج عورتوں سے خدا ہر کسی کو پناہ میں رکھے۔ اپنے مجازی خدا کے ساتھ ایسا سلوک، ایسی عورتیں دنیا میں بھی خوش نہیں ہوتیں اور اپنی آخرت بھی تباہ کر دیتی ہیں۔ حسام بٹ کی وقت میں اس دفعہ دلچسپی بڑھ گئی اور امید ہے کہ کہانی کا ٹیمپو آگے جا کر بہت دلچسپ ہوگا۔ وہ دل کہاں سے لاؤں، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی پیاری کہانی جس میں اول سے لے کر آخر تک کہانی نے ہمیں جکڑے رکھا۔ مغرب و مشرق میں شاکر لطیف صاحب نے بڑی اچھی منظرکشی کی ہے۔ جہاں مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے میں عورت کچھ بھی کر سکتی ہے اور مشرق میں عورت اپنی حیا اور شرم کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ، رضوانہ ساجد ......ایمان افروز واقعہ یوسفؑ کے والد محترم حضرت یعقوبؑ کے صبر سے سبق ملتا ہے۔ خواب سراب میں ناہید سلطانہ اختر نے عورتوں کو سبق دیا ہے

کہ نبیل جیسے لوگوں کے پیچھے مت بھاگیں، وہ صرف سراب ہوتے ہیں۔ لڑکیاں نادانی میں ایسی غلطیاں دہراتی ہیں اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ محفل شعر و سخن میں بادیہ ایمان ماہا ایمان، ملک محمد ظفر، ردا جاوید، صفدر معاویہ، اشفاق شاہین، میمونہ خان، ...... کہکشاں انور، آمنہ عمران اور سائرہ نواب کے اشعار اچھے تھے۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔"

✠ خلیق ربانی انجم چارسدہ سے شاملِ محفل ہیں۔ "اگست 2017ء کا شمارہ سات کو ملا اور کئی نشستوں میں تمام کیا۔ انشائیہ سے ہوتے ہوئے "آپ کے خط" میں پہنچا۔ "آپ کے خط" میں ادارتی نوٹ میں یہ بات/ وضاحت دل کو لگی کہ...... "جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ سسپنس ڈائجسٹ کے اجرا کو تقریباً چار عشروں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ لہٰذا قارئین کی جگہیں بھی بدل چکی ہیں۔ جنہوں نے جوانی میں سسپنس کی رفاقت اپنائی وہ یقیناً اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں اور جو نئی نسل سسپنس کی یادگار تحریریں نہیں پڑھ سکی، ہم ان کے لیے خاص طور پر گزشتہ 70 اور 80 کی دہائی کے شماروں سے نادر اور یادگار تحریریں سسپنس کلاسک کے عنوان تلے گاہے بگاہے شائع کرتے رہیں گے۔" اس حوالے سے میں نے بھی ایک خط بہت پہلے لکھا تھا۔ (آپ سے پہلے بھی بے شمار قارئین نے خطوط میں ہمیں اس سلسلے میں آمادہ کیا اور اسی تناظر میں ادارے نے اسے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیگر آرا اپنی جگہ مگر کہانیوں پر تبصرہ کہاں ہے، بھئی؟)"

✠ رمضان پاشا گلشن اقبال کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ "ماہِ اگست 2017ء کا سسپنس کا سرورق بہت دلکش تھا۔ سرورق جتنا میٹھا لگ رہا تھا، پسِ ورق اتنا ہی کھٹا لگا۔ فہرست بھی سادہ اور قابلِ دید تھی۔ انشائیہ حسبِ معمول دبنگ تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے عادل عباسی کو مبارک باد۔ موصوف کا طویل تبصرہ بھی جاندار اور شاندار تھا۔ اشفاق شاہین صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنے تبصرے میں میرا ذکرِ خیر کیا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ نے میرے نام کے ساتھ بھائی لکھا، میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ اس دفعہ تمام تبصرے اچھے تھے، البتہ گوجرانوالہ کے آصف محمود کا تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ موصوف کا "شیش محل" کے بارے میں بور کہانی" اور پرلوک سدھار گئی" پڑھ کر دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ "وقت" کے بارے میں موصوف کی بدذوقی ناقابلِ معافی ہے۔ غیر ملکی کہانیوں میں "دخل در معقولات" بہترین تھی۔ "سہارا" میں مزہ نہیں آیا۔ طبع زاد کہانیوں میں "باغی" بہت ہی عمدہ تھی۔ آخر میں "جاری ہے" دیکھ کر بڑا غصہ آیا۔ (کیوں بھائی غصہ کس بات پر۔ اچھی تحریر ہو یا کوئی بھی چیز ایک دم نہیں ملتی) "ذہانت" بہت مختصر بہت دلچسپ، طبع زاد کہانیوں میں "احساس" بھی بہت خوب تھی اور "زنداں" خوب سے خوب تر۔ "وقت" پڑھنے کے لیے وقت نکالنا میرے لیے وقت طلب کام بن گیا، آخر کار میں نے وقت نکال کر وقت پڑھ لی (یہ تو وقت کی مہربانی ہوگئی)۔ کہانی اب صحیح معنوں میں میرے معیار پر آ گئی ہے۔ اگلی قسط میں بڑی اٹھا پٹخ اور دھیں پٹاس ہونے والی ہے، مزہ دوبالا ہونے والا ہے۔ "وہ دل کہاں سے لاؤں" ڈاکٹر صاحب نے اپنے خصوصی موضوع سے ہٹ کر محبت کی کہانی لکھ دی۔ یہ بھی قابلِ قبول ہے۔ "مغرب و مشرق" یہ کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ "ناکام کوشش" بھی پسند نہیں آئی، اس میں کیا تھا جو پسند کی جائے؟ "خواب سراب" کہانی بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ پائے کی تھی۔ (تبصرے کا شکریہ)۔"

✠ ادریس احمد خان کا خط ناظم آباد کراچی سے۔ "اگست کا شمارہ ذاکر صاحب کے فن کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ انشائیہ بھی وقت کے حساب سے اپنی جگہ درست تھا جب تک کوئی مداوا نہ ہو تب تک امید پر ہی قائم رہنا ہے جب تک بھی امید بر نہیں آتی۔ (یہی تو جینے کا فن ہے جناب) اگست میں پاکستان کو بنے سات عشرے ہو جائیں گے۔ مفاد پرستوں، پیسے وجاہ حشم کی طمع کرنے والوں نے پاکستان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا مگر یہ بھی برحق ہے کہ ہمیں بحیثیت مسلمان امید اچھی رکھنا ہے۔ اداریہ بھی بروقت تھا۔ سرفہرست آنے پر عادل عباسی کو مبارک باد۔ اشفاق شاہین اور رمضان پاشا صاحب کا بہت شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ بہن طاہرہ گلزار بھی محفل میں حاضر تھیں۔ ہماری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کی دکھ کی گھڑیاں خوشیوں میں بدل جائیں، آمین۔ باقی دیگر "سسپنس" کے ساتھی اور دوست بھی جلوہ گر تھے۔ سب کو سلام۔ آپ سب کو عیدالضحیٰ اور جشنِ آزادی مبارک ہو۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر سیواجی اور اس کے بیٹے سنبھا کے حالات وواقعات پڑھے۔ تاریخ کے گوشوں سے روشناس ہوئے۔ باقی کہانیوں میں "دخل در معقولات"، منظر امام کی "سہارا" بہت اچھی اور منفرد لگیں۔ نیا سلسلہ "باغی" محمد طاہر عمیر کی کہانی بہت پسند آئی۔ امید ہے اسی طرح دلچسپی برقرار رہے گی۔ "ذہانت" بھی عمدہ رہی۔ "زنداں" بھی بلاشبہ اچھی کہانی تھی۔ زویا اعجاز بہت اچھا لکھ رہی ہیں خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دہری خوشی نے بھی خوشی کے لمحات مہیا کیے۔ گھمنڈ نے بھی محظوظ کیا اور اشعار کی محفل میں بھی مزہ آیا۔ احساس نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ وقت، وہ دل کہاں سے لاؤں، مغرب و مشرق اور داستانِ یوسف، ناکام کوشش اور خواب سراب بہترین کہانیاں تھیں۔" (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔

✠ زاہد احمد کی ناگن چورنگی کراچی سے آمد۔ "سب سے پہلے تو میں آپ کو ایک اندوہناک خبر سناؤں جو کہ میرے لیے بہت ہی صدمے کا باعث ہے کہ میرا گیارہ سالہ بیٹا عبدالکبیر حادثاتی طور پر آگ سے جل کر ایک ہفتے سول اسپتال کے برنس سینٹر میں زیر علاج رہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون، بہت افسوس ہوا یہ جان کر۔ اللہ آپ کو صبر اور بچے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین)۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرا غم اور صدمہ بڑا ہے مگر میرے اللہ نے دوسرے دن ہی بتا دیا کہ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے غم اور صدمے تم سے بھی بڑے ہیں۔ یعنی عید سے ایک دن پہلے ضلع احمد پور شرقیہ کا حادثہ ہوا۔ الٹے ہوئے آئل ٹینکر سے لوگ جو پیٹرول بھر رہے تھے اچانک اجل نے کئی خاندانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ پتا نہیں اگست کا سسپنس آیا یا نہیں، بہرحال ساری کہانیاں اور سلسلے پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں پہنچا تو الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

مئی کے سسپنس پر کیا ہوا تبصرہ جولائی کی محفل میں پڑھنے کو ملا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر کسی کی جائز محنت کا صلہ دیتا ہے۔ ادارے کا بہت شکریہ دیر سے ہی سہی پر مجھے محفل میں شامل کر کے ادارے نے میرا مان اور میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ جون صاحب کے افکار سننے کے لیے رکے۔ واقعی مجاہد ہتھیاروں سے جہاد کرتے ہیں۔ آپ نے زندگی بھر معاشرے کے ناسوروں کے خلاف قلم سے جہاد کیا۔ یہ نوکر شاہی کیا ہے، یہ وہ ناسور ہیں جو عام عوام تک انصاف پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ شیش محل کا آخری دیدار کیا۔ اتنی پیاری اور دلوں کو موہ لینے والی داستان اتنی جلدی ختم ہوگئی، تشنگی رہ گئی جیسے کہ چاند بانو تشنہ رہ گئی اس داستان میں۔ بہت ہی کم داستانیں ہوتی ہیں جو دل کو چھو جاتی ہیں اور یاد رہتی ہیں۔ شیش محل کا شمار بھی انہی داستانوں میں ہوتا ہے جو کہ عرصہ دراز تک قارئین کو یاد رہے گی...... اور ''وقت'' بھی بہت مناسب سلسلہ ہے اور اچھی جا رہی ہے۔ حسام بٹ صاحب ہمارے منجھے ہوئے رائٹر ہیں ان کی کاوشیں ہر کوئی پسند کرتا ہے۔ علی کا ایمان مضبوط تھا جو وہ ڈیلفی، ایپل بام اور ربی جیسے شیطانوں کے ٹولے سے بچ کر نکل آیا اور اب پاکستان اپنی ماں کو تلاش کرنے جا رہا ہے۔ آگے وقت اور زیادہ دلچسپ ہوگی۔ مغل صاحب نے دلاور کو ایسا محبت میں غرق کیا کہ وہ سیکیورٹی کے معاملات پر توجہ نہ دے سکا اور ایک کم عمر لڑکا اتنے سخت پہرے میں آ کر سویرا کو قتل کر دیتا ہے۔ دو حصوں پر مشتمل سلسلہ تشنہ کامی کا شکار ہوگیا۔ سویرا کا قتل اور ایک اور تشنگی رہ گئی کہ دلاور کے ماں باپ بھی اس کو نہ مل سکے۔ ''بادشاہ گر'' ان تمام سلاطین کی کہانیاں ہیں جنہوں نے اپنے اقتدار کی خاطر اپنے خونی رشتوں کو قتل کیا اور ان کی آپس کی جنگوں میں زیادہ تر مسلمان سپاہی آپس میں لڑ کر قتل ہوئے۔ مسلمانوں کی ایک دوسرے کے ہاتھوں نسل کشی ان ادوار میں جتنی زیادہ ہوئی، کبھی نہیں ہوئی اور مسلمان جب سے ہی کمزور چلے آ رہے ہیں۔ ''سیوا سے سنجا تک'' میں بھی یہی سب کچھ ہے۔ ''نشانہ'' میں بھی عین وقت پر سب الٹ ہوگیا۔ یعنی توپ کا گولہ چلنے سے پہلے توپ کا منہ توپ چلانے والوں کی طرف ہوگیا۔ باقی جولائی کا سسپنس شاندار رہا۔ پائندہ خان سمیت سوائے آصف محمود صاحب کے سب کے تبصرے شاندار تھے۔ اشعار کی محفل بھی بہت اعلیٰ رہی اور کترنیں لاجواب تھیں۔ باقی اگست کا شمارہ ہمیں جولائی کی 16 تاریخ کو مل گیا۔ تمام اہلِ وطن کو ایڈوانس جشنِ آزادی مبارک ہو۔ سرورق پر نظر پڑی تو بے اختیار ذاکر صاحب کے شاہکار کی تعریف کرنے کو دل چاہا لیکن سوچ رہا ہوں کہ تبصرہ بیگم صاحب نے پڑھ لیا تو بہت دن تک طنز و مزاح کے تیر چلائیں گی۔ اشتہارات پھلانگتے ہوئے جون صاحب کو سننے بیٹھ گئے بقول آپ کے جب سے پاکستان بنا ہے آنے والے حکمرانوں نے جھوٹے وعدے ہی کیے ہیں، مظلوم عوام کو ہمیشہ دھوکا دیا ہے لیکن اب عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا اور بہت ہو چکا۔ اداریہ بھی ہمیشہ کی طرح لاجواب ہے، بے شک سسپنس کے اجرا کو چار عشروں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اور 70ء سے 80ء کی دہائی کے شماروں سے نادر اور یادگار تحریروں کا کلاسک سسپنس کے نام سے آپ کا جو آئیڈیا ہے بہت شاندار ہے اور رہے گا۔ محفلِ دوستاں میں پہنچے تو عادل عباسی صاحب کو مسندِ صدارت پر جلوہ افروز پایا۔ بھئی بہت ہی اعلیٰ خوبصورت اور برجستہ تبصرہ کیا ہے ویلڈن۔ سوچ رہا ہوں کہاں سے شروع کروں۔ پہلے حضرت یوسفؑ سے پڑھنا شروع کیا بے شک آپ کے بھائیوں نے آپ کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ اگلے حصے کا انتظار ہے۔ طاقتور کے پاس سے گزرے تو ملک صاحب کو طاقتور کو طاقت اور ذہانت سے زیر کرتے ہوئے دیکھا ہر طاقتور طاقت کے نشے میں فرعون بن جاتا ہے سینڈوا گرز یبو اور کھارا کو پیسے چھین کر بے ہوش کر کے چھوڑ دیتا تو سہی تھا پر اس نے طاقت کے زعم میں دونوں کو قتل کر دیا۔ بہرحال انجام بہت ہی اندوہناک تھا اور اس میں لڑکی کے باپ غلام سرور کا بھی قصور ہے جو ذات پات کے چکر میں بیٹی گنوا بیٹھا۔ سلطانہ صاحبہ نے خوابوں اور سرابوں میں خوب بھٹکایا۔ بھولی بھالی ایمن تو بہت ہی سفاک نکلی اور بے شرم بھی تھی۔ آج کل دور ایسا آ گیا ہے کہ کوئی کسی کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ لوگ بے حس ہو گئے ہیں۔ کہیں ماں باپ نے بھی اولاد کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ کہانی کا انجام انتہائی اندوہناک اور سبق آموز ہے۔ ناہید صاحبہ نے معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے۔ طاہر عمیر صاحب باغی لے کر آئے ہیں۔ نئے سلسلے کا آغاز ہوا ہے۔ شروع ہی تیزی سے ہوئی ہے اور ٹیمپو تیز ہے۔ بہرحال کامران اپنے باپ چودھری حشمت کو کالے دھندوں کی وجہ سے ناکوں چنے چبوا دے گا۔ اب آشتی بھی اسے مل گئی ہے دخل در معقولات واقعی نامعقولات میں شمار ہوتا ہے۔ منظر امام صاحب واقعی اس بار تھوڑا سا المناک سہارا لے کر آئے۔ واقعی ہمیں غم ہلکا کرنے کے لیے کسی ایسے کاندھے کی ضرورت ہوتی ہے جس پر ہم سر رکھ کر رو سکیں۔ مشرق مشرق ہے... مغرب مغرب ہے۔ مشرقی اخلاقیات، شرم و حیا روایات کے معاملے میں مغرب سے بدرجہ بہتر ہے۔ باقی مغرب سے درآمد کہانیاں بھی بہتر ہیں۔ اگر ان پر خیال آرائی ہوگی تو تبصرہ بہت لمبا ہو جائے گا۔ بقیہ اشعار کی محفل میں جناب جاوید اختر، ملک محمد ظفر اللہ، ملائکہ حریم کے اشعار پسند آئے۔ کترنیں کم تھیں پر معیار اچھا ہے۔ باقی اس مرتبہ المناک کہانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔''

⌘ صادق آباد سے عطاء اللہ اعوان کا خط محکمۂ ڈاک کی عنایت سے ذرا تاخیر سے ملا۔ وہ تمام ہی قلم کاروں سے ناراض ہیں۔ کچھ خطوط کی کاٹ چھانٹ کر کے ان کی ناراضی کا ذکر اس لیے ضروری ہو گیا کہ وہ ان صفحات کو چاپلوسی کے لیے مخصوص قرار دے رہے ہیں جبکہ یہاں تلخ و ترش خطوط بھی جگہ پاتے رہے ہیں۔ انہوں نے بعض موجود و مقبول مصنفین کے لیے جہاں سخت اور تنقیدی الفاظ تحریر کیے ہیں، وہیں وہ ہمارے نئے قلم کار طاہر عمیر کے مداح بھی ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے محترم قاری ناپسند کے بعد ہمیں اپنی پسند سے بھی وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہیں گے۔

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عبدالجبار سیال، ڈیرہ غازی خان۔ پائندہ خان، سلیمان خیل، ضلع شیخوپورہ۔ بابر عباس، کھاریاں۔ امتیاز احمد، پھالیہ۔ مختار احمد، سرگودھا۔ منیر شگفتہ، وہاڑی۔ صبا سحر، کراچی۔

سانجھ

علی اختر

زندگی کا کوئی بھی دور ہو یا لمحہ ... اپنے دامن میں نہ صرف کچھ نیا لاتا ہے بلکہ گزرنے کے بعد یادیں بھی چھوڑ جاتا ہے لیکن ... صرف ان کے لیے جو اس پل کی زد میں آئے ہوں۔ 1857ء کی جنگ میں جہاں بے شمار داستانیں رقم ہوئیں اور بڑے بڑے سورماؤں کے بہت سے کردار آج بھی تاریخ میں اپنے کارناموں کے حوالے سے زندہ و جاوید ہیں، وہیں ایک طوائف زادی کے محبانہ جذبات اسے بھی تاریخ میں...... ایک خوب صورت جگہ عطا کر گئے۔ بے شک ہزاروں، لاکھوں نہ سہی مگر سیکڑوں دلوں میں اس کی جاں نثاری کا فسانہ محفوظ ہے۔ اگرچہ خود اسے یقین نہ تھا کہ کوئی اس کی قربانی کو یاد بھی رکھ سکے گا کیونکہ وہ تو ایک طوائف زادی تھی۔ اس کلنک کو اس نے جس خوب صورتی سے اپنی پیشانی سے صاف کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کردار حیثیتوں سے نہیں عمل سے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ کہ جس کا ہر سویرا بڑا روشن اور تابناک ہوتا تھا مگر... جب زندگی کی سانجھ ہوئی تو ایک ایسی روشنی اس کے ماتھے پر رقم تھی جس نے اس کے ماضی کو بے مثال بنادیا... شاید اس کے خلوص کے پیشِ نظر تاریخ میں اس کے کردار کو بھی سنہرے حروف میں لکھا جاسکے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

میرٹھ کی یہ صبح یہاں اترنے والی دوسری صبحوں کے مقابلے خاصی اداس تھی جیسے ہر چیز پر مردنی چھائی ہو۔ شہر کی تمام سڑکیں سنسان اور ویران تھیں۔ مئی کی تیز دھوپ نے جہاں دوسری رنگینیوں کو چاٹ لیا تھا... اس کی جسم کاٹتی شعاعیں فوجی بارکوں میں گرمی اور اس کی چھتوں کو جھلسانے لگی تھیں۔ فوجی اپنی اپنی بارکوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ سامنے پریڈ کے گراؤنڈ میں آم کے چاروں طرف درختوں پر جیسے غیر مرئی قوتوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ویرانی نے ہر سو اپنا قبضہ جمایا ہوا تھا اور چھاؤنی کا وسیع وعریض میدان پارے کی جھیل کی طرح جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

میرٹھ میں انگریز فوجیوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ جہاں کے انگریز فوجی اور اعلیٰ فوجی عہدیدار ایسی گرمی اور دھوپ کی لو سے بچنے کے لیے بچوں کو لے کر شملہ چلے جاتے تھے۔ اس سال گرمی کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ تھی اور انگریز اپنے بال بچوں کو گاڑیوں اور چھکڑوں پر لاد کر پہاڑوں کی طرف جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ویسے بھی ایسے موسم میں انگریز فوجیوں کی یہاں اس لیے ضرورت نہ تھی کہ اب میرٹھ پر ان کا قبضہ مضبوط ہو چکا تھا اور وہ شہر پر اپنے مضبوط قبضے کی وجہ سے آرام طلب اور طاقت کے نشے میں اس قدر سرشار ہو چکے تھے کہ اب وہ خود اعتمادی کے غرور

میں سارے عیش حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ شہر میں کئی ہفتوں سے طرح طرح کی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ ملک میں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ صاحب لوگ بھی ان افواہوں سے بے خبر نہ تھے۔ رات کے کھانے کے بعد جب ہندوستانی ملازم اور پنکھا قلی رخصت ہوجاتے...... اور انگریز افسر اکٹھے بیٹھتے تو اکثر ان افواہوں پر تبصرہ ضرور کرتے۔ اپنی اپنی معلومات کا تبادلہ کرتے، شراب کے پیگ چڑھاتے، باتیں افواہوں سے شروع ہوتیں اور جیسے جیسے نشہ چڑھتا جاتا افواہوں کی پریشانی ٹھٹھے اور مخول پر ختم ہوجاتی۔ ان گرم افواہوں میں ایک افواہ تھی کہ فوجیوں میں چپاتیاں تقسیم ہورہی ہیں پھر ایک اور افواہ یہ بھی گردش میں تھی کہ بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے تکیوں کے نیچے سے کنول کے پھول برآمد ہوئے ہیں۔ یہ کام کون اور کس مقصد کے لیے کر رہا تھا کسی کو معلوم نہ تھا۔

اس شام بھی کھانے سے فارغ ہوکر انگریز فوج کے نچلے درجے کے فوجی شراب پینے اور گپیں لڑانے کو اکٹھے ہوئے تو ان میں سے ایک فوجی افسر نے اپنے سے جونیئر سے سوال کیا۔

''ولیم...... تم جانتا...... یہ چپاتیوں کا کیا سلسلہ ہے؟''

''نو سر...... سنا ہے وہ ٹریول کرتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لگتا ہے، کمپنی کی حکومت آنے سے انڈین گدھوں کو زیادہ بھوک لگنے لگی ہے......'' ایک اور نے جواب میں کہا تو سارے ٹھٹھا مار کے ہنسنے لگے۔

''اور سنو...... سنا ہے، بارک پور میں ان ہندوستانی فوجیوں نے کارتوس لینے سے انکار کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کارتوسوں پر لگی ہوئی چربی کی وجہ سے وہ انہیں اپنے منہ سے نہیں توڑیں گے۔'' کسی اور نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا۔

''ہمیں کیا...... ہم تو شملہ جارہا ہے۔ کل اپنے بچوں اور بیوی کو لے کر......'' ان میں سے بڑے افسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''ان حرام خوروں کو پکڑ لیا گیا ہے اور سزائیں دے دی گئی ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''کورٹ مارشل کرنا چاہیے تھا......'' ایک بولا۔

پھر وہ سارے اپنی اپنی بولیاں اور رائے دیتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ میرٹھ کی فضاؤں میں اب آئے روز ایسی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔

میرٹھ میں فوجیوں کا تیسرا سوار دستہ سب سے بڑا اور منتخب دستہ تھا۔ اس کے ہندوستانی نوجوانوں پر جنرل ہوگف کو بڑا ناز تھا۔ اس دستے کے سپاہیوں کو بھی بارک پور کے فوجیوں کو کارتوس کے نہ استعمال کرنے پر انگریز افسروں کی جانب سے دی جانے والی ذلت آمیز سزاؤں اور گرفتاری پر بڑا رنج تھا اور ان کارتوسوں کو استعمال کرتے وقت ان کے بھی چہرے نفرت سے سرخ ہوجاتے تھے اور مارے غوف کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اس خبر کا نئے آنے والے کمانڈر کرنل کار مائیکل اسمائتھ کو بھی علم ہوچکا تھا۔ وہ اسی اپریل کو انگلینڈ سے تازہ دم میرٹھ میں تعینات ہوکر آیا تھا۔ اسے سپاہیوں کا یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا۔ اسے لگا کہ نئے کارتوسوں پر سپاہیوں کا اس طرح ناک بھوں چڑھانا بغاوت اور سرکشی کے مترادف ہے۔ فوج میں سرکشی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ بڑے دنوں سے اس موقع کا منتظر تھا کہ کسی دن ہندوستانی فوجی اس کے سامنے ایسی نفرت کا اظہار کریں تو وہ انہیں سبق سکھادے۔ بالآخر اسے یہ موقع بھی مل گیا۔ ایک دن اس نے تیسرے سوار دستے کو پریڈ پر بلایا اور کارتوس دینے سے پہلے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ......

''کارتوس پر گائے یا خنزیر کی چربی نہیں لگائی جاتی پھر بھی اگر آپ لوگوں کو اس کا وہم ہے یا کسی نے تمہیں شک میں ڈال دیا ہے تو ان کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے بجائے ہاتھ سے نوچ کر الگ کردو۔''

سوار دستے کے سپاہیوں نے اس کی باتوں کو خاموشی سے سنا۔ جب کارتوس انہیں دیے جانے لگے تو دستے کے نوّے سپاہیوں میں سے فقط پانچ سپاہیوں نے کارتوسوں کو پکڑا۔ بقیہ نے انہیں لینے سے انکار کردیا۔ کرنل اسمائتھ سپاہیوں کی اس خودسری پر حیران رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی نافرمانی پر انہیں کڑی سے کڑی سزا دے تاکہ انہیں نافرمانی کی دوبارہ جرأت نہ ہو لیکن فوجی اصول وضابطے کے تحت وہ اپنے سینئر جنرل گف کی اجازت کے بغیر کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ غصے میں کھولتا ہوا اپنے آفس میں چلا گیا اور پریڈ منسوخ کردی گئی۔

یہ 6 مئی 1857ء کی وہی صبح تھی جس روز فضا سوگوار لگتی تھی۔ جیسے بین کر رہی ہو۔ ہر شے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور فوجی بارکوں میں موجود سپاہیوں کے چہروں پر بھی خوف طاری تھا۔ لگ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ سراسیمگی اور خوف بارکوں سے نکل کر شہر کے گلی کوچوں، بازاروں پر بھی قابض ہوچکا تھا۔ پھر بارکوں سے بات نہ جانے کس طرح

نکل کر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل گئی۔ جو بھی سنتا... وہ ہندوستانی سپاہیوں کے اس اقدام کی تعریف کیے بنا نہ رہتا۔ لوگ سنتے، آگے سناتے اور فوجیوں کو شاباش دیتے۔

کرنل اسمائتھ نے اس واقعے کی اطلاع جنرل گف کو دی۔ جنرل گف نے اس واقعے کی سپہ سالار افواج کو رپورٹ کر کے اس سے مشورہ مانگا۔ فوج کے سپہ سالار نے معاملہ دیکھا۔ فوجیوں کا یہ ردِعمل صریحاً انگریز افسروں کی حکم عدولی تھا۔ وہاں سے ان فوجیوں کا فوراً کورٹ مارشل کر کے انہیں سخت سزائیں دینے کا حکم جاری ہوا۔ 7 مئی کو ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے ایک پرانی عمارت میں ڈال دیا گیا۔ اس سے اگلے دن جمعہ تھا۔ اس روز ان قیدیوں کو بلایا گیا...... اور ان سے انگریز افسروں نے اس عمارت کے کھلے صحن میں زمین پر بیٹھنے کو کہا جبکہ آفیسرز کے لیے کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک دیسی سپاہی کے ہاتھ میں ملزموں کی لسٹ دے کر سب کو باری باری بلانے کا حکم دیا گیا۔

''ماتا دین......'' دیسی سپاہی نے پہلا نام پکارا۔ ماتا دین ایک سن رسیدہ سپاہی تھا۔ جو زمین سے بہ مشکل اٹھا اور آفیسرز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ہاں تو ماتا دین تم کیا کہتا۔'' صاحب نے فردِ جرم پہلے انگریزی اور پھر اردو میں پڑھ کے سنائی اور اس سے سوال کیا۔

''صاحب۔ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔'' سپاہی نے دوسرا نام پکارا۔

''بلدیو سنگھ۔'' بلدیو سنگھ جلدی سے کھڑا ہوا۔

صاحب نے اس کی فردِ جرم پڑھی اور اس سے بھی وہی سوال کیا۔ تو بلدیو سنگھ نے بھی صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس طرح تمام ملزموں کو ان کے جرموں کی تفصیل بتائی گئی مگر ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ... ''ہم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا......!''

ملزموں کو دوبارہ حوالات بھیج دیا گیا۔

9 مئی کو فیصلے کا دن مقرر کیا گیا اور اس کے لیے بھی پریڈ کا میدان چنا گیا۔ چھاؤنی میں موجود تمام بارکوں سے دیسی اور انگریز فوجیوں کو میدان میں اس مقصد کے لیے لایا گیا کہ انہیں انگریزوں کی طاقت کا اندازہ ہو جائے اور آئندہ کے لیے وہ عبرت پکڑیں۔ میدان میں انگریزی دستے سامنے کھڑے کیے گئے۔ ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے توپ خانہ تھا اور توپ خانے کے پیچھے دیسی سپاہیوں کو کھڑا کیا گیا مگر ان کی رائفلیں خالی تھیں۔ جب سارے

انمول موتی

☆ زمین والے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اگر تمہارا تعلق آسمان والے سے پختہ ہو جائے۔ جب سجدے طویل ہو جائیں تو مشکلیں قلیل ہو جاتی ہیں۔

☆ جب انسان اپنی غلطی کا وکیل اور دوسرے کی غلطی کا جج بن جائے تو فیصلے نہیں فاصلے ہو جاتے ہیں۔

☆ زندگی سے پوچھا گیا سب کو اتنا غم کیوں دیتی ہو۔ زندگی بولی میں تو سب کو خوشی دیتی ہوں، پر ایک کی خوشی دوسرے کا غم بن جاتی ہے۔

☆ دوسروں میں جہالت تلاش کرنا جاہلوں کا کام ہے۔

☆ خوشی میں اللہ پاک کی تعریف کریں۔ مشکل میں اللہ پاک کو یاد کریں۔ خاموشی میں اللہ پاک کی عبادت کریں۔ تکلیف میں اللہ پاک پر یقین کریں، ہر لمحہ اللہ پاک کا شکر ادا کریں۔

مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل نیو کراچی

انتظامات مکمل کر لیے گئے تو ملزمان کو میدان میں لایا گیا۔

حسب سابق ان کی سزائیں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں سنائی گئیں۔ سن رسیدہ سپاہیوں کو کالے پانی اور نوجوانوں کو دس، پندرہ اور بیس سال قید کی سزائیں دی گئیں۔ اپنے جرائم کے لحاظ سے سزائیں بے حد سخت تھیں مگر قیدیوں پر ان سزاؤں کا کوئی اثر نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑے وقار اور ضبط کے ساتھ کھڑے رہے۔ تب دور سے ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور زنجیروں کی آوازیں سنائی دیں اور جب وہ پہنچ چکیں تو قیدیوں کو حکم دیا گیا۔

''اپنے جوتے اتار دو۔''

مئی کی تیز دھوپ اور چٹیل میدان میں اب وہ ننگے پاؤں کھڑے تھے۔ قیدیوں کی سرکاری وردیاں لے لی گئیں اور انہیں عام کپڑے، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ اس تمام عمل کو مکمل ہوتے ہوتے دن کے بارہ بج چکے تھے۔ ان قیدیوں کو انگریز فوجیوں کی نگرانی میں دوبارہ جیل بھجوا دیا گیا۔ ہندوستانی پلٹن کے پاس سے جب یہ قیدی گزرے تو کئی مسلمان اور سکھ قیدیوں نے اپنے مذہبی نعرے لگائے اور کئی ایک نے پکار کر اپنے ساتھیوں کو کہا۔

''بھائیو ہمیں بھول نہ جانا......!''

ان کے نعرے اور باتیں سن کر دیسی سپاہیوں میں

حرکت پیدا ہوئی تو ایک بڑے انگریز افسر نے برطانوی پلٹن کے سپاہیوں کو تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ بے بس فوجیوں کا اضطراب ختم ہو کر رہ گیا۔

ذلت اور حقارت کے یہ تلخ گھونٹ پی کر جب دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں پہنچے تو ان کے دل بڑے بوجھل تھے اور ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس روز شام تک وہ اپنے کھولتے ہوئے ذہنوں کو لے کر بارکوں میں پڑے رہے۔ جب شام کو وہ اپنا غم غلط کرنے بازار کی طرف نکلے تو عورتوں نے انہیں دیکھ کر طعنے دینے شروع کر دیے۔

''تم چوڑیاں پہن لو...... اور یہ رائفلیں ہمیں دے دو......!'' ایک عورت نے طنزیہ انداز میں آوازہ کسا۔

''کیا تم ایسے مرد ہوتے ہیں۔ لعنت ہے تم پر...... تم سے زیادہ غیرت تو زنخوں میں ہوتی ہے۔ تمہارے سامنے تمہارے ساتھیوں کو سزائیں ملیں اور تم خاموشی سے سنتے رہے......!'' دوسری عورت آگے بڑھ کر بولی۔

پھر ایک اور کی آواز آئی۔ ''بھاگو...... بھاگو...... انگریز تمہیں پکڑنے آ رہے ہیں......!''

اس کے بعد وہ زہریلی اور طنزیہ ہنسی ہنسنے لگیں۔

ایک تو دیسی سپاہیوں کے دل و دماغ پہلے سے کھول رہے تھے۔ اوپر سے عورتوں کے طعنے سن کر وہ بوجھل قدموں سے دوبارہ بارکوں میں پہنچے تو انہیں واقعتاً اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی اور یہ 9 مئی کی رات ان کے لیے بڑی کٹھن ثابت ہوئی۔ انہیں رہ رہ کر اپنے ان ساتھیوں کا خیال آ رہا تھا جنہیں اس قیامت خیز گرمی میں جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کو کچھ دنوں کے بعد کالے پانی بھیج دیا جائے گا۔ جہاں سے آج تک کوئی قیدی زندہ بچ کر نہیں پلٹا۔

پھر انہیں خیال آتا کہ اتنی وفاداری کی سزا یہ قید و بند کی صعوبتیں اور یہ کالا پانی ہی تھا تو لعنت ہے ایسی وفاداری پر...... اور ایسی نوکری کرنے سے فائدہ جس میں صرف ذلت ہی ذلت ہو...... لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے بال بچوں کا دھیان بھی آ جاتا اگر وہ نوکری چھوڑتے ہیں تو ان کا گزارہ کیسے ممکن ہوگا۔ وہ اور ان کے خاندان بھوکے مر جائیں گے لیکن پھر وہی خیال انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا...... کہ ذلت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ غلامی کی یہ سختیاں اور ذلتیں کب تک برداشت کرتے رہیں گے۔ مرنا تو انہیں ہے ہی...... پھر ایک ہی بار کیوں نہیں۔

وہ رات گئے تک یہی باتیں کرتے اور اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مل کر فیصلہ کر لیا۔ ایک ایسا فیصلہ جس کی بازگشت پورے ملک کے کونے کونے میں سنی گئی اور جس نے انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

10 مئی کو دیسی ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ میرٹھ کی چھاؤنی میں قتل و آتش زنی کا بازار گرم ہو گیا۔ سواروں کی تیسری رجمنٹ نے جیل کا رخ کیا۔ جہاں ان کے 85 رفقا اسیر تھے۔ جیل کا پھاٹک توڑ دیا گیا۔ ان پچاسی قیدیوں کے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی چھڑا لیا گیا۔ جن کی تعداد بارہ سو کے قریب تھی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا گویا ایک طوفان کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

''لورکی عالی'' کان پور شہر میں طوائفوں کا ایک ایسا ہی محلہ تھا جیسے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بازار حسن، لڑکی بازار، تن بازار کے ناموں سے قائم تھے۔

کان پور میں اس محلے کا نام لورکی عالی تھا۔ دوسرے شہروں کی طرح اس بازار میں بھی دو اقسام کی طوائفیں موجود تھیں۔ ایک گانے بجانے اور ناچنے والی اور دوسری جسم بیچنے والیاں۔ اگرچہ یہ ایک ہی محلے میں رہتی تھیں۔ مگر الگ الگ دھندوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ یا تعلق نہ ہوتا تھا۔ ناچنے گانے والی طوائفیں بے حد مہذب، تعلیم یافتہ اور خود کو دوسرے طبقے سے اس لیے بھی اعلیٰ سمجھتی تھیں کہ ان کے ہاں شرفا اور امرا کے علاوہ نوابوں کے بچے تہذیب سیکھنے آتے تھے۔ ان طوائفوں کے اپنے اپنے الگ گھرانے اور ڈیرے ہوتے تھے اور ان ڈیروں کی مالکنیں جو پیشے کے اعتبار سے خود بھی طوائفیں ہوتی تھیں، اپنے آپ کو خانم کہلواتی تھیں۔ ہر خانم کے پاس ایک بڑا ڈیرا یا حویلی ہوتی تھی جس میں طوائفوں کے حساب سے کمرے ہوتے تھے، جن میں ان کی رہائش ہوتی تھی۔ خانم ان طوائفوں کی کفالت کرتی تھیں۔ باقاعدہ ان کے دھندے سے ایک مخصوص رقم ان کو دی جاتی اور باقی خانم اپنے پاس رکھتی تھی۔ پولیس اور انتظامیہ سے خانم رابطہ رکھتی تھی اور ہر اونچ نیچ پر خود ان کی ذمہ داری اٹھاتی تھی۔

لورکی عالی میں ایسی ہی ایک خانم کی بڑی اور ٹھیکے دار حویلی میں ہر وقت طوائفوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا اور اس کی خاص وجہ خانم کا رویہ تھا۔ وہ ہر ناچنے اور گانے والی کے ساتھ اپنے بچوں اور بہنوں کی طرح پیار کرتی اور ان کا خیال رکھتی

تھی۔ اسی خانم کی حویلی کے ایک کمرے میں کان پور کی مشہور مغنیہ حسن بانو گوہر رہائش رکھتی تھی۔ اس کا اصل نام تو حمیدہ بائی تھا لیکن عرف عام میں اسے حسن بانو گوہر کہا جاتا تھا۔ اس کی ساس مذہباً ہندو تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پھر اس نے کسی مولوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گئی تھی۔

خانم اس کو بے حد چاہتی تھی کیونکہ خواص میں اس کی پذیرائی دوسری گانے اور ناچنے والیوں سے زیادہ تھی۔ اس کے گلے میں جیسے شیرینی اور آواز میں ایک جادو تھا جس کا ہر کوئی اسیر تھا۔ نوابین کے بگڑے بچوں، رئیس زادوں اور امیروں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا... جب اس کا دربار لگتا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت علیل تھی، جس کی وجہ سے دربار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ خانم کو اس کی وجہ سے خاصا نقصان بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے اسے بھی اس کی صحت کی بہت فکر تھی۔ بازار سے وابستہ ایک لیڈی ڈاکٹر سے اس کا علاج چل رہا تھا تو انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہے...... یہ سنتے ہی خانم کا ماتھا ٹھنکا۔ نہ جانے کتنے دن اور اب انتظار کرنا ہوگا۔

جب یہ خبر حویلی میں موجود دوسری طوائفوں کو لگی تو حویلی میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور اندازوں کی کمندیں مختلف آتے جاتے نوابوں، رئیس زادوں پر ڈالی جانے لگیں۔ ان میں اب باقاعدہ شرطیں لگنے لگی تھیں کہ حسن بانو گوہر کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوگی یا بیٹے کی۔

بازار حسن کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ یہاں کی طوائفوں میں ہمیشہ لڑکی کی پیدائش کو نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس دن بھی حویلی کی ساری نوچیاں خانم کے گرد بیٹھی ہنسی مذاق اور ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ خانم الگ اپنی گڑگڑی (چھوٹا حقہ) لیے بیٹھی تھی اور انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ حسن بانو گوہر کو انہوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھیں۔

''اللہ نے بیٹی کا منہ دکھانا ہے۔'' ان میں سے ایک بولی۔ ''میری پیش گوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی۔'' ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک چلبلی سی نوچی بولی۔

''ہاں...... ہاں اس کی پیش گوئی کبھی غلط نہیں ہوئی کیونکہ اس نے اپنی اماں کے بارے میں بھی پیش گوئی کی تھی۔ تبھی تو یہ خود پیدا ہوئی تھی۔''

اس بات پر وہ ساری کھلکھلا کر ہنس دیں۔ خانم بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

''خانم...... اگر حسن بانو نے لڑکی کا منہ دھویا تو ہم آپ سے مٹھائی لیں گے۔''

''اللہ تمہارے منہ میں گھی شکر ہو...... بہت مٹھائی بانٹوں گی......'' خانم نے ہنس کر جواب دیا۔

بات ان سے نکل کر اب طبلچیوں اور سازندوں تک پہنچ گئی تھی۔ اسی شام ایک دوسری نوچی کا دربار لگنے سے پہلے انہوں نے خانم کو گھیر لیا۔ خانم کو ان سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

''اللہ بیٹی کا منہ دھوئیں......'' ایک بولا۔

''چاندسی بیٹی آپ کی گود میں اترے ہماری دعا ہے......'' دوسرے نے دعا دی۔

''مگر خانم...... ہم اپنا حق اور نیگ ضرور لیں گے۔'' ان سب کا مطالبہ تھا۔

''ضرور ملے گا دادا...... سب کو ملے گا۔ اللہ میری حسن بانو کو وہ دن دیکھنا نصیب کرے۔''

پھر وہ شبھ گھڑی بھی آ گئی۔ اس روز صبح سے ہی علاقے کی ڈاکٹر نے خانم کی حویلی کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ وہ کبھی کوئی دوا لے کر آتی اور کبھی کوئی نصیحت کر جاتی۔ اسی شام حسن بانو گوہر کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو حویلی میں ایک جشن کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہر چہرہ خوشیوں سے دمک رہا تھا اور ہر نوچی بار بار آ کر حسن بانو کو بیٹی کی پیدائش پر مبارک باد دے رہی تھی۔

''لڑکی اتنی خوبصورت تو نہیں......'' ایک نے دوسری کو بتایا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ نواب وحیدالزماں کے چہرے بشرے پر گئی ہے۔ پہلے دن سے اس کی چغلی کھاتی تھی۔''

''اری جا...... نواب کا چہرہ اتنا برا بھی نہیں۔ نین نقش خوبصورت ہیں۔ صرف رنگ کے سانولے ہیں!'' دوسری نے جواب دیا۔

''ہائے میرے اللہ...... تو بھی اس کی چاہنے والی نکلی......''

...... اسی نے اس کی کمر پر دھول جماتے ہوئے کہا۔

بیٹی کی پیدائش پر خانم نے پوری برادری میں مٹھائی بانٹی بلکہ اپنی حویلی کی نوچیوں اور سازندوں میں درجہ بدرجہ انعامات کی بھی بارش کر دی۔

''اللہ میری چاندسی بیٹی کو لمبی عمر دے......'' خانم نے بیٹی کو گود لیتے ہوئے دعا دی۔

''خانم بچی کا نام تم نے ہی رکھنا ہے......'' حسن بانو گوہر نے نحیف آواز میں کہا۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں...... میری بچی کا نام عزیز النساء ہوگا...... اور میں اس کی پرورش، تربیت میں کوئی فرق

نہیں آنے دوں گی۔ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہوگی میری بیٹی...... اور دیکھنا حسن بانو تمہاری طرح اس کے گلے میں بھی کوئل بولے گی۔"

عزیز النساء ابھی بہ مشکل سے چند دن کی ہوئی تھی کہ ایک روز حسن بانو کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی۔ علاقے کی ڈاکٹر نے اپنی سی تمام تر کوشش کر دیکھی مگر اس کی طبیعت سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ناچار اسے شہر کے ایک بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اسپتال میں حسن بانو کو لائے ہوئے دو ہی روز گزرے تھے جب اس نے موت کو گلے لگا لیا۔

خانم کی حویلی میں ایک کہرام سا بپا ہوگیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر سینہ ماتم کناں تھا۔ لور کی عالی محلے کے جس جس گھر میں بھی یہ خبر پہنچی، انہوں نے اپنے اپنے طور پر اس صدمے کا بہت اثر لیا۔ حسن بانو گوہر تھی ہی اس قدر اخلاق اور شرافت کا پیکر کہ کتنے دنوں تک خانم کی حویلی میں اس کا سوگ منایا جاتا رہا۔

"یہ حسن بانو گوہر کی بیٹی نہیں میری اپنی بیٹی ہے۔" خانم کے یہ دعوے سن سن کر لوگ کہنے لگے تھے کہ خانم پر حسن بانو کی بے وقت موت کا تھوڑی دیر کے لیے اثر ہے۔ پھر یہ آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہوجائے گا مگر خانم نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اس نے عزیز النساء کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا اور اس کی تربیت میں بھی کوئی کمی نہ رہنے دی۔ عزیز النساء خانم کی اس قدر چہیتی تھی کہ حویلی میں موجود دوسری نوچیوں کو لگتا تھا کہ یہ خانم کی سگی بیٹی ہے۔ وہ بھی خانم کی نک چڑھی۔

جب ذرا عمر کی سیڑھیاں چڑھتے شعور کو پہنچی، تو اس کو اور بھی یقین ہونے لگا تھا کہ لوگ ایسے ہی اسے کسی اور کی بیٹی کہتے ہیں۔ وہ اصل میں خانم ہی کی بیٹی ہے اور خانم محض دوسری طوائفوں کی طرح اپنی عمر چھپانے کی خاطر اسے کسی اور کی بیٹی بتاتی ہے۔ وہ حویلی میں موجود دوسری نوچیوں پر اپنا رعب بھی جماتی اور بعض اوقات تو ان کے کسی مذاق پر باقاعدہ انہیں ڈانٹ بھی دیتی تھی۔ جب اس کی تربیت مکمل ہوئی، موسیقی کی تعلیم بھی پوری ہوئی تو ایک روز...... عزیز النساء کی زندگی کا پہلا باقاعدہ دربار سجایا گیا۔ عزیز النساء کے گلے سے کوئل کی طرح آواز نکلی تو دربار میں ہر بیٹھا ہوا شخص جھوم جھوم گیا۔ اس کی ایک ایک تان، لیٹے اور گلے سے نکلنے والی مرکیوں نے تو گویا دربار ہی لوٹ لیا پھر یہی عزیز النساء اسی دن سے عزیزن کے نام سے شہرت سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

توپوں میں سے چار توپوں کو انگریز سپاہی..... دھکیل کر میدان کے درمیان لائے۔ ہتھکڑیاں لگے چار سپاہیوں کو ان کے دہانوں سے باندھنے کے لیے ان کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور انہیں پیچھے باندھا پھر توپوں کے دہانے سے باندھ کر انہیں سر کرنے والے تھے کہ باقی کھڑے سپاہیوں میں سے چار سپاہی آگے بڑھے۔ باقی سپاہیوں کو محض اس لیے میدان میں لایا گیا تھا کہ وہ ان قیدیوں کو ملنے والی سزا سے عبرت حاصل کریں۔ ان اسیر قیدیوں میں سے وہ چاروں آگے بڑھے۔ باقی 24 سپاہی ملزموں کی صف میں اسی طرح کھڑے تھے۔ وہ چاروں بڑی ہمت اور بہادری سے آگے بڑھ کر بولے۔

"میدانِ جنگ میں ہم نے ہمیشہ پیش قدمی میں پہل کی ہے اور سب سے آگے رہے ہیں۔ اس لیے آج بھی یہ سعادت ہم کسی دوسرے کو نہیں لینے دیں گے...... پہلے ہمیں توپ دم کیا جائے......!"

انگریز تو پہلے ہی دیسی سپاہیوں میں پلنے والے بغاوت کے حربوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور انہیں سخت سے سخت سزائیں دے کر انہیں دبانا چاہتے تھے۔ انگریز افسر "مزد" کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا اور پہلے سے بندھے سپاہیوں کو کھول کر ان جوشیلے سپاہیوں کو توپوں کے دہانوں سے باندھ دیا۔ اس نے توپچیوں کو اشارہ کیا اور توپیں داغ دی گئیں۔ جوانوں کے جسموں کی بوٹیاں اڑ کر میدان میں دور دور تک بکھر گئیں۔ ان کے بعد دوسرے سپاہیوں کو بھی یہی سزا دی گئی۔ یہ واقعہ چھپرہ کے میدان میں پیش آیا جس کی اطلاع پورے ملک میں پھیل گئی۔

دیسی فوج نے انگریزوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان کی وفاداری، مردانگی اور اپنے کام سے محبت کے واضح ثبوتوں کو بھی انگریزوں نے وقت آنے پر پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے صلے میں دیسی فوج کو کیا دیا گیا۔ ظالمانہ سزائیں، تشدد کے واقعات یہی وہ اسباب تھے، جو 1857ء میں دیسی سپاہیوں کی بغاوت کا سبب بنے۔ انگریزوں نے دیسی سپاہیوں پر میدانِ جنگ میں تو اعتماد کیا لیکن عام حالات میں نظم و ضبط کے نام پر ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔ انہیں انگریز فوجیوں کے مقابلے میں کم رعایتیں دیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ چھین لیں۔ چھپرہ میں ان دیسی سپاہیوں کا

مقدمہ چل رہا تھا۔ انہوں نے بھی کم تنخواہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کی تو دیسی سپاہیوں میں سے انگریز افسر نے 24 سپاہیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ فوجی عدالت نے انہیں توپ دم کرنے کی سزا دی۔ سزا دینے کے بعد انگریز افسر کو خیال آیا کہ دیسی فوج میں کہیں پھر سے اشتعال نہ پیدا ہوجائے۔ چنانچہ ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور گورا فوج کو حکم ملا کہ توپوں کے دہانے ان کی طرف موڑ دیے جائیں تاکہ ان میں ہمت نہ ہو کہ اپنے ساتھیوں پر ہونے والے وحشیانہ ظلم کو دیکھ کروہ پیش قدمی کرسکیں۔ اگر ایسا کریں تو ان پر گولہ باری شروع کردی جائے۔ دوسری چھاؤنیوں میں بھی دیسی سپاہیوں کو بغاوت کرنے پر یہی سزا دی گئی۔

یہ وہی فوجی تھے جنہوں نے ارکاٹ کے محاصرے میں خود چاول کی پچھ پی کر راتیں گزاری تھیں اور انگریزوں کو چاول کھلائے تھے۔ 1824ء میں پہلے بھی ایک بار اسی بارک پور کی چھاؤنی میں دیسی سپاہیوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ ان سپاہیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ برما کے محاذ پر جانے کے لیے وہ اپنا سامان خود اٹھائیں...

.....اور باربرداری کے مصارف اپنی جیبوں سے ادا کریں، اسیر دیسی سپاہیوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے ساتھ ملک سے باہر جانے کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اگر ہمیں باہر بھجوانا ہے تو دوگنا بھتا ملنا چاہیے کیونکہ ملازمت کا اصول بھی یہی ہے۔" بات کمانڈر انچیف ایڈورڈ پیجٹ تک پہنچی تو فوراً وہ چھاؤنی میں پہنچا۔

"کیا مسئلہ ہے......؟" اس نے دیسی سپاہیوں سے پوچھا۔

"سر...... ملازمت دیتے وقت ہمارے ساتھ اس طرح کا کوئی معاہدہ ہوا تھا کہ ہمیں لڑنے کے لیے ملک سے باہر بھیجا جائے گا؟"

"تو...... پھر اب......؟" وہ غصے سے دہاڑا۔

"اگر بھجوانا ہے تو ہمیں اس سے بھی انکار نہیں مگر ہمیں اس کا دوگنا بھتا دیا جائے۔" فوجیوں نے دلیل دی۔

"اڑا دو...... ان کمینوں کو...... حکم عدولی کرتے ہیں سالے۔"

اس کے حکم پر توپوں اور رائفلوں کی گولیوں کی ان پر بوچھاڑ کردی گئی۔ بیشتر سپاہی مارے گئے جو باقی اپنی جانیں بچانے کو دریا میں کودے، وہ وہیں ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔ ان واقعات کے علاوہ اور بھی کئی ایسی مثالیں موجود تھیں جب سپاہیوں کو زائد تنخواہیں یا مراعات مانگنے پر سرعام درختوں پر سولیاں دے دی گئیں۔

اس کے علاوہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمان سپاہیوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی مثالیں موجود تھیں۔ انہیں انگریزی فوجی وردی پہننے پر مجبور کرنا، پگڑیوں کی جگہ ٹوپیاں پہننے، سکھوں کو ہندوؤں کی طرح بالیاں پہننے اور ماتھے پر تلک لگانے کے احکام جاری کرنا، مسلمانوں اور سکھوں کو ڈاڑھیاں منڈوانے پر مجبور کرنا اس میں شامل تھا جس کے نتیجے میں دیسی سپاہیوں میں ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف بددلی اور شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ سلگنے کے بعد 1857ء میں شعلہ بن کر بھڑکی۔ ان سپاہیوں نے انگریز حاکموں کے طرزِعمل کے خلاف کبھی اعلانیہ احتجاج کیا اور کبھی سازش کی، کبھی کمانڈو ایکشن کیا اور کبھی سامنے آکے مقابلہ کیا، چھپرہ میں فوجیوں کا مقدمہ...... ویلور کی بغاوت، بارک پور میں اعلانیہ نافرمانی کا مظاہرہ، پنجاب میں فوجیوں کے مقدمے اس کی بین مثالیں تھیں۔

فوجیوں میں یہ احساسِ محرومی بھی پرورش پارہا تھا کہ انگریز فوجیوں کے مقابلے میں ان کی تنخواہوں، الاؤنسز اور مراعات کم رکھ کر ان سے ناانصافی کی جارہی ہے۔ جلتی پر تیل کا کام بارک پور میں چربی لگے کارتوسوں کی تقسیم تھی جس پر یہاں کے فوجیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا پھر دوسری چھاؤنیوں میں آگ بھڑکی اور آخر میں میرٹھ تک اس کے شعلے جاپہنچے۔

بارک پور میں دیش منگل نامی سپاہی کے ہمراہ دوسرے سپاہیوں نے اتوار 29 مارچ 1857ء میں انگریز جنرل ہیرس پر گولی چلانا چاہی اور دوسرے انگریز افسروں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تو دیش منگل پانڈے پر مقدمہ چلا کر دوسرے دن اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے ساتھی ایشوری پانڈے کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ اس حادثے کے بعد گورنر جنرل کے حکم سے 34 ویں دیسی رجمنٹ توڑ دی گئی۔ بارک پور میں اس رجمنٹ کی سات کمپنیاں تھیں جنہیں ایک ساتھ ختم کرکے اس کے سپاہیوں کو دوسری رجمنٹوں میں بھیج دیا گیا۔ یہ سپاہی جن رجمنٹوں میں بھی پہنچے، بغاوت کی اڑتی چنگاریاں اپنے ساتھ وہاں تک لیتے گئے۔ کارتوسوں کا اشتعال انگیز معاملہ، ظالمانہ سزاؤں کے دیے گئے احکامات کے خلاف نفرت ان کے ساتھ ساتھ دوسری فوجی چھاؤنیوں تک بھی پہنچ گئی۔

اس طرح اب معاملہ صرف فوجیوں کی حد تک نہ رہا تھا۔ اس کی بھنک عوام تک بھی پہنچ چکی تھی اور جگہ جگہ انگریز حکومت کے خلاف سرگوشیوں کی ابتدا ہوچکی تھی۔ گلیوں،

محلوں، شاہراہوں اور چوکوں پر انگریز فوجیوں کے رویے کے خلاف لوگوں میں اشتعال اور نفرت پائی جانے لگی تھی۔ لوگوں کے ذہنوں میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بڑھتے چلے گئے کہ یہ سپاہی نہ صرف ان کے وطن ان کے دیس کے رکھوالے ہیں بلکہ شہریوں کی جان مال اور عزتوں کے بھی محافظ ہیں۔

اوپر سے نکالے گئے فوجی اپنی محرومیوں کی داستانیں لے کر جہاں بھی گئے، انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ میرٹھ کے جن 85 سپاہیوں کو بیڑیاں پہنائی گئی تھیں... ان کی وجہ سے میرٹھ میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور انہوں نے انگریز حکمرانوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کرڈالا تھا۔ فوج تو فوج عوام کے ساتھ بھی ان کا سلوک ظالمانہ تھا۔ انگریز کی عمل داری میں فرنگی فوجوں نے شہروں میں فوجی چھاؤنیاں بنائیں تو انہوں نے وہاں اپنے ملازموں کے ذریعے گاؤں گاؤں سے لگان بھی اکٹھا کرنا شروع کردیا۔ حکومت ان کی تھی، سکہ ان کا چلتا تھا، حاکم، جج، پولیس، بابو، منشی مکھیا...... سب ان کے ماتحت تھے۔ اس لیے انہیں پوچھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وہ جس طرح چاہتے دھونس زبردستی بے چارے عوام سے لگان اکٹھا کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی سودخور مہاجنوں نے بھی من مانی کرنا شروع کردی تھی۔ وہ بھی اپنے ہرکاروں اور ملازموں کو اپنے دیے گئے قرضے واپس لینے کو گاؤں اور دیہاتوں میں بھجواتے اور... ادائیگی نہ کرنے والوں پر بے تحاشا مظالم ڈھاتے، جس کی انہیں کھلی چھٹی تھی۔

انگریز حکمرانوں سے بے زاری اور نفرت کے محرکات مختلف علاقوں اور طبقوں میں الگ الگ تھے۔ کوئی ریاست کی ضبطی پر خفا تھا، کوئی پنشن کی بندش پر ناراض تھا، کسی کو انگریزوں کی وعدہ خلافی پر غصہ تھا، کسی کو جائداد کے نکل جانے کا غم تھا۔ کسی کو فارسی کی جگہ انگریزی زبان کے رائج ہونے کی شکایت تھی، کوئی عدالت اور جیل کے قوانین کو ناپسند کرتا تھا۔ علمائے کرام فرنگیوں کو اسلامی اقدار کے دشمن جانتے تھے۔ عوام ٹیکسوں اور محصولوں کے بوجھ تلے دبے کراہ رہے تھے اور فوجی انگریزوں کی نسلی منافرت اور دوسری بدسلوکیوں سے بیزار تھے۔ غرض ان گنت وجوہات اور بے شمار اسباب تھے، جو انگریزوں سے نفرت کا سبب بنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے بغاوت نے جنم لیا۔ گویا چپاتی تو ایک علامت تھی، زندگی اور زندہ رہنے کی...... ایک کنایہ تھی تہذیب اور تاریخ کا جس نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں کمپنی بہادر کے خلاف مورچا لگانے کی ٹھانی۔

☆☆☆

عزیزن بائی جوان کیا ہوئی، خانم کے دوبارہ سے دن پھر گئے۔ حسن بانو گوہر کی وفات سے جس کام پر زوال آگیا تھا، وہ عزیزن بائی کے دربار لگانے سے بڑی تیزی سے نہ صرف بحال ہوگیا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ بڑھنے لگا۔ عزیزن بائی کا دربار ہر روز لگتا اور اس کے تماش بینوں میں دن بدن اضافہ ہونے لگا تھا۔ عزیزن بائی کو ناچنا تو نہ آتا تھا۔ البتہ گائیکی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس کے گلے میں اللہ نے لوچ بھرا ہوا تھا۔ کوئل کی طرح کوکتی آواز میں جب وہ گیت شروع کرتی تو سننے والے اس پر واہ واہ کرتے نہ تھکتے تھے پھر عزیزن ویسے بھی اپنی ساتھیوں میں مقبول تھی۔ حویلی میں رہنے والی دوسری کنچنیوں پر اس کا خوف اس لیے بھی جما رہتا کہ وہ خانم کے زیادہ نزدیک تھی بلکہ حویلی میں آنے والے نئے لوگوں کو تو یہ پتا تھا کہ عزیزن بائی خانم کی بیٹی ہے اس لیے وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔

جیسے جیسے زمانہ بیتا جارہا تھا، عزیزن بائی کے جوبن پر بھی نکھار آتا جارہا تھا پھر تہذیب و تمدن تو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اب لکھنؤ کی طرح کان پور کے نواب اور رئیس زادوں میں شہدہ پن آنے لگا تھا۔ وہ بھی اب کنچنیوں اور طوائفوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل لاکر ان کے فن کو پرکھنے لگے تھے بلکہ بعض منچلے تو ایسا کرتے ہوئے باقاعدہ مزے لینے لگے تھے۔ عزیزن بائی کو جب اس بات کا پتا چل جاتا تو وہ دربار کرنے سے گریز کرنے لگتی تھی۔ پہلے پہل ایک دوبار ایسا ہوا تو خانم نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جان کیوں گھبراتی ہو۔ باہر دربار کرنے میں تمہارے ساتھ ہی تو جاتی ہوں......!“

نواب وجاہت مرزا ان دنوں تازہ تازہ اپنے والد کی بے پناہ دولت کا اکیلا وارث بنا تھا۔ نوجوان تھا، اس لیے بہت جلد بری سوسائٹی میں بیٹھنے کی وجہ سے مقبول ہوگیا، پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب کان پور کی کوئی کنچنی ایسی ہوگی جو نواب وجاہت مرزا کو نہ جانتی ہو۔ طوائفوں کے تو کوٹھے اس کی وجہ سے آباد ہونے لگے تھے۔ وہ بٹیر بازی اور مرغوں کی لڑائی کا دلدادہ تھا۔ ایک روز نہ جانے اس کے من میں کیا آئی اس نے گھر پر جشن منانے کی ٹھانی اور کان پور کی مشہور بائی شرفن کو دربار کے لیے مدعو کیا...... اس کے ساتھ ہی عزیزن بائی کو بھی بلالیا۔ اگرچہ عزیزن بائی نے دربار

کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ باہر دربار نہیں کرے گی... مگر نہ جانے وجاہت مرزا نے خانم کو کیا سکھایا تھا کہ خانم نے اس کے ہاں دربار کرنے کی حامی بھر لی۔

اس رات نواب وجاہت مرزا کے دولت کدے پر بے شمار رؤسا.... امرأ اور اس کے ساتھی جمع ہو گئے تھے کیونکہ نواب وجاہت مرزا نے اس کی تشہیر ہی انتہا کی تھی۔ کان پور میں ایک ہی وقت میں دو بہترین گانے والیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ شرفن خود شعر کہتی تھی اور زیادہ تر دربار کرتے ہوئے اپنی ہی غزلیں گاتی تھی۔ اس نے دربار شروع کیا اور گت لگا کے اپنی غزل سنانا شروع کی مگر پتا نہیں شعروں میں کچھ جھول تھا یا گائیکی میں لڑکھڑاہٹ موجود تھی جو بری طرح سے محسوس ہو رہی تھی لہٰذا جلد... ہی اسے ہٹا دیا گیا۔

اس کے بعد عزیزن نے گانا شروع کیا تو اس کی ابتدا سے ہی تماش بینوں نے اپنی جیبوں کے منہ کھول دیے۔ اس کی اڑتی ہوئی تانوں اور لپٹیوں پر لوگ اش اش کر رہے تھے اور عزیزن بھی خوب مزے لے لے کر گا رہی تھی۔ اس روز عزیزن کی شہرت چار دانگ پھیل گئی۔ اب کان پور میں ہر بندے کی زبان پر عزیزن بائی کا نام تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ...... اس نے کان پور کے سخن آشنا لوگوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گائیکی خدا کی دین ہے اور یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

دربار لگا کر جب خانم اور عزیزن واپس لوٹیں تو خانم عزیزن بائی کے آگے پیچھے بچھی بچھی جا رہی تھی۔ ''تم نہیں جانتیں۔ وہ سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب عزیزن گا رہی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے حوریں اتر اتر کر اس کی سنگت کر رہی ہوں...... ایک نور کی کرنیں تھیں جو عزیزن کے گلے سے نکل نکل بکھر رہی تھیں اور نوٹ تھے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ شرفن تو اس کی گت لگاتے ہی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ تماش بینوں نے ٹھٹھے مارے، فقرے اڑائے مگر وہ تھی کہ شرمندگی کے باعث کسی سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی۔ ہائے میرے ربا...... دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا وہ منظر...... آج میری بیٹی نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ جاؤ...... دادا سے کہو اس کے سر کا صدقہ اتارے...... اللہ میری بیٹی کو نظرِ بد سے بچائے۔''

اور حویلی کی ساری کنچنیاں حیران و پریشان خانم کی باتیں سن رہی تھیں۔

☆☆☆

چپاتی کی کہانی کہاں سے اور کب شروع ہوئی... کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ صرف قیافوں کو بنیاد بنا کر اس کی ابتدا کے بارے میں بیان کیا جاتا رہا مگر یہ حقیقت ہے کہ چپاتی نے کمپنی بہادر کے خلاف جتنا مضبوط مورچا بنایا کسی ہندوستانی نے نہیں بنایا۔ چپاتی گاؤں گاؤں چکر لگاتی اور قریہ قریہ گھومتی پھری۔ چپاتی کے بارے میں بہادر شاہ ظفر کے طبیب حکیم احسن بتاتے ہیں کہ چپاتی کی تحریک اودھ سے شروع ہوئی۔ فرینڈ آف انڈیا کے مصنف رسل کا دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا ایک پنڈت کے مشورے سے راجا مادھو سنگھ نے کی۔ بہر حال یہ صرف اندازے تھے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اس کی توجیہات مختلف انداز میں کی جاتی ہیں۔ چپاتی پہلے کس گھر سے نکلی اور کدھر روانہ ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔ وہ نہ تو گرفتار ہو سکی، نہ ہی اس پر پابندی لگائی جا سکی۔ وہ ایک نہ تھی، جو کسی کی پکڑ میں آتی۔ اس کے بے شمار روپ تھے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کیے گئے لیکن اس کی پرت سے کوئی خفیہ پیغام نہ نکلا، اسے سکھا کر پیسا بھی گیا لیکن پھر بھی کمپنی بہادر کو مایوس ہونا پڑا۔

سول سروس کے ایک انگریز افسر مسٹر تھارن جان بل جو 1857ء میں متھرا میں تعینات تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنوری کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں ایک روز دفتر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں میز پر نہایت گھٹیا آٹے کی بنی ہوئی چار چھوٹی چھوٹی اور میلی سی روٹیاں دھری ہوئی ہیں جو اپنی بناوٹ اور موٹائی میں بسکٹ کی طرح تھیں۔ تفتیش کی گئی، تو پتا چلا۔

''ایک گاؤں سے کوئی شخص آیا تھا اور چوکیدار کو اس ہدایت کے ساتھ ایک روٹی تھما کر رخصت ہو گیا کہ ایسی ہی چار روٹیاں اور بنا کر قریبی گاؤں کے چوکیداروں میں بانٹ دو۔ انہیں بھی ایسا کرنے کی ہدایت کر دینا۔ چوکیدار نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن پولیس کو بھی تمام ماجرا سنا دیا......!''

دوسرے دن ضلع کے دوسرے علاقوں سے بھی یہی اطلاع ملی۔ مسٹر تھارن کو چپاتی پر کسی خفیہ اطلاع یا علامت کا شک نہ گزرا مگر عام لوگوں میں زبردست ہراس پھیلنے لگا اور احساسِ نفرت شدید ہونے لگا۔ پانی اور آٹے کو گوندھ کر ایک چپٹی سی روٹی وہ لوگ پکاتے اور اسے ایک ہرکارہ لاتا اور دوسرے اسے آگے بڑھا دیتے۔ لارڈ کیننگ کے مطابق...

''ایک ہرکارہ اسے لے کر گاؤں کے چودھری کے پاس جاتا اور اس چپاتی کو آگے بڑھانے کا کہتا۔ اس طرح یہ چپاتی جگہ جگہ پہنچتی۔ کوئی بھی اسے لینے سے انکار نہ کرتا، کوئی شبہ نہ کرتا تھا، کوئی سوال و جواب نہ کرتا۔ بیشتر لوگوں نے اسے انتباہ اور تیاری کا سگنل سمجھا۔ یعنی چپاتی کا مقصد لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ کوئی زبردست بدشگونی ہونے والی ہے......!''

عام لوگوں کے خیال کے مطابق چپاتی کا مقصد ان کے ذہنوں پر یہ اثر ڈالنا ہے کہ عنقریب ان سے معاش کے ذرائع چھین لیے جائیں گے، اس لیے لوگو متحد ہو جاؤ۔ دوسرے افراد نے اس تصور کو قہقہوں میں اڑا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ملکی باشندوں کی عام توہم پرستی سے زیادہ کچھ نہیں۔ چپاتی کا یہ سفر کسی محدود علاقے تک نہ تھا۔ ہندوستان کے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں...... جہاں جہاں کمپنی کی عمل داری تھی اور لوگوں میں فرنگیوں کے خلاف کوئی جذبہ تھا... وہاں یہ چپاتی موجود ہوتی تھی۔ لارڈ کیننگ کو چپاتی کی سرگرمیوں کا علم شمال مغرب سے ہوا۔ شمالی ہند کے انگریز حاکموں نے اس کی شکایت کی۔ گوڑ گاؤں کے کلکٹر مسٹر فورڈ نے سب سے پہلے اس کی اطلاع حکومت کو دی تھی۔ ساگر...... کے علاقے کے کمشنر ارسکن نے رپورٹ کی کہ عام لوگ چپاتی کو آنے والے خطرے کی علامت سمجھتے ہیں۔ مدراس، میسور، اندور کے ساتھ ساتھ کان پور تک چپاتی کے خفیہ پیغام کا چرچا تھا لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ انگریز عہدیدار اسے کسی خطرے کی علامت نہیں سمجھتے تھے۔ اب یہ چپاتیاں پنجاب تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ اس میں مرحوم دربار لکھنؤ کا ہاتھ تھا۔ جھانسی اور بہار میں بھی یہی ہوا۔ سرحدی علاقے میں چپاتیاں اس طرح تقسیم کی گئیں کہ ایک ضلعی افسر نے دیکھا۔ ایک ہرکارہ ہے جو روٹیوں کا پلندا پشت پر لٹکائے پھر رہا ہے۔ ایک جگہ لوگوں کا مجمع دیکھ کر اس نے روٹیاں توڑ توڑ کر تقسیم کرنی شروع کر دیں۔ افسر نے پوچھا کہ یہ کیا ہے......؟ تو اس نے جواب دیا۔

"ہندوستان کی پرانی رسم ہے کہ جب کوئی مالک یا سردار اپنی رعایا سے کام لینا چاہتا ہے تو ان کی وفاداری اور سانجھ حاصل کرنے کے لیے اسی طرح روٹیاں بانٹی جاتی ہیں جس نے روٹی کا ایک ٹکڑا قبول کر لیا، یوں جانو...... اس نے وفاداری کا حلف اٹھا لیا۔"

افسر نے دوبارہ پوچھا۔ "بھلا وہ کون سا کام ہے......؟"

ہرکارے نے ایک پراسرار تبسم سے جواب دیا۔

"ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں......!"

بغاوت کا شعلہ بھڑکا، عدالتیں لگیں، سولیاں گاڑی گئیں، شہادتیں ہوئیں، لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ سلطانی گواہوں سے لے کر انگریز مؤرخوں نے اپنے اپنے اندازے لگائے لیکن چپاتی پہلے بھی خاموش تھی، پھر بھی مہر بہ لب رہی۔

سرخ کنول کے پھول کو بنگال کا پھول کہا جاتا ہے مگر 1857ء کی جنگ میں لگتا ہے کہ یہ بھی چپاتی کا بھائی بن گیا۔ بنگال کے لوگ جب انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کو اٹھے تو کنول کے اس سرخ پھول نے باغی فوجوں کے ہراول دستے کا کام کیا۔ وہ خفیہ پیغام رسائی کرتا۔ وہ غیور بنگالیوں کو یاد دلاتا کہ اب بنگال تمہاری نہیں غیروں کی ملکیت ہے۔ ہندوستان کی یہ روایت شروع سے ہی رہی ہے کہ ایک علاقے کے باشندوں نے کسی عملی قدم اٹھانے سے پہلے نہایت ہوشیاری سے لوگوں کو ایک ایسی ذہنی اور جذباتی فضا میں لا کر کھڑا کر دیا جہاں سے آگے کسی بھی منصوبے کی راہیں سازگار ہوتی چلی گئیں۔ ایسی فضا پیدا کرنے کے لیے لوگوں کی زندگی ہی کی کوئی نمائندہ چیز بطور علامت چن لی جاتی اور اسے آگے چلانے کے لیے کسی بھی شخص کے ہاتھ میں اسے تھما دیا گیا۔ لوگ اس شخص کو تو بھول گئے لیکن وہ علامت گاؤں گاؤں اور ہاتھوں ہاتھ گردش کرتی رہی پھر کسی کو پتا نہ چلا کہ وہ شے...... پہلے کس گھر سے نکلی اور کہاں کہاں پھرتی رہی۔ اس علامت سے وابستہ کسی عملی اقدام کا کوئی جچا تلا منشور نہ ہوتا تھا۔ یہ تو محض اشارہ تھی کہ آئندہ کچھ ہونے والا ہے۔

بنگال میں دوسرے ہندوستان کی طرح سرخ کنول کا پھول بھی خفیہ پیغام کی علامت بنا۔ جیسے ہندوستان میں چپاتی علاقہ علاقہ سفر کرتی تھی، اسی طرح بنگال میں سرخ کنول کا پھول محو سفر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ......

"ایک آدمی نظر آیا، اس کے ہاتھ میں سرخ کنول کا پھول تھا۔ یہ پھول اس نے (ہندوستانی) رجمنٹ کے سالار کو دیا۔ سالار نے وہ پھول دوسرے فوجی کے حوالے کیا۔ اس کے بعد ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا لیتا گیا اور آگے بڑھاتا رہا جب وہی پھول رجمنٹ کے آخری فوجی کے ہاتھ میں پہنچا تو وہ آدمی پھول لے کر نظروں سے اوجھل ہو گیا اور دوسری چوکی پر نمودار ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ بنگال میں کوئی فوجی دستہ کوئی چوکی ایسی نہ رہی ہوگی جہاں کنول کا پھول ہاتھوں ہاتھ گردش کرتا ہوا نہ پہنچا ہو۔ سازش کی اس سادہ علامت کی تشہیر ادھر پر کمپنی سرکار کے قبضے کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی......!"

چپاتی کی طرح پھر ایک وقت میں بنگال سے نکل کر ہندوستانی فضاؤں میں بھی یہ پھول اپنے پیغام کی خوشبو پھیلانے کو پہنچ گیا۔ سرخ کنول کا پھول چپاتی کی طرح بے زبان تھا۔ خاموش تھا۔ وہ کیا کہتا تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا۔ ٹریولین (Trevelyan) اپنی کتاب "کان پور" میں لکھتا ہے۔

"کنول کے سرخ پھول نے سچ مچ تمام لوگوں کو یک جان کر دیا تھا۔ اس لیے کہ بنگال میں سپاہیوں اور کسانوں کو

دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں، یہ سب سرخ ہونے والا ہے۔ ان کی نگاہوں اور ان کی نظروں کو ایک جنبش سے غیر معمولی، پراسرار اور عمیق معانی کھل جاتے تھے!''

اس طرح چپاتی کی طرح کنول کا پھول بھی اپنا خفیہ سفر جاری رکھے ہندوستان کے قریہ قریہ اور چپے چپے میں گھوم کر لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں نفرت کے شعلے بھڑکاتا رہا۔

☆☆☆

تانتیا ٹوپے ہمیشہ اپنا تعارف اس طرح کراتا تھا۔

''میرا نام تانتیا ٹوپے اور میرے باپ کا نام پڈونگ ہے۔ میرا اصل وطن پرگنہ جولا ضلع پٹودہ ہے لیکن میں بھور (کانپور) میں رہتا ہوں۔ میری عمر اس وقت چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہے......!''

تانتیا ٹوپے مرہٹوں کے پیشوا ''نانا صاحب'' کا معمولی ملازم تھا۔ تانتیا کی سرگرمیوں کا آغاز کان پور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سے ہوتا ہے۔ نانا صاحب، بالا صاحب اور راؤ صاحب بھٹور کو چھوڑ کر فتح پور میں مقیم تھے کہ اطلاع ملی دیسی فوج کی رجمنٹ 42 شیوراج پہنچ گئی ہے۔ فوج نے نانا صاحب سے درخواست کی کہ کسی قابلِ اعتبار شخص کو ہمارے پاس بھیجا جائے نظرِ انتخاب تانتیا پر پڑی۔ تانتیا شیوراج سے اس فوج کو لے کر بھٹور گیا۔ جہاں انگریزی فوج سے کان پور کا قبضہ چھڑانے کے لیے لڑائی ہوئی۔ تانتیا ہار گیا اور وہ نانا صاحب سے جا ملا۔ بھٹور سے شکست کھا کر تانتیا نانا صاحب کے حکم پر گوالیار پہنچا اور وہاں کی فوج اپنے ساتھ ملالی۔ فوج کا کچھ حصہ کالپی کے مقام پر چھوڑا اور دوسرے حصے کے ساتھ کان پور پر حملہ کیا۔

کان پور میں انگریزی فوج کا چیف کمانڈر یورپی جنگوں کا شہرت یافتہ جرنیل ونڈھم تھا۔ جو کمانڈر.... انچیف سر کولین کیمبل کے لکھنؤ چلے جانے کے بعد باہر سے کمک حاصل نہ کرسکتا تھا۔ کیمبل کو لکھنؤ کے انقلابیوں نے مصروف کررکھا تھا۔ تانتیا نے ونڈھم کی اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کردیا اور نصف کان پور کو انگریز کی عمل داری سے چھڑا لیا۔ اس معرکے کی تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ تانتیا نے اپنی غیر منظم فوج کے ساتھ برطانیہ کے نامور کمانڈر اور اس کی بہترین فوج کو اپنی ذہانت اور ہنرمندی سے زبردست شکست دی۔ ابھی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ خلافِ توقع سر کولین کیمبل لکھنؤ سے کان پور پہنچ گیا اور گیارہ روز کی اس جنگ میں بالآخر تانتیا کو شکست اٹھانا پڑی۔

تانتیا کو نانا صاحب کی طرف سے حکم ملا کہ چرکھاری پر حملہ کرو...... جہاں کا راجا انگریزوں کا وفادار ہے۔ گیارہ روز تک تانتیا نے محاصرہ کیے رکھا۔ بعد میں راجا نے شکست قبول کرلی۔ تو اردگرد کے بہت سے راجے تانتیا کے ساتھ مل گئے۔ انہی دنوں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو انگریز فوج نے محصور کرلیا تو اس نے راؤ صاحب سے امداد کی درخواست کی جو اس وقت کالپی پہنچ گئے تھے۔ تانتیا کو اس مہم پر مامور کیا گیا، جہاں اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد گوالیار پر حملہ کیا گیا جو کہ جھانسی کی رانی کی مدد سے تانتیا نے جیت لیا اور گوالیار پر قبضہ کرلیا۔ انگریز تانتیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھے اور ان کی خواہش تھی کہ تانتیا کو کسی طریقے سے گرفتار کرلیا جائے۔ مراد اور کوٹہ سرائے میں انگریزوں کے ساتھ جھڑپوں میں تانتیا کو شکست ہوئی۔ رانی لکشمی بائی انہی معرکوں میں ماری گئی۔ اس کے بعد تانتیا ادھر ادھر روپوش ہوگیا۔ اب وہ چھاپا ماروں کی طرح اچانک انگریزوں پر حملہ کرتا تھا پھر اس نے ادھر ادھر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے چھاپا مار دستے بنانا شروع کردیے۔ اس کے لیے اس نے پورے وسطی ہندوستان، گجرات، راجپوتانہ کے کئی چکر لگائے۔ کبھی کبھی اپنے ضلع کان پور میں بھی پہنچ جاتا۔ انگریزی فوج تانتیا کی گرفتاری کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگارہی تھی لیکن تانتیا کو ہر جگہ عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ اس لیے وہ ہر بار گرفتاری سے بچ جاتا تھا۔ بالآخر وہ پارون کے جنگل میں روپوش ہوگیا۔

☆☆☆

باغی ہندوستانی سپاہی اپنی اپنی جگہوں اور اپنے محاذوں پر انگریزی سرکار کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھے۔ عوام کی نفرت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا مگر معاشرے میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی تک انگریزوں کی حمایت میں تھے۔ یہ وہ طبقہ تھا جو انگریزوں کا مراعات یافتہ تھا یا پھر وہ رئیس تھے جو ابھی تک اپنی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ نوابین کے بیٹے، خم لنڈھانے والے شعرا شامل تھے اور ان کے لیے بازارِ حسن کی جاگتی راتیں اپنی کہانیاں سنانے کو بے چین رہتی تھیں۔ جنگِ آزادی کے دوران اور اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی عوام پر جو مظالم توڑے ان کی داستان بڑی دلخراش ہے۔ کوئی شہر، کوئی قصبہ، کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں درختوں سے لاشیں نہ لٹکائی ہوں۔ سیکڑوں بے گناہ اور نہتے عریاں بچوں، بیماروں کو گولیاں مار کر ہلاک کرڈالا، کچھ کو توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑادیا گیا۔ گاؤں کے

گاؤں انگریز سرکار کے حکم پر جلا دیے اور جان بچا کر بھاگنے والوں پر پیچھے سے گولیاں برسائی گئیں، جو دیہاتی ہاتھ اٹھائے ان کے پاس آئے اور سلام کر کے اپنی جان بچانے کی آس میں قریب آئے ان کو یا تو گولی ماردی گئی یا پھر زندہ درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ جو ان عورتوں کو گرفتار کر کے ان پر بلی کے بلونگڑے چھوڑ دیے۔ دیسی فوجیں 1857ء کے انقلاب کی روح رواں تھیں اور انگریز مؤرخ اسے ''سپاہیوں کی بغاوت'' کہہ رہے تھے لیکن جب سزائیں دینے پر آتے تو عوام اور سپاہیوں میں کوئی فرق روا نہ رکھتے۔ ان کے نزدیک اگر دیسی سپاہی بغاوت کے جرم دار تھے تو عوام جاسوسی کرتے اور ان سپاہیوں کو سہولتیں مہیا کرتے تھے جو کہ ان کے نزدیک بغاوت سے بڑھ کر جرم تھا مگر دوسری جانب عوام کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جنہیں اپنی موج مستیوں اور عیاشیوں کے علاوہ کسی اور بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان میں پتنگیں اڑانے والے، افیون کے نشئی اور بٹیر بازوں کے علاوہ خوبصورت رئیس زادے، جنہیں دولت نے پوری آزادی کی خلعت دے رکھی تھی اور وہ اپنے آباء کی دولت کو بے دریغی سے کوٹھوں پر ناچنے، گانے والیوں اور طوائفوں پر لٹا کے خوش ہو رہے تھے۔

ایسے ہی کان پور کے محلے لورکی عالی کے کوٹھے پر تقریباً پچاس سالہ بڑھیا، جس کا رنگ سانولا تھا، اس نے اپنے سارے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا، مگر آگے کے بالوں کی چند لٹوں کو بالکل سفید رکھا ہوا تھا جو اس کی شخصیت کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا۔ بڑھیا کپڑے (جو ریشم اور روئی کے دھاگوں سے بنا ہوا تھا) کا پاجامہ جس کے بڑے کھلے پائنچے تھے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے، جو اس کی موٹی کلائیوں میں خوب پھنسے ہوئے تھے۔ کانوں میں ہرے موتیوں لگی چھوٹی چھوٹی بالیاں، جن میں ہرے رنگ کی آنچ بہت قیمتی ہیرے دے رہے تھے اور ان کی مالیت اس وقت کے 13 لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ وہ اپنے سامنے پاندان کھولے بیٹھی تھی اور قریب ہی چاندی کی گڑگڑی (چھوٹا حقہ) رکھی ہوئی تھی۔ دربار ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ تماش بین ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ خانم سے ذرا ہٹ کر سازندے اپنے اپنے ساز سنبھالے بیٹھے تھے۔ مجرا شروع ہونے کو تھا۔ ابھی تماشائی ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں اور ٹھٹھے مخول میں لگے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اٹھارہ بیس سال کی نوچی اچانک دربار میں آ پہنچی۔ تماش بینوں کی نظریں اک دم اٹھیں اور اس پر جم گئیں جو انتہائی خوبصورت اور بنی ٹھنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے اپنی خوبصورتی کا غرور اس طرح جھلک رہا تھا جیسے وہ کسی کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر کے قابل بھی نہ جانتی ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ ناز و انداز ایسا جو ہر کسی کی جان نکالنے پر تلا ہوا ہو اگر وہ کوئی اور ہوتی تو شاید اس کے ناز اٹھانے کو کوئی نہ ہوتا، مگر یہاں تو اس کے ناز اٹھانے کو ہر کوئی لپکا پھرتا تھا۔ تماش بینوں کی دم بخود نظریں اور رکتے ہوئے سانسوں سے لگتا تھا۔ جیسے محفل کو سانپ سونگھ گیا ہو مگر وہ ایسی نازنین تھی کہ اپنے خمارِ حسن کے سبب کسی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی اور پھر جدھر ایک بار اس کی نگاہ پڑ گئی، سب اسی طرف دیکھنے لگے، رشک کے مارے جلے جاتے ہیں کہ اس کی نگاہِ ناز ان کی طرف کیوں نہیں اٹھی لیکن وہ بھی پوری کی پوری کائیاں تھی۔ تھوڑا مسکرا کے، ہونٹوں کو سکتر کے ہنستی اور جان بوجھ کر ان پر عذاب اتارتی تھی۔ دربار میں پاؤں رکھتے ہی وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی ادا کے ساتھ بیٹھی خانم کے پاؤں کو ہاتھ لگایا، زمین پر پڑے طاؤس (موسیقی کا ساز) اٹھایا، اپنی نازک اندام انگلیوں سے اس کے تاروں کو چھیڑا۔ تماش بینوں کو اک بار یوں لگا جیسے کسی نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ سازندوں نے اپنے اپنے سازوں کو اس کی لَے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ابھی گت شروع ہی کی تھی کہ اچانک دھڑام سے دروازہ کھلا اور چھبن میاں گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ چھبن میاں اس بازار کا کنچن (دلال) تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں نہ جانے ادھر ادھر کیا دیکھ رہا تھا کہ خانم کی نظریں اس پر پڑیں۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں تو آنے والے کو کچھ حوصلہ ہوا، پھر جیسے اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

''خانم...... خانم...... وہ...... یہ......''

اس کی بے ترتیب بات نے دربار کو بکھرا کر رکھ دیا۔ سب حیران نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نوچی پر سے ان کی نظریں ہٹ چکی تھیں۔ نوچی کو لگا جیسے اس کا فسوں ٹوٹ گیا ہو۔ وہ تیزی سے طاؤس چھوڑ کر اٹھی اور بھاگتے ہوئے اندر چلی گئی۔ چھبن میاں ابھی تک گھگیا رہا تھا اور اپنی بات پوری نہ کر پا رہا تھا۔ خانم نے انتہائی غصے سے اس کی جانب دیکھا اور زور سے بولی۔

''چھبن میاں کیا میا نک رہا ہے۔''

وہ بے ربطی سے بولا۔ ''وہ...... میں ادھر آ رہا تھا کہ بازار میں ایک ڈھاٹا بندھا شخص میرے قریب آیا، میں

ٹھٹک کر رہ گیا تو وہ تیزی سے مجھے کوئی چیز پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''اسے کوتوال تک پہنچا دینا اور اسے کہنا...... اس جیسی اور چار بنا کے آگے تقسیم کردے۔''

''لعنت ہے تم پر چھبن میاں تم مرد ہو کے اتنے ڈرے ہوئے ہو۔ لاؤ مجھے دو...... دیکھتی ہوں کیا سانپ ہے......!'' یہ کہہ کر خانم نے ہاتھ آگے بڑھا کر کپڑے میں لپٹی چیز پکڑ لی۔ اس کی تہ کھولی تو اس میں سے چپاتی نکلی...... بے ڈھبی...... چپٹی سی...... جیسے کسی اناڑی عورت نے اسے بنایا ہو۔

''اوہ چپاتی......''

چپاتی کا لفظ دربار میں کیا پھیلا تمام تماش بین کھسر پسر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ دربار سے نکلنے لگے اور چند لمحوں میں دربار اجڑ کے رہ گیا...... چپاتی کا خوف ان دنوں پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں چپاتی آ جاتی، لگتا، جیسے کسی نے زندہ سانپ پکڑا دیا ہو اور وہ جلد از جلد اسے دوسرے تک پہنچا کر سکھ کا سانس لیتا۔

''پھٹکار ہو تم پر...... تو اسے میرے سجے ہوئے دربار میں لے کر کیوں آ گیا... کسی اور کوٹھے پر مر کھپ گیا ہوتا۔ سب چوپٹ کر کے رکھ دیا...... جا...... لے جا اسے اور کوتوال کے حوالے کر دے۔'' خانم غصے سے دہاڑی۔

''میں نے جانا کہ کوتوال شہر تو آپ کے کوٹھے سے لگا بندھا ہے تو مجھے یہی مناسب لگا کہ اسے آپ کے حوالے کر دوں۔'' چھبن میاں نے پرسکون ہو کر کہا۔

خانم نے چپاتی دوبارہ لپیٹ کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''لے جا...... اور دیکھنا...... اپنا منہ سر لپیٹ کے جانا۔ راستے میں کوئی دیکھ، پہچان نہ لے۔ ایسا ہوا تو خوامخواہ سرکار میں شکایت ہو جائے گی...... یہ لے پکڑ اسے......

''کوتوال سے میری آج کل ان بن ہے۔ ورنہ میں اسے رکھ لیتی اور اسے خود پہنچا دیتی۔ اب جاؤ...... میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بھاگ کم جاؤ...... ذرا دیکھ بھال کے...... اس موئی چپاتی نے تو پورے دیس کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ پتا نہیں کیا گل کھلائے گی۔ ہر کوئی اس سے خوفزدہ ہے۔''

☆☆☆

امراؤ جان ادا کا تعلق فیض آباد کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ شکل وصورت کے لحاظ سے وہ اپنی ہم جولیوں سے اچھی تھی مگر اس کا شمار خوبصورتوں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتی ہے۔

''شکل وصورت میں بھی اپنی ہم جولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہ ہوسکتا تھا مگر ایسی بھی نہ تھی، جیسی اب ہوں کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے ایسا برا نہ تھا، ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپن میں پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی، مگر خوبصورت تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا، نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پاجامہ، چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا' نینو کی کرتی تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازہ تازہ چھدے تھے۔ ان میں نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں!''

اس کی شادی اس کی پھوپی کے بیٹے کے ساتھ طے ہوچکی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ ادھر سے شادی کا تقاضا ہو رہا تھا مگر ادھر روپے کی کمی تھی، جس کے سبب شادی رکی ہوئی تھی، حالانکہ جہیز کا سارا سامان بنا ہوا تھا۔ ان کے مکان سے تھوڑی دور ایک بدمعاش دلاور خاں کی رہائش تھی جو کہ لکھنؤ کی قید میں برسوں رہا تھا۔ اب پتا نہیں کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ اس کی امراؤ جان ادا کے ابا سے دشمنی تھی۔ نہ جانے کس سبب سے وہ خار کھاتا تھا۔ اس کے والد نے کبوتر پال رکھے تھے جن میں سے ایک کبوتر اڑ کر دلاور خاں کے پاس چلا گیا۔ لینے گئے تو اس نے انکار کر دیا۔ کبوتر کی قیمت چار آنے لگائی گئی، مگر وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ایک روز اس کے والد نوکری پر گئے اور یہ کھیلتی ہوئی ادھر نکل گئی تو دلاور خاں نے اسے بہلا پھسلا کر اغوا کر لیا اور پھر ڈرا دھمکا کر اسے لکھنؤ لا کر خانم جان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ قیمت صرف سوا سو روپے لگی اور اسے اپنی مہری حسینی بوا کی تحویل میں دے دیا جس نے اس کی بڑی اچھی طرح سے تربیت کی۔ پہلے ہی روز حسینی بوا سے امراؤ جان کا جو مکالمہ ہوا، وہ ایسے تھا۔

''بچی تو کہاں سے آئی ہے؟'' حسینی بوا نے سوال کیا۔

''میں فیض آباد بنگلے سے آئی ہوں۔'' امراؤ جان نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟'' حسینی بوا نے پھر پوچھا۔

''جمعدار!'' امراؤ جان نے بتایا۔

''اور تمہارا کیا نام ہے؟'' حسینی بوا نے اگلا سوال کیا۔

''امیرن۔'' بچی نے جواب دیا۔

"بھئی یہ بھلا کیا نام ہوا؟ یہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کہہ کر پکاریں گے۔" حسینی بوا نے دلاور سے کہا۔

اسی دن سے امیرن کا نام امراؤ ہوگیا، جب اس کو طوائفوں کے شمار میں لایا گیا، تو لوگوں نے اسے امراؤ جان کہنا شروع کردیا۔

امراؤ کا سن ابھی اس قدر نہ تھا مگر پھر بھی وہ ذہین تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اب اس کی ساری زندگی اسی جگہ گزرے گی چنانچہ اس نے بھی اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر خود کو اس ماحول میں رچا بسا لیا پھر ماحول کے مطابق اس کو گانے بجانے کی تربیت دی جانے لگی تو گانے میں بھی جلد ماہر ہوگئی۔ اوپر سے گلہ اللہ تعالیٰ نے بڑا سریلا دیا تھا۔ گانا سیکھنے کے بعد دوسری تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب کو رکھا گیا۔ سات آٹھ برس اس سے پڑھتی رہی اور یوں ہر علم میں طاق ہوتی چلی گئی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اسے تمام طوائفوں کی طرح خانم جان نے ایک الگ سے کمرا دے دیا اور دربار لگانے کی بھی اجازت مل گئی مگر ابھی وہ ناز و ادائیں جو کہ طوائفوں کا خاصا ہوتی ہیں' وہ نرت بھاؤ، وہ نگاہوں کی چتون کاری، ابھی وہ اس سے ناآشنا تھی حالانکہ چودہ کے سن کو پہنچ چکی تھی۔ پہلے پہل خوفزدہ اور دوسروں سے دبی دبی رہی مگر جلد ہی اسے پہلے مجرے کے لیے نواب شجاعت علی خاں کے بیٹے کی شادی پر بھجوا دیا گیا اگرچہ اس سے پہلے ایک مشہور زمانہ بڑودے سے آئی بائی گا چکی تھی جس کے گانے کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے، گویا پوتھیاں اس کی نوکِ زبان پر تھیں مگر ایسا کہ چار محلے ادھر آواز جائے' اس کے بعد امراؤ کی باری آئی۔ گو وہ پہلی بار محفل میں مجرا کررہی تھی لیکن اٹھتی جوانی اور اس پر مستزاد اس کی پھرتی چالاکی اور الھڑپن۔ تھوڑی دیر گت ناچی پھر اس نے جو غزل کی تان اڑائی تو ہر شخص محظوظ ہونے لگا، تمام محفل وجد کے عالم میں جھوم رہی تھی۔ اس کے ایک ایک شعر کو دس دس بار گوایا گیا اور یوں امراؤ جان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب امراؤ جان کی گائی غزلوں کی دھوم پورے لکھنؤ میں ہونے لگی اور اس کے حصول کے لیے قتل تو جیسے ایک معمولی بات ہو کر رہ گئے۔

امراؤ جان خود بھی شعر کہنے لگی تھی اور اب تو وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ اپنی قبیل کی کسی بھی نوچی کے کان کترنے لگی تھی۔ ذہین تو وہ شروع سے ہی تھی، اب وہ اس قدر بےباک ہوچکی تھی کہ اپنے بارے میں بڑے دھڑلے سے کہنے لگی۔

"یوں تو میرا طوائف کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے۔ جب ہم کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں، اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ مرنا کسی کو نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنی، بات بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا کنویں میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ جانا، سنکھیا کھا لینا...... یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے!"

پھر ایک ایسے ہی فریب میں امراؤ بھی آگئی۔ خانم جان کی نوچیوں میں سے خورشید جان پہلے ہی اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ایک روز حویلی میں ایک شخص فیض علی آیا جس نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمرد کی ہڑیں لگی تھیں، ایک جوڑی ہیرے کے کڑوں کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی اس کے آگے رکھ دیں۔ پھر وہ بغیر کسی خوف کے امراؤ کے پاس آنے لگا۔

ایک ڈیڑھ ماہ میں اس نے امراؤ کو اتنا روپیہ اور زیور دیا کہ اس کا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنوں سے بھر گیا پھر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جب تک فیض علی نہ آتا تو اس وقت تک امراؤ کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتیں، امراؤ کا جی بھی اس وقت نہ لگتا تھا جب تک وہ فیض علی کو نہیں دیکھ لیتی تھی۔ راتوں کو آنے والے لوگوں کو بھی سمجھ آگئی تھی کہ امراؤ اب بکاؤ مال نہیں رہی بلکہ وہ کسی کی پابند ہوچکی ہے۔ اس لیے وہ جلد ہی کھسک جاتے۔ جو جم کر بیٹھ رہتے، ان کو امراؤ کسی نہ کسی بہانے سے ٹرخانے لگی تھی۔

پنا مل جوہری بھی امراؤ کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ فیض علی کے آنے سے پہلے وہ روزانہ آیا کرتے تھے۔ مگر پھر کم کم آنے لگے۔ ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا پھر جب آئے تو کچھ اداس اداس، معمولی باتوں کا جواب دیتے اور پھر خاموش ہوجاتے۔ امراؤ نے سبب پوچھا تو بولے۔

"کیا تم نے نہیں سنا، ہم تو تباہ ہوگئے۔ گھر میں چوری ہوگئی، پشتینوں کا سب اثاثہ اٹھ گیا۔"

امراؤ نے حیرانی سے پوچھا۔ "چوری ہوگئی، کتنے کا مال گیا؟"

"سب اٹھ گیا، رہا کیا...... دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔" پنا مل نے افسردگی سے بتایا۔

"بہت افسوس ہوا۔" امراؤ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں جی، افسوس تو ہے۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے ہاں چوری ہوئی۔ لالہ گوہر پرشاد کے ہاں چور گھس آئے۔ اندھیر مچا ہوا ہے۔ سنا ہے، چور

باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ مرزا علی بیگ کوتوال شہر خود حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے۔ کسی سے کچھ پتا نہیں چلا۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے کہ یہ ہمارا کام نہیں۔''

ابھی امراؤ سے پنامل کو ملے دوسرا دن تھا، جب شہر کے چوک میں شور ہوا۔ امراؤ جلدی سے چلمن کے پاس کھڑی ہوئی، تو پتا چلا کہ چور گرفتار ہو چکے ہیں اور ان میں فیض علی بھی شامل ہے۔ مگر رات کے پچھلے پہر حسبِ معمول فیض علی اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''آج ہم باہر جاتے ہیں، پرسوں آئیں گے، تم چلوگی؟''

''تم جانتے ہو کہ میں بااختیار نہیں ہوں۔ مجھ پر خانم ہی کو اختیار ہے۔'' امراؤ نے جواب دیا۔

''مجھے پہلے ہی پتا تھا، تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تم پر جان بھی دے دیں، تو ہمیں آگے سے خشک ہی جواب ملتا ہے۔ اچھا تم بوا حسینی کو بلواؤ۔ ہم خود پوچھ لیتے ہیں۔'' فیض علی نے کہا۔

فیض علی نے امراؤ کے ساتھ آج تک جو سلوک کیا تھا، اس کے ناتے تو امراؤ کو فوراً اس کی بات مان لینی چاہیے تھی مگر وہ بھی مجبور تھی۔ اس نے بوا حسینی کو بلوایا اور اس سے امراؤ کو ساتھ لے جانے کا کہا۔

''کہاں لے جاؤ گے؟'' بوا حسینی نے پوچھا۔

''فرخ آباد۔ میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں، وہاں میری ریاست ہے۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔'' فیض علی نے پیشکش کی۔ بوا حسینی نے واپس آ کر جواب دیا۔

''ہم لوگ انہیں باہر جانے نہیں دیتے!''

یہ جواب سن کر فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو امراؤ نے اپنے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ فیض علی کے ساتھ ضرور جائے گی۔ اس نے اپنے ارادے سے فیض علی کو آگاہ کیا، تو وہ کھل اٹھا اور پھر اس کے تیسرے دن وہ فیض علی کے ساتھ لکھنؤ چھوڑ گئی۔ لکھنؤ چھوڑ کر وہ کس طرح دربدر ہوئی، یہ الگ کہانی رہی کیونکہ فیض علی یہاں آ کر بھی گرفتار ہو گیا۔ امراؤ اکیلی رہ گئی، چنانچہ اس نے واپس لکھنؤ جانے کے بجائے کان پور جانے کا قصد کرلیا۔

☆☆☆

غلغلہ تھا۔ اک شہرہ تھا جو امراؤ کے ساتھ ہی کان پور شہر میں اٹھ گیا تھا۔ رائے بریلی سے گڑھی چار پانچ کوس پر تھی جب فیض علی کے قافلے پر راجا شیو دھیان سنگھ کے آدمیوں نے دھاوا بول دیا۔ فیض علی اور اس کا ساتھی فضل علی موقع پا کر نکل گئے۔ پچاس ساٹھ آدمی گرفتار ہوئے، جن میں امراؤ جان بھی تھی۔ گڑھی جاتے راستے میں راجا صاحب کو بتایا گیا کہ ان عورتوں میں امراؤ جان بھی ہے جو لکھنؤ سے آئی ہے۔ راجا نے امراؤ سے لکھنؤ کے بارے میں جتنے بھی سوالات کیے، ان کے جوابات امراؤ نے بڑی متانت سے دیے۔ راجا نے امراؤ کو چند دنوں کے لیے اپنا مہمان رکھا۔ پھر رہائی ہوئی۔ راجا کی قید سے رہائی پر امراؤ نے ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا۔

اے ادا، قیدِ محبت سے رہائی معلوم
کب اسیرِ غمِ صیاد رہا ہوتے ہیں

پندرہ بیس دن کے بعد امراؤ گڑھی سے نکلی۔ راجا نے دس اشرفیاں اور دوشالہ، ایک رومال، ایک رتھ مع تین بیل دیا۔ گویا راجا نے امراؤ جان کو ایک ڈیرہ دار پتریا بنا کر رخصت کیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی امراؤ کے ساتھ کیے۔ وہاں سے وہ اناؤ پہنچی۔ یہاں آ کر اس نے راجا کے آدمیوں کو رخصت کیا۔ صرف گاڑی بان اپنے ساتھ رکھا۔ ایک سرائے میں رہنے کا بندوبست کیا۔ وہ باہر بیٹھی سرائے کی مالکن کا اپنے گاہکوں سے مول تول دیکھ رہی تھی کہ فیض علی کا سائیس نظر آ گیا۔ وہ بھی سیدھا اسی کے پاس گیا اور بتایا کہ فیض علی کو امراؤ کی اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے۔ وہ رات کے کسی پہر یہاں سرائے میں آئے گا۔

وہی ہوا، رات ڈیڑھ بجے فیض علی سرائے میں آیا اور معمولی بات چیت کر کے گاڑی بان کو رخصت کر کے گنگا کو عبور کر کے صبح ہوتے ہی کان پور پہنچ گئے۔ اس نے امراؤ کو لاٹھی محال کی سرائے میں اتارا اور خود مکان تلاشنے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد مکان تلاش کر واپس آیا اور امراؤ کو لے کر اس مکان میں اتر آیا پھر کھانا لانے بازار گیا۔ فیض علی نامی گرامی ڈاکو اور ان کا ساتھی تھا۔ وہیں دوبارہ سے پکڑا گیا۔ امراؤ اس کے انتظار میں ساری رات بیٹھی رہی۔ ناچار اگلی دوپہر اس مکان سے باہر نکلی۔ بازار میں سے گزر رہی تھی کہ دیکھا فیض علی کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں اور وہ سرکاری سپاہیوں کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر وہ سن سی ہو گئی۔ وہیں ٹھٹک گئی، ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی، وہ نکلتے چلے گئے۔

امراؤ حیران و پریشان کچھ دیر اپنی جگہ کھڑی رہی پھر نہ جانے اس کے ذہن میں کیا آئی۔ وہ ایک گلی کی طرف

چلی۔ تھوڑی دور گئی تھی کہ ایک اور پتلی سی گلی نظر آئی تو وہ اسی کے اندر چلی گئی۔ اس گلی میں ایک مسجد تھی۔

وہ بھاگ کر اسی مسجد میں پناہ گزین ہوگئی۔ کان پور میں انہی امام مسجد کی وساطت سے ایک کمرا کرائے پر لیا۔ کھانے پینے کا سامان بازار سے خرید لیا۔ ایک نوکرانی کھانا پکانے اور اوپر کے کام کاج کو دو خدمت گار نوکر رکھ لیے۔ اس کے بعد ذرا آرام ہوا تو سازندوں کی تلاش شروع کی۔ بہت سے لوگ آئے مگر کوئی پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیا مل گیا۔ اس کی معرفت دو سارنگیے بلوائے گئے جن کا تعلق کان پور سے تھا۔ طائفہ درست ہوا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک گانے کا چرچا رہنے لگا۔

شہر میں مشہور ہوگیا کہ لکھنؤ سے کوئی طوائف آئی ہے، اکثر مرد آنے شروع ہو گئے۔ شاعری بھی چمکنے لگی، پھر تو کوئی دن ایسا ہوگا جو کسی جلسے میں جانا نہ ہوتا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سارو پیہ کمالیا۔

زندگی میں پہلی بار امراؤ کو خودمختاری کی زندگی ملی تھی اور پھر امراؤ کا شمار اچھے گانے والیوں میں ہونے لگا۔ کان پور میں اس کے حوصلے سے زیادہ قدردانی ہونے لگی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں ایسی کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں امراؤ کو بلانا باعثِ فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہاں تک کہ کان پور میں شہرت کی حد یہاں تک پہنچ گئی کہ شام کو اس کے ہاں بہت اچھا مجمع رہتا تھا۔

اس شہر کی تمام طوائفوں کو اس طرح باہر سے آئی ہوئی ایک طوائف کا دھڑلے سے ان کے کاروبار پر چھا جانا بہت ناگوار گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس محلے کی تمام طوائفیں اس ٹوہ میں تھیں کہ آخر وہ کون ہے، جو ان کے ہاتھوں سے ان کا تمام کاروبار چھینتی جارہی ہے۔ خورشید جان خورشید، عزیزن بائی، شرفن کو اس بات کا بہت قلق تھا۔ ممکن تھا کہ وہ سب مل کر اس کے خلاف کوئی ردعمل ظاہر کرتیں کہ ایک روز امراؤ جان کا ایک خدمت گار عزیزن بائی کے پاس اس کا پیغام لے کر پہنچا۔

''اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو آج کی شام بیگم صاحبہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔''

''آج...... آج تو میں بہت مصروف ہوں۔ دربار سجتا ہے، پھر رات کے کسی پہر مجھے مجرے پر بھی جانا ہے۔'' عزیزن نے بہانہ بنایا۔

''اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو بیگم صاحبہ خود آپ کے ہاں اترنے کو تیار ہیں۔'' خدمتگار نے دوبارہ سے کہا۔

''کیا یہ بھی انہوں نے کہا یا اپنی طرف سے تم کہہ رہے ہو؟'' عزیزن نے پوچھا۔

''ہم تو خدمتگار ہیں، ہمیں بھلا یہ کہاں کا اختیار حاصل ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کہیں۔'' خدمتگار نے جواب دیا۔

''اور کون کون بلایا ہے؟'' عزیزن نے پوچھا۔

''فی الحال تو آپ ہی کو سندیس بھجوایا ہے۔'' خدمتگار بولا۔

''ہوں......'' عزیزن نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔

''اچھا۔ تو ہم حاضر ہیں۔ کہاں تشریف رکھتی ہیں آپ کی بیگم صاحب؟''

''کہیں تو میں لے جاؤں گا آ کر۔ وہ فی الحال آپ کے محلے سے ہٹ کر ایک کرائے کی کوٹھری میں رہتی ہیں۔''

پھر اس نے عزیزن کو پتا سمجھایا۔

''ٹھیک ہے میں خود ڈولی میں آجاؤں گی۔'' عزیزن نے یہ کہہ کر خدمتگار کو رخصت کیا۔

پھر اسی شام عزیزن تیاری کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آخر شہر میں اتری اس نئی نوچی کو اس کی کہاں ضرورت پڑ گئی۔ اگر کھلی دعوت ہوتی تو شہر کی اور بھی طوائفیں تھیں جنہیں دعوت پر بلایا جاسکتا تھا۔ صرف وہی کیوں؟ پہلی پہلی ملاقات ہے، اسے ذرا ٹھاٹ سے اس کے پاس جانا چاہیے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے مہین بسنتی دوپٹا اوڑھا اور اس کو اپنے کندھوں سے نیچے گرالیا۔ کچلی کا پھنسا پھنسا شلوکا اودھی گرنٹ کا سرخ جھالر والا پاجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا نولکھا ہار، ہاتھوں میں موتیوں کی سمرنیں، بازوؤں پر نورتن اور پاؤں میں سونے کی بیڑیاں پہن کر ایک بار کمرے میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنا روپ دیکھا تو خود ہی حیرت زدہ رہ گئی۔

وہ اپنی ڈولی میں بیٹھ کر امراؤ جان کے مکان پر اتری۔ کہاروں نے ڈولی اس کے دروازے کے سامنے رکھی اور دروازے پر دستک دی۔ ایک مہری نے آ کر دروازہ کھولا۔

عزیزن نے ڈولی کا پردہ سرکایا اور ڈولی سے باہر پاؤں رکھے۔ دروازہ عبور کر کے وہ اندر داخل ہوئی تو امراؤ اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔

''خوش آمدید...... مرحبا۔ جیسا سنا تھا، ویسے ہی پایا۔'' امراؤ نے عزیزن کو گلے لگاتے ہوئے تعریف کی۔

''جی شکریہ!'' عزیزن نے بھی تسلیمات ادا کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے اندر بیٹھتے ہیں۔ کچھ باتیں کرتے ہیں، پھر

کھانا کھائیں گے!'' امراؤ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دونوں اندر کمرے میں آگئیں۔

''بہت شہرت سنی تھی آپ کی۔ ادھر لکھنؤ میں بھی اکثر تمہاری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں اکثر کہا کرتی تھی کہ کبھی کان پور گئی، تو آپ کو ضرور ملوں گی۔'' امراؤ نے ہنستے ہوئے بات شروع کی۔

''ہمارے ہاں بھی جب ہم کبھی اکٹھی بیٹھتی ہیں تو ادھر ادھر کی تمام مشہور گانے اور ناچ دکھانے میں مہارت رکھنے والیوں کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے۔''

''اور ان میں آپ کا تو اکثر ذکر ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے بازار میں آپ کا تو ایک نام ہے۔ بڑی شہرت ہے، آپ کی۔ میری بھی بڑی حسرت تھی کہ آپ سے ملوں۔'' عزیزن نے بھی آہستہ آہستہ بات آگے بڑھائی۔

''مقدروں کی بات ہے۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ کان پور میں آن بسوں گی۔ لکھنؤ میرا بیری تو نہ تھا، ہر سہولت موجود تھی۔ اگر نہیں تھی، تو یہ خود مختاری نہ تھی۔'' امراؤ نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

''یوں نہ کہیے، یہ تو کان پور کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی مشہورِ زمانہ گائیکہ اور شاعرہ نے اس دھرتی کو شرف بخشا۔''

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

امراؤ جان نے اس کے جواب میں اپنا شعر پڑھا تو عزیزن بے اختیار بول اٹھی۔

''واہ واہ۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ آپ خوب کہتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی دو شاعرات بیٹھی ہیں، ان میں سے ایک تو خورشید جان خورشید ہیں اور دوسری شرفن...... مگر جو تخیلِ پرواز آپ کے ہاں ہے، وہ دوسروں کو کہاں نصیب۔''

''اللہ...... تو خورشید جان یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔'' امراؤ جان نے برملا بے ساختگی سے کہا۔

''تو کیا آپ ان سے واقف ہیں؟'' عزیزن نے پوچھا۔

''ان سے کون واقف نہیں۔ یہ بھی تو لکھنؤ سے تھیں، لکھنؤ چھوڑا اور ادھر آبسیں۔'' امراؤ نے بے یقینی سے کہا۔

''یہ خورشید خوبصورتی میں تو یکتا ہیں، مگر نہ تو ان کی آواز میں مرکیاں اور لوچ ہے اور نہ ہی اسے ناچنا آتا ہے۔ بس اپنی سندرتا کی بنا پر کان پور مارے بیٹھی ہے۔ خیر سے امین کان پوری سے زانوئے تلمذ رکھتی ہے۔ وہی زیادہ ان کی کفالت بھی کرتے ہیں۔ شاید خود ہی لکھ کر اسے دیتے ہوں۔ کان پور میں اس کا خاصا چرچا ہے مگر تعلی نہیں۔ ایک بات کہوں۔ اپنے آگے اس کا چراغ نہیں جلتا۔'' عزیزن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... بہت خوب۔ وہ تو کیا ہمارا اپنا چراغ آپ جیسی محب وطن اور لوک سدھار کے کاموں میں دلچسپی لینے والی مجاہدہ کے آگے نہیں جلتا۔'' امراؤ جان نے عزیزن کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے کہا۔

''اللہ۔ اب آپ بھی مجھے بنائیں گی۔ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ ہم مجاہدہ ہیں۔ ارے ہم تو کچھ بھی نہیں ان سپاہیوں کے آگے، جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک وقوم کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ ہم خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔'' عزیزن نے انکساری سے جواب دیا۔

''بس بس، رہنے دیں۔ آپ اتنا بھی نہ بنیں۔ لکھنؤ تو کیا پورے ملک میں آپ کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے، خواص میں تو جھانسی کی رانی اور جون آف آرک کا نام ہے، مگر عوامی سطح پر ملک وقوم کی خدمت کرنے والوں میں عزیزن کا نام مشہور ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں، ہم عورتیں ہیں، جتنا بھی ملک وملت کا کام کرتی رہیں، کس کام کا۔ نہ نام ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخ ہمیں اچھے نام سے یاد کرتی ہے۔ پھر ہم تو ویسے ہی رسوائے زمانہ طوائفیں ہیں۔'' امراؤ جان نے حقیقت بیان کی۔

''ہمیں نام کی کبھی بھی چاہ نہیں رہی۔ تاریخ ہمیں یاد رکھے یا ہمارے نام کو بھول جائے مگر ہمارے من میں ہے کہ قوم کے لیے کوئی تو ایسا کام کر جائیں جس سے یہ پتا چلے کہ راندۂ درگاہ اور معاشرے کی سب سے کمتر عورتوں کے سینے میں بھی ملک وملت کی اتنی ہی محبت ہے، جتنی ایک سپاہی کے دل میں ہے۔'' عزیزن نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

''تو آج سے ہم دونوں پکی سہیلیاں ہوئیں بلکہ بہنیں......'' امراؤ جان نے اپنے سر کی اوڑھنی عزیزن کے سر پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل پکی۔'' عزیزن نے بھی ہنستے ہوئے اپنا دوپٹا امراؤ کے ساتھ بدل لیا۔ اسی دوران مہری نے آواز دی کہ کھانا تیار ہے۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا، اس دوران بھی زیادہ تر باتیں ملک کے حالات سے متعلق ہوتی رہیں۔

''اب آتی جاتی رہنا۔'' امراؤ نے کھانے کے بعد عزیزن کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ لیتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ ہمارے ہاں نہیں اتریں گی؟'' عزیزن نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ جی جان سے آؤں گی۔ میری تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش تمہارے ملنے سے پوری ہوئی ہے۔ خورشید جان سے بھی ملوں گی۔" امراؤ نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"تو کیا اب لکھنؤ نہیں جائیں گی؟" عزیزن نے پوچھا۔

"لکھنؤ کس منہ کو لے کر جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہوگی، ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔" امراؤ نے اداسی سے کہا۔

"تو واقعی لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی...." عزیزن نے دوبارہ پوچھا۔

"لکھنؤ میں میرا رکھا ہی کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے، ہمارا گانے بجانے کا پیشہ ہے۔ جہاں رہیں گے، کوئی نہ کوئی قدردان پیدا ہو ہی جائے گا پھر جب سے میں نے خودمختاری کا مزہ چکھا ہے، خانم کی قید میں دوبارہ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر قید ہی رہنا ہوتا، تو وہاں سے نکلتی ہی کیوں۔" امراؤ نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے، اللہ کو یہی منظور تو جی جان سے۔ بندی آپ کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ لو اب مجھے اجازت دیجیے گا۔" عزیزن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"سچی بات ہے کہ آج میری برسوں کی خواہش پوری ہوئی ہے۔ بڑا انتظار تھا کہ میں آپ جیسی نڈر اور ملک وقوم کی ہمدرد عورت کو دیکھوں جس نے ہم جیسی راہوں کی دھول کا نام اونچا کر رکھا ہے۔" امراؤ جان کی آنکھیں یہ کہتے ہوئے چھلک پڑیں۔

"ارے نہیں میری بہن۔ میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا اور نہ ہی کوئی سراہے جانے والا کارنامہ انجام دے رہی ہوں۔ معمولی سا کام ہے جو آپ بھی کرسکتی ہیں۔ کان پور کی کوئی بھی عورت سرانجام دے سکتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں، آپ بھی میری ساتھی بن جائیں۔" عزیزن نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہ بابا۔ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ مردوں کا لباس پہن کر ڈھاٹا باندھ کر ہاتھ میں تمنچہ پکڑ کر دھائیں دھائیں لوگوں کو مارتی پھروں۔ میرا تو خون کی سرخی دیکھ کر ویسے ہی جی اوبھ جاتا ہے۔ کہاں گھڑسواری کرتی جنگ کرتے مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لاشیں گراتی پھروں۔ عزیزن یہ بڑے حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ یہ تم جیسی مردانہ صفات رکھنے والی عورتیں ہی کرسکتی ہیں۔ ہم تو دور سے ہی آپ کے جذبوں کو سلام کرنے والی طوائفیں ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے اور جوش ولولے سے جنگ و جدل کرنا اپنے بس میں کہاں...... توبہ توبہ۔" امراؤ جان نے اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

تو عزیزن نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"تم جو کر رہی ہو، وہ بھی تو ایک جہاد ہی ہے۔ لوگ شعروشاعری سے، اپنی تقاریر سے لوگوں میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ تم بھی ان میں سے ہو۔ خدا تمہارے جذبوں کو سلامت رکھے۔"

☆☆☆

فرصت ہی کہاں تھی، عزیزن کے پاس اس روز کے بعد اسے وقت ہی نہ ملا کہ وہ امراؤ کے پاس دوبارہ سے جاتی۔ بس وہ تو اپنے کاموں میں ہی اس قدر مصروف تھی کہ دوسری طرف اسے دھیان کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ بڑے دنوں تک وہ ان چھاپا مار کارروائیوں میں مصروف رہی تھی۔ آج ہی اسے دن کے وقت ذرا موقع ملا تھا۔ ملکی حالات دن بدن بگڑتے چلے جارہے تھے۔ کاروبار ویسے ہی بند ہوچکے تھے۔ دربار اور مجرے ختم ہوکر رہ گئے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں بڑی اداس بیٹھی تھی، پھر پتا نہیں کیوں اٹھ کر باہر کے دروازے کی چلمن کے پاس آگئی۔ اس نے باہر نظریں دوڑائیں، خال خال لوگ ادھر ادھر آجارہے تھے کہ اچانک اس کی نظریں امراؤ کے سارنگیے پر پڑیں۔

اس نے اپنے خدمتگار کو آواز دی جو اس کی آواز سنتے ہی بھاگا بھاگا آیا۔

"وہ ادھر جو شخص جارہا ہے، اسے جاکے کہو بیگم صاحب اسے بلارہی ہے۔"

خدمتگار بھاگ کر گیا اور اس کو ساتھ لے آیا۔ "اسے کمرے میں بٹھاؤ اور پانی چائے کا پوچھو۔ میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر عزیزن اپنے کمرائے خاص میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کو پلٹی، تو سارنگیے کے سامنے خدمت گار نے کھانے کا سامان اور گڑگڑی رکھی ہوئی تھی اور پان لگا کر اسے دے رہا تھا۔

"ہاں تو تم ہی تھے جو امراؤ جان کے ساتھ سنگت کرتے تھے؟"

"جی ہاں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیا حال ہے امراؤ کا؟"

"وہ تو جی...... جس روز آپ ان کے ہاں اتری تھیں، اس کے دوسرے دن ہی کان پور چھوڑ کر واپس چلی گئی تھیں۔" سارنگیے نے بتایا۔

''تفصیل سے بتاؤ۔ اس کا تو ارادہ جانے کا نہیں تھا۔'' عزیزن نے دوبارہ سے پوچھا۔

''درست کہا...... مگر اسی رات لکھنؤ سے چند لوگ آئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔'' سارنگیے نے بتایا۔

''یقیناً وہ گوہر مرز اور بوا حسینی ہوں گی۔ پھر کیا ہوا؟'' عزیزن نے استفسار کیا۔

''وہ بڑھیا بڑی خرانٹ تھی، آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی اللہ بیٹی۔ کیا سخت دل کرلیا ہے۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔'' وہ کہنے لگی۔

''بس پھر کیا تھا، بیگم صاحب نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے نہ صرف معذرت کی بلکہ اسی دن لکھنؤ جانے کا ارادہ کرلیا۔ انہوں نے فوراً سامان باندھا اور مکان کے کرائے کے ساتھ نوکروں چاکروں کے حساب بے باق کرنے میں وہ دن نکل گیا۔ اگلی صبح پوری شکرم کرائے پر منگوائی۔ ضروری اسباب اس پر لادلیا اور فضول سامان ہم ایسے ندیدوں میں بانٹ دیا اور خود لکھنؤ روانہ ہوگئی۔ سنا ہے، جاتے جاتے نوچی خورشید جان خورشید کو بھی واپس لے جانے کی دعوت دی تھی مگر وہ عین وقت پر روپوش ہوگئی اور جانے سے رہ گئی۔ واہ رے مقدر۔ کتنے عرصے بعد کام ملا تھا۔ وہ بھی کالے نصیبوں کے ہاتھوں اجڑ گیا۔'' سارنگیے نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اللہ مالک ہے۔ وہ خود کوئی اور سبب بنادے گا۔'' عزیزن نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور اپنی طرف سے کچھ اس کی نذر کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

''تو امراؤ...... اچھا بہناپا دکھایا۔ اچھی دوستی نبھائی۔ کیا اسے محبت اور چاہت کہتے ہیں؟ جاتے ہوئے مل کر بھی نہیں گئیں۔ اب کے بچھڑے تو پتا نہیں پھر ملاقات ہو بھی پائے گی یا نہیں۔ مگر عزیزن اس قدر بے وفا نہیں ہے کہ وہ تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کو بھلا پائے گی۔ کبھی نہیں۔ شاید زندگی بھر نہیں۔'' عزیزن کی آنکھوں میں یہ سوچتے ہوئے خودبخود آنسو آگئے اور پھر اسے امراؤ کا وہ شعر یاد آگیا۔

وشتِ جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

☆☆☆

کان پور شہر میں طوائفوں کے محلے ''لور کی عالی'' میں دو ہی تو کنچنیاں شہرت کی بلندی پر تھیں۔ ان میں ایک خورشید جان تھی، پری کی صورت، شہابی رنگت، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہو۔ آنکھ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ سرخ، سفید ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، بھرے بھرے بازو، گول کلائیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لیے بنا ہے۔ اداؤں میں وہ دلفریبی، وہ بھولا پن کہ جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہوجائے۔ جس محفل میں جاکے بیٹھ جائے معلوم ہو کہ ایک شمع روشن ہوگئی۔ بیسوں طوائفیں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی ہے۔

جب سے دربار کرنا شروع کیا، خورشید جان سے خورشید جہاں ہوگئی۔ خود سخن طراز تھی مگر اس حسن و خوبی پر آواز بالکل ہی نہ تھی۔ کان پور کے مشہور شاعر امین کان پوری سے تلمیذ رکھتی تھی اس کا اپنا شعر تھا۔

ہم تڑپتے ہیں، تو ہنس ہنس کے فرماتے ہیں
کیا ہوا تھا، یہ ترا دردِ جگر وصل کی رات

دوسری لور کی عالی محلے کی مشہور مغنیہ..... حسن بانو گوہر (حمیدہ بائی) جو اب بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی وفات بیٹی کی پیدائش کے بعد ہوگئی۔ بیٹی کی پرورش اسی محلے میں ہوئی۔ بیٹی کا نام عزیز النساء رکھا گیا۔ لور کی عالی اس زمانے کی تہذیب سے آراستہ طوائفوں کا محلہ تھا۔ اس کی دادی ہندو تھی لیکن وہ اسلام کی حقانیت سے آشنا ہوئی تو اپنا آبائی مذہب ترک کردیا اور نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آئی۔ عزیز النساء کی والدہ اسے جنم دیتے ہی فوت ہوگئی مگر اپنے پیچھے ایک حویلی نما مکان چھوڑ گئی۔ عزیز النساء اسی گھر میں پلی بڑھی۔ وہ جب جوان ہوئی، تو عزیز النساء سے عزیزن بائی ہوگئی۔ اونچا لمبا قد، شنگرفی رنگ روپ، موٹی بڑی آنکھیں، کمان ابرو، تازے گلاب کی پتیوں ایسے ہونٹ، نم چھوٹی ناک میں جھلمل کرتا ہیرے کی کنی کا کوکا، اوپر سے کوئل کی طرح آواز۔ عزیزن بائی کا بالاخانہ بھی حسن اخلاق، تہذیب و تمدن، آداب و شائستگی کا بالاخانہ تھا جہاں رکھ رکھاؤ کے آداب سے انحراف کی اجازت نہ تھی۔ عزیزن کے مزاج میں ہندو اور مسلم دونوں تہذیبوں کا امتزاج تھا۔ گو وہ خورشید جہاں خورشید کی طرح سخن طراز نہیں تھی مگر اس کا شعری ذوق بہت عمدہ تھا۔ اسے حضرت امیر خسرو، میر تقی میر، غالب، ذوق غرض بہادر شاہ ظفر کا کلام ازبر تھا۔ میرا بائی کے بھجن اور بھگت کبیر کے دوہے بھی یاد تھے، جنہیں وہ موقع کی نزاکت سے برجستہ پیش کر کے داد حاصل کرتی اور غزل، گیت، بھجن، دادرا، ٹھمری، برہی اور بدائی کے گیتوں سے اپنی سریلی آواز کا جادو جگاتی تھی اور یہی چیز اسے خورشید جہاں خورشید سے

منفرد کرتی تھی۔

آج بھی جب وہ دربار کرنے کو اٹھی، تو اس نے چڑھتے کالے گرنٹ کے بڑے بڑے پائنچوں والا پاجامہ پہنا جو سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ دیکھنے والوں کا سانس کھینچنے والی بدن پر کسی کسائی کرتی، گھاس رنگی چنری، کانوں میں سونے کے بڑے بڑے بالے، ہاتھوں میں کڑے، گلے میں موتیوں کا شاہ ہار پہن کر جب وہ اپنے قد جتنے شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے ایک لمحے کو یوں لگا جیسے اس کا عکس بھی اسے صدقے واری جانے لگا ہو۔ اس نے ایک بار پھر شیشے کے آگے گھوم پھر کر اپنے ہر انگ کا جائزہ لیا، پھر جب اسے ہر طرح سے یقین ہوگیا تو وہ آہستہ آہستہ پاؤں اٹھاتے ہوئے اس کمرے میں آئی، جہاں دربار لگا تھا۔

کمرے میں فرش پر سفید دودھ کی طرح چادر بچھائی ہوئی تھی۔ چاندی کے منقش پان دان، گلوریاں رکھنے کی طشتریاں، پیک تھوکنے کے اگالدان بڑی ترتیب کے ساتھ تماش بینوں کے سامنے رکھے تھے۔ کمرے کی چھت پر لگی خوبصورت چادر اور اس کے عین درمیان میں لگا ہوا بڑا سا فانوس جس کے اردگرد شیشے کے گلوب لگے ہوئے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ فرشی گدوں پر..... باتہذیب امیر زادے، شعروشاعری کے الفاظ سے کھیلنے والے شاعر، دولت اڑانے والے رئیس زادے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کئی شوقین تماش بینوں کے آگے چاندی کی گڑگڑیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف ادھیڑ عمر کا کھچڑی بالوں والا بوڑھا طنبورہ لے کر بیٹھا، اس کی تاروں میں بھی کبھی جھنجھناہٹ پیدا کرکے اس کے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ دوسری طرف طبلیا ایک چھوٹی سی ہتھوڑی کے ساتھ طبلے کو ''سدھ'' کر رہا تھا۔ ان سب کے سامنے خانم بھی بیٹھی تھی جس کے آگے پاندان کھلا پڑا تھا اور قریب ہی صندوقچہ رکھا ہوا تھا اس سے ذرا ہٹ کر خالی جگہ عزیزن کے لیے رکھی گئی تھی۔

ایک نازک نخریلی نوچی ہر ایک کو پان بنا بنا کر دے رہی تھی۔ جب اس نے دربار میں پاؤں رکھا تو پان دینے والی نوچی ایک معصوم مسکراہٹ پھینکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے آتے ہی سب کی نظریں اس کی جانب اٹھیں۔ اس نے جھک کر اپنا نازک سا ہاتھ اٹھایا اور ماتھے تک لے جاتے ہوئے درباری سلام پیش کیا تو بیک وقت بسم اللہ کی آوازیں اٹھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہر طرف نظر دوڑائی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی تو معاً ایک طرف سے آواز اٹھی۔

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں....
شتر کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھلبل ہو

عزیزن نے پھر مسکرا کر سلام کیا اور خانم کے نزدیک بیٹھ گئی۔ خانم نے اونچی آواز میں اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''اللہ بری نظروں سے بچائے!''

عزیزن نے تیکھی اور چترائی نظروں سے اردگرد دیکھا اور پھر نظروں ہی نظروں میں اپنے سازندوں کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ کرتے ہی طنبورے میں جان پیدا ہوئی۔ طبلے نے کھنگورا ابھرا اور اس نے گت شروع کردی۔ سامنے بیٹھے تماش بینوں نے واہ واہ کا شور مچادیا۔ تھوڑی دیر تک گت دربار میں مجرا کرتی رہی پھر اس نے غزل چھیڑ دی، سرگم صاف تھا۔ جب اس کے گلے سے مور چھنا نکلا تو سننے والے دم بخود ہوکر بیٹھ رہے۔

عزیزن بائی ایک ایسی حسین ناگن تھی جس کی دراز ریشمی زلفوں میں الجھنے اور اس کی نشیلی آنکھوں میں ڈوبنے والے بے شمار تھے لیکن کسی میں یہ جرأت تھی ہی نہیں کہ اس کی شرابِ دوآتشہ کا جام اپنے ہونٹوں سے لگا سکے۔ اس کی اداؤں پر فریفتہ اور جرأت اظہار کی بے باکی کی وجہ سے اسے ''بجلی'' کے نام سے چاہنے والے پکارتے تھے۔ وہ اپنے ہی زمانے کی مشہور اور لکھنؤ کی کنچنی امراؤ جان ادا کی سہیلی بھی تھی جو کان پور کی ایک بڑی سی حویلی میں بڑے ٹھسے سے رہتی تھی۔ اس حویلی کے بے شمار کمرے تھے جن میں خانم کی نوچیاں رہتی تھیں۔ ہر وقت دس بارہ نوچیاں تو یہاں موجود ہی رہتی تھیں مگر یہ سب ناچنے گانے والی تھیں۔ ان میں طوائف کوئی نہ تھی۔ حویلی کے مختلف کمروں میں مختلف کنچنیاں رہتی تھیں، جن کے اپنے اپنے سازندے اور اپنے اپنے دربار الگ لگانے کے لیے اوقات مقرر تھے۔ یہ حویلی پریوں کا گڑھ لگتی تھی، جدھر بھی نظر دوڑاؤ ان بیبیوں کے ٹھٹھہ مخول، گانے بجانے اور گیت سنگیت کی محافل میں طبلوں، سارنگیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ ناچنے گانے کی تربیت دینے والے استادوں کی جھڑکیاں، مصاحبین اور خدمت گاروں کا ایک الگ جم غفیر تھا جو سب اسی ایک حویلی میں رہتے تھے۔ یہاں ناچ گانے کے علاوہ نوچیوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم، رکھ رکھاؤ اور تہذیب سکھانے والے استادوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا اور اسکول جانے اور فنِ تعلیم سے آراستگی کا سامان بھی موجود تھا اسی لیے شہر کے امیر، رئیس اور معزز لوگوں میں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا ان میں حوصلہ بھی تھا۔

ہر فنکار پر اگر خدا تعالیٰ کی نظر ہو تو ایک ایسا مقام آتا ہے جب وہ خواص سے نکل کر عوام میں اپنی شہرت بنا لیتا ہے۔ اب نہ صرف کان پور میں عزیزن بائی کی خوبصورتی اور گائیکی میں خوش گلوئی کے تذکرے عوام تک پہنچ چکے تھے بلکہ اس کی گائی ہوئی غزلیں، ٹھمریاں اور بھجن گلیوں اور بازاروں میں لوگ گاتے پھرتے تھے۔ اس کا ایک اثر اور بھی ہوا کہ اب دوسری نوچیاں بھی اس سے دبی دبی سی رہنے لگی تھیں۔ ویسے بھی جب عزیزن بائی خانم کے زیرِ اثر آئی تھی، یہاں حویلی کی ساری نوچیوں، سازندوں اور دوسرے خدمتگاروں کو یہی علم تھا کہ عزیزن بائی خانم کی اپنی بیٹی ہے۔ خانم نے اس کی پرورش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک اور اس کے بچپن کی ناز برداریوں سے لے کر نوجوانی کے غرور اور تمکنت، تعلیم و تربیت کسی بات میں کمی بھی تو نہ چھوڑی تھی۔ اس لیے حویلی کی تمام نوچیوں پر اس کا دبدبہ تھا۔ وہ کسی کو گھاس بھی تو نہ ڈالتی تھی۔ عزیزن بائی کی بنتی تھی تو صرف دلبر جان سے زیادہ بنتی تھی۔ وہ جب فارغ ہوتی تو دلبر جان کے کمرے میں آجاتی یا پھر دلبر جان اس کے کمرے میں موجود ہوتی۔ کہتے ہیں کہ نوچیاں اور طوائفیں اپنی گفتگو اور اپنے انداز و اطوار میں بڑی کھلی ڈلی ہوتی ہیں۔ چلبلاہٹ اور بات بات پر چھیڑ چھاڑ، عشوہ طرازیاں اور غمزے سب ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے وہ بگڑے رئیس زادوں، بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے امیروں، دولت لٹانے والے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا مقصد نکالتی ہیں۔ دلبر جان میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ سب طوائفوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنا بنا کر رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے وہ بہت فائدے اٹھاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اس سے دل بہلایا، سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ دوسرے آدمی سے منگواؤ، تو بے ایمانی کا دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کر آپ کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں، رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کر پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ ''چرکھٹ'' پھنسا کر لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کر مجرے میں انہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کر اہلِ محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ یا گا رہی ہے، یہ تال دیتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کرتے ہیں، ہر تال اور مرکری پر واہ واہ کرتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک تماش بین دلبر جان نے بھی پھانس رکھا تھا۔ وہ جب بھی عزیزن بائی سے ملتی، اسی کے تذکرے لے کر اور مزے مزے سے اس کی حرکتوں اور باتوں کو عزیزن بائی کے گوش گزار کرتی رہتی تھی۔ جب بھی عزیزن اس کی باتوں سے اکتا جاتی، تو وہ اسے جھڑک بھی دیتی تھی لیکن اس کے باوجود ایک دلبر جان ہی تھی جس سے عزیزن بائی کی گاڑھی چھنتی تھی۔

☆☆☆

وقت کا جن ایسا خبیث ہے کہ اگر وہ حالات کی بوتل میں قید رہے تو ہر طرف خیر کا ڈنکا بجتا ہے مگر جب یہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے تو پوری دنیا پر قابو پانے کی ضد میں معاشرے میں بے حد بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ لوگوں کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار رکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ایسی ہی ہوا پورے ہندوستان میں آج کل پھیلی ہوئی تھی۔ ملک میں ہونے والے واقعات اور ان کی خبریں سن سن کر ہر شخص بے چین تھا۔ پورا ملک توڑ پھوڑ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ پرانی بادشاہیاں اپنی آخری سانسوں پر تھیں۔ انتشار اور بگاڑ نے پورے معاشرے پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔

جب ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں کامیاب مدافعت کی صورت باقی نہ رہی اور انگریزی فوج کے قدم شہر میں جم گئے تو انگریز سرکار نے اس وقت کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی لال قلعے سے ہمایوں کے مقبرے میں منتقل کر دیا۔ نئے حکمرانوں نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ فروری 1857ء کو ہی لوگوں نے نئی نئی خبریں سننا شروع کر دی تھیں۔ لوگوں کے کاروبار ٹھپ ہونے لگے تھے۔ بازارِ حسن میں بھی کاروبار ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ چپاتی سے لے کر سرخ کنول کے پھول کی کہانی اپنے دامان میں چھپی کہانیاں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی رہیں۔ تانتیا ٹوپے کان پور کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھرتا رہا۔ اب لوگوں کو یقین ہونے لگا تھا کہ انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ انہی دنوں ایک روز عزیزن بائی نے دلبر جان سے کہا۔

''وطن میں جو چنگاری سلگ رہی ہے، مجھے لگتا ہے، یہ جلد ہی شعلہ جوالہ بن کر سب کو خاکستر کر ڈالے گی۔''

''بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔'' دلبر جان نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

’’تم دیکھ رہی ہو کہ جتنے بھی بڑے بڑے سرمایہ دار، رئیس اور حکمران طبقہ ہے، وہ انگریزی سرکار کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مجال ہے انہیں ذرا بھی احساس ہو حالانکہ عوام کو زیادہ فکر لگی ہے کہ وطن ان کے ہاتھوں سے نکلتا جارہا ہے۔ اس لیے تیسرے درجے کے لوگ اکٹھے ہورہے ہیں۔ ان کی ایک سانجھ بن رہی ہے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے۔‘‘ عزیزن بائی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

دلبر جان نے بھی دکھی انداز میں جواب دیا۔ ’’مگر ہم کیا کرسکتے ہیں، بس اللہ ہی رحم فرمائے گا!‘‘

’’کیوں نہیں کرسکتے، ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ ہم ایسے کم ہمت تو نہیں اور نہ ہی ہم ایسے نچلے درجے کے لوگوں سے کسی بات میں کمتر ہیں۔ ہم ان سے اونچے ہیں۔ ہم اپنی قوم اور اپنے آپ کے برے بھلے کا سوچ سکتے ہیں۔ ہم تو وہ ہیں، جن سے شرفاء آکر تمیز سیکھتے ہیں۔ تہذیب و تعلیم کا درس لیتے ہیں۔ وہ جو آج بڑے ہیں، انہیں ہم نے ہی بولنے، اٹھنے بیٹھنے کے انداز سکھائے ہیں۔ اگر آج کے اس لمحے میں ہم لوگ پیچھے رہ گئے تو آنے والا وقت ہم کو الزام دے گا۔ ہمارے بے حس رویے کا ماتم کرے گا۔ بولو...... کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ تمہیں برے نام سے یاد کریں؟‘‘ عزیزن بائی جذباتی ہونے لگی تو دلبر جان اس کا رویہ دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

’’ہم کر بھی تو کیا سکتے ہیں۔ ہم عورتیں ہیں، کمزور اور ناتواں پھر ہمارا نام کون سا تاریخ میں آنا ہے۔‘‘

’’دلبر جان! تو بھی پاگل ہے، ہم کسی صلے یا ستائش کے لیے یہ کام کریں گے۔ ہماری تاریخ تو ایسی عورتوں سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر ہر مقام پر کام کیا۔ جنگیں لڑیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹیاں کیں۔ تم نے نہیں سنا آج کے دور میں بھی ایسی عورتیں موجود ہیں۔ جھانسی کی رانی اور حضرت محل جیسی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں۔ رہی بات ہمارے آباء کی تو ان کی عظمت وحشمت کی کہانیاں گو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قعر گمنامی میں ڈبودی گئیں۔ آج اگر ان درخشاں روایات کو زندہ کرنے کا موقع ملا ہے، تو ہمیں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں بھی اس سانجھ میں اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔‘‘ عزیزن بائی کا جذباتی پن اس کی نہ صرف گفتگو بلکہ اس کے جسم کے انگ انگ سے جھانک رہا تھا۔

’’بات تو کچھ کچھ میری بھی سمجھ میں آرہی ہے لیکن...... !‘‘ دلبر جان نے خوف اور حوصلے کی ملی جلی زبان میں کہا۔

’’شاباش دلبر جان مجھے تم سے یہی توقع تھی، دیکھ میں نے ایک روز نواب میر اولاد علی سے تمنچہ مانگ لیا تھا۔‘‘

’’عزیز از جان۔ اگلی بات بعد میں۔ پہلے تمہیں میری ایک بات کا آج جواب دینا ہوگا۔ بولو سچ بتاؤ گی۔‘‘ دلبر جان نے شوخی سے پوچھا۔

’’پوچھو میری جان۔ آج تم نے میرے کہے کی لاج رکھی ہے، جو پوچھو گی بتاؤں گی۔‘‘ عزیزن بائی نے ہنس کر اس کے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

’’بڑے دنوں سے یہ باتیں میرے کانوں میں پڑرہی ہیں کہ تم نے خواتین کا ایک فوج کی طرح کا بریگیڈ تیار کر رکھا ہے اور کانپور میں جتنے معرکے بھی ہوئے ہیں، ان میں تمہاری اس بریگیڈیئر نے بڑھ چڑھ کر نہ صرف حصہ لیا ہے بلکہ انگریزوں کو سب سے زیادہ پریشان کیے ہوئے ہے...... اور...... اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ تم ہی نے اس عورت کو تربیت دی ہے جو پیپل کے درخت پر چڑھ کر انگریز فوجیوں کو گولیوں سے بھون ڈالتی ہے۔‘‘

’’بڑی گھنی ہو تم۔ یہ تم نے کس سے سنیں اور تمہیں کس نے مخبری کی ہے؟‘‘ عزیزن بائی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

’’یہ میری بات کا جواب نہیں۔ میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔ رہی بات ان باتوں کی تو تمہیں پتا ہے جس طبقے سے ہمارا تعلق ہے، وہاں آنے والا ہر شخص نہ صرف اپنے اندر کی باتیں کھول دیتا ہے بلکہ اپنی جیبیں بھی الٹ جاتا ہے۔‘‘ دلبر جان نے اسی انداز میں کہا۔

’’ہوں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہاں میں بتارہی تھی کہ یہ تمنچہ مجھے خوبصورت لگا تھا۔ اس لیے میں نے اس روز میر اولاد علی کو موڈ میں دیکھتے ہوئے یہی کہہ کر اسے رکھ لیا تھا اب ہم روزانہ رات کے اندھیرے میں دونوں اس حویلی میں نکلا کریں گے اور جہاں کوئی گورا نظر آئے گا، اسے نشانے پر رکھ لیا کریں گے، وہ بھی تو اسی طرح کے ظلم ہمارے آدمیوں عورتوں پر کررہے ہیں۔‘‘ عزیزن بائی نے کمال خوبصورتی سے اس کی بات بدل کر اپنا منصوبہ اسے بتایا۔

’’مگر اس بات کی بھنک خانم کو بھی تو لگ سکتی ہے، اس کا پھر ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟‘‘

دلبر جان کے اندر کا خوف بولا۔

’’تم اس کی مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ میں سنبھال لوں گی۔ مجھے صرف تمہاری حمایت اور ساتھ کی ضرورت ہے۔‘‘

عزیزن بائی نے دوبارہ سے یقین دہانی چاہی۔
''کیوں اداس ہوتی ہو، دلبر جان نے پہلے کبھی تمہارا ساتھ چھوڑا ہے، میری رگوں میں بھی پٹھان کا خون ہے، وہ ظلم پر چپ کیونکر رہے گا۔'' دلبر جان نے پورے جوش سے عزیزن کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا۔
ان کے علاوہ ''لورکی حالی'' میں طوائفوں کے جلسے تو ویسے ہی کم ہوکر رہ گئے تھے۔ لوگ خوف کے مارے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے تھے اور دولت رکھنے والے تو پہلے ہی بزدل ہوتے ہیں۔ گاہکی کم ہونے کی وجہ سے انہیں اور بھی کھل کھیلنے کا موقع فراہم ہوگیا تھا۔ وہ دونوں بھیس بدل کر مردوں کے کپڑے پہنتیں، ان کی طرح اپنے منہ اور سر پر ڈھاٹے باندھتیں اور باہر گلی محلوں میں نکل جاتیں۔ انہیں جہاں بھی کوئی انگریز نظر آتا، اسے گولی مار کر گرادیتیں اور آگے نکل جاتیں۔ آہستہ آہستہ ان کی کارروائیوں کی دھوم پورے کان پور میں پھیل گئی اور گوروں نے ڈر کے مارے راتوں کو گھروں سے باہر نکلنا بند کردیا۔

☆☆☆

''خوشی اس بات کی ہے کہ میرے شہر کے لوگ بھی بیدار ہونے لگے ہیں۔ انہیں بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ انگریز ان کا دشمن ہے۔ وہ ایک ایسا کیکڑا ہے، جو آہستہ آہستہ پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لینے پر تلا ہوا ہے۔'' تانتیا ٹوپے نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، جو اس کے لیے خبر لے کر آیا تھا کہ کان پور میں چھاپامار کارروائیاں شروع ہوچکی ہیں۔
''ڈھاٹے باندھے لوگ راتوں کو گلیوں بازاروں میں نکلتے ہیں اور انگریزوں پر حملہ آور ہوکر انہیں جان سے ماررہے ہیں۔ پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں۔ کان پور میں تو انہوں نے راتوں کو انگریزوں کا باہر نکلنا بند کردیا ہے۔'' ساتھی نے پوچھا۔ ''شاید سردار آپ کو ان کی کچھ خبر ہو۔'' اس نے کچھ وقفے کے بعد دوبارہ پوچھا۔
''وہ کوئی بھی ہوں۔ یقیناً ان کی سوچیں اور ان کے منصوبے ہم سے ملتے جلتے ہیں تو پھر وہ ہمارے ہی ساتھی ہوئے نا۔'' تانتیا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
وہ اندھیری راتوں میں سے ایک رات تھی۔ جب عزیزن بائی اور دلبر جان مردانہ بھیس میں شہر کے بیچوں بیچ شکار کی تلاش میں پھر رہی تھیں کہ اچانک ایک موڑ پر وہ دونوں ٹھٹک کے رہ گئیں۔ سامنے سے گھوڑوں پر سوار دو آدمی ان کے سامنے آگئے۔ ان کے منہ پر بھی ڈھاٹے بندھے تھے۔ سامنے آتے ہی ان میں سے ایک سوار جو اسلحے سے لیس تھا، وہ چھلانگ لگا کر ان کے نزدیک آیا۔ اس نے منہ سے ڈھاٹا اتارا تو عزیزن بائی فوراً بول اٹھی۔
''تانتیا...... تم!''
''ہاں عزیزن! مجھے تمہاری ساری کارروائیوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ میں مبارک باد دیتا ہوں کہ اب کان پور کی عورتیں بھی اس جنگ میں ہمارے ساتھ شریک ہوچکی ہیں۔ یہ کچھ اسلحہ میں تمہیں دینے آیا ہوں۔ تمام مجاہدہ بہنوں میں تقسیم کردینا اور ہاں کل تک گھوڑے بھی تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ مجھے جلدی ہے، میں جارہا ہوں۔''
یہ کہہ کر تانتیا چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا، وہ رائفلیں اور تمنچے اس کے پیروں میں ایک بوری کی شکل میں پھینک گیا تھا، عزیزن اور دلبر جان نے وہ بوری اٹھائی اور حویلی لے آئیں۔
''اب اگر مخبری ہوجائے تو ہم سب ماری جائیں گی۔'' دلبر جان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔
''کچھ نہیں ہوتا، حوصلہ رکھو۔ موت تو پھر بھی آنی ہے، اگر وطن کی آزادی کے لیے آجائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی۔'' عزیزن نے ہمت و حوصلے سے جواب دیا۔
اسلحہ ملنے سے عزیزن بائی کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔
4 جون 1857ء کو انگریزوں نے تانتیا سے جھڑپوں کے بعد پورے کان پور پر قبضہ کرلیا تو لوگوں کے ساتھ ساتھ عزیزن بائی کی نفرتوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس نے اور نوچیوں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔ اب وہ اپنے بھیس بدل کر اور اپنے جسموں پر اسلحہ سجا کر پورے شہر کا چکر لگاتیں۔ ایک انگریز مورخ کے مطابق......
''وہ اسلحہ باندھے گھوڑے پر سوار، بجلی کی طرح شہر کی گلیوں اور فوجی چوکیوں میں چکر لگایا کرتی۔ کبھی گلیوں میں گھوم گھوم کر بے حال اور زخمی سپاہیوں کو دودھ، مٹھائی اور پھل بانٹتی تھی اور کبھی زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ انگریزوں کے قلعے کی دیوار کے نیچے باغی سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی اور محاذ جنگ پر گولہ بارود اور سپاہیوں کے لیے ناشتا اور کھانا بھی پہنچاتی تھی!''
انہی دنوں کان پور میں مولوی سید احمد اللہ جیسے مرد مجاہد کا ورود ہوا۔ مولوی سید احمد اللہ کو انقلاب اودھ کا روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ وہ سید احمد شہیدؒ کے مقلدوں میں سے تھے، جنہوں نے سید احمد علی کا نام بدل کر سید احمد اللہ کردیا۔ انہوں نے زمانے کے رواج کے مطابق دینی تعلیم حاصل

کرنے کے بعد فنِ سپاہ گری میں بھی مہارت حاصل کی۔ وہ جے پور سے ٹونک اور وہاں سے گوالیار آئے اور ایک بزرگ محراب شاہ کے پاس قیام کیا۔ محراب شاہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انہوں نے احمد اللہ شاہ کو فرنگیوں کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد سے وہ ایک نیا فلسفۂ حیات، ایک نیا پیغام عمل لے کر نکلے۔ وہ دہلی آئے۔ وہاں کے حالات دیکھ کر دلبرداشتہ ہوکر آگرہ آ گئے جہاں انہوں نے کئی سال تک قیام کیا۔ وہ ہفتے میں دو دن تبلیغی جلوس نکالتے جس کے آگے نقارہ بجتا ہوتا۔ اسی مناسبت سے لوگ انہیں ''ڈنکا شاہ'' کے نام سے پکارنے لگے۔ اس وقت وہ اپنے آتشیں لب و لہجے سے اپنی تقاریر کے ذریعے لوگوں کو جہاد کی تلقین اور مجاہدین کا لہو گرماتے تھے۔ کان پور پر قبضے کے بعد وہ کان پور میں آئے تو ان کی تقاریر سن کر لوگ ان کے پیغام پر جہاد کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ انگریزوں کی دراز دستیوں کے ہاتھوں کیا امیر، کیا غریب...... سبھی نالاں ہو چکے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ فرنگیوں کو ملک سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ مولوی احمد اللہ شاہ نفرت کے اس شدید جذبے کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سیر و سیاحت کے باعث ان کا تجربہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا اور مختلف شہروں میں ان کے حامی اور مددگار بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جب کان پور میں ان کا ورود ہوا، تو پورے شہر میں شور مچ گیا کہ ''ڈنکا شاہ'' اب کان پور آ گئے ہیں۔ اب انگریزوں کو یہاں سے بھاگنا ہوگا۔

رات بھر شہر کی گلیوں اور محلوں میں چکر لگا کر وہ دونوں تھک چکی تھیں اور اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ جب حویلی میں ایک شور سا اٹھا۔ عزیزن بائی کی آنکھ کھلی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی اور اس شور سے متعلق دریافت کیا۔ ایک مہری نے بتایا کہ آج شہر کے چوک میں ''ڈنکا شاہ'' کا تبلیغی جلوس نکل رہا ہے جس کے بعد ان کا خطاب بھی ہوگا۔

ڈنکا شاہ کا نام عزیزن نے بھی سن رکھا تھا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھے گی اور ان کی تعلیمات سے بھی مستفید ہوگی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور دوڑتی ہوئی دلبر جان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

جون جولائی کی سخت گرمیوں، حبس اور بدنوں میں سانسیں روکنے والے دن تھے۔ محلہ ''لور کی عالی'' میں جشنوں، درباروں اور مشاعروں کی سانسیں بھی ملکی حالات کے پیشِ نظر رکی رکی سی چل رہی تھیں۔ طوائفوں کے گاہکوں میں بھی قدرے کمی واقع ہو چکی تھی اور وہ اٹھتے بیٹھتے اپنے کاروباری مندے کی باتیں کرتے آخر میں انگریزوں کو بددعائیں دینے لگی تھیں۔ وہی نوچیاں جو ایسے حالات میں بھی اپنے کاروبار سجائے رکھنے کی دعوے دار تھیں، اب علی الاعلان ہندوستانی فوجیوں کی حمایتی بن چکی تھیں۔ ایسے موسم میں جب کسی نوچی کی دہاڑی لگ جاتی، تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔

ایک ایسے ہی دن کا ذکر ہے جب ایک سترھی بہتری عورت عزیزن کی حویلی میں داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گورا اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ روئی کی طرح کے سفید بال مگر انہیں بڑی مہارت سے سنبھالا ہوا تھا۔ کمر میں قدرے خم آیا ہوا تھا۔ اس نے تن زیب کا کرتہ، نین سکھ کا پاجامہ اور سفید ململ کا نفیس دوپٹا بڑے سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے اور انگلیوں میں مندریاں پہن رکھی تھیں۔ وہ ہانپتی کانپتی ہوئی حویلی میں آئی اور ایک خدمتگار سے عزیزن بائی کا پوچھا۔

خدمتگار نے فوراً عزیزن بائی کو اس کی آمد کا بتایا تو عزیزن نے حسبِ روایات اس کے ہاتھ بڑھیا کے لیے پان دان بھجوایا اور اسے مزید کہا کہ وہ چاندی کی منقش گڑگڑی تازہ کر کے اس کے سامنے رکھے۔ وہ خود جلدی سے تیار ہو کر اس کمرے میں پہنچی جہاں اس بڑھیا کو بٹھایا گیا تھا۔

''جی بتائیے، میں عزیزن ہوں۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اللہ خوش رکھے، لمبی عمر دے۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔'' بڑھیا رک رک کر بولی۔

''کہیے، کیسے تشریف آوری ہوئی؟'' عزیزن نے بات آگے بڑھائی۔

''وہ ہماری بیگم صاحبہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ وہاں عورتوں کا جلسہ رکھا ہے، تمہارا مجرا ہوگا۔ دربار لگے گا صرف عورتوں کا۔''

ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ خانم بھی اس کا سن کر ادھر آ گئی، وہ اس کی بات سن کر فوراً بول اٹھی۔

''دیکھیے اماں بی۔ عزیزن ناچی نہیں ہے، وہ تو صرف گاتی ہے۔ اس کے گلے کا سارا کان پور معترف ہے۔ ناچنے والی چاہیے تو کوئی دوسری لے جاؤ۔ ویسے بھی عزیزن کھلا جلسہ نہیں کرتی۔''

''دیکھیے۔ مجھے صرف عزیزن کا کہا گیا ہے اور اسی کی بات کرنی ہے۔ میں کسی دوسری نوچی کو لے جاکر خود کو مشکل میں کیوں ڈالوں۔ آپ اس کی کہیے۔'' بڑھیا نے اسی انداز میں کہا۔

''دیکھیے اماں بی۔ ایک تو ویسے ہی پورے ملک میں افراتفری پڑی ہوئی ہے۔ انگریزی فوجیں اور ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان جگہ جگہ جھڑپیں ہورہی ہیں۔ گورے مولی گاجروں کی طرح یہاں کے لوگوں کو کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ سرعام درختوں کے ساتھ بے گناہوں کو پھانسیاں دی جارہی ہیں۔ توپ بند کیا جارہا ہے، ایسے میں آپ کی بیگم کو کیا سوجھی سالگرہ منانے کی۔'' عزیزن نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بٹیا! بڑوں کے چونچلے ہیں۔ ان کی وہی جانیں، ہم تو ان کی مہریاں ہیں۔ ہماری ڈیوٹی لگی، ہم آگئے۔ رہی بات ڈر اور خوف کی...... تو ہم ان کی حفاظت کو سپاہی بھجوادیں گے۔''

''نہ بوا...... ہم تو نہ جانے کی۔'' عزیزن نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا، تو خانم نے بڑی خشمگیں نظروں سے عزیزن کو دیکھا۔ عزیزن کی نظریں خانم سے چار ہوئیں تو اس نے نظروں ہی نظروں میں پیشکش کو قبول لنے کا اشارہ کیا۔ تب عزیزن نے بھی آمادگی کا اظہار کردیا۔

جلسے کی رات جب عزیزن وہاں سے فارغ ہوکر واپس آرہی تھی، بیگم صاحبہ کے ساتھ بھیجے ہوئے سپاہی ڈولی اٹھائے کہاروں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے چلے آرہے تھے اور عزیزن ڈولی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسری نوچی بھی تھی، جس نے جلسے میں ناچنا تھا۔ وہ بھی دونوں سرگوشیوں میں مصروف تھیں کہ معاً دور سے بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر یہ آوازیں بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب آئیں۔ کہار اور سپاہی ڈولی وہیں رکھ کر بھاگے اور درختوں کی اوٹ میں ہوگئے۔

تھوڑی دیر تک بے تحاشا گولیاں چلتی رہیں۔

عزیزن اور دوسری نوچی بھی ڈولی سے نکل کر درختوں کی پناہ میں چلی گئی تھیں۔ جب ذرا فائرنگ کی آواز تھمی تو عزیزن اپنی ساتھی کے ہمراہ ڈولی میں آبیٹھی۔ کہار ابھی ڈولی اٹھانے ہی کو تھے کہ ایک بار پھر گھبرا کر انہوں نے ڈولی کو زمین پر اتار دیا۔ عزیزن نے ڈولی کا تھوڑا سا پردہ سرکا کے دیکھا۔ ایک دیسی سپاہی کہاروں سے گفتگو کررہا تھا جسے دیکھ کر کہار خوفزدہ ہوگئے تھے۔ وہ سپاہی کچھ دیر ان کے پاس رکا اور پھر کچھ ان کے حوالے کرکے دوسری طرف نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ایک کہار ڈولی کے قریب آکر بولا۔

''بی بی جی! یہ کچھ وہ دے گیا ہے۔ لے لیں۔''

عزیزن نے ہاتھ باہر نکالا، تو کہار نے کنول کا پھول عزیزن کے حوالے کردیا اور بولا۔ ''جی وہ کہہ رہا تھا بیگم صاحبہ کو دے دینا اور کہنا آگے دے دے۔''

عزیزن نے کنول کا سرخ رنگا پھول دیکھتے ہی بے ساختہ کہہ دیا۔

''تانتیا...... یہ تم تھے۔'' یہ کہہ کر اس نے سرخ کنول کا پھول کہار کے ہاتھ سے لے لیا۔ کہاروں نے ایک بار پھر ڈولی اٹھالی اور لورکی عالی کی طرف بڑھنے لگے۔ جب وہ ایک کھلی جگہ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا۔ دس پندرہ فوجیوں کی لاشیں وہاں پڑی تھیں، جنہیں گوروں نے باغی کہہ کر پکڑا اور یہاں لاکر گولیوں کے آگے رکھ لیا۔ وہ اپنی طرف سے انہیں ہلاک کرکے چلے گئے تھے۔ کہار ان کے قریب سے ڈولی لے کر نکلے جارہے تھے، جب عزیزن کو ان کی لاشوں کے نیچے سے ایک سانس لیتی، کانپتی آواز سنائی دی۔ ''پانی......!''

عزیزن نے ڈولی رکوائی اور ڈولی میں سے نکل کر لاشوں کی طرف بھاگی۔ کہار بھی اس کے پیچھے ادھر بھاگے۔ وہ دو لاشوں کے بیچ میں زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

عزیزن نے خادم کو اشارہ کیا تو وہ دوڑتا ہوا ڈولی کی طرف گیا اور ادھر سے پانی کی بوتل اٹھالایا۔ عزیزن نے بوتل زخمی کے منہ سے لگادی۔ اس نے پانی پی کر تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔

''اسے کندھوں پر اٹھا کر حویلی لے چلو۔'' عزیزن نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا گٹھے جسم کا دیسی فوجی سپاہی تھا۔ گندم گوں رنگ۔ دیسی پگڑی باندھے ہوئے سپاہیوں کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اسے غنودگی کی حالت میں حویلی پہنچادیا گیا۔ عزیزن نے اس کی مرہم پٹی کی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے بتایا۔

''میرا نام شمس الدین ہے۔ میں کان پور کے باغی سپاہیوں کا سرغنہ ہوں۔ میں اور میرے ساتھی کتنے دنوں سے انگریزوں کی ہٹ لسٹ پر تھے، رات وہ انگریزوں کے قابو میں آگئے۔ انہیں گرفتار کرکے اس کھلے میدان میں لایا گیا اور انہیں گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا گیا۔ میرے سمیت سب گولیاں کھا کر گر پڑے۔ ابھی مجھ میں جان باقی تھی جب میں نے دیکھا، میرا ایک ساتھی گولی کھا کر گر پڑا، وہ زخمی تھا لیکن باہمت تھا۔ وہ دوبارہ اٹھا تو گورے نے اسے پکڑ کر سہارا

دیا۔ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو اسے ایک بار پھر گولی ماردی گئی۔ یہ دیکھ کر میں بے ہوش ہوگیا، پھر مجھے نہیں پتا ' میں کہاں ہوں۔ ہوش آیا، تو میں یہاں تھا۔ آپ کون؟'' شمس الدین نے کراہتے ہوئے اپنی کہانی سنا کر پوچھا۔

''میرا نام عزیزن ہے۔ میں بازارِ حسن کی سب سے بڑی اور مشہور نوچی ہوں۔'' عزیزن نے بتایا۔

''اوہ......'' شمس الدین کے منہ سے نکلا۔

''مجھے وطن کے رکھوالے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان رکھوالوں کو جو ہم جیسے بے عزتوں کی بھی رکھوالی کرتے ہیں۔'' عزیزن نے کہا۔

''کونسی عزت اور کس کی رکھوالی۔ جب ظالم اور حملہ آور جیت جاتے ہیں، تو وہ اسی طرح جشن مناتے ہیں مگر جب ان کی راہ روکنے والے پیدا ہو جائیں اور ان کی راہوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ پاگل کتوں کی طرح ادھر ادھر بھونکتے اور سونگھتے پھرتے ہیں اور جہاں جہاں انہیں ایسے بندے مل جاتے ہیں، انہیں پکڑ کر ان پر ظلم کی انتہا کر ڈالتے ہیں تاکہ دوسرے اس سے عبرت پکڑیں۔ مگر جب ظلم بڑھ جاتا ہے، دباؤ سخت ہو جاتا ہے، تو بغاوت بھی بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں کو اب سمجھ آ چکی ہے۔'' شمس الدین نے جواب میں عزیزن کو بتایا۔

''کیا ایسے وہ ہمارے وطن کو چھوڑ... جائیں گے؟'' عزیزن نے اگلا سوال کیا۔

''کوشش تو کر رہے ہیں۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔'' شمس الدین نے جواب دیا۔

اب کمپنی بہادر کے خلاف لوگوں کا دباؤ بڑھنے لگا تھا، جگہ جگہ سے بغاوت کی خبریں آنے لگی تھیں۔ انگریزوں کو ہندوستانی سپاہیوں کی چھاپا مار کارروائیوں سے خوف آنے لگا تھا۔ انہی دنوں انگریز سرکار نے فیصلہ کیا کہ اپنی عورتوں، بیویوں اور بچوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پر پہرا بٹھا دیا جائے۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے نانا صاحب، بالا صاحب اور راؤ صاحب بٹھور سے رابطہ کیا جنہوں نے مل کر ایک بڑی حویلی میں ان سب کو اکٹھا کر کے انہیں پناہ دے دی۔

☆☆☆

''بی بی گھر'' میں تقریباً ڈیڑھ سو انگریز عورتوں اور بچوں کو پناہ دے دی گئی۔ یہ 25 جون 1857 کا دن تھا جب پورے کان پور میں بغاوت کے شعلے پوری توانائی سے بھڑکنے لگے تھے۔ انگریزوں کے خلاف عوام کی نفرت پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ راؤ صاحب نے صلاح مشورے کے بعد عزیزن بائی کو ''بی بی گھر'' کا انچارج بنا دیا۔

ان ہی دنوں شمس الدین کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے۔ اتنا عرصہ یہاں رہنے اور عزیزن کی بے لوث تیمارداری نے شمس الدین کے دل میں عزیزن کی چاہت پیدا کر دی تھی۔ ایک روز شمس الدین نے اس سے کہا۔

''میرے زخم اب مندمل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا میں سوچ رہا ہوں کہ واپس میدان میں چلا جاؤں۔''

''بس اتنی جلدی......'' عزیزن کے منہ سے اچانک نکلا۔

''اتنے دن تو ہو چکے ہیں، تمہاری ساری سرگرمیوں اور کاروبار کے درمیان رکاوٹ بنے ہوئے، اب مجھے جانے ہی دو۔'' شمس الدین نے دوبارہ کہا۔

''لگ تو یوں رہا ہے، جیسے تم کل ہی یہاں آئے ہو۔ کچھ دیر تو اور مہمان داری کرنے دو۔'' عزیزن نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''جی تو میرا بھی جانے کو نہیں کر رہا مگر وقت کی مجبوری ہے۔'' شمس الدین نے آخر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ پھر اسے لگا کہ عزیزن اس کی بے باکی کا برا نہ مان جائے، تو اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ گوروں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو باغیوں سے بچانے کے لیے ایک حویلی میں اکٹھا کر دیا ہے اور اس کا نام ''بی بی گھر'' رکھا ہے۔''

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟'' عزیزن نے اس کے چہرے پر آنکھیں جماتے ہوئے پوچھا۔

''فوجی ہوں۔ ارد گرد پر بڑی تیکھی اور چوکنی نظر رکھتا ہوں اور اپنے مخبر کے بارے میں بھلا تمہیں کیوں بتاؤں۔ جو میں نے پوچھا ہے ' اس بارے میں جواب دو...... ٹھیک ٹھیک!'' شمس الدین نے پریم سے پوچھا۔

''اگر میں انکار کر دوں اور کہہ دوں مجھے کچھ علم نہیں تو......'' عزیزن نے بھی گفتگو میں ملائمت اور محبت کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔

''مجھے پکا یقین ہے۔ تم کم از کم میرے ساتھ ایسا نہیں کر پاؤ گی۔'' شمس الدین پورے یقین سے بولا۔

''اس قدر بھروسا کرنے لگے ہو۔'' عزیزن نے چتون سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتنی دیر اپنے قریب رکھ کر ایک بھروسا ہی تو تم نے دیا ہے مجھے۔'' شمس الدین نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''تو سنو۔ یہ سب راؤ صاحب کی آشیرباد سے ہوا ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے اس بی بی گھر کا

انچارج بنا دیا گیا ہے۔'' عزیزن نے اسے سب بتا دیا کہ کس طرح انہیں اکٹھا کر کے ایک حویلی میں رکھ دیا گیا اور اس کا نام بطور انچارج کیسے منتخب ہوا۔

''عزیزن !ایک بات کہوں۔ اگر انگریز ہماری عورتوں اور بچوں کا لحاظ نہیں کرتے تو ہمیں بھی ان کی عورتوں اور بچوں کو تحفظ نہیں دینا چاہیے۔'' شمس الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری بات بجا مگر میرا اور تمہارا مذہب پناہ میں لیے لوگوں کی ہر حال میں حفاظت کی تلقین کرتا ہے۔'' عزیزن نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''مگر ان پر ذرا گہری نظر تو رکھ سکتی ہو۔ یہ بے اعتباری اور مطلبی قوم کی عورتیں ہیں۔ کسی وقت بھی دغا دے سکتی ہیں۔ اور ہاں، یہ پڑھے لکھوں والی باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں۔''

''خود پڑھی ہیں۔ شاید تمہیں علم نہیں۔ ہم خاندانی نوچیاں ہیں۔ ہم اپنا جسم نہیں بیچتیں۔ ہم صرف گانا بجانا اور ناچ کرتی ہیں اور تم جیسے لوگوں کو نچواتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں بھی بچوں کو اسی طرح تعلیم دلوائی جاتی ہے، جیسے عام لوگوں کے بچے حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے گھر بھی ایک مولوی صاحب پڑھانے آیا کرتے تھے جن سے میں نے الف، ب کے بعد کریما کے علاوہ محمود نامہ، آمد نامہ، گلستان بوستاں پڑھی۔ اس کے سارے شعروں کے معنی بھی یاد کیے۔ اس کے علاوہ فارسی کی اور بہت سی کتابیں۔ عربی کی صرف ونحو۔ منطق کے رسالے۔ کیا کچھ نہیں پڑھا اس طوائف نے۔'' عزیزن نے ایک ہی سانس میں بتایا تو شمس الدین کی حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

''اب تمہارا کیا خیال ہے؟'' عزیزن نے اسے حیران دیکھ کر پوچھا۔

''اب مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔'' شمس الدین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

''اور اس باندی کے لیے کیا حکم ہے؟'' عزیزن نے ٹھنڈی آہ بھر کر پوچھا۔

''تم کو کسی میری پہنچ میں ہو جو میں تم پر اپنا حکم چلاؤں۔'' شمس الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

''ایک بات کہوں۔ طوائف سے لوگوں کی آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور تمہاری تو آنکھیں، انگ انگ کچھ اور بول رہا ہے مگر زبان اقرار نہیں کر رہی۔'' عزیزن کے تجربے نے جواب دیا۔

''جنگیں مردوں اور خاص کر سپاہیوں کا زیور ہوتی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ یہ زیور گہنا جائے۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔'' شمس الدین بولا۔

''خاموش آنکھوں سے جھلکتی ہوئی کہانیاں بھی زیور ہی ہوتی ہیں۔ اب میرا بھی یہاں رہنا بیکار ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میدان میں تمہارے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر لڑوں گی۔'' عزیزن نے حوصلے سے کہا۔

''نہیں عزیزن! جنگیں لڑنا عورتوں کے بس کی بات نہیں اور لوگوں کے دلوں پر راج کرنے سے یہ کام اور بھی مشکل ہے۔'' شمس الدین نے ہنس کر جواز پیش کیا۔

''وہم ہے تمہارا شمس الدین۔ اگر یہ عورتوں کا کام نہیں تو تاریخ کے صفحات سے ان عورتوں کے نام بھی نکال دو جنہوں نے جنگیں لڑیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ سپاہیوں کے لیے رسد بہم پہنچائی۔ انہیں پانی پلایا۔ اس کی آج بھی مثالیں موجود ہیں.... کہو تو نام گنوادوں۔'' عزیزن جذباتی انداز میں بولی۔

''نہ بابا! میں تمہاری علمیت کا قائل ہو چکا ہوں۔ تمہاری دلیلیں وزنی ہیں۔'' شمس الدین نے ہنستے ہوئے ہار مان لی۔

''تو پھر چلوں تمہارے ساتھ؟'' وہ خوشی سے بولی۔

''نہیں ابھی نہیں۔ وقت آیا تو میں خود تمہیں اجازت دے دوں گا۔'' شمس الدین نے کہا۔

''تو پھر ایک وعدہ کرو کہ اس کملی سے ملنے کو یہاں آتے جاتے رہو گے۔ ان آنکھوں کو یہ چہرہ دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔'' عزیزن جذباتی ہو کر بولی۔

''ہوں۔ کوشش کروں گا۔ سپاہیوں کو وعدوں کی زنجیروں سے نہیں باندھا جا سکتا۔'' شمس الدین سنجیدگی سے بولا۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر بولا۔ ''لو، اب میں چلتا ہوں۔''

شمس الدین نے جانے کے بعد بھی عزیزن سے رابطہ رکھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کئی دنوں سے عزیزن دیکھ رہی تھی کہ ''بی بی گھر'' میں پناہ لینے والی انگریز عورتیں مجاہدین کی مخبری میں ملوث پائی جانے لگی تھیں۔ ادھر ادھر کے حالات اپنے بھائیوں، خاوندوں اور جاننے والوں کو دیسی سپاہیوں کی کارروائیوں سے متعلق نہ صرف اطلاعات دینے لگی تھیں بلکہ اپنی حمایتی ہندوستانی عورتوں کو بی بی گھر میں بلا کر ان سے حالات کا پتا لگاتیں اور گوروں کو یہ اطلاعات بہم پہنچانے لگی تھیں۔ عزیزن کو ان کی ایسی باتوں سے نفرت

ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنے طور پر اس کی کھوج لگائی، تو اس پر انکشاف ہوا کہ انگریزوں کی بہت سی کارروائیاں انہی پناہ حاصل کرنے والی عورتوں کی مہیا کردہ تھیں۔

جب بات اس کے بس سے نکلنے پر آئی تو ایک روز جب رات کے اندھیرے میں وہ شمس الدین سے ملی تو اس نے ساری باتیں اس کے گوش گزار کردیں۔

''تم ایسا کرنا کہ بی بی گھر کا دروازہ ایک روز اس طرح کھلا رکھنا کہ جیسے پتا چلے کہ تم دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو۔ ہم چھاپا ماروں کا گروپ ان پر حملہ آور ہوکر ان آفات کا قلع قمع کردے گا۔'' شمس الدین نے تجویز پیش کی اور پھر وہی ہوا جس کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

اس رات چھاپا مار ہندوستانی سپاہیوں نے بی بی گھر پر شب خون مارا اور انگریز عورتوں سمیت ان کے بچوں کو قتل کردیا۔ بی بی گھر کو آگ لگا کر جلا دیا گیا۔

عزیزن بائی کو اس جرم کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا اور اسے جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جنرل ہیولاک عزیزن بائی کو دیکھتے ہی اس کے حسن کا اسیر ہوگیا۔ اس نے پہلی پیشی پر عزیزن کو فراخ دلانہ پیشکش کی کہ اگر عزیزن اس بات کا اعتراف کرلے کہ وہ جنگِ آزادی میں شریک رہی ہے اور آئندہ کے لیے معافی مانگ لے تو اسے رہا کیا جاسکتا ہے۔ یہ پیشکش کرنے کے بعد اسے اگلی پیشی تک کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

شمس الدین کو عزیزن بائی کی گرفتاری کا پتا چلا تو وہ بے چین ہوگیا۔ وہ بھیس بدل کر قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی میں سوار ہوتی عزیزن بائی سے ملا اور پوچھنے لگا۔

''تم گرفتار کیوں ہوئیں۔ نکل جاتیں۔ یہ تم نے کیا کیا۔''

''میرے سجن کو ساری عمر یہ گلہ رہتا تھا کہ عزیزن نے جنگ آزادی کی سانجھ میں حصہ کیوں نہیں ڈالا۔'' عزیزن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارا نام کونسا تاریخ میں لکھا جانا تھا۔ کونسا تمہیں بہادری کا تمغا ملنا تھا۔ یقیناً تم ماردی جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں، جنگ اگر ہندوستانی سپاہی جیت بھی جائیں تو روایات کے مطابق بڑوں ہی کی بلے بلے ہوگی۔ تمہاری جیسی عورتوں کو کسی کھاتے میں نہیں رکھا جائے گا۔ میری بانو اور تم اس جرم سے مکر جاؤ۔ عزیزن! اپنی جان بچاؤ۔ بہت قیمتی ہوتی ہے یہ جان۔ جھانسی کی رانی، حضرت محل کا نام اس لیے زندہ رہ سکتا ہے کہ ان کی حیثیت بڑی ہے۔ اور تم...... تم تو ایک نری طوائف ہو۔'' شمس الدین نے دکھ بھرے لہجے میں مشورہ دیا۔

''ایک ہی تو بڑائی کی بندی میرے ماتھے پر لگنے لگی ہے۔ اپنے کام سے مکر کر یہ موقع بھی گنوادوں۔ اپنے مقصد سے پیار کرنے والوں کو سجناں مشورہ تو ٹھیک سا دو۔'' عزیزن نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

''کوشش کرتا ہوں۔ اداس مت ہونا۔ میرا انتظار کرنا۔'' شمس الدین نے کہا تو سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے جیل لے گئے۔

اگلی پیشی پر ایک بار پھر جنرل ہیولاک نے اپنی پیشکش کو دہرایا۔

''تم...... عزیزن بائی۔ اپنے جرم بارے کیا کہتا ہے؟ تمہیں قبول ہے یا نہیں؟''

عزیزن کچھ دیر خاموش رہی تو وہ پھر بولا۔

''کہہ دو۔ تم نے یہ نہیں کیا۔ ہم چھوڑ دے گا، ہمیں خوبصورت لوگوں کو مارنے سے ڈر لگتا ہے۔''

''میں بزدل نہیں اور نہ ہی ڈرپوک۔ رحم کی بھیک مانگنے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگالوں۔ کم از کم مجھے آگے جاکے بھی شرمندگی تو نہ ہوگی۔ عزیزن نے یہ سب ہندوستان کی آزادی اور برطانوی حکومت کے خاتمے کے لیے کیا ہے۔ اگر زندہ رہی تو آئندہ بھی کروں گی۔ جب تک میرا ملک تمہارے تسلط سے آزاد نہیں ہوجاتا......'' عزیزن بائی نے جذباتی انداز میں کہا تو جنرل ہیولاک نے فائر بریگیڈ کو حکم دیا اور عزیزن بائی کا کومل بدن گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ اس کی لاش دوسرے سپاہیوں کے ساتھ ایک اندھے کنویں میں پھینک دی گئی۔ اس طرح ایک طوائف اپنے لہو سے مادرِ وطن کی مانگ بھر کر سرخرو ہوگئی مگر اس کا نام تاریخ کے اندھے گونگے صفحات میں دب کر رہ گیا۔ کون اس نام سے گرد جھاڑ کر اسے اجالے گا یا اسے گمنامی کی دیمک یونہی چاٹ جائے گی۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ...... محمد قاسم فرشتہ۔ منتخب التواریخ...... عبدالقادر بدایونی۔ باربوسہ کے مشاہدات...... باربوسہ۔ اعجاز خسروی...... امیر خسروؒ۔ تاریخ داؤدی...... خواند میر۔ ہندوستان عہدِ وسطیٰ میں...... کنور محمد اشرف۔ سندھ ساگر...... اعتزاز احسن۔ سہ ماہی تاریخ...... (1857ء) ڈاکٹر صولت ناگی۔ امراؤ جان ادا...... مرزا ہادی رسوا۔ بازار حسن کی شاعرات...... فردوس علی

ادھورا خواب

تنویر ریاض

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مختلف صلاحیتوں کے حامل انسانوں کو دنیا میں اتارا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے آگہی کے دروازے بھی کھول دیے۔ اسے بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے خوابوں سے راہنمائی حاصل کرے مگر اس بار اس کے خوابوں کا خاکہ کچھ ادھورا رہ گیا لیکن... آگہی نے اس کی چھٹی حس کو پوری طرح بے دار کر دیا تھا۔

ناقابل یقین صورت حال اور بے معنی گمان کا دلچسپ احوال

''میرا نام مارتھا ہے۔'' اس لڑکی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر نو سال ہوگی۔ اس نے بڑے سائز کے گول شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا جو میرے چشمے جتنا بڑا تھا اور نارنجی رنگ کی بے ڈھنگی سی فراک پہن رکھی تھی۔ ہم تینوں یعنی مارتھا، اونیل اور میں اس چھوٹے سے دفتر میں موجود تھے۔ میں اور میرا پارٹنر اونیل کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ وہ ہمارے سامنے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی تھی۔ یہ 1957ء

کے اوائل کی بات ہے۔ وہ ہفتے کی سہ پہر تھی اور کمرے سے باہر سرما کی تیز ہوائیں چلنے کی آواز کسی سیٹی کے مانند گونج رہی تھی۔

''کیا تم اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے ہو؟'' مارتھا نے اونیل کے دیہاتی لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اونیل منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آئرش۔ میرا تعلق آئرلینڈ سے ہے۔''

لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آئرلینڈ کے بارے میں جانتی ہوں۔ وہاں سانپ نہیں ہوتے۔ یہ بات مجھے مسز لارسن نے بتائی تھی۔ وہ دوسری جماعت میں میری ٹیچر تھی لیکن اس بات کو بہت عرصہ ہو گیا۔''

اونیل مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اتنی پرانی بات کیسے یاد آ گئی؟''

''یہ صحیح ہے کہ وہ کبھی میری ٹیچر تھی لیکن اب وہ میری نظر میں مشتبہ ہو گئی ہے۔''

''مشتبہ؟'' میں چونک پڑا۔ ''اس عمر میں تم لوگوں پر شک کرنے لگی ہو۔ یہ تو تمہارے گڑیوں سے کھیلنے کے دن ہیں۔''

''مجھے گڑیاں پسند نہیں ہیں۔'' مارتھا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے دراصل تین لوگوں پر شبہ ہے اور اسی لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں مسٹر پلنکٹ...... کیونکہ اس علاقے میں تم ہی واحد سراغ رساں ہو۔'' پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے بولی۔ ''میرا مطلب ہے تم دونوں۔''

''اور تمہیں مسز لارنس پر شبہ کیوں ہوا؟''

''کیونکہ وہ میرے خواب میں آئی تھی۔''

''تمہارے خواب میں......؟''

''ہاں اور میرے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنے شریک کار کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم اس بارے میں مسٹر اونیل کو بتاؤ۔ اسے اس طرح کے عجیب خواب سننے کا بہت شوق ہے۔''

''اپنی بات جاری رکھو مارتھا!'' میرے ساتھی نے کہا۔ ''ہمیں اپنے خوابوں کے بارے میں بتاؤ۔''

پہلی بار لڑکی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ''بعض اوقات میرے خوابوں میں چیزیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ ان کا کیا مطلب تھا۔ مثلاً میں نے گزشتہ موسم گرما میں خواب دیکھا کہ ہماری بلی ایک سور ما سے لڑ رہی ہے جس کے جوتوں میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ حقیقی زندگی میں کیا ہوا؟ وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ اسے ایک موٹر سائیکل نے کچل ڈالا۔''

اونیل اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

اس وقت میرا دل چاہا کہ اس لڑکی کو دفتر سے نکال کر کسی قریبی آئس کریم پارلر کا راستہ دکھا دوں۔ بہرحال پرائیویٹ سراغ رساں اور بچوں کی آیا میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے لیکن اونیل ابھی تک اس سے باتوں میں لگا ہوا تھا۔

''تم اپنے حالیہ خواب کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''میں نے یہ خواب گزشتہ رات دیکھا۔ میں فائیو اینڈ ڈائم اسٹور میں تھی۔ وہی جہاں تمہاری منگیتر کام کرتی ہے مسٹر پلنکٹ۔''

منگیتر کا نام سن کر میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرے علاوہ مسز لارسن، مس واٹسن اور مسٹر اسٹوک بھی وہاں موجود تھے۔''

''ہنری اسٹوک......'' میں نے پوچھا۔ ''یہ وہی شخص ہے نا جس کا کیمرا اسٹور ہے؟''

''ہاں، یہ وہی ہے اور مس واٹسن سنیما میں کام کرتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ تھیٹر میں بیٹھی فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ میں نے خواب میں ان تینوں کو ایک ہی وقت میں اسٹور آتے دیکھا اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک خوفناک کام کرنے والا ہے۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔ اس لیے میری نظر میں تینوں ہی مشتبہ ہیں۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ خواب کی طرح حقیقی زندگی میں بھی یہ تینوں اکٹھے نظر آئے تھے؟'' اونیل نے کہا۔

''بالکل۔'' مارتھا نے جواب دیا۔ ''میں نے دو دن پہلے ان تینوں کو اسٹور میں اکٹھے دیکھا تھا پھر یہ گزشتہ شب مجھے خواب میں نظر آئے اور اسی لیے میں سوچ رہی ہوں کہ ان میں سے ایک کوئی بہت برا کام کرنے والا ہے۔''

''تم مجھے ترتیب وار بتاؤ۔'' اونیل نے کہا۔ ''تم نے بتایا کہ دو دن پہلے اسٹور گئی تھیں؟''

مارتھا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ میں جمعرات کے روز اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہاں گئی تھی اور کتابوں کے ریک کے پاس کھڑی ایک مزاحیہ کتاب پڑھ رہی تھی کہ وہ تینوں وہاں آئے۔ سب سے پہلے مسٹر اسٹوک، اس کے کچھ دیر بعد مس واٹسن اور مسز لارسن سب

سے آخر میں آئی۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تینوں ایک ہی وقت میں وہاں موجود تھے۔ میں نے مسز لارسن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ انہوں نے چند چیزیں خریدیں اور چلے گئے۔"

"تم یہ بتا سکتی ہو کہ انہوں نے کیا خریداری کی؟" اونیل نے پوچھا۔

"مجھے یاد نہیں۔ ویسے بھی میں کتاب میں کھوئی ہوئی تھی۔" میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "اسٹور میں لوگ خریداری کرنے ہی آتے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی خوفناک بات نظر نہیں آتی۔"

"لیکن وہ خواب واقعی خوفناک تھا۔" مارتھا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "اس خواب میں معاملہ کچھ مختلف تھا۔ میں کتاب نہیں پڑھ رہی تھی بلکہ ایک کونے میں کھڑی ہوئی تھی اور اسٹور میں اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا پھر میں نے دیکھا کہ وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی میں نے انہیں حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ بس وہ تینوں ایک ساتھ کھڑے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد مسز لارسن اور دوسرے لوگوں کو کچھ سایوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں خوفزدہ ہوگئی کیونکہ جانتی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے پھر میں نے ایک خوفناک چیخ سنی لیکن یہ کسی انسان یا جانور کی نہیں تھی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیسی چیخ تھی پھر اسی دوران ایک اور خوفناک بات ہوئی اور وہ یہ کہ ان سایوں سے ایک نوک دار پنجہ اڑتا ہوا آیا... وہ چمک دار چاندی کا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ بری بات یہ کہ وہ پورا خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے آ کر گرا۔ میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگی اور یہیں خواب ختم ہوگیا۔"

اونیل ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "اوہو...... یہ تو بہت ہی تکلیف دہ خواب تھا۔"

"گزشتہ شب میں نے ایک نہیں بلکہ دو خواب دیکھے۔" مارتھا بولی۔ "میں نے دوسرے خواب میں دیکھا کہ کسی قصبے میں جا رہی ہوں جس کا نام مجھے معلوم نہیں پھر مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی میرے دماغ میں بول رہا ہو...... نصف شب کے قریب وہ اسے پاجامہ پہنے ہوئے دیکھیں گے۔ بالکل یہی الفاظ تھے پھر میری آنکھ کھل گئی لیکن یہ پہلے خواب کی طرح ڈراؤنا نہیں البتہ عجیب ضرور تھا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ یہ ایک عجیب خواب تھا لیکن مجھ سمیت بہت سے لوگ اس طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔ ابھی دو رات پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ نائب صدر نکسن، بل ہیلی کے ساتھ ڈرم بجا رہا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟"

وہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔ "بالکل نہیں۔ تم نے اپنے خواب میں جو دیکھا وہ مضحکہ خیز ہے جبکہ میرے خوابوں میں ان واقعات کی طرف اشارہ ہے جو ہونے والے ہیں۔ ماما کہتی تھیں کہ میں خوب صورت خواب دیکھنے والی ہوں۔ ان کے کہنے کے مطابق تمام خواب خدا کی طرف سے خوب صورت تحفہ ہیں۔ ان میں برے خواب بھی شامل ہیں۔"

"پھر تو تمہیں اپنی ماما کو ان خوابوں کے بارے میں بتانا چاہیے۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" مارتھا نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ گزشتہ جولائی میں ماما کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔" اونیل نے کہا۔ "تمہیں اس چھوٹی عمر میں یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔"

میں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت چھوٹا تھا جب میری ماں کا انتقال ہوا۔ اس لیے میں اس صدمے کی شدت کو محسوس کر سکتا ہوں۔"

"ہاں۔" مارتھا نے کہا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا ایک رول نکالا جس کے گرد ربر بینڈ لپٹا ہوا تھا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "پورے تینتیس ڈالرز ہیں۔"

"تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے اپنی کہانیاں بیچ کر خود کمائے ہیں۔ ایک کہانی کے پچاس سینٹ ملتے ہیں۔"

"تم مذاق کر رہی ہو۔ یقین نہیں آتا کہ یہاں کے لوگ اپنے بارے میں قصے کہانیاں پڑھنا پسند کرتے ہوں گے۔"

"وہ قصے کہانیاں نہیں تھیں اور میں نے انہیں یہاں نہیں بلکہ نیوہیمپشائر میں بیچا تھا۔ میں ماما کے انتقال کے بعد اپنی خالہ گنی کے پاس وہاں ایک مہینا رہی تھی۔" اس نے اپنی آواز مدھم کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں کہانیاں نہیں بیچتی کیونکہ میرے والد اسے پسند نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ رقم کسی محفوظ جگہ پر

رکھ دو۔‘‘

وہ دو قدم آگے بڑھی اور وہ رقم میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ’’یہ تمہاری فیس ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ان مشتبہ لوگوں میں سے اصل مجرم کو تلاش کرو۔‘‘

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’میں یہ رقم نہیں لوں گا۔‘‘

’’اگر یہ کافی نہیں تو میں مزید پیسوں کا انتظام کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے لیے مجھے چھپ کر کہانیاں فروخت کرنا ہوں گی تاکہ میرے والد کو معلوم نہ ہو۔‘‘

’’تم بہت اچھی لڑکی ہو اور مجھے اپنے مقصد سے مخلص بھی دکھائی دیتی ہو لیکن میں خوابوں کی تحقیقات نہیں کرتا۔ تم اپنے پیسے واپس لے لو۔‘‘

اس نے انکار کرنے کے انداز میں اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ تم میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے لیکن تمہیں ایسا کرنا چاہیے۔‘‘

’’میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔‘‘ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ رقم واپس لے لی۔

اب اونیل کی باری تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ’’میرا ساتھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ کوئی مناسب بات نہیں ہوگی کہ ہم تمہاری محنت سے کمائی ہوئی رقم لے لیں۔‘‘

مارتھا اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’شاید کوئی نیا سراغ رساں اس شہر میں آجائے اور وہ میرا کیس لے سکے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ مڑی اور دفتر سے چلی گئی۔

اس واقعے کے چند روز بعد یکم جنوری کی شب جارج موسکی نامی ایک شخص واٹر بری میں گرفتار ہوا جو یہاں سے تیس میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ پولیس نے اس کے گھر سے پائپ، پیتل کی ناب، ٹارچ کے سیل اور جیبی گھڑیاں برآمد کیں۔ یہ تمام اشیا دھماکا خیز مواد کی تیاری میں استعمال ہوتی ہیں۔ درحقیقت وہ ایک قابلِ نفرت بمبار تھا جس نے گزشتہ سولہ سالوں کے دوران نیویارک میں تین درجن سے زیادہ بم دھماکے کیے تھے۔

ابھی میں نے یہ خبر پڑھی ہی تھی کہ اونیل میرے پاس آکر بولا۔ ’’تمہیں یاد ہے کہ مارتھا نے اپنے دوسرے خواب میں کیسی آواز سنی تھی؟‘‘

’’اس میں کسی شخص کے بارے میں اشارہ تھا جو پانی میں پکڑا گیا۔‘‘

’’تم نے غور نہیں کیا کہ یہ شخص موسکی واٹر بری میں پکڑا گیا اور اس وقت اس نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔‘‘

’’کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مارتھا نے اس بمبار کے پکڑے جانے کی پیشین گوئی کردی تھی؟‘‘

’’میں اس سے بھی آگے کی بات کررہا ہوں۔ اسے خواب میں پتا چل جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔‘‘ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ خبر پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ مارتھا کے دوسرے خواب کے بارے میں بھی کچھ معلومات ادھر ادھر سے حاصل کی جائیں۔‘‘

’’تمہارا اشارہ ان تین افراد کی جانب ہے جن پر مارتھا نے شبہ ظاہر کیا تھا؟‘‘

’’ہاں، مارتھا کو شبہ تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک مذموم حرکت کرنے والا ہے۔ میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید کوئی بات سامنے آجائے اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔‘‘

’’مجھے صرف معقولیت کی بنیاد پر اعتراض ہے۔ یاد کرو، مارتھا نے خود کہا تھا کہ اسے کہانیاں گھڑنا پسند ہے۔ وہ اس کام میں مہارت حاصل کرچکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنے خوابوں کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ بھی ایک کہانی ہے۔ بہرحال اگر تم اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔‘‘

’’میں پہلے ہی اسے بتا چکا ہوں کہ اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’تم اس سے کب ملے تھے؟‘‘

’’میں نے جیسے ہی اخبار میں خبر پڑھی تو اس سے ملنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہ مجھے اسکول کے باہر سڑک پر ہی مل گئی تھی۔‘‘

’’تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے بھی کوئی اعتراض ہوسکتا ہے؟‘‘

اونیل نے میرے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے اپنی تحقیقات شروع کردینی چاہیے۔‘‘

میں نے سردمہری سے کہا۔ ’’تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس کا حصہ نہیں ہوں۔‘‘

’’یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میں اس سڑک پر اونیل کا پیچھا کررہا تھا جو اسٹور کی طرف جارہی تھی۔

’’صبر کرو۔‘‘ میں نے اسے آواز دیتے ہوئے کہا۔ ’’اتنی جلدی کیا ہے؟‘‘

ساٹھ سال کی عمر میں بھی اس کی تیز رفتاری دیکھنے

سے تعلق رکھتی تھی اور جب وہ کسی کیس کی تفتیش کے لیے نکلتا تو اس کے پیروں کو پر لگ جاتے۔ بہرحال میں اس تک پہنچ ہی گیا جب وہ اسٹور کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اینی حسب معمول کاؤنٹر پر موجود تھی اور بچوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے گرم جوش مسکراہٹ سے کہا۔

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

میں نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی سے پوچھو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ یہاں کیوں آیا ہے۔''

اینی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یقیناً تم کسی کیس کے سلسلے میں آئے ہو۔ کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟''

''ہاں۔ تم ہمیں متعلقہ ڈیٹا فراہم کر سکتی ہو۔''

''واقعی۔'' میری منگیتر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے؟''

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اونیل نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمیں مارتھا سے معلوم ہوا تھا۔

اینی نے سب کچھ سننے کے بعد افسردہ لہجے میں کہا۔ ''بے چاری مارتھا۔''

''کیا تم اسے اچھی طرح جانتی ہو؟'' اونیل نے پوچھا۔

''اسی اسٹور سے جان پہچان ہوئی ہے۔ میں اسے کبھی کبھی کتابیں پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہوں۔ اس بے چاری نے بڑا کٹھن وقت گزارا ہے۔ گزشتہ موسم گرما میں اس کی ماں مرگئی اور اس کا باپ...... اس کے بارے میں بھی میں نے کوئی اچھی بات نہیں سنی۔''

''وہ نکما ہے یا آوارہ؟'' اونیل نے پوچھا۔

''سننے میں آیا ہے کہ وہ شراب اور عورتوں کا رسیا ہے۔ یہاں تک کہ بیوی کے مرنے کے بعد وہ کسی دندان ساز کی بیوی کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔''

''بہرحال تم ہمیں مارتھا کے مشتبہ افراد کے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''تم ہنری اسٹوک کو تو جانتے ہو۔'' اینی بولی۔ ''وہ کیمرا اسٹور کا مالک ہے۔''

''ہاں۔ اس نے دس سال قبل بھائی جم کے مرنے کے بعد یہ دکان سنبھالی تھی۔''

''جم بہت کم عمر تھا جب اس کا انتقال ہوا۔'' اینی بولی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اکتیس سال کا تھا۔''

''اسے کیا ہوا تھا؟'' اونیل نے پوچھا۔ اسے یہاں آئے تین سال سے بھی کم عرصہ ہوا تھا۔

''کسی کو اس بارے میں معلوم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک روز قصبے کے سرے پر واقع جنگلوں میں گیا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں جو پارٹی گئی، ان میں میرے والد بھی تھے۔ انہیں تین دن بعد اس کی لاش ایک پہاڑی کے نیچے ملی۔ کچھ دنوں بعد ہی اس کے بھائی ہنری نے کیمرا اسٹور کا انتظام سنبھال لیا۔''

اینی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ماریا واٹسن کو نہیں جانتی۔ وہ خوب صورت عورت سنیما میں کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ گزشتہ برس ہی قصبے میں آئی ہے۔ البتہ جین لارسن یہاں ہمیشہ سے ہے۔ وہ گرامر اسکول میں میری ٹیچر بھی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی بدمزاج واقع ہوئی ہے۔''

''اور یہ تینوں افراد گزشتہ ہفتے یہاں آئے تھے؟'' اونیل نے پوچھا۔ ''ایک ہی وقت میں۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

''ہاں۔ میرا خیال ہے کہ بدھ یا جمعرات کو آئے تھے۔'' اینی نے جواب دیا۔

''ان میں سے ہر ایک نے کیا خریداری کی؟''

''ماریا نے دو فلمی رسالے خریدے۔ وہ ہمیشہ یہاں سے یہی رسالے خریدتی ہے۔ مسز لارسن کا مجھے یاد نہیں۔ البتہ ہنری اسٹوک نے جو خریدا، اسے بھلانا مشکل ہے۔ اس نے ستائیس ٹوائلٹ ربر کپ خریدے جو صفائی کے کام میں آتے ہیں۔''

''ستائیس!'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اس نے ہمارا تمام اسٹاک خرید لیا۔''

''کیا تم نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں یہ پمپ کیوں خرید رہا ہے؟''

اینی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پوچھتے ہوئے ڈر لگا۔'' یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر پر رکھی اشیا سمیٹنے لگی۔ اچانک اس کی نظر سامنے والی کھڑکی پر گئی اور وہ پُر جوش آواز میں بولی۔ ''تم دونوں خوش قسمت ہو۔ مسز لارسن ابھی ابھی یہاں سے گزری ہے۔ اگر تم جلدی کرو تو اسے پکڑ سکتے ہو۔''

''ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی اونیل دروازے سے باہر جا چکا تھا۔

اینی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ تم بھی اپنے ساتھی کے پیچھے جاؤ۔''

اب میرا وہاں رکنا بیکار تھا۔ میں بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ میں نے سڑک کے پار اونیل کو ایک طویل قامت عورت کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ

تقریباً پچاس کے پیٹے میں تھی، میں بھی ان کے پاس چلا گیا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اونیل اصل موضوع پر کس طرح آتا ہے۔

''ہم تمہاری ایک پرانی شاگرد کو جانتے ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتی ہے۔''

''اوہ۔''

''حال ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا جس کے بعد وہ بے چاری ایک برے دور سے گزر رہی ہے اور اکثر و بیشتر اسے ہنگامہ خیز خواب نظر آتے ہیں۔ میں اور لی اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا تم دونوں ماہر نفسیات ہو؟'' مسز لارسن نے پوچھا۔

''نہیں۔ ہم صرف اس کے دوست ہیں اور ہمیں اس کی حالت پر تشویش ہے۔'' اونیل نے کہا۔ ''کیونکہ تم بھی اس کے ایک خواب میں آئی ہو اس لیے ہم نے سوچا کہ تم سے بھی بات کر لی جائے۔''

''اور اس کا موضوع کیا ہوگا؟''

''یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔'' اونیل بولا۔ ''شاید کوئی خاص موضوع نہ ہو لیکن ایک چھوٹی سی دوستانہ گفتگو جو کبھی نقصان دہ نہیں ہوتی۔''

مسز لارسن اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور بولی۔ ''مارتھا بہت ہی عجیب لڑکی تھی اور جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، اب بھی اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔''

''ہاں۔ وہ خاصی منفرد ہے۔'' اونیل نے کہا۔ ''اور بلاشبہ اس کا دماغ امتیازی طریقے سے چیزوں کی تشریح کرتا ہے۔ اس نے گزشتہ ہفتے تمہیں کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ فائیو اینڈ ڈائم اسٹور میں دیکھا تھا۔ کیا یہ پوچھنا بے جا مداخلت ہوگا کہ تم نے اس روز وہاں سے کیا خریداری کی؟''

''ہاں۔'' اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ ''یہ سوال پوچھنے کا کیا مقصد ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اسے ڈراؤنے خواب آتے ہیں لیکن اس سے کہو کہ وہ ان پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ مجھے بھی بچپن میں ڈراؤنے خواب آتے تھے لیکن میں نے اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔''

''تم جانتی ہو کہ اس کی ماں نہیں ہے جو اس کی راہنمائی کر سکے۔''

''ہاں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس روز فونوگراف کی سوئی اور چاکلیٹ خریدی تھی۔ دراصل میں اپنے شوہر کے پرانے ریکارڈ سننا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اس کے مرنے کے بعد بارہ سال سے فونوگراف استعمال نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے ایک نئی سوئی کی ضرورت تھی۔ وہی خریدنے گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کہانی کا اس لڑکی کی پریشانی سے کیا تعلق ہے؟''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد ہم مارسیا واٹسن سے ملنے کے لیے مووی تھیٹر کی جانب روانہ ہوئے۔ میٹنی شو ختم ہوا تھا اور نوعمر تماشائیوں کا ہجوم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر فلم پر تبصرے کر رہا تھا۔ ہم ان کے درمیان میں سے راستہ بناتے ہوئے لابی میں داخل ہوئے جہاں ایک نوجوان لڑکا بیزاری سے فرش کی صفائی کر رہا تھا۔

''کیا مس مارسیا واٹسن موجود ہیں؟'' اونیل نے پوچھا۔

اس لڑکے نے اپنا کام روک کر اسے دیکھا اور رکھائی سے بولا۔ ''وہ اندر ہال میں ہے۔''

ہم تھیٹر میں داخل ہوئے جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ البتہ اسکرین پر ایک رنگین فلم چل رہی تھی اور ہال میں مارسیا کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ پچھلی قطار کے آخری کونے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کم روشنی میں بھی پہچان لیا۔ ہم اس کے پاس گئے اور اونیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مس واٹسن؟''

وہ عورت ہماری طرف گھومتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔''

''کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں شاید تم ہماری مدد کر سکو۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی پھر اس نے پروجیکٹر روم کے روشن دان کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''ٹھیک ہے جوئے تم اسے بند کر سکتے ہو۔''

''کیا میٹنی شو ابھی ختم نہیں ہوا؟''

''وہ تو پندرہ منٹ پہلے ختم ہو چکا ہے لیکن مجھے یہ روبوٹ روبی بہت پسند ہے۔ اس لیے میں نے جوئے سے کہا تھا کہ وہ یہ ریل دوبارہ چلائے۔ وہ ہمیشہ میری بات مانتا ہے۔''

اسکرین خالی ہو چکی تھی۔ مارسیا نے دیوار میں لگا ہوا سوئچ آن کیا تو ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

''اب بتاؤ۔ مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟'' اس نے ہم دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ اونیل نے ایک بار پھر مارتھا اور اس کے خوابوں کے بارے میں بتانا شروع کیا لیکن اس نے مارسیا کو اپنی اور میری اصلیت سے آگاہ نہیں کیا۔

مارسیا نے غور سے اس کی بات سنی اور بولی۔ ''میں

ان خوابوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی لیکن اس لڑکی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کچھ عجیب سی ہے۔ کئی مرتبہ وہ ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہو کر مجھ سے احمقانہ سوالات کرتی رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیٹ ڈیزائنر کون ہے یا اس فلم میں کتنے ایکسٹرا اداکار ہیں۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میں اس اسٹور میں مووی میگزین لینے گئی تھی۔ مجھے اسٹارز کے بارے میں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ کاش میں بھی ان جیسی بن جاؤں۔''

''تمہیں یاد ہے کہ اسٹور میں تم نے مارتھا کو دیکھا تھا؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید دیکھا ہو۔ دراصل میری توجہ میگزین پر تھی۔''

اتنی دیر میں صفائی کرنے والے لڑکے مکی نے اسے آواز دے کر بلایا تو وہ بولی۔ ''ایک منٹ...... میں آرہی ہوں۔''

''اسی میگزین میں ہمفرے بوگارٹ کے بارے میں بھی مضمون شائع ہوا تھا۔ وہ میرا دور کا رشتے دار تھا۔ اس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اگر زندہ رہتا تو شاید ہالی وڈ میں میرا آڈیشن کروا دیتا۔''

مکی نے ایک بار پھر اسے آواز دی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شاید یہ لڑکا بھی مجھ پر فریفتہ ہو گیا ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ مکی اور جوئے جیسے لوگ تمہارے معیار کے ہیں۔'' اونیل نے کہا۔

''نہیں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرا بوائے فرینڈ کوئی اور ہے اور وہ میرے معیار کا ہے۔''

میں نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تفصیل بتاتی، مکی ایک بار پھر اس کا نام لے کر چلایا اور وہ منہ ہی منہ میں ہمیں خدا حافظ کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ جب ہم دونوں لابی میں پہنچے تو وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ مکی سر جھکائے صفائی میں مصروف تھا۔

کیمرا اسٹور وہاں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس دکان میں وہ سب کچھ تھا جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دیواروں پر پورٹریٹ سائز کی تصاویر، شادی کے فوٹو اور چند قدرتی مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ شیشے کے دو کاؤنٹر جن میں کیمرے اور فلمیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں دو کیمرا اسٹینڈ رکھے ہوئے تھے۔ ایک پردے کے پیچھے سے ہنری اسٹوک برآمد ہوا۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ جسم فربہ اور سر گنجا ہو رہا تھا۔

''تمہیں کچھ چاہیے؟'' اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

جب اونیل نے اسے پوری بات بتائی تو وہ بولا۔ ''میں کسی مارتھا کو نہیں جانتا۔''

''لیکن وہ تمہیں جانتی ہے۔'' اونیل نے کہا۔

''یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں اس قصبے کا معروف دکاندار ہوں۔ اس کے علاوہ سماجی تقریبات کا بھی انعقاد کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی شادی کی تقریب میں آئی ہو جس کی میں نے تصویریں بنائی تھیں۔ بہرحال میں اس کے خوابوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اسٹوک نے کہا۔ ''کیا تم یہ سب اس لڑکی کے اطمینان کے لیے کر رہے ہو یا یہ کسی قسم کی کوئی تفتیش ہے؟ ویسے پرائیویٹ سراغ رساں اپنا وقت خوابوں پر ضائع نہیں کرتے۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے اسٹور سے تین روز قبل کچھ خریداری کی تھی۔'' اونیل نے کہا۔ ''کچھ ٹوائلٹ کپ جن کی تعداد ستائیس تھی۔''

''یہ صحیح ہے۔'' اسٹوک نے تصدیق کی۔ ''ان کے پاس مزید اسٹاک نہیں تھا۔''

''یہ تو بڑے شرم کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس بارے میں تجسس ہوگا کہ میں نے وہ سب کیوں خرید لیے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

وہ ہمیں عقبی کمرے میں لے گیا جس کی تمام دیواروں پر غیر روایتی تصاویر آویزاں تھیں۔ وہاں ہم نے نوبیاہتا جوڑوں اور فارغ التحصیل طلبہ کی تصاویر کے بجائے مختلف چیزوں مثلاً ٹیلی فون ڈائریکٹری، بوتاٹی کا ڈھیر، کھلونے نما خرگوش اور ٹوائلٹ کپ کے ایک بڑے ٹیلے کی تصاویر دیکھیں۔

''اسے تم میری اختراع سمجھ لو۔'' اسٹوک مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''پلاسٹک کا بنا ہوا خرگوش محض ایک کھلونا ہو سکتا ہے لیکن ستر پلاسٹک کے خرگوش......''

''پاگل پن۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں۔ یہ ایک آرٹ ہے۔''

''یقیناً یہ بہت دلچسپ کام ہے مسٹر اسٹوک۔'' اونیل نے ڈپلومیٹک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ کوشش کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

فوٹو گرافر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''شاید تین یا چار سال...... میں نے جمی کی بنائی ہوئی ٹائروں کے ڈھیر کی پرانی تصویریں دیکھی تھیں۔ اسی سے متاثر ہو کر مجھے بھی

یہ شوق ہوا۔''

''اوہ......اب سمجھا۔'' اونیل نے کہا۔ ''تم تصویریں بنانے کے بعد ان ٹوائلٹ کپ کا کیا کرتے ہو؟''

''میں ربر والا حصہ کاٹ کر پھینک دیتا ہوں اور لکڑی کا دستہ آتش دان کی آگ روشن رکھنے کے کام آتا ہے۔''

اونیل نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کبھی قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کا بھی مطالعہ کیا ہے مثلاً جانوروں کے پنجے یا پرندوں کے پر وغیرہ وغیرہ؟''

''نہیں۔ میں انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو ترجیح دیتا ہوں۔''

اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اسٹوک اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولا۔

''شاید کوئی گاہک آیا ہے۔'' اس نے تیزی سے پردہ ہٹایا اور باہر چلا گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئے۔

دفتر پہنچ کر میں نے اونیل سے کہا۔ ''اس بھاگ دوڑ کا کیا نتیجہ نکلا؟ محض وقت ہی ضائع ہوا۔''

''یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔'' اونیل بولا۔

''کیا واقعی؟'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''ہم نے کیا حاصل کیا؟''

''ایسے تین لوگوں سے میرا تعارف ہوا جن سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ گو کہ یہ ملاقات مختصر تھی لیکن اس سے ہمیں ان کی دلچسپ شخصیت کی جھلکیاں نظر آئیں۔''

''یہ سب کچھ مبہم سا ہے۔'' میں نے اپنے چشمے کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ملاقات ایک چڑچڑی اسکول ٹیچر، عجیب فوٹو گرافر اور ایک خوب صورت عورت سے ہوئی۔ ان تینوں کے درمیان صرف یہ تعلق بنتا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر تھے اور وہاں سے انہوں نے کچھ خریداری بھی کی۔''

''جس میں وہ ستائیس ٹوائلٹ کپ بھی شامل ہیں؟''

''ہاں۔ مانتا ہوں کہ یہ ایک عجیب بات ہے لیکن اسٹوک نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ بہرحال تم نے اپنا مشن پورا کر لیا اور معلومات حاصل کر لیں۔ تم نے اس لڑکی سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ان معلومات سے کوئی نتیجہ اخذ کرو گے تاہم کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوا۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو اونیل نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ ''چار بج گئے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم نے اسے یہی وقت دیا تھا۔''

دروازہ کھلا اور مارتھا اندر داخل ہوئی۔ اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ہم دونوں کو باری باری دیکھا اور بولی۔ ''کیا تم نے کیس دیکھا؟''

''ہاں۔ میں ان تینوں سے مل چکا ہوں۔'' اونیل نے کہا پھر اس نے تفصیل سے ان ملاقاتوں کا احوال بتایا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ درمیان میں اس نے ایک دو مرتبہ تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر جذباتی انداز میں بولی۔

''تم نے اسے حل کر لیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وہ چیزیں خریدیں جن کا موت سے تعلق بنتا ہے۔''

''رک جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے وہ سب غور سے سنا جو مسٹر اونیل نے تمہیں بتایا؟ ہمیں کوئی مفید معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔''

''لیکن تم معلوم کر چکے ہو۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''پہلی بات مسز لارسن نے تمہیں بتایا کہ اس نے گراموفون ریکارڈ کی سوئی خریدی کیونکہ وہ اپنے مرے ہوئے شوہر کے ریکارڈ سننا چاہ رہی تھی۔ پھر تم نے کہا کہ مسٹر اسٹوک نے وہ ٹوائلٹ کپ اس لیے خریدے کیونکہ اس نے ان کی تصویریں بنانے کا خیال اپنے مرے ہوئے بھائی کی تصویریں دیکھ کر لیا تھا۔ تیسری بات تم نے یہ کہی کہ مس واٹسن نے میگزین اس لیے خریدا کہ اس میں اس کے مرحوم کزن ہمفرے بوگارٹ کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔''

میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔''

''انہوں نے جو چیزیں بھی خریدیں، ان کا تعلق مرے ہوئے رشتے داروں سے ہے۔'' مارتھا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں صرف مشتبہ افراد کو دیکھنا ہے۔ مس واٹسن کو تو الگ کر دو۔ وہ اپنے کزن کو اس لیے قتل نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اس کی پہنچ سے بہت دور ہالی وڈ میں تھا۔ البتہ مسز لارسن اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے۔ مسٹر اسٹوک کا بھائی کافی عرصہ پہلے مر گیا تھا اور کوئی نہیں جانتا کہ جنگل میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ممکن ہے کہ گرنے سے اس کے سر میں چوٹ نہ آئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام مسٹر اسٹوک کا ہی ہو۔''

اونیل اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''جب تم نے اپنا خواب بیان کیا تو کہا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک مشتبہ شخص کچھ غلط کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ وہ پہلے ہی ایسا کر چکا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مارتھا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ ''میں الجھ گئی تھی۔''

اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک طویل

قامت چوڑے کاندھوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں پانا پکڑ رکھا تھا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' وہ گرجتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈ؟'' مارتھا اس کی طرف دیکھتے بولی۔ میں اور اونیل بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ آنے والا غصے سے بولا۔

''میں نے ایک سوال پوچھا ہے۔''

''مجھے بھی تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اتنا بڑا پانا کیوں لے کر آئے ہو؟''

''میں ہارڈ ویئر کی دکان سے آ رہا ہوں۔'' وہ آدمی غراتے ہوئے بولا۔ ''میرا پرانا اوزار ٹوٹ گیا تھا لیکن اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میری بات کا جواب دو۔''

اس بار جواب دینے کی ذمے داری اونیل نے سنبھالی۔ ''ہم آپس میں مشاورت کر رہے ہیں۔ تم اسے معلومات کا تبادلہ بھی کہہ سکتے ہو۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' وہ شخص جس کا نام مورلے تھا، سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس نے میری بیٹی کو اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے باہر لگے ہوئے سائن بورڈز دیکھے، ان میں ایک درزی، ایک اسکول سیکریٹری اور......''

''اور ایک پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یہ مت بھولو۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میری بیٹی یہاں کیا کر رہی ہے؟''

مارتھا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ ''ڈیڈی! میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور میں ان لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے لڑکی۔ یہ تمہارا ایک احمقانہ خواب سننے کے عوض ایک بازو اور ایک ٹانگ کاٹ لیں گے۔ اچھا ہوا۔ تمہاری ماں زندہ نہیں ہے۔''

اونیل اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم تمہاری بیٹی سے کوئی فیس نہیں لے رہے بلکہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کی راہنمائی کر رہے ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم مجھے بے وقوف مت سمجھو۔''

خواجہ لقمان

خواجہ لقمان تھے تو اگرچہ غلام ابن غلام لیکن اللہ والے تھے۔ ہوس اور لالچ سے ان کی زندگی پاک تھی۔ آقا بھی ان کا صاحب نظر تھا اس لیے بظاہر تو وہ مالک تھا لیکن خواجہ لقمان کے مقام و مرتبے سے واقف تھا۔ لقمان اپنا بھید ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔ آقا اس قدر گرویدہ اور معتقد ہو گیا تھا کہ اپنا کھانا انہیں بھجواتا اور جو واپس بچ کر آتا وہ جھوٹا کھانا خود کھاتا تھا۔ اگر کبھی لقمان کھانا واپس کر دیتے اور نہ کھاتے تو آقا بھی وہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ خربوزہ تحفے میں آیا۔ مالک نے خادم کو بھیجا کہ جا کر لقمان کو بلا لاؤ۔ وہ تشریف لائے اور مالک کے سامنے بیٹھ گئے۔ مالک نے چھری سے خربوزہ کاٹا اور ایک قاش خواجہ لقمان کو پیش کی۔ انہوں نے بہت شوق سے کھائی تو مالک نے دوسری قاش دی پھر تیسری اور یوں 17 قاشیں خواجہ لقمان نے کھا لیں۔ جب ایک قاش باقی رہ گئی تو مالک نے کہا ''یہ قاش میں خود کھاؤں گا۔'' اس نے سوچا خربوزہ بہت میٹھا اور مزیدار تھا جو خواجہ لقمان اس کی سترہ قاشیں مزہ لے کر کھا گئے۔ مالک نے وہ قاش منہ میں ڈالی تو وہ مرچوں سے زیادہ کڑوی تھی۔ اس نے زبان پر چھالے ڈال دیئے تھے۔ حیرت سے پوچھا۔

''لقمان! تم نے یہ زہر کی طرح کڑوا خربوزہ کیسے کھایا۔ کیا تمہیں اپنی جان سے دشمنی ہے کوئی عذر پیش کر کے خربوزہ کھانے سے معذرت کر دی ہوتی۔''

خواجہ لقمان نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کے ہاتھ سے اس قدر کھایا ہے کہ مارے شرم کے جھک کر رہ گیا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی کڑوی شے آپ کے ہاتھ سے کھانے کو ملے اور میں انکار کر دوں۔ آپ کے ہاتھ سے ملنے والے کڑوے خربوزے کو آپ کی محبت اور شفقت نے میٹھا کر دیا تھا۔''

سبق: اللہ والے آزمائشوں میں سرخرو ہوتے ہیں۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

میں نے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا لیکن جب اس نے یہ بات دوبارہ کہی تو میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تم تو شکل سے ہی احمق لگتے ہو۔“

اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور آگے بڑھ کر پانا میری جانب گھمایا۔ وہ غالباً میرے سر کا نشانہ لینا چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ جب کوئی تمہاری کھوپڑی پر حملہ کرے تو بیٹھ کر اسے لات مارو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ فرش پر گر پڑا اور اس کا پانا بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اونیل تیزی سے آگے بڑھا، اس نے جھک کر وہ اوزار اٹھایا اور اسے میری میز پر رکھ دیا۔ اب وہ مورلے کی پہنچ سے دور تھا۔

مارتھا خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ڈیڈی کہ یہ تم نے کیا ہے۔“

وہ چند لمحے فرش پر پڑا رہا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے، جب تک مجھے ڈاک سے کوئی بل موصول نہیں ہوتا مجھے اس کی پروا نہیں کہ یہ لڑکی کیا کرتی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے آخری بار اپنی بیٹی کو دیکھا اور بولا۔ ”اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جانا۔“ اس نے اپنا پانا اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد مارتھا نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”یقیناً تم دونوں سوچ رہے ہو گے کہ میرے باپ کا رویہ دوستانہ نہیں تھا۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“

”میری ماما ہمیشہ اس کے رویے کی شکایت کرتی تھیں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

”مارتھا، ہمیں بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے باپ نے کبھی تم پر ہاتھ اٹھایا یا......؟“

”نہیں۔ اس نے مجھے کبھی نہیں مارا۔“ مارتھا نے کہا۔ ”درحقیقت اس نے مجھے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ کبھی سر پر بھی تھپکی نہیں دی۔ کم از کم اس نے مجھے مارا نہیں اور نہ ہی وہ لوگوں پر بڑے اوزاروں سے حملہ کرتا ہے۔“

”لیکن اس نے مجھ پر جو حملہ کیا، اسے، تم کیا کہو گی؟“

اونیل نے مارتھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خواب میں چاندی کا پنجہ دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے باپ کے اسی اوزار کی علامت تھا۔“

مارتھا بولی۔ ”میرے خواب میں وہ پنجہ خون آلود تھا۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ میرا باپ کسی کو اپنے اوزار سے قتل کرنے والا ہے؟“

میں نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔ ”اس نے ابھی ابھی مجھ پر اپنا پانا گھمایا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اونیل نے کہا۔ ”لیکن ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس کا جواب بالکل مختلف ہوگا۔“

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کے بجائے اپنا کوٹ اٹھایا اور دفتر سے باہر چلا گیا۔ مارتھا بھی وقت ضائع کیے بغیر اس کے پیچھے چل دی۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ اونیل اور مارتھا سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو ایک بلاک کے فاصلے پر مورلے کھڑا ہوا نظر آیا جو سگریٹ سلگا رہا تھا۔

پھر ہم نے سڑک پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے گھسٹنے کی آواز سنی۔ ایک سرمئی رنگ کی کریسلر کار تیزی سے مورلے کی طرف آ رہی تھی۔ آخری لمحے میں اس نے خطرہ محسوس کیا اور تیزی سے ایک جانب ہٹ گیا۔ کار نے ایک خطرناک یوٹرن لیا۔ مورلے اب سڑک پر چت لیٹا ہوا تھا۔ کار ایک بار پھر اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مورلے نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی اور وہ اس کار سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مارتھا کی چیخ نکل گئی۔

میں نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی اور اس سے پہلے کہ کار دوبارہ اس تک پہنچتی، میں نے مورلے کو پوری قوت سے پکڑا اور ہم دونوں ہی فٹ پاتھ پر آن گرے۔ کار چند انچ کے فاصلے سے گزری اور ہمارے عقب میں دیوار سے ٹکرا گئی۔ پھر دھات کے چرچرانے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ڈرائیور کا دروازہ کھلا اور اس میں سے کوئی باہر آیا۔ میں نے لیٹے لیٹے برابر میں پڑا ہوا چشمہ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، وہ مارسیا واٹسن تھی۔

ابھی میں اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ مارسیا نے اچانک ہی مورلے پر چلانا شروع کر دیا۔ ”کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری حرکتوں کا علم نہیں۔ تم اس دندان ساز کی بیوی کے

ماہنامہ
سرگزشت
کا ایک
اہم نمبر
بے وقت
موت نمبر
ان افراد کی روداد جو ''بے وقت موت'' کا شکار ہوئے لیکن
اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے
سرگزشت کا خاص نمبر
اہمیت کا حامل ہوتا ہے
لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں
اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں
تو پہلے آگاہ کر دیں تا کہ کوئی دوسرا اس
شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے

ساتھ جو گل کھلا رہے ہو، وہ میں جان گئی ہوں۔'' اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور یوں لگا جیسے وہ مورلے کے چہرے کو نشانہ بنانے والی ہے۔

''بہت ہو چکا۔'' اونیل ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔''

عین اسی وقت میں بھی آگے بڑھا اور ہم اسے بازوؤں سے پکڑ کر دور لے گئے۔ اس کے باوجود مارسیا کی چیخ و پکار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہذیانی کیفیت میں بولتی رہی۔ ''تم سور کی اولاد، جھوٹے، مکار...... مجھ سے کہتے رہے کہ میں تمہاری محبوبہ ہوں، وہ نہیں۔ لیکن تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔''

اس کی جارحیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم اسے زیادہ دیر تک مورلے سے دور رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ خوش قسمتی سے وہاں موجود کسی شخص نے پولیس کو اطلاع دے دی اور چند ہی منٹ بعد وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مورلے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنا پانا اٹھایا اور لنگڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں مارتھا کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا لیکن وہ سب کچھ دیکھ اور سن چکی تھی۔ اونیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہ سب دیکھنا پڑا۔''

مارتھا نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا مس واٹسن یہ کہہ رہی تھی کہ میرے ڈیڈی کی بہت سی گرل فرینڈز ہیں اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے؟''

''ہاں۔ میری بچی۔'' اونیل نے قدرے تاسف سے کہا۔

''اسی لیے اس نے ڈیڈی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''ہاں۔''

''یہ سب کچھ ویسا ہی ہے جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔'' مارتھا بولی۔

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

مارتھا نے اپنا چشمہ سیدھا کیا اور بولی۔ ''مس واٹسن ہی وہ مشتبہ عورت ہے جو کوئی غلط کام کرنے والی تھی اور اس کا نشانہ میرا باپ تھا۔ میں نے خواب میں جو چیخ سنی، وہ اس کی کار کے ٹائروں کی آواز تھی۔ چاندی کا پنجہ میرے ڈیڈی کا پانا تھا اور وہ بھی خون آلود ہوجاتا اگر وہ اپنی کار ان پر چڑھا دیتی۔''

''علامتی طور پر ایسا ہی ہے۔'' اونیل بولا۔

''لیکن تم دونوں نے عین وقت پر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ میں ہمیشہ تمہاری احسان مند رہوں گی۔''

''یاد کرو تمہاری ماں نے کیا کہا تھا؟'' اونیل بولا۔ ''تمہارے خواب خوب صورت تحفہ ہیں۔''

''ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈیڈی بہت زیادہ چڑچڑے ہو رہے ہوں۔''

اس واقعے کے تین دن بعد مارتھا کا باپ مورلے دندان ساز کی بیوی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دونوں میکسیکو کے کسی نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے تھے۔ جب مارتھا اسکول سے واپس آئی تو گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے مورلے کے خط پر گئی جس پر مختصر تحریر تھی۔

''میں قسمت آزمانے جارہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی خالہ کو بلالو۔''

آنٹی گنی نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ گو کہ باپ کے چلے جانے سے مارتھا کی زندگی میں ایک خلا تو ضرور پیدا ہوا لیکن خالہ نے اپنی محبت اور شفقت سے وہ کمی پوری کردی۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد میری منگیتر مجھے زبردستی اسکول کے فنکشن میں لے گئی۔ وہاں میں نے مارتھا کو اسٹیج پر دیکھا۔ اس نے بے ڈھنگی فراک کے بجائے بے حد خوب صورت نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس پر ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے دو بازو پھیلائے اور گانا شروع کیا۔

''خوب صورت خواب میرا سرمایہ ہیں۔''

اس کا اعتماد اور چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ماں کے مرنے کے بعد باپ کی عدم توجہی سے بچوں کی شخصیت پر کتنے منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے مورلے کا جانا مارتھا کے حق میں اچھا ہی ہوا اور اس کی خالہ نے ماں کی کمی پوری کردی لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ اس کا صحیح جواب تو شاید مارتھا بھی نہ دے سکے۔ باپ کا خط پڑھ کر اس نے بھی سوچا ہوگا کہ مورلے کا اسے چھوڑ کر چلے جانا تو اس کے خواب میں شامل نہیں تھا۔

چوتھا درویش

منظر امام

داستانیں... ہر دور کا نہ صرف حصہ رہی ہیں بلکہ عکاس بھی ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر تحریر بھی کچھ ایسا ہی منظر نامہ پیش کررہی ہے جس میں بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کے لوگ انتہائی الجھے ہوئے حالات کا شکار اپنے اپنے مسائل کا غم منا رہے ہیں۔

دورِ ابتلا میں مبتلا چار درویشوں کا عجیب قصہ

سر نیہوڑائے ہوئے تھے سارے درویش اور جنگل میں ایسی خاموشی تھی کہ پتا بھی گرے تو شور برپا ہووے۔ ڈاڑھیاں بڑھ آئی تھیں ان درویشوں کی اور بال ہوگئے تھے ایسے جیسے افریقا کے جنگلات ہوں...... اور رات بھی کہ نام نہیں لے رہی تھی گزرنے کا اور ایسے میں بلند کیا ایک درویش نے نعرۂ ہو اور لگا رونے کچھ اس انداز سے کہ اجنا کے دل بھی دہل جاویں۔

''اے بدنصیب اس طرح رو کر کیوں برباد کررہا ہے اپنی انرجی۔'' کہا ایک درویش نے۔

''صاحبو! یاد آرہی ہے مجھے وہ زندگی کہ جو بسر کی میں نے قرض کی چھاؤں میں۔'' گویا ہوا درویش۔ اگرچہ ابھی بھی وہ روتے روتے بیزار کیے دے رہا تھا دوسروں کو۔

''بہت خوب۔'' گردن ہلائی ایک سینئر درویش نے۔

''اغلب ہے کہ تیری داستان میں حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔''

''ہاں۔'' سانس لی اس رونے والے نے کہ اس کی سانسیں بھی بھرائی ہوئی تھیں۔ ''دوستو! میں ہوں ایسا کم عقل اور بدنصیب کہ نہ ہووے گا دوسرا کوئی ایسا کہ جس کے ساتھ ایسی افتاد گزری ہو۔''

''ہم تیری داستان سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں۔'' کہا درویشوں نے۔

''صاحبو! میں اپنی حکایت وہاں سے ابتدا کروں گا جہاں سے زندگی شروع ہوئی ہے اجیرن ہونی۔'' کہا اس درویش نے۔ ''جو سنی حکایت بھی تو درمیان سے سنی۔ نہ انتہا کی خبر ہے نہ ابتدا معلوم۔''

''ہوا یہ کہ میں قرض لینے میں نہیں رکھتا تھا اپنا جواب۔ میری حکمت عملی ہی ایسی تھی کہ جس سے بھی قرض کی بات کی اس نے اپنا کلیجا نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ایک محبوبہ دلنواز تھی میری کہ اس کے سارے لوازمات پورے کیا کرتا اس قرض سے اور وہ سمجھتی کہ میں کوئی جاگیردار یا نواب ہوں کہ دولت میرے اوپر برستی ہے۔

''اس نے ایک دن فرمائش کی کہ مجھے ایک ٹی وی چاہیے۔ صاحبو! یہ ٹی وی بھی کیا بلا ہے کہ سچ ہے اس کے آگے جام جمشید بھی اور دکھاتا ہے مناظر رنگارنگ اور جلوے ہزار اور اس محبوبہ دلنواز نے جس ٹی وی کی فرمائش کی، قیمت اس کی تھی ہزاروں میں۔ تو صاحبو! یہ تو کھیل تھا میرے دائیں ہاتھ کا۔''

''نامعقول۔'' بلبلایا ایک درویش۔ ''محاورہ ہے بائیں ہاتھ کا۔''

''اس وقت بائیں ہاتھ پر لگی ہوئی تھی چوٹ اور بندھی ہوئی تھی پٹی اس لیے دائیں ہاتھ کہہ رہا ہوں۔'' سمجھایا حکایت سنانے والے درویش نے۔ ''خیر۔ تو میں پہنچ گیا ایک دکاندار کے پاس کہ جس کے یہاں سامان بھرا تھا اوپر سے نیچے اور آمدن تھی ہزاروں میں۔ اور وہ بھی مجھے رئیسِ اول گردانتا تھا۔ مؤدب ہوا مجھے دیکھ کر اور لگا خوشامدیں کرنے کہ اس کے تئیں آج اس کی دکان کی تقدیر بدلنے جا رہی تھی۔ مجھے ضرورت ہے سامان کی کہ قیمت جن کی پچاس ہزار سے کم نہ ہو۔'' میں نے ایک شان کے ساتھ حکم دیا۔

''سرکار! یہ پوری دکان آپ ہی کی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ جو چاہیں لے جائیں۔''

''غرضیکہ میں نے اس کی دکان کے سامان سے بھر دی سوزوکی اور پہنچا دیا وہ سارا سامان ایک ایسی دکان پر کہ جو کچھ فاصلے پر تھی اور جس سے معاملات طے ہو چکے تھے اور وہ سب کچھ میں نے فروخت کر دیا۔ کُل چالیس ہزار میں۔''

''یہ کون سی عقل مندی ہوئی۔'' ایک درویش نے کہا۔ ''پچاس کی چیزیں تو نے چالیس میں بیچ دیں۔''

''بھائیو! وہ پچاس اس دکاندار کو کون دینے جا رہا تھا۔'' مسکرایا وہ درویش اتنا کہہ کر اور سب اس کی فطانت پر اش اش کر اٹھے۔ ''بھائیو! وہ سامان میں نے حوالے کیا اس دکاندار کے اور چالیس ہزار لے کر پہنچ گیا ایک بڑی دکان پر کہ جہاں ٹی وی فروخت ہوتا تھا اور خریدا پچیس ہزار کا ٹی وی اپنی محبوبہ دلنواز کے لیے کہ جس کے حسن کا کوئی ثانی نہیں تھا اس پورے علاقے میں۔ جہاں وہ کرائے کے مکان میں اپنے ماں باپ اور گیارہ عدد بہن بھائیوں کے ہمراہ رہا کرتی تھی۔''

''اے ناہنجار درویش! اگر تو فنکار تھا اتنا ہی بڑا تو پھر تو نے ٹی وی کیوں ادھار نہیں لیا؟'' پوچھا ایک درویش نے۔

''اس کی دو وجوہات تھیں۔'' کہا اس درویش نے۔

''پہلی یہ کہ ٹی وی والا دکاندار آشنا نہ تھا میرا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کی دکان میں کام کیا کرتے ایسے پہلوان قسم کے لوگ جو ادھیڑ دیا کرتے ذرا سی دیر میں دوسروں کو اور تباہ کر دیتے۔ بس یہ خوف مانع رہا۔ اس لیے پرہیز کیا میں نے اس کی دکان سے ادھار کرنے میں۔

''اور جب میں نے پیش کیا وہ تحفہ اپنی محبوبہ دلنواز کو تو اس کی خوشیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ اس طرح چہک اٹھی جیسے پرندے چہک اٹھتے ہیں بادلوں کو دیکھ کر اور گاتے ہیں ایسے ترانے جن میں کیف و مستی شامل ہوتی ہے۔ تو صاحبو! اب فکر یہ لاحق ہوئی کہ وہ پچاس ہزار کیسے ادا کیے جاویں کہ دکانداروں کی مدت کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ نہیں کرتے لحاظ کسی بھی شریف شخص کا اور کر دیتے ہیں بھرے بازار میں اس کی بے عزتی۔

''محبوبہ تو خوش تھی لیکن میں غمگین تھا کہ اب یہ فکر لاحق ہوگئی تھی۔ بہرحال اس کا مداوا کچھ دنوں کے بعد ہی ہوگیا۔ میں نے ایک زمین کے جھانسے دیے ایک ایسے آدمی کو کہ جس کا شوق ہی یہی تھا کہ زمین خریدو چاہے جہاں پر چاہو۔

''صاحبو! اس آدمی کا کاروبار بھی ایسا تھا کہ شرم آوے شیطان کو بھی اس کے کارناموں پر اور ملامت کریں فرشتے اس پر اور گالیاں دیویں شریف لوگ۔ اس نے پورے شہر کے قبرستانوں میں قبریں خرید رکھی تھیں اور جب کسی کو ضرورت ہوتی تو اپنا کمیشن رکھ کر مہنگے داموں قبریں فروخت کر دیتا۔ اس کے کارندے بیٹھے رہتے تھے قبرستان کے گیٹ پر۔''

''توبہ، توبہ......'' درویشوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔ ''یہ تو بڑا ستم اور ظلم ہے۔''

''ہاں بھائیو! لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔'' کہا اس درویش نے۔ ''تو میں نے اس کو زمین کا جھانسا دیا اور اس

سے اینٹھ لیے لاکھ روپے کہ پچاس جن میں سے دکاندار کو ادا کرنے تھے اور پہنچ گیا اپنی رئیسانہ شان کے ساتھ دکاندار کے پاس اور رکھ دیے اس کے سامنے پچاس ہزار کے نوٹ کہ جن کو دیکھ کر وہ میرے ہاتھ چومنے لگا تھا۔''

''اے ناہنجار! پھر اس کا کیا ہوا جس کا لاکھ لیا تھا؟'' پوچھا ایک درویش نے۔

''اس کا لاکھ میں نے کسی اور سے لے کر اس کے حوالے کیا تھا۔'' بتایا اس نے۔

''لعنت ہو تجھ پر کہ تیری داستان میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ہم درویشوں کو خوش کر سکے۔ یہ تو ادھار لینے اور دینے کی کہانی تھی۔ اس میں کہاں ہے پوشیدہ دلچسپیاں؟''

''وہ دلچسپیاں تو اب شروع ہوتی ہیں بھائیو۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میری اصل داستان اپنا آغاز چاہتی ہے۔ جب میں نے منصوبہ بنایا ایک بینک میں ڈاکا ڈالنے کا۔''

''کیا؟'' اب سب ہی درویش متوجہ ہو گئے تھے اس کی جانب۔ ''بینک میں ڈاکا؟''

''ہاں بھائیو! اور وہ بھی اس وقت جب تمام قرض خواہوں نے ایک دن مجھے گھیر لیا تھا۔ ساٹھ ستر کی تعداد تھی ان کی اور یوں لگتا تھا میرے گھر کے باہر جیسے کوئی جلسہ برپا ہو رہا ہو۔ نہ جانے کیسی وبا پھیلی تھی کہ سب کے سب ایک ساتھ قرض وصول کرنے آدھمکے تھے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ کیا حال ہو رہا ہوگا میرا۔ اس لیے میں نے ان سب کے سامنے ایک تقریر کی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ یہ دنیا فانی ہے اور کسی کو یہاں نہیں رہنا ہے۔ ہر ایک کو اپنا حساب دے کر جانا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنا حساب دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑوں گا اس دنیا کو کہ قیامت کا حساب اس سے سخت ہوگا اور نہ کام آوے گی کوئی سفارش کہ وہی روزِ آخر ہے لیکن نہ سنی کسی نے اور کرتے رہے تقاضا پھر میں نے مہلت لی ان سے ایک ہفتے کی کہ میں ایک ہفتے کے بعد سب کا حساب بے باق کر دوں گا کہ خوفِ خدا میرے دل میں ہے۔''

''کہاں سے ادا ہوتی یہ رقم؟'' سوال کیا کسی نے۔

''میرا ارادہ اس شہر خانہ خراب سے بھاگ جانے کا تھا۔'' بتایا درویش نے۔

''لعنت ہے تجھ پر۔'' ملامت کرنے لگے درویش کہ تو نے بٹا لگایا درویشوں کے نام پر اور تصور کیا ادھار لے کر بھاگ جانے کا۔ درویشوں کی پوری روایت سے بغاوت کی ہے تو نے۔ درویش تو علامت ہوتے ہیں پاکیزگی اور اعلیٰ کردار کے... اور تو ہے کہ اپنی اوچھی حرکتوں کو بیان کر رہا ہے۔

''صاحبو!'' کہا حکایت سنانے والے درویش نے۔ ''ذرا یہ تو دیکھو کہ میری کہانی میں عنصر دلچسپی کا شامل ہونے لگا ہے یا نہیں۔ آگے اور بھی کئی مقامات آہ و فغاں ہیں۔''

''اچھا چل، جاری رکھ اپنی کہانی۔'' حکم دیا ایک ایسے درویش نے کہ جو شاید پیدا ہی درویش ہوا تھا۔

''تو ہوا یہ کہ میں بھاگ بھی نہیں پایا۔'' بتایا درویش نے۔ ''ان کم بختوں نے نگرانی شروع کروادی میری۔ پھیل گئے میرے چاروں طرف۔ جہاں جاتا سائے کی طرح میرے ساتھ ہوتے۔ دو دفعہ ریلوے اسٹیشن سے کھینچ کر واپس لے آئے۔ میرے عزیزو! بڑا ہی مخمصہ تھا میرے ساتھ کہ میں پھنس گیا تھا بری طرح اور میری ساری ہوشیاری ہوا ہو گئی تھی۔ بھول گیا تھا اپنی ساری عقل مندی۔

''اور میں اس الجھن میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا کہ جہاں کے گل بوٹے اپنی بہاریں دکھا رہے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی۔ طیور نغمہ سرا تھے اور سبزے کی طراوت آنکھوں کو سکون پہنچا رہی تھی لیکن اے دوستو! جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں اس وقت یہ دنیا ہوتی ہے۔ اس وقت یہ کنکر ہیرا ہے۔ اس وقت یہ شبنم موتی ہے۔ تو میری جیب تو خالی تھی۔ اگر وہ محبوبہ دلنواز بھی سامنے ہوتی میرے تو ہرگز توجہ نہ کرتا اس کی طرف۔ اتنے میں ایک مرد آوارہ وعیار صفت میرے پاس آ کر بیٹھ گیا کہ زبان اس کی عجیب اور لہجہ اس کا غریب تھا...... ''کیا بات ہے بھئی۔'' اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''تھوبڑے پر پھٹکار کیوں برس ریلا ہے۔''

''میرے عزیز! پہلے تو یہ بتا کہ تھوبڑا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس پر اس نے بتایا کہ تھوبڑا چہرے کو کہتے ہیں اور یہ عوامی زبان ہے۔ میں سن کر بہت ملول ہوا کہ عوامی زبان بھی کیسی ہوگئی ہے پھر پوچھا اس مرد آوارہ نے۔ ''بھائی کچھ پریشانی دکھیلا ہے۔ بتا میرے کو شاید کوئی کام آسکوں۔''

''اے عزیزو! ایسے میں ذرا سا سہارا بھی بہت ہوا کرتا ہے۔ میں نے اس کو اپنا ہمدرد جانا اور سنا دی اپنی ساری کہانی۔ جس پر وہ بہت دیر تک اس طرح ہنستا رہا جیسے اس کے سارے بریک ناکارہ ہو گئے ہوں۔ پھر چپ ہو کر بولا۔ ''اوئے، خانہ خراب! اگر ہم تیرے کو ایک راستہ بتا دے تو اپن کا کمیشن کیا ہوگا۔''

''میرے عزیز! پہلے راستہ تو بتا۔ بتا کوئی صورت اس جنجال سے نکل آنے کی۔

اس پر اس نے بینک ڈکیتی کا منصوبہ بتایا۔ میرا یہ حال تھا کہ اس نادر منصوبے کو سن کر خطا ہو گئے تھے میرے اوسان اور دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں دل کی پھر میں نے کہا۔ ”اے منحوس صورت انسان۔ ایسا کبھی نہیں ہووے گا۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“

”تو پھر مار کھا لوگوں سے۔“ کہا اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ۔ ”تیرے کو ایک ترکیب بتا ریلا ہے تو تیرے نخرے نہیں ملتے۔“

”لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔“

”آج کل بہت آسان ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنے بدن سے بم باندھ کر بینک میں گھس جا۔“

”اے عزیزو! اندازہ کر سکتے ہو میری حالت کا۔ جب اس نے دیا ہوگا مشورہ بم باندھ کر بینک میں گھس جانے کا۔ بم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جس کے ذکر سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں ہاتھ پاؤں اور موت آ جاتی ہے نگاہوں کے سامنے۔ میں نے انکار کر دیا۔“

جس پر وہ ہنسنے لگا۔ ”میرے کو معلوم تھا خانہ خراب کہ تو بزدل انسان ہے۔ تو صرف رو سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”بس میرے عزیزو! اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے اعصاب کھول اٹھے۔ آباؤاجداد میں سے کسی نے نہ برداشت کیا ہوگا طعنہ بزدلی کا۔ کہ یہ ایک دھبا ہے میرے خاندان کے نام پر۔ لہٰذا تاؤ کھا کر میں فوراً تیار ہو گیا۔“

اتنا سنا کر وہ درویش اپنی کہانی میں تجسس پیدا کرنے کی غرض سے قصداً خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے پیدا کر دی تھی اپنی کہانی میں ایک دلچسپی۔ اس لیے سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے چپ سادھ لی تھی۔ بالآخر پھٹ پڑا ایک درویش۔ ”اونا ہنجار! آگے کیوں نہیں بتاتا۔ تیرے جسم کو کیڑے کھائیں۔ خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے تو نے۔ بتا آگے کیا ہوا؟“

مسکرایا وہ درویش ایسی مسکراہٹ جو فاتحانہ ہوا کرتی ہے۔ پھر گویا ہوا۔ ”بھائیو! میں نے مان لی اس بندے کی بات اور تیار ہو گیا بم باندھ کر بینک میں داخل ہونے کے لیے کہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ قرض خواہوں نے جان عذاب کر دی تھی میری اور خوشیاں پلٹ گئی تھیں میرے دروازے سے۔ پھر یہ ہوا کہ دو دنوں کی تربیت لینی پڑی مجھے۔“

”کس بات کی تربیت؟“

”یہی کہ باندھا جاتا ہے کس طرح بم کو اپنے جسم کے ساتھ اور کس طرح دھمکی دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ مراحل طے ہو گئے تو ایک رات دھاوا بول دیا قرض خواہوں نے کہ تعداد جن کی ساٹھ ستر کے قریب تھی اور وہ سب کے سب انتہائی کمینہ صفت لوگ تھے۔ لیکن اس وقت چونکہ میں کر چکا تھا ارادہ بالکل پختہ اس لیے کوئی غم نہ تھا مجھے اور میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اے مرگی زدہ لوگو! خوش ہو جاؤ کہ کل صبح تمہارے لیے شادمانی اور کامرانی لی ہے۔ کیونکہ میں چکا رہا ہوں سب کے قرضے کہ مجھے آگے قیامت میں بھی جواب دینا ہے۔“

”اے مفلس انسان! کہاں سے لائے گا اتنے پیسے کہ ہم سب کو فارغ کر سکے۔“

”یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ تم آم کھاؤ پیڑ مت گنو۔“

”نہیں، ہم تو پیڑ بھی گنیں گے کیونکہ تجھ پر کوئی بھروسا نہیں رہا۔“ سب نے کہا۔

پھر میں نے بتا دیا اپنے اس منصوبے کے بارے میں کہ جس کا تعلق ایک بم سے تھا اور وہ بم باندھنا تھا مجھے اپنے بدن سے۔ حیران ہوئے وہ سب کے سب یہ سن کر۔ پھر گویا ہوا ان میں سے ایک گرگِ باراں دیدہ۔ ”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تو کدھر سے پیسے لاتا ہے۔ تو اپنے بدن سے توپ باندھتا ہے یا بم باندھتا ہے، ہمیں تو اپنی رقم چاہیے۔“

سب نے تائید کی اس کی پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم بھی تیرے ساتھ ہی بینک چلیں گے۔“

”صاحبو! ہوش کے ناخن لو۔“ میں پریشان ہو گیا تھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ اب کیا میں پورا جلوس لے کر بینک میں ڈاکا ڈالنے جاؤں گا؟“

”لیکن پھر انہوں نے خود کہا اور صلاح ہوئی کہ وہ اندر نہیں جائیں گے بلکہ باہر رہیں گے بینک سے اور جب میں بینک سے کامیاب اور شادکام دولت لیے باہر آؤں گا تو سب کو وہیں تقسیم کر دوں گا۔ حق بہ حقدار رسید۔

”اب امتحان تھا اس موالی کا جس نے رائے دی تھی مجھے... اور بات کر لی تھی اپنے کمیشن کی اور بم لانے اور باندھنے کی ذمے داری بھی اس کی تھی۔ اور جو ایسی زبان میں باتیں کرتا جو نہ سنی ہوں گی کبھی میں نے۔ تو اے درویشو! رات دس بجے وہ لے آیا ایک چھوٹا سا بم کہ جو دیکھنے میں سیب کے موافق تھا لیکن چھپی ہوئی تھی اس میں ایسی تباہی کہ جو تباہ کر دیتی اس بینک کو۔“

اس موقع پر دخل دیا ایک درویش نے۔ ”اے مردِ

نادان! جب بینک ہی اڑ جاتا تو پھر تیرا وجود کدھر جاتا؟''

''اے درویشو! تم نہیں جانتے کہ جو موت قرض خواہوں کے ہاتھوں آئے، وہ بم کی موت سے کئی گنا بھیانک ہوا کرتی ہے۔'' یوں کہا اس درویش نے۔

اس پر صاد کیا سب نے اور سنتے رہے اس کی داستان۔

''اے عزیزو! اس کے بعد میں نے ایک پرچہ تحریر کیا جس پر لکھا تھا...... میرے عزیز! میں نے اپنے بدنِ خاک پر ایک مہلک بم باندھ رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس تھیلے میں نوٹ بھر دو۔ ورنہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ میں یہ بم اڑا کر تم سب کو عالمِ بالا کی سیر کرا دوں گا۔''

''اور یہ خط کس لیے تحریر کیا؟''

''دینے کے لیے اس آدمی کو جو نوٹ گنا کرتا ہے اور بینک کی زبان میں جسے کیشیئر کہا جاتا ہے۔'' بتایا اس درویش نے جو اپنی حکایت سنائے جا رہا تھا۔ ''تو مختصر یہ کہ میں روانہ ہو گیا دوسری صبح بینک کی جانب۔ اس شان سے کہ کیا کوئی دُلہا کی سواری بھی گئی ہوگی کہ میرے ساتھ ساتھ ساٹھ ستر قرض خواہ چل رہے تھے اور ان سبھوں کو یہ امید تھی کہ کامرانی مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

''بہر حال میں پہنچ گیا اس بینک میں کہ جس کی نشاندہی اس مردِ آوارہ ولوفر نے کر دی تھی اور پھیل گئے بینک سے باہر میرے قرض خواہ اور میں تھیلا اٹھائے داخل ہو گیا بینک میں۔

''اب بینک کی صورتِ حال سن لو۔ اس میں کئی لوگ تھے۔ ایک سے ایک صحت مند اور جوان لیکن جو کیشیئر تھا، وہ ایک مدقوق سا آدمی تھا کہ جو صدیوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے داد دی دل ہی دل میں اس مردِ آوارہ ولوفر کو کہ جس نے ایسے بینک کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھ کی پرچی اس کیشیئر کو پکڑا دی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت بینک میں عملے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

''اس کیشیئر نے ڈالی ایک نگاہ اس پرچی پر اور مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پرچی دکھاتے ہوئے گویا ہوا۔ ''اے میرے عزیز! تجھے بدنِ خاکی نہیں لکھنا تھا۔ یہ ترکیب غلط ہے۔''

میں غصے سے بے حال ہو گیا تھا۔ اتنی مشکل سے میں نے صحیح ترکیب کا انتخاب کیا تھا اور وہ اسے غلط قرار دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہوش کے ناخن لو۔ یہ بالکل درست ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی شاعر ہوں اور جانتا ہوں کہ صوتی لحاظ سے کون سی ترکیب بہتر ہوتی ہے۔''

''اے خبیث انسان۔'' میں چڑ کر بولا۔ ''میں اس بینک میں ڈاکا ڈالنے آیا ہوں۔ تجھ سے اردو ادب پر بحث کرنے نہیں آیا۔''

''لیکن میں بھی دوسرے مزاج کا انسان ہوں۔ زبان کی غلطی نہیں ہوتی ہے برداشت مجھ سے۔ بدنِ خاکی کو جسمِ خاکی لکھ کر لاؤ۔''

''اس دوران بینک کا منیجر بھی وہاں آنکلا۔ اس نابنجار نے وہ پرچی اس کو بھی پکڑا دی۔ اس نے بھی وہی اعتراض کیا جو کیشیئر نے کیا تھا۔ میں تو عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ ڈاکا ڈالنے والے کو اس بات سے کیا غرض ہوتی ہے کہ بدنِ خاکی اور جسمِ خاکی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

''ایسا تماشا میں نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ ذرا سی دیر میں پورا اسٹاف اسی معاملے پر بحث کیے جا رہا تھا۔ سب کے سب جمع ہو گئے تھے۔ میری طرف کسی کی توجہ ہی نہیں تھی۔

''انتہا یہ تھی کہ بینک میں آنے والے کسٹمر بھی اس بحث میں شامل ہو گئے تھے۔ بلکہ ایک ستم ظریف برابر والی دکان سے فرہنگِ آصفیہ بھی اٹھا لایا تھا اور اس میں ایسی ترکیب تلاش کی جا رہی تھی۔

''اے صاحبو! میں تو اپنا سر پیٹ رہا تھا۔ اس دوران کچھ پولیس والے بھی آ گئے۔ وہ پرچی انہیں بھی دکھا دی گئی اور وہ بھی زبان کی اس بحث میں برابر کے شریک ہو گئے۔ اب خود سوچو میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ میں وہاں سے بھاگ نکلوں...... اور میں ان... کم بختوں کو آپس میں الجھا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

''بینک کے باہر میرے قرض خواہ موجود تھے۔ انہوں نے میرا تعاقب شروع کر دیا اور میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ راستے میں اس بم کو بھی اپنے بدنِ خاکی یا جسمِ خاکی سے الگ کر کے ایک طرف پھینک دیا اور اس جنگل کی طرف آ گیا اور تم درویشوں کو اپنی داستان سنا دی ہے۔''

''اے مردِ ناداں! تیری اس داستان میں نصیحت کا کون سا پہلو ہے؟''

''نصیحت کا یہی پہلو تو ہے کہ جب تک بدن خاکی اور جسم خاکی کا فرق نہ معلوم ہو۔ کسی بینک میں ڈاکے کی کوشش مت کرنا۔''

صاد کیا اس بات پر سارے درویشوں نے اور اس جنگل پر ایک بار پھر ایک طویل خاموشی اتر آئی۔

دوسرا حصہ

باغی

محمد طاہر عمیر

ضد ہو یا بغاوت... ہمیشہ غیر متوقع حالات اور نظریات کے خلاف جنم لیتی ہے۔ جہاں بے اصولی کا راج ہو وہاں بغاوت جنگ کرتی ہے اور جنگی صورت حال میں پھول نہیں بٹتے بلکہ زخم لگتے ہیں... کبھی اپنوں کو اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی دشمن کو دشمن کے ہاتھوں مگر... مشترکہ مفاد دشمن کو بھی دوست بنا کر خونی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے... جس طرح وہ باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مقابل اپنے حصے کا کردار ادا کررہے تھے... وہ جو معاشرتی ناسوروں کا علاج کرنے نکلا تھا جب جانے پہچانے رستوں پر چلتے چلتے اپنے ہی پیروں کے آبلوں کو دیکھا تو روح تک زخمی ہوگئی اور پھر اندر کی وحشتوں نے اسے باغی بناکر اپنوں کی نظروں میں ہی مجرم ٹھہرادیا جبکہ دوسری جانب اس کا دل اس نازک اندام حسینہ کی اداؤں پر اس طرح آیا کہ اس کے کردار کی کالک اس کی گھنی زلفوں میں مدغم ہوکر رہ گئی مگر... کب تک ... پھر وقت کا وار ایسا چلا کہ ہر رنگ اپنی الگ شناخت کرا گیا۔

عشق کی جنوں خیزیوں میں پیار بھرے رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کتھا

آشتی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونک گئی۔ ”تم....“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کراہ کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ بھی زخمی تھے۔

”بولنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے لیکن میرے ہاتھ سے بنی دودھ ڈبل روٹی شاید تمہیں دوبارہ نہ مل سکے۔“ میں نے شانوں سے پکڑ کر اسے بٹھایا اور پیچھے ایک تکیہ اور رکھ دیا۔ میرے ہاتھوں سے چمچ کے ذریعے دودھ ڈبل روٹی کھاتے ہوئے وہ عجیب سے انداز سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ناشتا کروا چکنے کے بعد میں نے اسے پین کلر گولیاں... دیں، انجکشن لگایا اور بازو کی پٹی پھر سے بدل دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور واپس اس کے قریب آ بیٹھا۔

”میں جانتا ہوں تم اس وقت کس حیرانی سے گزر رہی ہو۔ مختصر طور پر اتنا بتا دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے۔ کل شب میں تمہیں وہاں سے نکال لایا ہوں۔ کیوں نکالا...؟ اس کے جواب میں بس اتنا کہہ دیتا ہوں کہ اگر تمہارے دشمنوں کو تمہاری جان چاہیے تو مجھے تمہاری زندگی چاہیے۔“

وہ بنا پلکیں جھپکائے مجھے دیکھتی رہی۔ ”جانتی ہو مجھے تمہاری زندگی کیوں چاہیے...؟ کیونکہ مجھے تمہیں... تمہاری امانت لوٹانی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مم... میرا لباس کیسے بدل گیا؟“ اس نے جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ نحیف آواز میں پوچھا۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اسے بتا دیا۔

”جس بندے کا یہ گھر ہے۔ اس کی بیوی نے تمہارا لباس بھی بدلا ہے۔ یہ اسی کا لباس ہے۔ ویسے وہ دونوں میاں بیوی اس گھر کے پاس میں ہی ایک اور گھر میں رہتے ہیں۔“

”تم... جانتے ہو۔ میرے دشمن کون لوگ ہیں۔ جن لوگوں نے میری یہ حالت کی ہے وہ...“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں، میں جانتا ہوں اور میں تو ٹرین میں ہی جان گیا تھا۔ وہ کن کٹا ماکھا چودھری حشمت علی کا خاص بندہ ہے۔“

”اور تم...؟“

”میں... میں چودھری حشمت علی کا بیٹا ہوں۔ مجھے پیار سے وہ ”باغی پتر“ بلاتے ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”خیر۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ تم پر تو میرے کئی سوال ادھار ہیں۔ لیکن سوالات سے معاملہ صاف نہیں ہوگا۔ بہتر ہے تم مجھے اپنی ساری کہانی سناؤ۔ شروع سے۔“ میری بات سن کر وہ پھر سے خاموش سی ہو گئی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں تم سے کسی بھی جواب کے عوض وہ سلوک نہیں کروں گا جو تمہارے دشمنوں نے کیا۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں تب بتا دینا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”مجھے تم پر اعتبار ہے۔ لیکن میرے جواب تمہیں تکلیف دیں گے۔“ اس نے کہا۔

”یہ بات میں پہلے سے ہی جانتا ہوں۔“ ایک توقف کے بعد اس نے اپنی کہانی شروع کی۔

”ہمارا گھر پاکپتن کے ایک چھوٹے سے محلے میں تھا ہم پانچ بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں ہے۔ باپ جسے نشے کی حالت میں اپنی بیٹیوں کے نام تک یاد نہیں رہتے اور ماں جس کی کمر دوسروں کے گھروں میں جھاڑو دیتے دیتے کمان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس معاشرے میں ہر ناجائز کام برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن غربت ایک ایسا جرم ہے جسے کوئی برداشت نہیں کرتا اور پھر اگر اس جرم میں حسن بھی شامل ہو جائے تو اس کی خیر نہیں رہتی۔ میری آپا نعیمہ ہم سب سے بڑی اور ہم سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ حالات نے چھوٹی عمر میں ہی انہیں ہماری دوسری ماں کا رتبہ دلا دیا تھا۔ گھر میں سلائیاں کر کے انہوں نے ہم سب کو بڑی محنت سے پالا۔ خاص طور پر میں جو کہ سب سے چھوٹی تھی اور مجھے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلانے کا بیڑا اٹھایا اور میں کالج تک جا پہنچی۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ تعلیمی درس گاہیں بھی منشیات جیسی لعنت سے محفوظ نہیں ہیں۔ ایک پورا نیٹ ورک تھا جو اس کام میں ملوث تھا اور یہ سب جاننے کے باوجود کوئی ان کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ فیصل کالج کا ایک ایسا طالب علم تھا جو کہ لڑائی جھگڑے میں پیش پیش رہتا تھا۔ وہ منشیات فروشی میں بھی ملوث تھا لیکن اس میں ایک بہت اچھی بات تھی، وہ کالج کی لڑکیوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ادب سے پیش آتا اور کسی بھی مسئلے کی صورت میں ان کی مدد کرتا۔ حالات نے مجھے بھی اس کی مدد لینے پر مجبور کر دیا۔ ایک رات ابا نے اماں سے کہا کہ بہت جلد ہمارے علاقے کا ایک بدمعاش آدمی ”جعفری“ آپا نعیمہ کی برات لے کر آ رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ خبر قیامت سے کم نہیں تھی لیکن ابا کے مدہوش کانوں میں ہمارے رونے چلانے کی آوازیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اگلے دن اماں نے محلے کے کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے مدد کی

درخواست کی لیکن سبھی جعفری نامی اس بدمعاش کے ڈر سے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ نعیمہ آپا تو جیسے سکتے میں چلی گئی تھیں۔ ان کی نظریں ٹکٹکی باندھے آسمان کو تکتی رہتیں۔

ہمیں پتا چلا کہ ابا نے نعیمہ آپا کو جوئے میں ہار دیا تھا۔ میری پریشانی کو کالج میں میری بہترین دوست عارفہ نے محسوس کیا اور سب کچھ سن کر اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فیصل سے مدد لوں۔ میں اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ لیکن وہ کہے جا رہی تھی۔

''جس طرح سانپ کے کاٹے کا علاج سانپ کا زہر ہی ہوتا ہے، ایسے ہی ان غنڈے بدمعاش لوگوں کو صرف ان جیسے لوگ ہی روک سکتے ہیں۔ ویسے بھی بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ منع ہی کرے گا۔''

''میں اس کی بات مان گئی اور یوں میں نے فیصل سے مدد طلب کرلی۔ اس نے مجھ سے صرف ایک سوال کیا کہ برات کس تاریخ کو آئے گی۔ میں نے بتادیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں بے فکر ہو جاؤں۔ جعفری سے وہ خود ہی نمٹ لے گا۔ میں واپس تو آ گئی لیکن دل مطمئن نہیں تھا۔ اسی دوپہر کو میں نے اور اماں نے پلان بنایا کہ ہم سب رات کے اندھیرے میں اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے لیکن شام تک جعفری کے دو مشٹنڈے ہمارے دروازے کی چوکھٹ پر پہرے دار بن کر جم چکے تھے۔

ہماری تمام تر دعاؤں کے باوجود دن گزرتے گئے۔ برات جمعرات کو آنی تھی، صرف ایک دن قبل میں کالج میں پھر سے فیصل سے ملی۔ اس کے تسلی بھرے بول سن کر میں واپس پلٹی تو اس نے مجھے پکارا، میں پلٹی تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ فیصل کے ہاتھ میں ایک سیاہ پستول تھا۔

''اسے لے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ ضرورت پڑ جائے۔'' اس نے کہا۔

''مم... میں اسے کیسے... لے جاؤں۔ مجھے یہ چلانا نہیں آتا۔''

''جب سر پر پڑتی ہے تو یہ خود بخود چلنے لگتی ہے۔ ویسے بھی اسے چلانے کے لیے کوئی کورس نہیں کرنا پڑتا۔ ادھر دیکھو...... اسے یوں دونوں ہاتھوں سے پکڑنا ہے۔ یہ سیفٹی کیچ ہٹادینا ہے اور پھر یہ ٹریگر دبادینا ہے۔'' میں پریشانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

''گھبراؤ نہیں۔ یہ میں صرف تسلی کے لیے دے رہا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے پستول خود ہی میرے کندھے سے لٹکے بیگ میں ڈال دیا۔ اس رات جعفری پہلی بار ہمارے گھر آیا۔ بھاری بھرکم سیاہ وجود سفید لٹھے میں تھل تھل کرتا ہوا اچل رہا تھا۔ ناک تلے اتنی گھنی مونچھیں تھیں کہ ہونٹ نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے ساتھ درجن بھر عورتیں تھیں۔ ابا ان کی راہ میں بچھے جارہے تھے۔ بنی سنوری عورتوں نے آپا نعیمہ کو زبردستی قریب بٹھا کر جانے کون سی رسمیں شروع کردیں۔ اماں اور ہم سب ایک کونے میں کھڑے اپنی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

''تو ادھر اتنی دور کیوں بیٹھا ہے۔ اپنی دوہٹی کے پاس آ کر بیٹھ.. اور شگن کی انگوٹھی بھی نکال۔'' ایک بڑی عمر کی عورت نے جعفری سے کہا تو وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا آپا کی طرف بڑھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب آپا کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سر کی چادر اور گود میں رکھا سامان نیچے جا گرا۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں سبزی کاٹنے والی چھری تھی۔

''خبردار کوئی میرے قریب آیا تو جان سے ماردوں گی۔'' آپا چلا کر بولیں تو بڑھتے ہوئے جعفری کے قدم رک گئے۔ بڑی عمر والی عورت اٹھ کر چیخی۔

''زبان سنبھال کر بات کر کڑیے۔ اب تو ہماری ہونے والی... بہو ہے۔'' آپا کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور اس عورت کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کی گونج بہت دیر تک آتی رہی۔

''بند کرو یہ ڈراما اور دفع ہو جاؤ تم سب۔ میری مرضی کے خلاف مجھے کوئی نہیں لے جاسکتا۔'' وہ چلا رہی تھی۔ عین اسی لمحے جعفری نے آپا کا چھری والا ہاتھ پکڑلیا اور اسے اس طرح مروڑا کہ چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

''سوچا تھا تجھے شرافت سے بیاہ کر لے جاؤں۔ پر لگتا ہے تجھے شرافت راس نہیں ہے۔ اب نہ نکاح ہوگا نہ برات آئے گی۔ تیری ڈولی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ جائے گی۔''

جعفر دہاڑا۔ اماں گڑگڑاتی ہوئی اس کے پاؤں میں جا گری۔ اس منظر کے بعد میری برداشت ختم ہوگئی۔ جانے کیسے میرے ہاتھوں میں موجود پستول سیدھا ہوا... اور کیسے میں نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے نشانہ باندھا۔

''جعفری! تیری دلہن ادھر ہے۔ لے اسے ساتھ لے جا۔'' میں نے بلند آواز میں کہتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ جعفری میرے ہاتھ میں موجود پستول دیکھ کر یوں ساکت ہوا کہ گولی لگنے تک ہل نہ سکا۔ گولی کی آواز بہت بھیانک تھی۔ جعفری

گر چکا تھا اور اس کے ساتھ کی کچھ عورتیں بھاگ گئیں اور کچھ اس کی لاش سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

اماں اور ساری بہنیں مجھ سے لپٹ گئیں اور ہم کتنی ہی دیر اپنی قسمت کو روتے رہے۔ میرے کان پولیس گاڑی کے سائرن کا انتظار کر رہے تھے لیکن اچانک ہی حالات نے نیا موڑ لے لیا۔ فیصل اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ ایک گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ صورتِ حال کا اندازہ ہوتے ہی اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ لیکن فیصل اماں کو سمجھانے لگا، وہ کہہ رہا تھا کہ میرا پولیس کو گرفتاری دینا خطرے سے خالی نہیں۔ اماں نے مجھے سمجھا بجھا کر اس کے ساتھ چلے جانے کو کہا۔ وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر ساہیوال کے پوش علاقے کے ایسے گھر میں لے آیا جہاں اس کی ایک آنٹی اور میری ہم عمر لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھے سنبھالا۔ اگلے دن شام کو جا کر فیصل وہاں پہنچا تو مجھے حالات کا اندازہ ہوا۔ پولیس والے اماں اور بہنوں کو تھانے میں لے گئے تھے لیکن یہاں بھی فیصل نے مدد کی اور اپنے اثر رسوخ سے انہیں چھڑا لایا۔ اب پولیس میری تلاش میں تھی۔ دو دن بعد ہی فیصل نے مجھے بتایا کہ پولیس تک فیصل کا نام بھی پہنچ گیا ہے اس لیے میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ اس بار بھی اسی نے میری مدد کی۔ رات کے اندھیرے میں ایک ویگن کے ذریعے مجھے وہاں سے نکالا گیا۔ اب کی بار ایک طویل سفر نے مجھے بہاولپور پہنچا دیا۔ اس کے بعد فیصل سے میرا رابطہ نہیں رہا۔ کچھ دنوں بعد مجھے بتایا گیا کہ فیصل کو پولیس نے شبہے میں گرفتار کر لیا ہے۔

''سیٹلائٹ ٹاؤن کی جس کوٹھی میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا اس میں عورتوں کے حقوق کی ایک این جی او کا دفتر تھا جس کے مالک کا نام رانا ایوب تھا اور اس این جی او کے لیے کام کرنے والی بیشتر لڑکیاں یہیں رہائش پذیر تھیں۔ سارہ ان سب سے سینئر تھی۔ وہ میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ سارہ مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ میں جتنے دن وہاں رہی اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اس نیٹ ورک کا ایک حصہ بن رہی ہوں جس کا تعلق منشیات فروشی سے ہے۔ این جی او تو صرف ایک پردہ ہے۔ لیکن ہمارا رابطہ صرف رانا صاحب سے ہی تھا۔ سارہ نے مجھے مارشل آرٹ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ سکھایا تھا جیسے میک اپ کے ذریعے چہرہ بدل لینا اور ان کے کام سے متعلق کوڈ ورڈ وغیرہ۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے اس گھناؤنے کام کے لیے تیار کر رہے ہیں لیکن میں نے تب تک انکار کرنا مناسب نہ سمجھا جب تک تربیت پوری نہ کر لی۔ میرا خیال تھا کہ اس ''نیم فوجی'' تربیت کے بعد میں سیلف ڈیفنس میں ماہر ہو جاؤں گی اور یہاں سے نکل جاؤں گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک دن میری ملاقات رانا صاحب سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے جعفری قتل کیس میں سے میرا نام نکال دیا ہے۔ دوسری جانب رانا نے میری اماں اور بہنوں کو بھی اپنی تحویل میں لے کر کسی اور شہر منتقل کر دیا تھا اور اب اس کا کہنا تھا کہ میری زندگی اس کی مرہونِ منت ہے اور ایسے ہی گزرے گی جیسے وہ چاہے گا۔ اس نے میرے پر کاٹ کر میرا پنجرہ کھول دیا تھا، میں آزاد ہو کر بھی اڑ نہیں سکتی تھی۔ اس کی بات ماننے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ میں باقی لڑکیوں کے ساتھ کام کرتی رہی پھر میرا ٹرانسفر کر دیا گیا۔ میری ڈیوٹی مراد آباد میں لگا دی گئی۔ یہاں پر میں معروف غیر ملکی چینل کی جانب سے ایک رپورٹر کے طور پر آئی تھی جو کہ سرحد پار کر کے آنے والے جانوروں کی فلم بندی کرتا ہے لیکن درحقیقت یہاں مجھے منشیات کی رقم وصول کرنے کا کام سونپا گیا۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر ایک توقف کے بعد بتانے لگی۔

''تمہیں معلوم ہے یا نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ چودھری حشمت علی اسمگلنگ کا کام بھی کرتے ہیں کیونکہ ایک تو مراد آباد بارڈر ایریا ہے۔ لہٰذا یہاں اسمگلنگ کے کام میں زیادہ رکاوٹ پیش نہیں آتی، دوسری بات جو زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ یہاں ایک ایسا خفیہ راستہ ہے جو سرحد پار جاتا ہے۔ اس راستے کے بارے میں سوائے مخصوص لوگوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس راستے کے ذریعے بنا کسی رکاوٹ کے یہاں کا مال ادھر اور وہاں کا ادھر آتا رہتا ہے۔ ویسے بھی چودھری حشمت علی کے تعلقات دارالخلافہ سے اتنے قریبی ہیں کہ ان کے کسی غیر قانونی کام کو ''غیر قانونی'' ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارے دونوں بھائی بھی اس کام کو پسند نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے خود کو زمینوں تک محدود رکھا ہے۔ چودھری حشمت علی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کیونکہ تمہارا کزن جواد ان کا داہنا ہاتھ بن کر ان کے ہر غیر قانونی کام کو اچھی طرح سنبھال رہا ہے۔ چودھری حشمت صرف قیمتی نوادرات کی اسمگلنگ ہی کرتا ہے۔ جو

انڈیا کے راستے پوری دنیا میں کہیں بھی بیچے جاسکتے ہیں۔اس علاقے میں چودھری حشمت علی کا اثر رسوخ دیکھ کر عالمی مارکیٹ سے منشیات کے اسمگلروں نے چودھری حشمت سے رابطے شروع کیے لیکن چودھری حشمت علی منشیات کے بہت خلاف تھے۔ جب انہوں نے اس کام کی اجازت نہ دی تو ان لوگوں نے دوسرا راستہ نکال لیا۔ ان لوگوں نے چودھری حشمت علی کے چند ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بڑی کامیابی سے اسمگلنگ کیے جانے والے نوادرات میں ہی منشیات کی ایک بھاری کھیپ چھپا کر انڈیا بھیجنے میں کامیاب ہوگئے۔ چودھری حشمت علی کو قطعی معلوم نہیں کہ ان کے نوادرات کی اسمگلنگ کی آڑ میں منشیات بھی اسمگل ہونے لگیں۔ یہ منشیات انہی مجسموں یا آرٹ کے پیسوں کے اندر چھپا کر یا ان کے کارٹن میں رکھ کر بھیجی جاتیں اور ان کی رقم علیحدہ سے موصول ہوجاتی۔ میرا کام منشیات کی رقم وصول کرنا تھا اور یہ طریقہ بہت عجیب تھا۔

''وہ بہت سرسبز اور زرعی علاقہ ہے۔ لہٰذا یہاں جانور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں مراد آباد میں غیر ملکی چینل کی ایک رپورٹر کے طور پر رہتی تھی جو بارڈر پار کر کے آنے والے جانوروں کی فلم بندی کرتا ہے لیکن درحقیقت میں منشیات کی کھیپ کا معاوضہ وصول کرتی تھی جو کہ ہیروں کی شکل میں آتا تھا۔ جب یہاں سے منشیات انڈیا تک پہنچ جاتی تب ہمیں فون کیا جاتا اور وقت مقررہ پر میں ان کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچ جاتی۔ وہ لوگ عموماً کسی ''بھیڑ'' کو استعمال کرتے تھے۔ اس بھیڑ کی گھنی اون میں ہیروں کو چپکا دیا جاتا تھا اور اسے پاکستان کی طرف ہانک دیا جاتا تھا۔ اس بھیڑ پر ایک خاص چپ لگائی جاتی تھی۔ جو ایک انٹینا نما آلے پر سگنل دے کر بھیڑ کی لوکیشن بتادیا کرتی تھی۔ یہ آلہ مجھے پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ میں اس کی مدد سے بھیڑ کو تلاش کرتی اور اس سے ہیرے اور چپ حاصل کرلیتی۔ ہیرے ہمارے باس کے پاس چلے جاتے اور چپ (chip) منشیات کی اگلی کھیپ کے ساتھ ہی واپس انڈیا پہنچ جاتی لیکن پھر ایک دن ایسا واقعہ ہوا کہ منشیات کی اسمگلنگ کا پول کھل گیا۔ چودھری حشمت علی کے خاص بندے ماکھے کو کسی طرح پتا چل گیا کہ نوادرات کی آڑ میں منشیات بھی بھیجی جارہی ہیں۔ اس نے یہ خبر چودھری کو بتائی اور چودھری حشمت علی نے رات کو اس گودام پر چھاپا مارا جہاں سپلائی کا مال رکھا گیا تھا لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے قبل منشیات غائب ہوچکی تھیں۔ چودھری صاحب کو منشیات نہیں ملیں لیکن وہ ماکھے کی بات پر بھی اعتبار کرتے تھے۔ انہوں نے ماکھے کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کرے اور اس تحقیق کے دوران ہی ماکھے کو مجھ پر شک ہوچکا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ ماکھے کو مجھ پر کیسے شک ہوا لیکن اس نے میری خفیہ نگرانی ضرور کروانی شروع کردی۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اینٹی نارکوٹکس نے ایک ریڈ میں ہمارے باس رانا صاحب کو گرفتار کرلیا تھا۔ کیونکہ ہمارا رابطہ صرف رانا صاحب کے ساتھ تھا۔ ان کے بگ باس کا کچھ پتا نہیں تھا اس لیے نیٹ ورک میں ہلچل ہوئی اور میرے جیسے کئی لوگ ان کے چنگل سے نکل گئے۔ میں نے بھی خود کو آزاد تصور کیا لیکن اس ہنگامے میں ایک بات کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ ہماری ایک سپلائی کے عوض ملنے والے ہیرے اس شام کو پہنچ رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر ہی وہ ہیرے حاصل کیے اور پاکستان چلی گئی۔ مجھے اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنا تھا۔ پاکستان میں، میں اپنی ایک دوست کے ہاں ٹھہری تھی، جب مجھے وہاں ایک فون ریسیو ہوا۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ وہ ہمارا بگ باس ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا باس صرف رانا تھا اس لیے میں اب آزاد ہوں تو جواباً اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں آزاد رہ سکتی ہوں لیکن بدلے میں، میں آخری کھیپ کے ہیرے اسے دے دوں۔ میں نے اسے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں ہیرے اس کے حوالے کردوں تو وہ مجھے میرے گھر والوں کا پتا بتا سکتا ہے۔ میں سن رہ گئی اور پھر میں نے فوراً ہی اس سودے کی ہامی بھی بھرلی۔

''اس نے مجھے پاکستان میں ہی ایک جگہ کا پتا دیتے ہوئے کہا کہ میں ہیرے لے کر وہاں پہنچوں۔ جب میں اس کے مطلوبہ مقام پر پہنچی تو میں نے پہلی بار بگ باس کو دیکھا اور اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی کیونکہ میں اسے پہلے سے اچھی طرح جانتی تھی۔ میں ہیروں کے عوض اپنے گھر والوں کا پتا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے دھوکا دیتے ہوئے ہیرے چھیننے کی کوشش کی۔ وہ مجھے بھولی بھالی سمجھ کر ہیرے ہتھیا لینے کی جستجو میں تھا مگر میں اسے دھوکا دے کر نکل گئی اور لاہور پہنچ گئی۔ وہاں میری ایک دوست ہاسٹل میں رہتی تھی۔ مجھے وہاں پہنچے دوسرا دن ہی ہوا تھا جب مجھے ایک اور فون ریسیو ہوا۔ میں بگ باس کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی بھی مجھ سے مصالحت کرسکتا ہے۔ اس بار میں نے اسے بتایا کہ مصالحت کیسے ہوگی۔ پلان کے مطابق بگ باس کی طرف سے ایک بندہ اکیلا مجھے ملے گا اور وہ مجھے

میرے گھر والوں تک پہنچائے گا۔ اس کے بعد میں اسے وہ پتا بتاؤں گی جہاں میں نے ہیرے چھپا رکھے ہیں (کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہیرے میرے ہیئر کلپ میں موجود تھے) چنانچہ میں نے میک اپ کے ذریعے خود کو بدلا اور لاہور سے کراچی جانے والی سپر ایکسپریس میں سوار ہوگئی۔ مگر خرابی قسمت کہ نہ صرف ماکھا اینڈ کمپنی وہاں میرے پیچھے لگ گئی بلکہ انہوں نے مجھے اس بہروپ میں پہچان لیا۔ ادھر گاڑی میں وہ آدمی تو مجھے نہ ملا البتہ تم مل گئے۔ میں نے ہیروں کو محفوظ کرنے کی خاطر انہیں تمہیں تھمایا اور خود وہاں سے نکل گئی۔ پھر اس کے بعد میں تم سے شاہ مراد کے مزار پر ملی لیکن جب تم نے بتایا کہ تم چودھری حشمت علی کے بیٹے ہو تو میں خوفزدہ ہوگئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ ساری رات میں پریشان ہوتی رہی کہ میں نے اتنی بڑی غلطی کیوں کردی کہ وہ ہیرے چودھری حشمت علی کے بیٹے کے سپرد ہی کردیے لیکن پھر سوچا کہ تم کون سا اس معاملے سے واقف ہو لہٰذا اگلے دن میں پرانے رہٹ کی طرف روانہ ہوئی لیکن راستے میں ہی ماکھے کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں پھر سے جان بچانے کے لیے بھاگی لیکن اس بار قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی چلائی ہوئی ایک گولی میرے بازو میں لگی اور میں پکڑی گئی۔ باقی کے حالات تم جانتے ہو اور اب یہاں ہوں تمہارے سامنے۔''

اس نے بات ختم کر کے گہری گہری سانسیں لینا شروع کردیں۔ میں بالکل خاموش بیٹھا اس کی کہانی سنتا رہا۔ اس دوران کھڑکی سے آنے والی دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ اس نے تمام کہانی اس انداز سے سنائی تھی کہ مجھے مزید سوالات کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ ایک اہم بات میں نے ضرور پوچھی۔

''تم نے بگ باس سے متعلق کہا ہے کہ تم اسے جانتی تھیں۔ کون تھا وہ؟''

''تھا نہیں وہ اب بھی ہے۔ بے شک منشیات کا معاملہ تو ختم ہوگیا ہے لیکن وہ ابھی تک یہیں موجود ضرور ہے۔ میں اس کا نام تو بتا سکتی ہوں مگر شاید تم یقین نہ کرو۔''

''اس بات کی فکر نہ کرو کہ میں کس بات پر یقین کروں اور کس بات پر نہیں۔ تم مجھے اس کا نام بتاؤ۔ میں ہر طرح کا انکشاف سہہ سکتا ہوں۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر ایک دم سر اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''اس کا نام نواب شبیر احمد ہے۔'' میں نے جو انکشاف سہنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ مجھے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک جھٹکا سا میرے سارے بدن کو ہلا کر رکھ گیا۔ وہ جو نام لے رہی تھی اس کا میرے وہم و گمان میں بھی گزر نہ تھا۔

''تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں۔ سچ یہ ہے کہ ایک عرصے تک مجھے خود بھی اس بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ تو جب ہمارے نیٹ ورک کا شیرازہ بکھرا تب نواب نے مجھ سے رابطہ کر کے آخری سپلائی کے ہیرے مانگے۔ تب مجھے نواب شبیر احمد کی اصلیت معلوم ہوئی۔''

''نواب صاحب ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ تو...... وہ تو......'' میرے الفاظ ختم ہو رہے تھے کیونکہ میں بچپن سے انہیں جانتا تھا۔ وہ جدی پشتی خاندانی نواب تھے جن کے لیے ان کی انا اور عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ انہوں نے انگریزوں کی غلامی قبول کرنے کے بجائے اپنی ساری زمین اور نوابی چھوڑ دی تھی۔ ایسا شخص جس کے لیے عزت سے بڑھ کر کچھ نہ ہو، وہ ایسا کیوں کرے گا...؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

میں اس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تھک چکی تھی۔ خود میرا دماغ بھی گھن چکر بن چکا تھا۔ میں اسے آرام کا مشورہ دیتے ہوئے باہر صحن میں نکل آیا۔ کھلے میں آ کر میں خود کو سنبھالنے لگا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ہم ابھی تک بخت نگر کے اس چھوٹے سے گھر میں ہی تھے، جواد نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلوں اور میں نے اس ہدایت پر عمل بھی کیا تھا لیکن مجھے آشتی کے زخموں کی فکر تھی میری فرسٹ ایڈ نے اسے وقتی طور پر تو تقویت دی تھی لیکن مکمل علاج ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا چنانچہ تین چار دن پہلے میں نے جواد کے ذریعے ہی ایک ڈاکٹر کو بلوایا تھا جس نے آشتی کے بازو پر لگے زخم کو ٹانکوں کی مدد سے سی دیا تھا اور اس کی تجویز کردہ ادویات سے وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ جواد مجھے ہر طرح سے اپ ڈیٹ کر رہا تھا جس سے مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈیرے میں ہونے والے ہنگامے اور فائرنگ کو نامعلوم ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈلوا دیا گیا تھا۔ البتہ میری اور آشتی کی تلاش جاری تھی۔

''میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں جودی۔ یہ سب کچھ کیا دھرا اس نواب کے بچے کا ہے۔ مجھے ابا جی نے مل کر انہیں سب کچھ بتانا ہوگا۔'' میں نے جواد سے کہا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ ماما جی تمہاری بات پر یقین

کرلیں گے؟ تم اس وقت ان کے لیے سب سے زیادہ بے اعتبار بندے ہو گا می۔ پہلے تم نے ماہی سے رشتہ توڑا۔ پھر ماکھے کی دھلائی کردی۔ اور پھر ان کی قید سے آشتی کو لے بھاگے۔ ان کے بندے زخمی ہو گئے اور تم کہتے ہو کہ تم انہیں بتاؤ گے تو وہ تمہاری بات کا یقین کرلیں گے۔۔؟''

''تو کیا کروں۔ اب کیا باقی کی عمر یہیں اس گھر میں چھپ کر گزار دوں؟'' میں نے جھنجلا کر کہا تو وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''تمہیں بھائی شفیق سے بات کرنی چاہیے بلکہ ٹھہرو تم نہیں، میں ان سے بات کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو ہی بات کرلے۔ میری بات کا تو وہ بھی یقین نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا اور پھر فون بند کردیا۔

''میں اپنی جان بچانے کا شکریہ ادا کروں یا اس بات کی معافی مانگوں کہ میری وجہ سے تم ایسے حالات میں گھر گئے ہو۔'' آشتی اٹھ کر باہر صحن میں ہی آ گئی تھی۔

''شکریہ ادا کرسکتی ہو لیکن ایک کپ چائے بنانے کے بعد...اور معافی بھلے وقتوں کے لیے سنبھال لیتے ہیں۔''

وہ چائے بنا کرلے آئی۔ اس نے صغراں کا پرانا لیکن صاف لباس پہن رکھا تھا جو اسے کافی ڈھیلا تھا۔ سفید دوپٹے کو گلے میں اوڑھ کر بالوں کو جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ پیشانی کا زخم ہلال کی شکل میں موجود تھا۔ لیکن یہ نشان اس کی خوبصورتی میں رکاوٹ نہیں تھا۔ چہرے کی زردی میں اب سرخی دوڑنے لگی تھی۔ کانچ جیسی آنکھوں کا سحر پھر سے عود کر آیا تھا۔

''فرض کرو تمہیں ہیرے مل جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا کرو گی؟''

''مجھے ان ہیروں کا لالچ اپنے لیے نہیں ہے، میں ان کے ذریعے اپنی ماں اور بہنوں کو معاشرے سے تحفظ دلوانا چاہتی ہوں، وہ تحفظ جو آج کل صرف پیسے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بس ایک بار انہیں محفوظ کر جاؤں...پھر اپنے بارے میں سوچوں گی۔ میرے لیے تو زندگی کے سارے معانی ہی بدل چکے ہیں۔ میں ایک ایسی قیدی چڑیا بن گئی ہوں جس کا پنجرہ کھلا ہے، خواہشِ پرواز بھی ہے لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ باہر ہوا میں کئی شکرے اور عقاب گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ فیصلہ تو بس یہ کرنا ہے کہ پنجرے کی سلاخوں میں دم توڑا جائے یا باہر کھلی ہواؤں میں۔''

''دنیا میں کوئی بھی انسان اتنی جلدی نہیں مرتا جتنی جلدی مایوس انسان مرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مایوس نہ ہو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔''

''بہت کم لوگ ہیں جنہیں میری زندگی کی پروا ہے لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ تمہیں میرے زندہ رہنے سے دلچسپی کیوں ہے؟''

''شاید اس لیے کہ میں نے ابھی تمہاری امانت لوٹانی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اور اس کے علاوہ بھی ایک اور بات ہے۔'' وہ سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھتی رہی۔

''تمہیں بچانے میں کچھ میرا اپنا مفاد بھی تھا۔''

''کیا مطلب...؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کچھ سوالوں کے جواب ان سوالوں میں ہی پوشیدہ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا عین اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہاں شوکا اور صغراں تھے۔ صغراں آشتی کو لے کر اندر چلی گئی جبکہ میں اور شوکا صحن میں لگے کیکر تلے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ میں اس سے حالات کی نوعیت کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ دونوں عشا کے وقت واپس چلے گئے۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ آشتی کے سوجانے کے بعد میں صحن میں سگریٹ سلگانے کے لیے نکل آیا، تب مجھے علم نہیں تھا کہ صحن میں نکل آنا میرے لیے کتنا مفید ہوگا۔ دھپ کی پہلی آواز پر میں چونکا۔ یقیناً کوئی دیوار پر سے کود کر اندر آیا تھا۔ میں چونکہ اندھیرے میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اس لیے نظروں سے محفوظ تھا۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کو میں نے مٹھی میں دبا کر بجھا دیا۔ مجھ سے بائیں طرف چند گز کے فاصلے پر حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک نہیں دو آدمی تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آدمی زمین پر رینگتا ہوا باہری دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر موجود اپنے ساتھیوں کو اندر لانا چاہتا تھا۔ میری گن اندر ہی پڑی تھی لیکن میں خالی ہاتھ بھی انہیں سنبھال سکتا تھا لہٰذا خاموشی سے ان کی حرکت دیکھتا رہا۔ دروازے کی طرف رینگنے والا میری پہنچ میں آ چکا تھا۔ اب مجھے بھی ایکشن میں آ جانا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی میں اس پر کود پڑا۔ اس کے سر کے لمبے بالوں کو گرفت میں لے کر میں نے درخت کی اوٹ میں اسے کھینچ لیا اور یہ میرے لیے بہتر ثابت ہوا کیونکہ اس کے چیختے ہی دوسرے سائے نے عین اسی جگہ پر رائفل کا برسٹ مارا جہاں میں اس پر جھپٹا تھا۔ میرا شکار نہتا تھا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا سر کیکر کے کھردرے اور سخت تنے سے اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ گولیوں کی آواز سناٹے میں دور تک گئی

تھی اور باہر موجود ان کے ساتھی بھی ایکشن میں آ گئے۔ گھر کا باہری دروازہ اور کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ کمزور رکاوٹیں جلد ہی ٹوٹ جائیں گی مگر ابھی میری توجہ کا مرکز وہ دوسرا آدمی تھا جس نے فائر کیا تھا۔ میں درخت کے اوپر چڑھ آیا اور تیزی سے ہوا میں پرواز کرتا ہوا ٹھیک اس دوسرے آدمی کے اوپر جا گرا۔ اس نے گھبرا کر پھر فائر کیا لیکن گولیاں کچی دیوار میں لگیں۔ میں نے اس کی گردن عقب سے جکڑ لی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی بے ہوش ہو کر لمبا لیٹ چکا تھا۔ اس کی گن میرے قبضے میں آ گئی اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے اندر سے آشتی کی چیخ سنائی دی اور پھر باہری دروازہ ٹوٹ گیا۔ میں جو بھاگ کر اندر جانے والا تھا وہیں رک کر رہ گیا۔

کھلے دروازے سے تین چار آدمی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے گن کو نیم دائرے میں گھماتے ہوئے دو برسٹ مارے لیکن یہ خیال رکھا کہ گولیاں ان کی ٹانگوں کو ہی نشانہ بنائیں۔ دو بندے شکار ہو گئے اور باقی دو جان بچانے کے لیے دائیں بائیں بھاگے۔ مجھے آشتی کی فکر تھی لیکن میں اب یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ میں وقفے وقفے سے فائر کرتا رہا لیکن وہ کم بخت بالکل محفوظ پوزیشن میں تھا پھر اچانک دیوار پھلانگ کر ایک آدمی عین میرے اوپر آن گرا تو گن بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آنے والا عقب سے مجھ سے لپٹ چکا تھا۔ اس نے میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی اور اس کی ٹانگوں نے کراس کی صورت میں کمر کو جکڑ لیا تھا، میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اسے پچھلی دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر کو پکڑنا چاہا لیکن میری ختم ہوتی قوت مدافعت کی وجہ سے میرے بازو ہوا میں بلند نہ ہو سکے۔ میری سانس تقریباً بند ہو چکی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بالکل آخری لحات میں جب مجھے اپنی موت کا یقین ہونے لگا تبھی میں نے آخری رسک لینے کا فیصلہ کیا اور پھر اپنی بچی کھچی ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور مٹی کے اس ڈھیر کے عقب سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ اس دوران یہ خیال رکھا کہ میرا چہرہ دیوار کی طرف ہی رہے۔ اس طرح میری پشت سے چمٹا وہ آدمی چھپے ہوئے شخص کے نشانے پر آ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق اس طرف سے فائر ہوا اور مجھ سے چمٹے پیر تسمہ پا کے جسم میں اترتا چلا گیا۔ اس کو لگنے والے جھٹکے سے میں منہ کے بل گر گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میرا رکا ہوا سانس سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دوبارہ بحال ہو گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کا خون آلود جسم خود پر سے ہٹایا۔ کیونکہ میرے کان قدموں کی چاپ سن رہے تھے جو میری طرف ہی آ رہے تھے۔ چھپا ہوا.... آدمی یقیناً مجھے ہٹ کرنے کے بعد یہ دیکھنے کے لیے آ رہا تھا کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا، میں نے خود کو زوردار جھٹکے سے اٹھایا۔ پیر تسمہ پا کی لاش پرواز کرتی ہوئی اس رائفل بردار سے جا ٹکرائی۔ وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ میں بھاگ کر اس کی طرف آیا اور جولات میں نے اس کی کنپٹی پر ماری، اس میں میری ساری جھنجلاہٹ اور نفرت شامل تھی۔ وہ ڈکرا کر ساکت ہو گیا۔ اس کی گن اٹھا کر میں کمروں کی طرف بھاگا لیکن یہاں آشتی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ ایک آدمی دہلیز پر ہی خون کے تالاب میں اوندھا لیٹا تھا جبکہ دو بندے آشتی والے کمرے کے فرش پر خاک چاٹتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”یہ دونوں کہاں سے آ گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس طرف کی کھڑکی توڑ کر۔ میں فائرنگ کی آواز سے جاگی تو دیکھا دو مسلح آدمی اندر داخل ہو چکے تھے لیکن انہوں نے مجھے گولیاں مارنے کے بجائے ساتھ چلنے کو کہا۔ اسی لمحے کوئی باہر سے بھاگتا ہوا اندر داخل ہونے لگا تو انہوں نے اس پر فائر کر دیا۔ میں سمجھی تم ہٹ ہو گئے ہو۔ یہ دونوں مسلح ضرور تھے لیکن بالکل ہی بودے نکلے۔ میری ایک ایک ِکک کھا کر ہی بے ہوش ہو گئے۔ باہر تو بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ جلدی جلدی تفصیل بتاتے ہوئے میرا حال پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں بہت زیادہ گھائل ہو چکا ہوں۔“

”اوہ...... کیا ہوا؟ کوئی گولی تو نہیں لگ گئی؟“ اس کی نظریں مجھے ٹٹول رہی تھیں۔ اس کی میرے لیے پریشانی مجھے اچھی لگی۔

”ضروری تو نہیں کہ بندہ گولی سے ہی زخمی ہو۔“ میں نے شرارت سے کہا۔ وہ پہلے کچھ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر منہ بنا کر بولی۔

”یہ مذاق کا کون سا وقت ہے؟“

”مذاق اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

وہ دہلیز پر گرے آدمی کو سیدھا کرتے ہوئے بولی۔

”یہ نواب شبیر احمد کے ہی گرگے ہیں۔“

''لیکن انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کیوں کی؟ کیا چودھری حشمت علی نے اپنے بیٹے کے ڈیتھ وارنٹ جاری کر دیے ہیں؟'' میں بڑبڑایا۔ چند لمحوں بعد ہی ہم اس گھر کو چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

''یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بلب کی زرد روشنی میں وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر قبل جب ہم اس گھر سے افراتفری میں نکلے تھے، تب پہلے میرا ارادہ شوکے کی طرف جانے کا ہی تھا لیکن آشتی نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے ہم پر حملہ کیا ہے، وہ شوکے سے واقف نہ ہوں۔ کیونکہ اس گھر کے بارے میں یا تو جواد کو پتا تھا یا پھر شوکے کو۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''ہمیں یہاں سے کچھ اور دور جانا ہوگا۔ قادر پور میں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہاں کون ہوگا؟''

''حق نواز چاچا۔ وہ نواب کے لیے کام ضرور کرتا ہے لیکن مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی ایک چھوٹے سے گھر میں اکیلے رہتے ہیں۔'' میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم چار پانچ کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد قادر پور میں ایسی جگہ پہنچے جہاں چند مکانوں کے علاوہ دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آشتی نے ایک پرانا لکڑی کا دروازہ بجانے کا تکلف کیا۔ تکلف اس لیے کہ بند دروازے کے اندر لگی کنڈی اتنی ڈھیلی تھی کہ میں دروازے کی درز میں ہاتھ ڈال کر اسے بہ آسانی کھول سکتا تھا۔ آشتی کو دیکھ کر ادھیڑ عمر حق نواز حیران رہ گیا اور جلدی جلدی پوچھنے لگا۔

''پتر! تو کہاں غائب ہو گئی تھی اور اس وقت کہاں سے آ رہی ہے؟ اور یہ پٹی؟ تو ٹھیک تو ہے نا اور یہ تیرے ساتھ کون ہے؟''

''تیری تو مت ای ماری گئی ہے نواز۔ اسے بیٹھ کر ساہ تو لینے دے۔'' حق نواز کی شفیق چہرے والی بیوی آشتی کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے اندر آ گئے۔ آشتی نے مختصر الفاظ میں حق نواز کو ساری باتیں بتلائیں۔

''اوہ تو یہ چودھری حشمت کا پتر کامران ہے جو ولایت پڑھنے گیا تھا۔'' وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا اور پھر چونک گیا۔

''او پتر! یہ تیری قمیص تو لہولہان ہو رہی ہے۔ کہیں کوئی گولی تو نہیں لگ گئی؟''

''نہیں چاچا! گولی نہیں لگی۔ بس چھوٹی موٹی چوٹیں ہیں۔'' پر میرے انکار کے باوجود اس نے میری قمیص اتروا کر جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔

''ہاجرہ! تو پانی گرم کر کے لے آ۔ چھوٹے چودھری جی! اتنی بھی چھوٹی چوٹیں نہیں ہیں۔'' میں خاموش رہا۔ دونوں نے زبردستی ہمیں کھلایا پلایا۔ میری گردن پھوڑے کے مانند دکھ رہی تھی۔ آشتی اور ہاجرہ ایک دوسرے کمرے میں چلی گئیں جبکہ حق نواز نے میرے لیے بیٹھک میں بستر لگا دیا۔ وہ اب میرے ساتھ بالکل کسی ملازم کی طرح پیش آ رہا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر اس سوچ میں غرق تھا کہ جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا انہیں یقیناً معلوم تھا کہ میں چودھری حشمت علی کا بیٹا ہوں لیکن پھر بھی انہوں نے مجھے قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔ اسی دوران ہلکی سی آواز کے ساتھ بیٹھک کا دروازہ کھلا اور آشتی اندر داخل ہوئی۔

''مجھے لگتا ہے تم درد کی وجہ سے سو نہیں پا رہے۔'' وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم بھی تو جاگ رہی ہو جبکہ تمہیں تو اب زیادہ درد بھی نہیں ہے۔''

''جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی تکلیف ہے پھر نیند کیسے آئے گی۔ میں حیران ہوں کہ وہ لوگ نواب کے آدمی تھے لیکن انہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ تم چودھری حشمت علی کے بیٹے ہو۔ اس کے باوجود انہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کیوں کی؟''

''میں ان کے ڈیرے میں گھس کر ان کے آدھ درجن آدمیوں کو زخمی کر کے تمہیں بچا لایا ہوں۔ کیا اس کے بعد وہ مجھ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کریں گے؟''

''یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ میں سگریٹ کا دھواں اگلتا رہا۔

یک لخت اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے پہلی بار اسے بے خوف ہو کر غنڈوں کی دھلائی کرتے دیکھا تھا۔ وہ بڑے نڈر انداز میں چلتی ٹرین کے دروازے سے چھت پر چڑھ گئی تھی پھر مزار پر بھی وہ اپنے دشمنوں کو جل دینے میں کامیاب رہی تھی۔ بعد میں، میں نے اسے زخموں سے چُور دیکھا اور آج میں پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ جتنی بھی بہادر اور مضبوط نظر آنے کی کوشش کرے، اندر سے وہ ایک حساس اور نازک سی لڑکی

ہی ہے۔ میں نے اس کی کلائیاں تھام کر ہاتھوں کو چہرے سے اٹھالیا۔ آنسوؤں سے تر بتر چہرے پر بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ انسان اس وقت روتا ہے جب وہ ہر معاملے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے لگا وہ ہمت ہار رہی تھی۔

''تم کیوں روتی ہو آشتی۔ یہ دیکھو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ کہیں رات کے اندھیرے میں تمہاری ماں تمہارے لیے دعا کر رہی ہو گی۔ تمہاری بہنیں پل پل تمہاری حفاظت کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی ہوں گی اور پھر میں بھی تو ہوں۔ بے شک میں تمہارا کوئی نہیں ہوں لیکن جب تک ہوں، تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ تمہیں بچانے میں میرا اپنا مفاد بھی پنہاں تھا۔ پھر کیوں تم نہیں سمجھتی کہ اس فقرے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ کیوں تم محسوس نہیں کر رہی ہو کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ''تم......؟'' اس کے لب تھرتھرا کر رہ گئے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم نہ تو اکیلی ہو اور نہ ہی کمزور۔ میں جانتا ہوں کہ تم کتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہو اور اب تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس لیے مایوس ہونا چھوڑ دو۔ تم دیکھنا بہت جلد یہ ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس کے بعد جو زندگی شروع ہو گی وہاں محبت کی بہاریں ہوں گی۔ اتنی شدید محبت کہ تمہیں یہ دن کبھی یاد بھی نہیں آئیں گے۔'' میں نے اسے اپنے قریب کیا تو اس نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا۔ اسی لمحے میرے موبائل پر بیپ ہونے لگی۔ یہ ایک ریمائنڈر تھا۔

''چوبیس تاریخ، فارم ہاؤس پارٹی، کہانی کا آخری ٹکڑا۔''

☆☆☆

گیٹ سے اندر دور تک پھیلی روش پر اس وقت ''بی ایم ڈبلیو'' سے لے کر ''آوڈی'' تک اور ''لینڈ کروزر'' سے لے کر ''لیکسز'' تک ہر طرح کی مہنگی گاڑی موجود تھی۔ فارم ہاؤس کا وسیع و عریض میدان اس وقت روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ڈنر سوٹ میں ملبوس کئی افراد گھاس پر ٹولیوں کی صورت میں موجود تھے۔ سامنے اسٹیج بنایا گیا تھا اور وہاں ملک کے نامور غزل خواں اپنی آواز کے سُر بکھیر رہے تھے۔ ایک کونے میں باربی کیو کا سیٹ اپ لگا ہوا تھا۔ ہرن بھونے جا رہے تھے۔ بکروں کی سجی تیار ہو رہی تھی اور ساتھ تکے اور کباب بنائے جا رہے تھے۔ سفید لباس اور سرخ پگڑیاں پہنے ویٹر تلخ، ترش اور شیریں مشروبات کے ساتھ کبابوں کے تھال اٹھائے گھوم رہے تھے۔ تبھی مجھے جواد نظر آ گیا اور

عین اسی وقت جواد کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔ وہ تیر کی طرح میری جانب آیا اور میرا بازو پکڑ کر ایک جانب لے گیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں پتا ہے کہ تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے؟''

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ شوکے کے گھر پر حملہ نواب کے آدمیوں نے ہی کیا تھا نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ایک توقف کے بعد وہ بولا۔ ''مجھے اس حملے کا پیشگی پتا نہیں تھا اس لیے اطلاع نہیں کر سکا۔ لیکن تم نے اچھا کیا جو آشتی کی بات مان کر حق نواز کے گھر چلے گئے۔''

''تم کیسے جانتے ہو کہ میں حق نواز کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' میں چونک گیا۔

''تم سمجھتے ہو کہ ان حالات میں، میں نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے؟ میں اگر تمہاری کھل کر مدد نہیں کر سکتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں نے تمہارے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شوکے کے گھر پر حملہ ہونے کے بعد تو میں اور بھی چوکنا ہو گیا ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی؟ کیا چودھری حشمت علی کو اس بات کا علم ہے کہ ان کے دیرینہ دوست نے ان کے بیٹے کو مارنے کے لیے یہ حملہ کروایا تھا؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''ماما جی کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ یہ سب نواب شبیر احمد اپنے طور پر کر رہا ہے اور تمہارے تعلقات تو پہلے ہی ماما جی سے اچھے نہیں ہیں اس لیے تم انہیں نواب کی اصلیت بتاؤ گے بھی تو وہ یقین نہیں کریں گے۔''

''وہاں دو بندے قتل ہو گئے ہیں اور کم از کم پانچ زخمی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں خاموش رہوں۔ میں یہ سب کرنا نہیں چاہتا جودی! قلم اٹھانے والی انگلیاں ٹریگر نہیں دباتیں لیکن مجھے اسی طرح مجبور کیا جاتا رہا تو آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''دیکھ......تو واپس جا۔ آشتی کے پاس رک۔ میں ہوں نا ادھر۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے بس نواب کے بارے میں چند ثبوت اکٹھے کر لینے دے بھائی پھر میں تجھے نہیں روکوں گا۔'' وہ کچھ دیر مجھے سمجھاتا رہا۔ اسی لمحے ایک ویٹر میری طرف آیا۔

''کامران صاحب! آپ کو چودھری صاحب بلا رہے ہیں۔'' ہم دونوں نے چونک کر دیکھا۔ اباجی اپنے چند مہمانوں کے ساتھ کھڑے ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ہاتھوں میں سنہری مشروب کے گلاس تھے۔ میں ان

سب سے واقف تھا۔

''یہ میرا سب سے چھوٹا پتر ہے، چودھری کامران۔ لندن سے کرمنالوجی کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ بڑا جوش ہے اس کے خون میں۔ کہتا ہے اس نظام کو بدل دوں گا جو کئی دہوں (عرصے) سے اس ملک پر قائم ہے۔'' وہ مہمانوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''جب ہم نے سروس جوائن کی تھی تو ہمارا خون بھی گرم تھا۔ پہاڑوں سے سر ٹکرانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن جب سر ٹکرایا تو لہولہان ہو گئے۔ آج اسی پہاڑ کے سامنے سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔'' تفاخر سے بتاتے ہوئے امجد صدیقی ڈپٹی اٹارنی جنرل تھے۔

''آپ سب جو مرضی کہہ لیں قریشی صاحب۔ پر یہ میرا پتر وہی کرتا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ کسی کی نہیں سنتا اور ہم نے بھی اسے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ جا..... موجاں کر۔'' اباجی ہنستے ہوئے بولے۔''میں نے کہا تھا کہ اگر صحافی ہی بننا ہے تو لندن جا کے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر بجائے نوکری کرنے کے اپنا اخبار نکال لے یا اپنا ٹی وی چینل کھول لے مگر یہ کسی کی نہیں سنتا۔'' میں ان کے الفاظوں میں چھپا طنز صاف محسوس کر رہا تھا۔

''چودھری صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہاری رپورٹس میں پڑھتا رہتا ہوں۔ خاص کر وہ رپورٹس جن میں تم بڑے بڑے لوگوں کو اسکینڈلائزڈ کرتے ہو۔ بالکل کسی بلیک میلر کی طرح۔'' امجد صدیقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا سر! اسکینڈلائزڈ کرنے اور سچ کا پردہ چاک کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' میری بات سن کر وہ سب ایک دم چپ سے ہو گئے۔

''تم جس روزنامہ میں کام کرتے ہو، تمہاری جگہ پہلے ایک پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا...... کیا نام تھا اس کا؟'' وہ ماتھے پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

''سلیمان رحمانی۔'' میں نے ان کی مشکل حل کر دی۔

''ہاں سلیمان۔ بہت اچھا صحافی ہے لیکن ہے کہاں، آج کل نظر نہیں آ رہا؟''

''وہ اسپورٹس میگزین کے ایڈیٹر بن گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ اسپورٹس۔ خوب، بہت خوب۔ تو تم کہاں جاؤ گے؟ میرا مطلب ہے ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ جب کوئی بہت زیادہ خطرناک رپورٹنگ کرنے لگتا ہے تو فیشن یا پھر اسپورٹس میگزین میں بھیج دیا جاتا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے اس ملک کا۔ کوئی اچھا کام کرنے کی ٹھان لے تو ساری سرکار اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم اس طرح کی صحافت کو بلیک میلنگ کہتے ہیں۔'' ممتاز ہاشمی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کہنے کو تو ہم بھی کرپٹ افسران کو ''غدار وطن'' کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ہاشمی کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ سلیم قریشی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ وہ منہ موڑ کر مشروب پینے لگا۔ اس ساری بات چیت کے دوران اباجی بالکل خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے ماحول خراب ہوتے دیکھا تو فوراً قہقہہ لگایا۔

''میں نے کہا تھا نا۔ یہ میرا باغی پتر ہے۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے ہر اس شخص کو باغی کہنا شروع کر دیا ہے جو کسی حسین جھوٹ کا پردہ چاک کر کے اس کے گندے سچ کو بے نقاب کرنے کی ہمت کرتا ہے یا پھر اس کرپشن آلود سسٹم کا حصہ بننے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ جو بھی یہاں رشوت، ذخیرہ اندوزی، قبضہ مافیا اور غلط بات کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کرتا ہے، ہم اسے باغی کہہ رہے ہیں اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

''تو تمہیں لگتا ہے کہ تم اس ملک میں انقلاب لا سکتے ہو؟'' طنزیہ آواز میں پوچھا گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں کرپشن کے خلاف آواز اٹھاؤں گا تو لوگ میرا ساتھ دیں گے۔ آپ اسے انقلاب کہہ لیں یا بارش کا پہلا قطرہ۔''

''تمہاری ہر بات مفروضے سے شروع ہو کر مفروضے پر ختم ہو رہی ہے ینگ مین۔''

''میں کسی معجزے کی امید نہیں رکھتا لیکن یہ یقین ضرور رکھتا ہوں کہ اپنے حصے کا حق ادا کر کے بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ میرا کام کسی کو سزا دلوانا نہیں۔ صرف غلط کام کرنے والوں کو عوام کے سامنے لانا ہے اور اس بات کا فیصلہ اگر اس ملک کے یہ طاقتور لوگ نہیں کریں گے تو فیصلہ عوام کے ہاتھ میں آ جائے گا کیونکہ انقلاب کی پہلی نشانی یہی ہے کہ عوام کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا اندازہ ہونے لگے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہاں سے ہٹ گیا اور حویلی کی طرف چلا آیا۔

تہ خانوں میں جانے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ سارے ملازم تو فارم ہاؤس میں مصروف تھے۔ میں بتیاں

جلا کر سیدھا ہال کے آخری حصے میں پہنچا۔ کہانی واقعی مکمل ہوچکی تھی۔ نایاب اسٹوپے کا آخری حصہ نیشنل میوزیم سے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اب یہ آرٹ کا ایسا شاہکار بن چکا تھا جس کا کوئی ثانی نہیں تھا لیکن جو بات اس خوبصورت ترین آرٹ میں خامی کا باعث بن رہی تھی، وہ یہ کہ یہ لاجواب آرٹ ایک وڈیرے کے تہ خانے میں پڑا تھا۔ میں نے اس کی بہت سی تصویریں لیں اور باہر نکل آیا۔ میں بھرجائی اور نازو سے ملنے کے لیے گھر کے دوسرے پورشن کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن جب میں نے ایک کھلی کھڑکی سے ماہی کو لان میں چہل قدمی کرتے دیکھا تو میں اس کے قریب چلا آیا۔

''کیسی ہو ماہی؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بنا کسی تاثر کے بولی۔

''دیکھو ماہی! اس دنیا میں سب کچھ سب کے لیے نہیں ہوتا۔ اگر انسان صابر ہوجائے تو اللہ خوش ہوجاتا ہے۔''

''تمہیں لگتا ہے صبر کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک لفظ بول کر کسی رشتے کو ختم کردینا؟'' اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟'' اس نے اچانک ایسا سوال کردیا کہ میں چونک گیا۔

''کون؟ کس کی بات کررہی ہو؟''

''وہی جس کا تحفہ تم نہیں بھولے تھے۔''

''نہیں ماہی! وہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے لیکن......'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''اگر مگر لیکن کے بعد پہلے فقرے کی نفی ہوجاتی ہے۔ اس لیے میں تمہیں یہیں پر روک دیتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر میں بھی اندر اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔

☆☆☆

''آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔'' میں دفعتاً چلایا۔ وڈے کمرے کی گمبھیر خاموشی میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا پھر چودھری حشمت علی کی آواز گونجی۔

''تو قابلِ اعتبار نہیں رہا۔ میں تیری کسی بات کا اعتبار نہیں کرسکتا۔ میں کیا اس کمرے میں کوئی بھی تیری بات کا یقین کرنے والا نہیں ہے۔'' میں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔ وڈے کمرے میں بھائی شفیق، عمران، بھرجائی، نازو اور ماہی کے ساتھ ساتھ نواب شبیر احمد بھی

موجود تھے۔ کچھ دیر قبل مجھے اچانک اطلاع ملی تھی کہ مجھے وڈے کمرے میں طلب کیا گیا ہے تو مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہاں یہ سب لوگ موجود ہوں گے۔

''تو نے نواب صاحب کے ڈیرے پر کئی بندوں کو زخمی کرنے کے بعد ایک خطرناک قیدی لڑکی کو بھگانے میں مدد کی۔ میں پوچھتا ہوں کیوں کیا تو نے ایسا؟''

''کیونکہ وہ...... اس حویلی کی ہونے والی بہو ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اس طرح کسی قید خانے میں رہے۔''

میری اس بات میں ایسا دھماکا تھا جس نے وڈے کمرے میں سناٹا طاری کر دیا۔ اباجی کے ہاتھ میں پکڑی حقے کی نے ہونٹوں میں دبی رہ گئی۔ ماہی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو؟'' بھائی شفیق کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے انہیں غصے میں دیکھا تھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور یہ کوئی کچا فیصلہ نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''پھر بکواس یہ بکواس کیے جا رہا ہے۔ یہاں بات اور ہو رہی تھی اور تو نے نیا تماشا کھڑا کر دیا ہے۔'' اب کی بار عمران بولا۔

''آپ کی نظر میں یہ تماشا ہو سکتا ہے لیکن یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔''

''تو جانتا ہے وہ لڑکی کون ہے؟'' اباجی کی آواز گونجی۔

''میں تو بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شاید آپ میں سے کوئی نہیں جانتا اور اگر کسی کو جاننے کا شوق ہو تو وہ آپ کے دوست جناب نواب شبیر احمد سے پوچھ سکتا ہے۔''

''مم...... میں؟ کیا مطلب؟ میں کیسے اس لڑکی کے بارے میں جان سکتا ہوں؟ سوائے اس کے کہ کچھ عرصہ قبل یہ اطلاعات ملی تھیں کہ وہ لڑکی ہمارے علاقے میں غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔'' نواب صاحب چونک کر بولے تو میں مسکرا دیا۔

''ویسے یہ خوب کہی آپ نے نواب صاحب کہ...... ''غیر قانونی کام۔'' مطلب آپ جو بھی کریں وہ سب قانونی اور کوئی اور یہ سب کرے تو غیر قانونی۔ لگتا ہے مجھے تفصیل بتانا ہی پڑے گی۔ بہت عرصہ قبل جب منشیات فروشوں نے یہاں پر منشیات کی اسمگلنگ کی اجازت چاہی تھی تو اباجی نے انہیں انکار کر دیا تھا لیکن منشیات فروشوں نے اباجی کے انکار پر یہاں اسمگلنگ کا پلان ختم نہیں کیا، صرف تبدیل کر لیا تھا۔ انہوں نے اباجی کا ایک ایسا بندہ اپنے ساتھ ملا لیا جو ان کی نوادرات کی اسمگلنگ کے ذریعے ہی بڑے خفیہ طریقے سے منشیات بھی اسمگل کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اباجی کا بہت قریبی بندہ چنا اور اس بندے نے بھی رازدارانہ انداز میں نوادرات کے ڈبوں کے ذریعے ہی منشیات کی کھیپ پڑوسی ملک بھجوانے کا کام کامیابی سے سرانجام دیا اور وہ آدمی کوئی اور نہیں ...... نواب شبیر احمد خود ہیں۔''

''اپنی زبان کو لگام دو کامران۔'' نواب صاحب بھڑک اٹھے۔

''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ لڑکی جس کا نام آشتی ہے، ہمارے علاقے میں منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ضرور رہی ہے لیکن اس سے یہ کام زبردستی کروایا گیا تھا اور اب جبکہ اس سے یہ کام کروانے والے نہیں رہے، وہ واپس اپنی دنیا میں شرافت کی زندگی بسر کرنے جا رہی ہے تو یہ نواب صاحب اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے پاس منشیات کی آخری کھیپ کا معاوضہ موجود ہے۔'' میری باتوں سے جیسے کمرے میں موجود ہر فرد کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

''یہ...... یہ الزام ہے ہم پر۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' نواب صاحب کی کانپتی ہوئی آواز گونجی۔

''عمران! تو کامی کو اندر لے جا۔ مجھے لگتا ہے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' بھائی شفیق نے عمران سے کہا تو عمران بے اختیار میری طرف بڑھا۔

''رکو...... اسے کہنے دو۔'' اباجی کی گمبھیر آواز گونجی تو وڈے کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔

''کہہ دے کامران۔ آج سب کچھ کہہ دے کیونکہ آج کے بعد تو ہمارے سامنے کبھی نہیں آئے گا۔''

''مجھے پتا تھا کہ آپ کبھی بھی اپنے بیٹے کی بات کا یقین نہیں کریں گے لیکن جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ آپ کی پناہ میں کھڑا یہ شخص ...... یہ نواب آپ کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں لگا ہے اور آپ کو یقین اس وقت آئے گا جب ایک دن آپ کے اعتماد کی عمارت ڈھے جائے گی۔ تب آپ کو میری بات کا اعتبار آئے گا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔'' میں بھی کہتا رہا۔ اباجی سپاٹ چہرے سے میری طرف دیکھتے رہے۔ میں انہیں نواب کے بارے میں وہ سب بتاتا رہا جو آشتی نے مجھے بتایا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے پوچھا۔

"یہ سب تجھے اس کڑی نے بتایا ہے جس کا نام آشتی ہے؟"
میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہاں۔"
"مرے گی وہ لڑکی۔ ایسی فسادن کو میں عبرت ناک سزا دوں گا۔" وہ بڑبڑائے تو میں چلا اٹھا۔
"آخر آپ کو میری بات پر یقین کیوں نہیں ہے؟"
"شاید اس لیے کہ مجھے تیرے بارے میں سب پتا ہے۔" اباجی نے رسان سے کہا اور پھر ایک توقف کے بعد بولے۔ "مجھے پتا ہے کہ تو یہاں کیوں اور کس لیے آیا ہے۔ تجھے یہاں اپنے گھر کی محبت نہیں بلکہ تیری فرض شناسی کھینچ کر لائی ہے۔ تو یہاں اپنے اخبار کے لیے یہ رپورٹ تیار کرنے آیا ہے نا کہ تیرا باپ کتنا ظالم اور جابر چودھری ہے۔ وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔ چودھری حشمت اپنے مزارعوں سے غلاموں جیسا سلوک کرتا ہے۔ چودھری حشمت نے اپنی نجی جیلیں بنوا رکھی ہیں جن میں کئی بے گناہ لوگوں کو پابہ زنجیر رکھا گیا ہے۔ چودھری حشمت ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، اسمگلنگ کرتا ہے، سرکاری افسروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس پنڈ میں بیٹھ کر سرکار کی کرسی کو ہلاتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" وہ تلخی سے بولے۔
"کیا یہ سچ نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"تو کیا سمجھتا ہے تیری اس رپورٹ کے چھپنے کے بعد میری عزت داؤ پر لگ جائے گی؟ مجھ پر انکوائری بٹھا دی جائے گی یا پھر عوام میرے خلاف لانگ مارچ شروع کردے گی؟ کیا ہوگا تیری اس رپورٹ کے شائع ہونے سے؟" وہ دہاڑے۔
"شاید آپ وہ زمین واپس کرنے پر مجبور ہوجائیں جس پر آپ کا حق نہیں ہے۔ شاید آپ کی جیل سے وہ مظلوم آزاد ہوجائیں جو معمولی گناہوں کی بھیانک سزا بھگت رہے ہیں۔ شاید کاغذ کے چند نوٹوں کے بدلے آپ اپنی تہذیب گمشتہ کو بیچنے سے باز آجائیں۔ شاید پہلی بار اس ملک میں کسی بڑے آدمی کا احتساب ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہو۔ میری اس رپورٹ کو کھڈے لائن لگا دیا جائے۔ الٹا مجھے کسی معاملے میں پھنسا دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے روکنے کے لیے جان سے مار دینے سے بھی گریز نہ کیا جائے لیکن مجھے کسی نتیجے کی پروا نہیں ہے۔ میرے سامنے جو غلط ہوگا اسے میں سب کے سامنے لاؤں گا۔" سبھی گنگ کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اباجی اور میرے درمیان ہونے والے اس مکالمے کا ہر لفظ سچ پر مبنی تھا۔
"ٹھیک ہے۔" پھر وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔
"اب تو جا۔ تیرے لیے اس حویلی اور میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوچکے ہیں۔" آخری بات میں ان کا لہجہ دوٹوک ہوگیا تھا۔ میں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔ وڈی بھرجائی کے چہرے پر ممتا کی تڑپ تھی۔ باقی سب چہرے جھکے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے ہیئر کلپ اٹھایا اور کسی سے بھی ملے بغیر حویلی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہ چھت پر کھڑی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہوچکا تھا۔ آسمان پر ایک خوبصورت منظر تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے آشیانوں کی جانب محو پرواز تھے۔ نیچے صحن میں لگے پیپل کی شاخوں میں سے ان گنت چڑیوں کا شور اٹھ رہا تھا۔ آشتی سینے پر بازو باندھے افق کی جانب دیکھے جارہی تھی۔ ہلکی ہوائیں اس کے لمبے بالوں کو ہولے ہولے سہلا رہی تھیں۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔
"آشتی۔" میں نے اسے پکارا تو وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔
"کیا تم اپنا نام تبدیل کرنا پسند کروگی؟" حیرانی کا ایک اپنا رنگ ہوتا ہے، آنکھوں سے ابھر کر سارے چہرے پر پھیلتا ہے۔ میں نے اس انوکھے منظر کا نظارہ آشتی کے چہرے پر دیکھا۔
"نام...... وہ کیوں؟" وہ الجھ کر بولی۔
"کیونکہ ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن اپنا نام تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اب باپ کا نام ساری عمر تو لڑکیوں کے نام کے ساتھ جڑا نہیں رہتا۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر تمہیں میرا نام اچھا لگے تو اپنے نام کے ساتھ شامل کرسکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
اس کے ملیح چہرے پر بکھرا حیرت کا رنگ حیا کے سرخ رنگ میں تبدیل ہوا اور پھر یک لخت ایک انجانے سے خوف سے زردی میں ڈھل گیا۔ اپنی مضطرب آنکھوں کی کیفیت چھپانے کے لیے اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔
"کیا میں اس خاموشی کو ہاں سمجھوں؟" میں نے پھر پوچھا۔
"ایسا نہیں ہوسکتا کامی۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو۔ ہم دونوں کے بیچ چور سپاہی کا رشتہ ہے جو اس وقت صرف اور صرف ہمدردی کی دھند میں چھپا ہوا ہے۔

جیسے ہی دھند چھٹے گی، کچھ باقی نہیں رہے گا۔ میں جرائم کی دنیا میں گردن تک دھنسی ہوئی ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میں اس کے سامنے آگیا۔

''میں تمہارا مستقبل ہوں آشتی۔ میری محبت کو ہمدردی کہہ کر اس کی توہین مت کرو۔ میں تمہیں چودھری حشمت علی کی حویلی میں دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''پلیز کامی! مجھے ایسے خواب مت دکھاؤ۔ جب یہ خواب ٹوٹیں گے تو بہت تکلیف ہوگی۔'' میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ میں تمہیں نواب کے چنگل سے باہر نکالوں گا۔ موت کے جو سائے تمہارے پیچھے ہیں، ان سب کو ہٹادوں گا۔ تم اپنی زندگی بالکل نئے انداز سے شروع کرو گی۔''

''کامی! اگر ایسا ہوجاتا ہے جیسا کہ تم نے کہا تو میں اپنے آپ کو اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کروں گی مگر......'' میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر بات کو روک دیا۔

''اگر مگر لیکن کے بعد پہلے فقرے کی نفی ہوجاتی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں یہیں پر روک دیتا ہوں۔'' اور ایسا کہتے ہوئے مجھے ماہی یاد آگئی۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''چلو اس لمحے کو یادگار بنانے کے لیے ایک کام کرتے ہیں۔ ویسے میرے پاس جو کچھ ہے تمہیں پسند آئے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اچانک اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا جس پر سفید ہیئر کلپ رکھا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے ساکت ہوگئی پھر لرزتے ہاتھوں سے اس نے کلپ کو اٹھایا اور کھول کر اس میں سے ہیرے نکال لیے۔ اس کی خوبصورت ہتھیلی پر چکا چوند روشنیوں کی کرنیں جگمگا اٹھیں جس کا عکس اس کی کانچ جیسی شفاف آنکھوں میں بھی جھلملانے لگا تھا۔

''امانت واپس ہوگئی۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ اس نے ہیرے واپس کلپ میں ڈال دیے۔

''میں تمہارے کن کن احسانات کا بدلہ چکاؤں گی کامران۔''

''یہ تو میرا فرض تھا یا پھر...... ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اگر تم سوچتی ہو کہ میں یہ سب کہوں گا تو سوری۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ جب وقت آئے گا میں ہر احسان کا بدلہ سود سمیت واپس لوں گا۔'' میں نے شرارتی انداز سے کہا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ حیا کا سرخ رنگ اس کے چہرے پر اس طرح چھا گیا کہ میں مبہوت ہوکر رہ گیا۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آں ہاں...... لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا۔'' وہ شوخی سے بولی اور ہاتھ چھڑا کر سیڑھیوں کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ میں ایک طرف رکھی کرسی پر ڈھیر ہوکر گر سا گیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ پھر اچانک مجھے آشتی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد ایک فائر ہوا۔ میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اسی لمحے ایک آدمی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے سر کے بال پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ اڑتا ہوا پکی منڈیر سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا واپس صحن میں گرتا چلا گیا۔ جیسے ہی میں سیڑھیوں سے اترا ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گیا۔ میرے قدموں میں حق نواز اوندھا پڑا ہوا تھا۔ خون کا سرخ تالاب اس کے گرد پھیلتا جارہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تبھی آشتی کی دوسری چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ اندرونی کمروں سے آرہی تھی۔ میں لاش پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور تبھی میرے سر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ میں سر پکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ دھندلی آنکھوں کے سامنے ایک آدمی ہاتھ میں لوہے کا گول راڈ تھامے کھڑا تھا۔ میں درد کی ناقابلِ برداشت لہروں کے آگے بے بس ہوگیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔ مجھے میری گردن پر پہاڑ سا ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا اور میں ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ اس بے ہوشی میں ہر قسم کا احساس مفقود تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھلنے لگیں۔ دماغ کا رابطہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ختم ہوا تھا۔ گزرے واقعات یاد آتے ہی میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا۔ میری گردن کے عقبی حصے اور سر سے درد کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں چکراتے سر کو سنبھالتے ہوئے کھڑا ہوا۔ بلب کی زرد روشنی میں ڈوبا کمرا خالی تھا۔ میں باہر نکلا۔ سارا گھر خالی تھا۔ حتیٰ کہ حق نواز کی لاش بھی غائب تھی اور وہ زخمی بھی غائب تھا جسے میں نے چھت سے نیچے پٹخا تھا۔ البتہ سیڑھیوں کے پاس اور صحن میں خون کے آثار موجود تھے جنہیں کچی مٹی جذب کرچکی تھی۔ گھر کے باہری دروازے کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ میری رگ رگ میں خون کا فشار بلند ہونے لگا۔ کنپٹیوں پر دھمک سی ہورہی تھی جس میں ایک ہی نام گونج رہا تھا...... ''آشتی!''

☆☆☆

فرش پر دو آدمی بے ہوش پڑے تھے۔ تیسرا میرے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ دیر قبل اس کے ہاتھ میں ری پیٹر تھی لیکن اب وہ گن کمرے کے ایک کونے میں پڑی تھی اور اس آدمی کی حالت بگڑ چکی تھی۔ اس کی قمیص دھجیوں کی صورت میں بدن سے اتر چکی تھی۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ایک کان سے خون بہہ رہا تھا اور چہرہ میرے تھپڑوں کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا۔ میں نے ایک اور تھپڑ اسے رسید کیا۔ وہ گھوم کر دیوار سے ٹکرایا اور اسے ماتھے پر سخت چوٹ لگی۔

''بتا...... وہ قیدی لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ ایک ہفتے سے ادھر کوئی نہیں آیا۔ میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھاتا ہوں۔ میں اس قیدی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے روتے ہوئے وہی جواب دیا جو وہ پہلے بھی دے چکا تھا۔ میں غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہا۔

''تیرے پاس دو منٹ ہیں۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو اٹھا اور دفع ہو جا۔ اگر دو منٹ کے بعد تو مجھے اس علاقے میں نظر بھی آیا تو مار ڈالوں گا۔'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ اس نے میری بات پر تیزی سے عمل کیا اور دونوں بے ہوش آدمیوں کو گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے گھوم پھر کر ایک بار پھر ساری عمارت کا جائزہ لیا۔ یہ وہی ڈیرہ تھا جہاں آشتی کو پہلے بھی قید کیا گیا تھا اور میں اسے نکال کر لے گیا تھا مگر اب یہ خالی تھا۔ باوجود اس کے کہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ آشتی کو اسی جگہ رکھنے کی غلطی نہیں کر سکتے لیکن میں پھر بھی یہاں آ گیا تھا۔ اس عمارت کے تہ خانوں میں تمباکو کے ذخیرے تھے۔ یہاں مجھے پیٹرول کے چند کین بھی مل گئے تھے۔ میں نے اس عمارت کے اندرون اور بیرون کو پیٹرول میں نہلا کر آگ لگا دی اور خود بھڑکتے شعلوں کو دیکھتا ہوا ایک جانب چل دیا۔ اسی لمحے میرا موبائل وائبریٹ ہونے لگا۔

''یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم کامی۔'' بھائی شفیق کی غصیلی آواز گونجی۔ ''میں نے سنا ہے تم نے فارم ہاؤس کے گوداموں میں آگ لگا دی ہے اور وہاں تہ خانوں میں قید خطرناک قیدی بھگا دیے ہیں؟''

''تم نے سنا نہیں تھا بھا۔ جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی، اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ ان گوداموں میں وہی گندم تھی جو اناج غریب کے پیٹ کے بجائے اسٹور میں رکھ دیا جائے۔ اس کا جلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے اور وہ خطرناک قیدی جن گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے، وہ خود بھی بھول چکے تھے۔''

''سچ کہہ رہا تھا عمران کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ کامی! تو جو کر رہا ہے وہ بہت غلط ہے۔ تو ایسا کر میرے پاس آ جا ادھر شہر میں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب ٹھیک نہیں ہو سکتا بھا جی۔ جب تک میری آشتی مجھے نہیں مل جاتی، تب تک سب ٹھیک نہیں ہوگا اور جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل رہے گی میری چودھری صاحب اور نواب صاحب سے کھلی جنگ جاری رہے گی۔'' میں نے سرد آواز میں کہا۔

''کامی! میری بات کا تو یقین کر۔ میں نے آج تک تجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ آشتی کے بارے میں نہ تو ابا جی کو کچھ معلوم ہے اور نہ نواب صاحب کو۔ میں نے دونوں سے بات کی تھی اور وہ دونوں......'' میں نے بات کاٹ دی۔

''آپ بہت بھولے ہیں یا پھر مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔ جس دن میں نے وڈے کمرے میں آشتی کو اپنانے کی بات کی تھی بھی چودھری صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے میری زندگی سے نکال دیں گے۔ میں جانتا ہوں آشتی کو انہوں نے ہی اغوا کیا ہوگا اور جب تک وہ مجھے نہیں مل جاتی، آپ کو میرا پاگل پن نظر آتا رہے گا۔'' میں نے کال کاٹ دی۔

آج ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ قادر پور میں حق نواز کے گھر ہونے والے واقعے کے بعد وہاں سے میں سیدھا مراد آباد حویلی پہنچا۔ ابا جی اور نواب صاحب نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ انہوں نے آشتی کو اغوا کروایا ہے۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس بار جوا بھی میری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ ابا جی کا خاص کارندہ ماکھا غائب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آشتی کو ماکھا ہی لے کر کہیں غائب ہوا ہے مگر جب چار پانچ دنوں تک میں ناکام ہی رہا تب میں نے ابا جی اور نواب صاحب سے کھلی بغاوت کرتے ہوئے ان کے خفیہ و ظاہری اڈوں پر حملے شروع کر دیے۔ ابا جی کے فارم ہاؤس والے گودام اور آج نواب صاحب کا یہ ڈیرہ میں نذرِ آتش کر کے اپنے اندر کی آگ انہیں دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غصے میں میرے ہوش و حواس کھوتے جا رہے تھے۔ مجھے اس وقت کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا جس کی وجہ سے میرا پاگل پن بڑھتا جا رہا تھا۔ میں یہاں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا لیکن میری محبت میرے

مقصد کے آگے اس طرح دیوار بنی تھی کہ میں باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ ان دنوں میرا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ حویلی میرے لیے ممنوعہ قرار دی جا چکی تھی۔ شوکے اور حق نواز کے گھر بھی محفوظ نہیں تھے۔ میں آشتی کی تلاش میں تھا جب موبائل پھر سے وائبریٹ کرنے لگا۔ اب کی بار جواد تھا۔

''کامی! کہاں غائب ہو تم؟ میں نے تمہیں ایک گھر کا پتا دیا تھا کہ وہاں رہ لو مگر تم گئے ہی نہیں۔'' وہ ناراضی بھرے انداز میں بولا۔

''مجھے کسی بات کا ہوش نہیں جودی...... مجھے تو اپنی بھی خبر نہیں ہے۔''

''اوہ خدایا! کامی کیوں خود کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ابھی ابھی مجھے نواب صاحب کے ڈیرے کے بارے میں اطلاع ملی تو میرا دھیان فوراً تمہاری طرف گیا۔''

''ایسی اطلاعات تمہیں ملتی رہیں گی جب تک مجھے آشتی نہیں مل جاتی۔ بتا دینا چودھری حشمت علی اور نواب شبیر احمد کو۔''

''میں نے بہت کوشش کی لیکن آشتی کا پتا نہیں چل سکا۔ مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے اسے......'' وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

''نہیں جودی! مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ نواب کو وہ ہیرے چاہئیں جو آشتی کے پاس تھے۔''

''لیکن تم نے بتایا تو تھا کہ تم نے وہ ہیرے آشتی کے حوالے کر دیے تھے۔ اب تک تو وہ نواب کے پاس پہنچ بھی گئے ہوں گے۔'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''جانتا ہوں لیکن ایک بات کوئی نہیں جانتا۔ جو ہیرے میں نے آشتی کو دیے تھے، وہ نقلی تھے۔ اصلی ہیرے اب بھی میرے پاس ہیں۔''

''کیا؟'' وہ زور سے چلّایا۔ ''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے نقلی ہیرے کہاں سے آ گئے بیچ میں؟''

''اسے میرا ٹرمپ کارڈ سمجھو۔ وہ نقلی ہیرے میں نے کسی اور مقصد کے لیے منگوائے تھے لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر ہیرے نواب کے پاس چلے گئے تو وہ آشتی کو مارنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ اسی لیے جو ہیرے میں نے آشتی کو دیے تھے، وہ نقلی تھے۔ وہ نقلی ہیرے میں نے شہر سے اپنے ایک دوست کے ذریعے منگوائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اگر انہوں نے کبھی آشتی کو اغوا کر لیا تو نقلی ہیروں کی وجہ سے وہ اسے کم از کم جان سے نہیں ماریں گے بلکہ اس کے بعد وہ آشتی کے بجائے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تم سمجھ لو میں آشتی کو بچانے کی خاطر اس کا جرم اپنے سر ڈال چکا ہوں۔''

''ہوں...... چل ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا پھر بات ہوگی۔'' اختتامی فقروں کے بعد کال ختم ہوگئی۔ میں بھوسے کے اس ڈھیر پر لیٹ گیا جو درختوں کے اس جھنڈ میں میرے لیے گرم بستر سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

میری آنکھیں کھلیں تو سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ متلی کی سی کیفیت تھی لیکن چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ میں ایک لوہے کی کرسی پر رسیوں سے بندھا ہوا بیٹھا تھا جس کے پائے زمین کے اندر تک دھنسے ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد تھا میں رات کو بھوسے کے ڈھیر پر سویا ہوا تھا اور اب یہاں پر اس حالت میں کب پہنچا تھا، مجھے قطعی علم نہ تھا۔ اگر میں غلط نہیں تھا تو یہ سر درد اور متلی کی کیفیت اس بدنام زمانہ کلوروفام کے اثرات کا ہی دوسرا نام تھا۔ یعنی مجھے سوتے ہوئے ہی بے ہوش کیا گیا تھا اور یہاں لا کر باندھ دیا گیا۔ شاید بلکہ یقیناً میرا ٹرمپ کارڈ کام کر گیا ہوگا۔ جیسے ہی نواب کو نقلی ہیروں کا علم ہوا، اس نے مجھے اغوا کر لیا ہوگا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والوں کو دیکھ کر میری طویل سانس خارج ہوگئی۔ آنے والے پانچ افراد تھے اور سبھی مسلح۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی، صرف کمرے کے مختلف حصوں میں جا کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے پلاسٹک کی کرسی اٹھائی ہوئی تھی۔ اس نے کرسی عین میرے سامنے کچھ فاصلے پر رکھ دی اور خود دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ کوئی آنے والا تھا یا شاید...... نواب صاحب ہی تشریف لانے والے ہوں۔ چند لمحوں بعد کوئی اندر داخل ہوا اور اسے دیکھ کر میں بت بنا رہ گیا۔ اگر کوئی مجھے یہ کہتا کہ قیامت آ گئی ہے تو میں یقین کر لیتا لیکن اس منظر پر یقین کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے سامنے آشتی تھی۔ اس نے سرخ و سیاہ رنگ کے امتزاج سے بنا لباس پہن رکھا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کا روپ نکھار دیا تھا۔ سرخ ہونٹ مسکراہٹ کے سے انداز میں کھنچے ہوئے تھے۔ وہ ایک شاہانہ چال چلتی ہوئی میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور سگریٹ سلگا لیا۔ ایک لمبا سا کش لے کر اس نے دھواں نگلنے کے بجائے میرے چہرے پر اگل دیا۔

''ہیلو کامران! کیسے ہو تم؟'' میں گنگ بیٹھا رہا۔ جواب دیتا بھی تو کیا۔ میرا دماغ تو پنکھے کی رفتار سے گھوم

رہا تھا۔

''شاید تم اپنی ''محبت'' کو بھول گئے۔ ارے بھئی میں آشتی ہوں...... تمہاری آشتی۔ وہی جس کی خاطر تم آسمان سے تارے توڑ کر لانا چاہتے تھے۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہے جارہی تھی۔

''ارے بھئی کچھ بولو تو سہی۔ میں جانتی ہوں تمہارا ''سینس آف ہیومر'' کتنا اچھا ہے۔ میرے اس انداز پر کوئی خوبصورت سا جملہ کہونا۔'' میں کیا کہتا کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں لمحۂ موجود میں ہوں بھی یا نہیں۔ میرے سامنے وہی آشتی ہے یا نہیں۔ میں کیا کہتا کہ حیرت کے مقام انتہا پر الفاظ مرجاتے ہیں۔

''لگتا ہے تمہیں بہت شاک لگا ہے مجھے دیکھ کر۔ ہاں لگنا بھی چاہیے۔ تمہیں کیا لگتا تھا، تمہیں دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگتی تھیں؟ یا پھر تمہارے ڈائیلاگ سن کر میرے کانوں میں وائلن بجنے لگتے تھے؟ جانتے ہو جب تم نے پہلی بار مجھ سے اپنی اس ''محبت'' کا اظہار کیا تھا تو میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر کتنا روئی تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتی تو شاید قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی۔ تم مرد بھی نا کمال کرتے ہو۔ کوئی لڑکی تم سے دو میٹھے بول کیا بول دے، تم دیوداس بن کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہو۔ اپنی مثال ہی لے لو۔ میرے خیال میں تم اچھے بھلے سمجھ دار انسان ہو لیکن میری جھوٹی کہانی پر جھٹ سے اعتبار کر لیا اور اپنے ہی باپ کے دشمن بن گئے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ مرد چتنا بھی ذہین ہو کبھی بھی عورت کو نہیں سمجھ سکتا۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میری سماعتوں میں ایک ہی بازگشت گونج رہی تھی۔

وہ سفاک لہجے میں بولی۔ ''اتنا تو تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ میں نے تمہیں صرف استعمال کیا تا کہ میں ہیروں تک پہنچ سکوں جو میں نے غلطی سے تمہیں تھما دیے تھے۔ باقی بہت کچھ تمہیں بتانے کو رہ گیا ہے لیکن وہ بعد میں...... پہلے ہم کام کی بات کر لیں۔ ہاں تو مسٹر کامران! تم نے میری امانت میں خیانت کرتے ہوئے اصلی ہیرے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟ تمہارے پاس اس سوال کا جواب دینے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو فوراً بتا دو، ورنہ کچھ دیر بعد بتا دینا لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس کچھ دیر میں تمہاری آنکھیں، تمہارے ہاتھ، تمہارے پیر اور کئی دوسری چیزیں سلامت نہیں رہیں گی...... اور میں تم سے کوئی رعایت نہیں برتنے والی کیونکہ مجھے تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور نہ ہی میری پوری زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا لمحہ آیا ہے جس میں، میں نے تم سے محبت کرنے کی غلطی کی ہو۔'' اس فقرے کے دوران ہی اس نے یک لخت جلتا ہوا سگریٹ میرے بندھے ہوئے ہاتھ پر بجھا دیا۔ میں ہاتھ کی پشت پر ابھر آنے والے سرخ دائرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مجھے درد کیوں نہیں ہورہا؟ میری خاموشی پر اس کا پارہ چڑھتا گیا۔ وہ چلا کر کچھ بولی لیکن اب مجھے اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا منظر تھا اور میری سماعتوں میں اس منظر میں بولا جانے والا ایک فقرہ گردش کیے جارہا تھا۔ ''یہ مت کہو کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی کیونکہ اس بات سے مجھے درد ہوتا ہے۔'' میں مخبوط الحواس بیٹھا رہا۔

پھر کسی نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اس کے بعد دوسرا اور تیسرا۔ کوئی شے کوڑے کی طرح مجھ پر برسنے لگی۔ اس کے بعد اچانک میرا جسم جھنجھنا اٹھا۔ مجھے لگا کہ جیسے روح جسم سے نکلنے والی ہی ہے مگر اس ساری کیفیت میں مجھے درد محسوس نہیں ہورہا تھا۔

''یہ مت کہو کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی کیونکہ اس بات سے مجھے درد ہوتا ہے۔'' تب میں اسے ماہی کی ایک جذباتی بات سمجھا تھا لیکن آج مجھے پتا چلا کہ جب کوئی یہ جملہ کہتا ہے تو واقعی درد ہوتا ہے۔ میرے ہوش و حواس پر اندھیرا چھا رہا تھا پھر اچانک ہی ڈھیر سارا پانی میرے منہ پر آگرا اور میں کھانستے ہوئے حال میں لوٹ آیا اور میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ایک بندہ پلاسٹک کی بالٹی لیے کھڑا تھا۔ میرا گیلا جسم لہولہان تھا۔ سر سے بہنے والا لہو میرے چہرے سے بہتا ہوا ٹھوڑی پر سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ جبڑا بھی ٹوٹا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ منہ سے خون آلود رال بہہ رہی تھی اور میرا لباس تاروں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنی خستہ حالت میں بھی میں اپنے پورے ہوش میں کیسے ہوں؟ مجھے تو درد سے بے حال ہوجانا چاہیے تھا لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس مخدوش حالت میں بھی میں جو درد محسوس کر رہا تھا، وہ اس کے الفاظ کا درد تھا۔

''اصلی ہیرے کہاں ہیں کامران۔'' ایک چلاتی ہوئی آواز نے میرے حواس بحال کیے۔

''ہیرے...... اصلی ہیرے؟'' پھر مجھے یاد آگیا کہ میں کہاں ہوں اور وہ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے۔

''ہاں...... تمہارے اصلی ہیرے میرے پاس ہی ہیں...... میرے پاس۔''

''کہاں ہیں وہ؟ بتاؤ...؟'' وہ مجھے جھنجوڑ رہی تھی اور میں غائب دماغی سے دیکھتا جا رہا تھا۔ ان کانچ جیسی شفاف آنکھوں میں جو میں دیکھنے کا خواہش مند تھا، وہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا...... صرف غصہ تھا...... نفرت بھرا غصہ۔

''تم بتاؤ گے...... سب کچھ بتاؤ گے۔ اگر مجھے نہیں بتاؤ گے تو کسی اور کو تو ضرور بتادو گے اور وہ ''کوئی اور'' بہت جلد یہاں آنے والا ہے۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''کوئی اور...... نواب شبیر احمد؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''نواب شبیر...... ہونہہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''شاید اب بھی تم اس احمقانہ سی بات پر یقین کیے بیٹھے ہو جو میں نے تمہیں بنا سوچے سمجھے کہی تھی۔ کمال کی بات ہے۔ کیسے صحافی ہو تم۔ تم تو بات کی تہ تک پہنچنے والے لوگ ہوتے ہو۔ بہر حال، تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ نواب شبیر کا منشیات اور ہیروں والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں جس کے لیے کام کرتی ہوں، وہ بندہ کوئی اور ہے۔ اس سے مل کر تمہیں یقیناً خوشی محسوس ہوگی کیونکہ وہ میرا شوہر بھی ہے۔''

یہ ایک اور دھماکا تھا۔

''کون ہے وہ؟'' میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کیا آشتی کی اصلیت سے بڑا بھی کوئی راز فاش ہونے والا تھا؟ کیا میرا ریزہ ریزہ ہونے والا وجود کسی اور دھماکا خیز انکشاف کا متحمل ہوسکتا تھا؟ اسی وقت دروازے سے باہر کوریڈور میں بھاری قدموں کی آواز گونجی۔ میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے کمرے میں داخل ہوا۔ آشتی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

''اوہ ڈارلنگ! تم نے اتنی دیر کیوں کردی؟'' آشتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ آنے والے نے سر کو ترچھا کیا تو اس کی چمک دار اور مسکراتی ہوئی آنکھیں آشتی کے سیاہ بالوں کے پیچھے سے مجھ پر جم سی گئیں۔ اس نے آہستگی سے آشتی کی بانہوں کو پیچھے کیا اور میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ سفید کاٹن کے بے داغ سوٹ اور سیاہ پشاوری چپل پہنے وہ بڑا ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ میرے اندازوں کے سارے محل ایک لمحے میں چکنا چور ہوتے چلے گئے۔

''صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ سوال پوچھتا، میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دے دیا۔

''اصلی ہیرے نازو کے پاس ہیں...... جواد!''

سچ کہا تھا آشتی نے۔ میں اسے دیکھتے ہی بتادوں گا کہ ہیرے کہاں ہیں اور اب اسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ ان ہیروں کا کوئی مول نہیں ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی چیز کا کوئی مول نہیں ہے۔ یہاں ہر رشتہ اور ہر جذبہ اتنا بے وقعت ہے کہ ان کا کوئی مول ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کوئی اور نہیں میرا یار، میرا کزن، میرا اپنا بہت ہی پیارا...... جواد تھا۔

''آشتی نے تمہیں جو اپنی کہانی سنائی ہے، وہ کافی حد تک درست ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی بہن کو بچاتے ہوئے ایک قتل کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ پھر وہ منشیات کے چنگل میں پھنس کر رانا ایوب تک پہنچ گئی تھی۔ ساری کہانی سچ ہے سوائے اس کی آخری باتوں کے جو کہ اس نے مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد تبدیل کردی تھیں۔ رانا ایوب کی گرفتاری کے بعد جب آشتی ہیرے لے کر نکل رہی تھی تب بگ باس نے اسے ہیروں کے بدلے اس کے گھر والوں کا پتا بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ بگ باس اس سے پاکپتن کی ایک کوٹھی میں ملا تھا لیکن وہ نواب شبیر احمد نہیں تھا...... میں تھا...... میں جواد صدیقی۔'' میرے جسم میں سنسنی سی دوڑتی جا رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک انکشاف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بولتا رہا۔ ''اور وہاں بھی میری آشتی سے پہلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جس لڑکے نے کالج میں آشتی کی مدد کی تھی، اس کا نام بھی فیصل نہیں تھا۔ وہ بھی میں تھا...... جواد صدیقی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں کالج میں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن وہ محبت ابھی اقرار کے مرحلے سے دور تھی۔ میں اس وقت بھی اسی گینگ کا بگ باس تھا۔ آشتی کے ہاتھوں جعفری کے قتل کے بعد میں نے ہی اسے بچایا اور پھر جب رانا ایوب کی گرفتاری نے میرے گینگ کا شیرازہ بکھیر دیا تو ایک بار پھر مجھے آشتی کے سامنے آنا پڑا۔ یہ بہت بدل گئی تھی۔ کالج کی ڈرپوک اور سہمی ہوئی آشتی کی جگہ میرے سامنے ایک دلیر اور نڈر لڑکی کھڑی تھی۔ یہ بھی مجھے اپنے بگ باس کے روپ میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ اسے یہاں بلانے کا مقصد اس سے صرف ہیرے حاصل کرنا نہیں تھا۔ میں نے اسے اس کے گھر والوں کا پتا بتادیا اور پہلی بار اس سے محبت کا اقرار بھی کیا اور کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جواباً اس نے کہا کہ اسے ابھی تو اپنے گھر والوں کی فکر ہے، وہ کچھ دن سوچ کر میری بات کا جواب دے گی۔ یہ وہاں سے چلی گئی اور مجھے لگا کہ میں اب اس کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ کیا ہیرے اور کیسے مقاصد۔ سبھی محبت کی لہر میں بہہ گئے۔ آشتی نے ایک ہفتے بعد مجھ سے رابطہ کیا اور خوشخبری سنائی کہ اس نے میری

بات مان لی ہے۔ دراصل در در بھٹکنے کے بعد اسے بھی کسی مضبوط سہارے کی تلاش تھی۔ ہماری شادی ''موسی وال'' کے ایک کچے گھر میں ہوئی جہاں آشتی کی فیملی رہ رہی تھی۔ میں نے شادی کے بعد بھی آشتی کو وہیں رکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ماماجی (چودھری حشمت علی) اسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر ایک چھوٹا سا توقف کیا اور بولا۔ ''جب میں ساہیوال میں بی کام کر رہا تھا تبھی ایک دن میری ملاقات ایک غیر ملکی ''ڈیوڈ گرین'' سے ہوئی۔ وہ منشیات کے ایک عالمی ریکٹ کا رکن تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی کمپنی چاہتی ہے کہ چودھری حشمت علی کے خفیہ راستے کے ذریعے منشیات بھی اسمگل ہوں اور اس کام کے لیے اس نے مجھے پیشکش کی کہ میں خفیہ طور پر اگر یہ کام کرسکوں تو وہ مجھے لاکھوں روپے معاوضہ دیں گے۔ میں نے ان کی یہ پیشکش قبول کرلی تھی اور پھر بڑی جدوجہد کے بعد رانا ایوب جیسے ایک دوست کی مدد سے میں نے پورا نیٹ ورک تیار کرلیا تھا۔ ڈیوڈ اینڈ کمپنی افغانستان سے منشیات پاکستان اسمگل کرتی تھی۔ اس کام کے لیے میں نے بڑی محنت کی اور ماماجی کے بڑے خاص خاص بندوں کو بھاری معاوضوں پر اپنے ساتھ ملایا اور ماماجی کا خفیہ راستہ بھی استعمال کیا لیکن پھر رانا ایوب گرفتار ہوا اور میرا نیٹ ورک بکھر گیا مگر آشتی سے جڑ جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میری آشتی میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ وہ اکیلی بہت کچھ کرسکتی ہے۔ یہ جانتی تھی کہ میں چودھری حشمت علی کا بھانجا ضرور ہوں لیکن میرے پاس اپنی کوئی جاگیر یا بینک بیلنس نہیں ہے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہمیں بہت سارا پیسا چاہیے تھا۔ میں نے اور آشتی نے مل کر دوبارہ کام کا آغاز کیا اور آشتی نے ثابت کیا کہ وہ اکیلی بہت سی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ یہ مارشل آرٹ کی ماہر تھی، میک اپ کے ذریعے اپنی شناخت چھپالیتی تھی اور اداکاری تو اسے خوب آتی تھی۔

''رانا ایوب کی گرفتاری کے بعد ڈیوڈ اینڈ کمپنی ہمارا ساتھ چھوڑ چکی تھی اس لیے میں نے خود مختلف ممالک میں موجود اسمگلروں سے رابطے کیے اور اپنے طور پر کام شروع کرلیا۔ ہم نے منشیات کی پہلی کھیپ بڑی کامیابی سے بھیجی اور اس کا معاوضہ بھی ہیروں کی صورت میں ہمیں مل گیا۔ پہلی کھیپ سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اس کام میں بہت زیادہ منافع مل سکتا ہے لیکن افسوس کہ ہمیں دوسری کھیپ بھیجنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ایک دن ایک چھوٹی سی غلطی کے ذریعے ماماجی کے خاص آدمی ماکھے کو علم ہوگیا کہ نوادرات کی آڑ میں منشیات بھی اسمگل ہورہی ہیں اور اس کام میں آشتی ملوث ہے۔ مجھے فوراً آشتی کو منظر سے ہٹانا تھا۔ لہٰذا میں نے وہ سارے ہیرے اس کے حوالے کیے اور اسے لاہور روانہ کردیا۔ آشتی کو یہ ہیرے ہمارے ایک خاص آدمی کو پہنچانے تھے جس کا نام وسیم احمد تھا۔ وہ میرا پرانا دوست اور بہت بڑا اسنار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہیرے بیچ کر ہمیں جو رقم ملے اس کے ذریعے ہم پاکستان سے باہر جانے کا بندوبست کرلیں لیکن افسوس اسی دن وسیم احمد کی جیولر شاپ پر ایک ڈکیتی کے دوران اسے قتل کردیا گیا۔ میں نے آشتی سے کہا کہ وہ ہیروں کو کسی بینک لاکر میں محفوظ کرکے واپس مراد آباد آجائے لیکن اسی دوران آشتی کو اندازہ ہوا کہ کوئی مسلسل اس کے تعاقب میں ہے۔ یہ ماکھے کے آدمی ہی تھے اور انہوں نے آشتی کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہیرے چھپاسکے۔ اسی بھاگم بھاگ میں آشتی نے واپس گاؤں آنے کا فیصلہ کرلیا لیکن وہ لوگ ٹرین میں بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ آشتی نے میک اپ کے ذریعے اپنا بہروپ بدل رکھا تھا لیکن... پھر بھی وہ ہیروں سے متعلق پریشان تھی۔ اسی دوران مجھے تمہارا فون موصول ہوا کہ تم گاؤں آرہے ہو۔ میں نے آشتی کو تمہارا حلیہ بتا کر کہا کہ اگر صورت حال زیادہ خراب ہوتو وہ ہیرے کسی بہانے سے تمہارے حوالے کردے۔ میں نے آشتی کو نہیں بتایا تھا کہ تم کون ہو۔ بس اتنا کہا تھا کہ تم اس کے ہیروں کی مکمل حفاظت کروگے کیونکہ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جانتا تھا اور آشتی نے ایسا ہی کیا۔'' میں خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا۔

''اس کے بعد ہم نے جمعرات کا بے صبری سے انتظار کیا کیونکہ جمعرات کو مزار پر تم نے ہماری امانت لوٹانی تھی لیکن مزار پر بھی ماکھے کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ وہیں آشتی کو تمہاری اصلیت معلوم ہوئی تو وہ گھبرا کر واپس میرے پاس آگئی اور اس کی بات سن کر میں نے اسے تسلی دی کہ کامران تمہیں نہیں جانتا اس لیے تم اسے اسی طرح اجنبی بن کر ملو اور ہیرے واپس لو۔ اس دوران میں خود بھی ایک رات تمہارے کمرے کی تلاشی لے چکا تھا لیکن مجھے وہ ہیئر کلپ نہیں ملا۔ لہٰذا تم سے کیے گئے وعدے کے مطابق آشتی پرانے رہٹ پر پہنچی لیکن ماکھا اس کے پیچھے وہاں بھی پہنچ گیا اور اس بار وہ بچ نہیں سکی۔ یہ وہ وقت تھا جب میں ماماجی کے ساتھ چولستان شکار پر گیا ہوا تھا۔ ماکھے نے آشتی کو

کہاں چھپایا تھا، مجھے بالکل علم نہیں تھا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ تم نے آشتی کو ڈھونڈ لیا اور اس سے پہلے کہ تم اسے آزاد کرواتے، ماماجی نے آشتی کو نواب شبیر احمد کے حوالے کر دیا۔ اس وقت تک مجھے علم ہو چکا تھا کہ آشتی کو کہاں قید کیا گیا ہے اور میں اسے چھڑوانے کا منصوبہ ہی بنا رہا تھا کہ تم نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے تمہیں استعمال کرنے کا سوچا لہٰذا میں نے آشتی کا پتا تمہیں بتا دیا اور تم نے تو کمال ہی کر دیا...... بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح حملہ کیا اور اسے بچا لائے۔ اس کے بعد میں نے شوکے کو تمہاری مدد کے لیے بھیجا اور شوکے نے ہی آشتی کو ایک موبائل فون دیا جس سے آشتی نے چھپ کر مجھ سے رابطہ کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔ تبھی میں نے ایک اور پلان بنایا اور آشتی سے کہا کہ وہ بھی تم سے محبت کا ڈھونگ رچائے۔ آشتی نے ایسا ہی کیا اور اس نے تمہیں اپنی مظلومیت کی ایسی داستان سنائی جسے سن کر تم آشتی کے حمایتی بن کر اپنے ہی باپ اور نواب صاحب کے دشمن بن گئے اور پھر اپنی محبت کے نشے میں چور ایک دن تم نے اسے ہیرے واپس کر دیے۔ آشتی چاہتی تھی کہ وہ فوراً واپس آ جائے لیکن میں اس پلان کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اگر ایک طرف مجھے آشتی اور ہیروں کی فکر تھی تو دوسری طرف مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ چودھری حشمت علی کے بیٹے نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اب اگر آشتی غلط ثابت ہو جاتی تو تمہاری بغاوت بھی دم توڑ جاتی اور میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے حق نواز کے گھر پر حملہ کر کے آشتی کو اغوا کرنے کا ڈراما کھیلا اور اس طرح کھیلا کہ تمہیں لگے کہ یہ سب کچھ نواب صاحب نے ہی کیا ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور نواب کی کھلی جنگ ہوتی اور یہی ہوا۔ تم نے واقعی کمال کر دیا۔ نواب کے ڈیرے کے ساتھ ساتھ اپنے ہی باپ کے گوداموں کو بھی جلا ڈالا۔ مجھے بہت خوشی ہوتی اگر یہ جنگ جاری رہتی لیکن مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ہیرے تو نقلی ہیں تو میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں تمہارے سامنے آ جاؤں۔ ویسے بھی اب مزید ڈراموں کی ضرورت نہیں رہی۔ تمہارے بتا دینے کے بعد ہیرے مجھے مل ہی چکے ہیں۔ اب میں اور آشتی ہیروں سمیت اس گاؤں سے بلکہ اس ملک سے ہی چلے جائیں گے۔ ہاں، ایک چھوٹا سا ڈراما یہ ضرور ہوگا کہ تمہاری موت کو یوں ظاہر کیا جائے جیسے کہ تمہیں نواب کے آدمیوں نے مارا ہے۔ اس طرح چودھری حشمت علی اور نواب کے درمیان بھی دوری پیدا کی جا سکتی ہے۔'' اس نے بات ختم کرنے کے بعد یوں مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے مجھ سے اپنے کارناموں کی داد وصول کرنا چاہتا ہو۔

''تم نے ایسا کیوں کیا...... جواد؟'' میں نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

''میں نے ایسا کیوں کیا؟ اچھا سوال ہے۔'' وہ اچانک ہی بے چین سا ہو گیا جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''تم نہیں سمجھ سکتے۔ کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے ایسا کیوں کیا کیونکہ تم ایک آن بان اور شان والے چودھری کی اولاد ہو۔ تمہیں دنیا کی ہر نعمت پلیٹ میں رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ سونے کا چمچ لے کر تم پیدا ہوئے اور آج تک وہ چمچ سونے کا ہی رہا۔ پھر تم کیسے جان سکتے ہو کہ جو بندہ دوسروں کی پھینکی ہوئی روٹی پر زندگی گزار رہا ہو، اس پر کیا بیتتی ہے۔ تمہارا بینک بیلنس تو آج تک لاکھوں کے ہندسوں سے کم نہیں ہوا تو تم یہ کیسے سمجھ سکتے ہو کہ جب کوئی نوٹوں کی گڈی دیتے ہوئے کہتا ہے...... یہ لو اس مہینے کا خرچ تو عزتِ نفس پہ کیا گزرتی ہے۔ کیا جاگیر میں میری ماں کا حصہ نہیں تھا؟ اور اس کے علاوہ میرے باپ کی جائداد بھی تو تھی...... لیکن ان کے مرجانے کے بعد ماماجی نے اپنی بہن کی کفالت کا ڈراما رچاتے ہوئے ایک طرف زمانے کو یہ بتایا کہ وہ اپنی بیوہ بہن اور یتیم بھانجے سے کتنی محبت کرتے ہیں تو دوسری طرف بڑی خاموشی سے ہماری جاگیر کا حصہ بھی ہڑپ کر گئے...... مگر تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے کامی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا اور میں واقعی کچھ بھی نہیں سمجھ پایا۔

''جان! کیوں وقت برباد کر رہے ہو اس پر۔ ہمیں ہیرے مل چکے ہیں۔ ہمیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔'' اچانک آشتی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ آشتی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو آشتی۔ ہمیں مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اب ان باتوں سے کیا مطلب۔''

پھر وہ میری طرف مڑا۔ ''مجھے معاف کر دینا کامی۔ میں تمہارے معاملے میں مجبور ہوں۔ میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری قسمت تمہیں بار بار ہمارے آڑے لا رہی ہے۔ ہم یہاں سے دور جا رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے ہمارا راز وقت سے پہلے ہی فاش ہو جائے۔ اس لیے تمہارا مرجانا ہی ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔'' اس نے کولٹ پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔ میں اتنا

پُرسکون تھا کہ مجھے خود پہ حیرت ہو رہی تھی۔ حالانکہ جو میں دیکھ اور سن چکا تھا، مجھے کسی بھی وقت برین ہیمبرج ہو سکتا تھا مگر جانے کیوں اس "پہلی تکلیف" کے بعد اب میں اتنا بے حس ہو چکا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اگلے چند منٹوں میں مرنے والا ہوں، مجھے نہ تو خوف محسوس ہو رہا تھا اور نہ ہی زندگی کی تمنا باقی رہ گئی تھی۔ جسے دل میں جگہ دی جاتی ہے تو اسے یہ حق بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اس گھروندے کے ساتھ من چاہا سلوک کرے۔ انسان اپنی ساری زندگی اسی کھوج میں لگا دیتا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے؟ جب اس پر اس دنیا کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے، تب وہ مر جاتا ہے۔ مجھے بھی اب زندہ رہ کر کیا کرنا تھا۔ کہ میں دنیا کی حقیقت کو اس لمحے میں پہچان گیا تھا۔ میرے ماتھے سے بہنے والا خون میری پلکوں سے ہوتا ہوا آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ مجھے اس وقت ساری دنیا خون میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھی...... اسی خون آشام منظر میں، میں نے جواد کو دیکھا۔ اس نے پستول کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش نہیں تھی، چہرے پر ملال نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا دے گا لیکن میں اس کے ساتھ کھڑی آشتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دشمن جاں صرف ہونٹوں سے کہہ دیتی کہ "کامران مر جا......" تو میں مر جاتا۔ جواد کی انگلی ٹریگر پر دباؤ بڑھانے لگی۔

"تو مجھے مارے گا جودی۔ اپنے سب سے اچھے دوست کو۔ اپنے بھائی کو؟ اتنا حوصلہ کہاں سے لے آیا ہے جگر؟" میں نے بھیگی آواز میں کہا۔

"کاش تو اس معاملے میں نہ پڑتا اور مجھے یہ سب اس طرح نہ کرنا پڑتا لیکن میں مجبور ہوں کامی۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تو بچ گیا تو چودھری حشمت علی کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ اس لیے تجھے مرنا ہی ہوگا میرے یار۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک باہر سے تیز فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یوں لگا جیسے پوری فوج نے اس گھر پر حملہ کر دیا ہو۔ تڑتڑاہٹ کی گھن گھرج میں کئی برسٹ کھڑکیوں کو توڑتے ہوئے کمرے کی دیواروں میں پیوست ہونے لگے۔ کمرے میں موجود بھی افراد اپنے آپ کو بچاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگے۔ حتیٰ کہ کمرے کے وسط میں کرسی سے بندھا میں اکیلا رہ گیا۔ میں خود کو اس کرسی کی بندش سے چھڑانے لگا لیکن اسی لمحے کھلے دروازے کے باہر سے کولٹ پسٹل کا دھماکا ہوا۔ میں نے ایک تیز گرم سلاخ کو اپنے جسم میں گھستے ہوئے محسوس کیا۔ دروازے سے باہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں گولی جواد نے چلائی تھی یا آشتی نے...... یا پھر یہ ان کے کسی آدمی کی گن سے نکلی تھی۔ بس یہ اتنا تھا کہ اس پر میرا نام لکھا تھا۔ درد کی ناقابل برداشت لہر میرے سینے سے اٹھنے لگی۔ میں سختی سے دانت بھینچے اپنی چیخ کو روکتا رہا۔ حتیٰ کہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

محبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہمیں اس کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہمیں اس کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگے۔ بالکل انسان کی زندگی کی طرح...... یوں اچانک شروع ہو جاتی ہے کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ہم پیدا ہوئے اور کب بڑے ہو گئے اور یہ زندگی اس وقت اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے جب ہم جینا سیکھ چکے ہوتے ہیں اور مزید جینے کی چاہ لیے ہوتے ہیں۔ مجھے زندگی کی ضرورت نہیں رہی تھی، شاید اس لیے مجھے دوبارہ زندگی لوٹا دی گئی۔ گولی میرے دل میں گھسنے کے بجائے ٹیڑھے راستے پر جا نکلی۔

میں ساہیوال کے ایک مہنگے ترین پرائیویٹ اسپتال کے کمرے میں تھا۔ یہاں بھائی شفیق اور عمران موجود تھے۔ میری حالت خطرے سے باہر ہو چکی تھی اور اب مجھے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں میرا مکمل خیال رکھ رہے تھے۔ جب سے میں ہوش میں آیا تھا، میں نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دونوں بھائی خود ہی بولتے رہتے، میں بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہتا۔ انہی دنوں میں ایک دن عمران بھائی نے بتایا کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچے۔ آشتی کا پیچھا کرتے ہوئے ماکھا اور اس کے آدمی عین اس وقت وہاں پہنچے جب مجھے گولی مارنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس عمارت پر دھاوا بول دیا۔ وہاں پندرہ منٹ شدید فائرنگ کے بعد جواد کے سارے آدمی مارے گئے جبکہ وہ خود آشتی سمیت نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب ماکھے کو اندازہ نہیں تھا کہ اندر میں کس حال میں ہوں۔ جب وہ مجھ تک پہنچا تب تک میں گولی کا شکار ہو چکا تھا۔ مجھے شدید تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ میری کہنی اور گھٹنے کا جوڑ متاثر ہوئے تھے۔ بجلی کا کرنٹ بھی لگایا گیا تھا۔ ماکھے نے فوراً مجھے مراد آباد کے اسپتال پہنچایا جہاں طبی امداد کے بعد مجھے شہر روانہ کر دیا گیا۔ اسی دوران میں وہ چودھری حشمت علی کو اطلاع دے چکا تھا۔ اس ساری افراتفری میں کسی کا دھیان جواد اور آشتی کی طرف نہ گیا اور وہ دونوں فرار ہو گئے۔

قدرت نے میرے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا کہ جن

لوگوں سے میں نے محبت کی تھی، انہوں نے ہی مجھ سے میری زندگی چھیننے کی کوشش کی اور جن سے میں نے نفرت کی تھی، انہوں نے میری زندگی بچالی۔ میں جب تک جاگتا رہتا کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے شیشوں سے باہر خوبصورت پھولوں کو دیکھتا رہتا۔ جب یہ منظر دیکھ دیکھ کر آنکھیں دکھنے کی حد تک تھک جاتیں تو سو جاتا۔ دن گزرتے گئے اور مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ جس دن میں حویلی پہنچا تو ساری حویلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ بڑے گیٹ سے رہائشی عمارت تک آتش بازی کی گئی۔ سب سے پہلے بھرجائی نے مجھے گلے لگایا اور کتنی ہی دیر روتی رہیں۔ میں نے انہیں چپ کرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ پھر نازو ڈبڈبائی آنکھوں سے سامنے آئی۔ مجھے اوپر میرے کمرے کے بجائے نیچے ہی ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ یہ کمرا میرے لیے ہی سیٹ کیا گیا تھا۔ میرے بستر کے اردگرد سبھی گھر والے آن کھڑے ہوئے۔ عمران بھائی، نازو اور بھرجائی کو تفصیل سے بتا رہے تھے کہ مجھے دوائیں کیسے اور کب دینی ہیں۔ کھانے میں کیا اور کیسا کھلانا ہے اور دوسری ہدایات وغیرہ تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ پھر جس وقت آنکھیں کھلیں تو باہر رات ہو چکی تھی جبکہ کمرے میں ہلکے پاور کا ایک بلب روشن تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تبھی چوڑیوں کی کھنکناہٹ نے سناٹے کو توڑا۔ میں نے سر گھما کر دائیں جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے کوئی فرشتہ میرے داہنی جانب بیٹھا ہے لیکن وہ ماہی تھی۔ سفید براق لباس اور سفید حجاب کیے وہ ایک جائے نماز پر دعا کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے بیٹھی آسمان سے اتری کسی پاکیزہ مخلوق کے مانند ہی نظر آ رہی تھی۔ میری آہٹ پا کر اس نے جلدی سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرتے ہوئے میری طرف آ گئی۔

''کچھ چاہیے کامران؟'' سفید حجاب میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''پانی۔'' میں نے آنکھیں موندتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تو اس نے فوراً پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہاتھ میری گردن کے عقب میں ڈال کر مجھے ذرا سا اٹھا کر پانی پلایا۔

''درد تو نہیں ہو رہا؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے کہا تو وہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''کیسی ہو ماہی؟'' میں نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن میں ڈر گیا تھا کہ اگر تم نے مجھے معاف کر دیا تو......'' میں رک گیا۔

''میں نے معاف کر دیا تو؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولی۔

''تو کہیں یہ محبت کی ریت ہی نہ پڑ جائے۔ مجھ جیسوں کو معافی نہیں، سزا ملنی چاہیے۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔''

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ''تم سو گئے تھے اس لیے رات کی دوا نہیں لی۔ ابھی دوں؟'' وہ خود ہی بولی۔

''آں...... نہیں۔ دوا سے مجھے پھر نیند آ جائے گی اور میں مزید سونا نہیں چاہتا۔ تم مجھ سے باتیں کرو۔'' میں نے کہا۔ وہ میرا دل بہلانے کو باتیں کرتی رہی۔ کچھ بچپن کی یادیں، کچھ شرارتیں، کچھ ایسا وقت جب ہم بہت اچھے دوست تھے۔ وہ مجھے سناتی رہی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ یہ وہ تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ میں، وہ، نازو اور جواد ہم سب اکٹھے ہی پلے بڑھے تھے اور ہم چاروں کی طبیعت بھی ایک جیسی ہی تھی۔ ہر وقت شرارت، ہر وقت مذاق، ہر وقت کسی نہ کسی کو تنگ کرتے رہنا۔ جواد کی یاد میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

''ماہی! تم بہت اچھی ہو لیکن میں بہت برا ہوں۔'' میں نے اچانک اس کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ ہم دونوں بہت اچھے ہیں کامی۔ بُرا وہ وقت تھا جو بیت گیا۔''

''اس وقت کو برا بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ کاش ہماری زندگی ''ری وائنڈ'' ہو سکتی تو جانتی ہو میں کیا کرتا؟ میں زندگی کو بچپن میں ہی رکھتا۔ اپنے آپ کو...... تمہیں...... ہم سب کو کبھی بڑا ہونے ہی نہیں دیتا۔ کاش کہ میں تمہارے درد کا ازالہ کر سکتا۔'' وہ آہستہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی اور ایک پھونک میرے چہرے پر مارتے ہوئے اس نے میری آنکھ کے گوشے سے نکلتے آنسو کو اپنی پور میں سمیٹ لیا۔

''سو جاؤ کامی! سوچیں تکلیف دیتی ہیں...... سو جاؤ۔'' وہ میری پیشانی کو اپنی نازک سی انگلیوں سے دبانے لگی۔ میں اس کے لمس سے شرمندہ سا ہو کر سو گیا۔

ماہی میرے ساتھ ہی رہی۔ میری دوائیں، کھانا اور ایکسرسائز کی تمام ذمے داری اس نے خود ہی اپنے اوپر لے لی۔ عمران، مینا اور احسن...... ماہی کے ساتھ مل کر میری دل جوئی کرتے رہتے۔ روز صبح سے ہی سارے میرے کمرے میں اکٹھے ہو جاتے۔ کبھی کیرم تو کبھی لوڈو، کبھی پہیلیاں تو کبھی کسوٹی کا دور چلتا۔ ڈاکٹروں نے ایک عجیب سی ایکسرسائز

بتائی تھی۔ سینے کی ورزش کرنے کے لیے منہ سے غبارے پھلانے کا نسخہ تجویز کیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ سوائے میرے بھی اسی شغل میں مصروف رہتے۔ کسی کا غبارہ دھماکے سے پھٹ جاتا تو کسی کے ہاتھوں سے چھوٹ کر شوں کی آواز کے ساتھ راکٹ کی طرح پرواز کر جاتا۔ ان کی کوششیں کامیاب رہتیں اور جب بھی میں کسی بات پر بے اختیار ہنس پڑتا، تب ان سب کے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔

ان سارے لمحات میں میں نے نازو کو بہت بدلا ہوا محسوس کیا۔ وہ شریر اور چلبلی سی لڑکی ایک دم خاموش اور سہمی سہمی سی نظر آنے لگی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کے بھائی کی سزا اسے دی جائے گی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ کمرے میں مجھے کھانا دینے آئی تو میں نے اسے پاس بٹھالیا۔

''تمہیں کیا ہوا نازو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مسکرانا بالکل ہی بھول گئی ہو۔''

''نہیں تو...... میں تو بس تمہارے لیے پریشان تھی۔''

وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

''پریشان تو سب ہیں لیکن تم تو خوفزدہ بھی ہو...... کیوں؟'' میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا عمران بھائی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟'' وہ بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی۔

''دیکھو...... اگر کوئی ایسی بات ہے تو فوراً بتا دو۔ مجھے بھائی سے زیادہ بھابی عزیز ہے۔ تم جانتی ہو نا مجھے میں تو......'' میں یکدم چپ ہو گیا کیونکہ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونے لگی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر میں نے اس کے ہاتھ چہرے پر سے ہٹا دیے۔

''بھائی نے...... ایسا کیوں کیا کامی...... وہ تو...... وہ تو بہت اچھے تھے۔ وہ تو ہم سب سے زیادہ تمہارے قریب تھے...... وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔''

''کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں نازو جو اچھے انسان کو برا بنا دیتی ہیں۔ ویسے بھی جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس سب میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے پھر تم کیوں خوفزدہ ہو؟ تم صرف جواد کی ہی نہیں میری بہن بھی تو ہو اور میں اپنی بہن کے چہرے پر آنسو نہیں صرف اور صرف مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز...... میری خاطر ہی پریشان ہونا چھوڑ دو۔ مجھے وہی پرانی شرارتیں کرنے والی نازو بھابی چاہیے...... سمجھی تم!'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اباجی اور نواب صاحب بھی آجاتے اور ان کے آتے ہی سارا شرارتی ٹولا غائب ہو جاتا۔ اباجی بس روایتی انداز میں حال چال پوچھ لیتے۔ وہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہی تھے۔ نواب صاحب کے سامنے بھی میں شرمندہ ہی ہو کر رہ جاتا لیکن نواب صاحب نے میری ساری غلطیاں معاف کر دی تھیں اور یہ ان کا بڑا پن ہی تھا ورنہ تو میں نے ان سے بہت بدتمیزیاں کی تھیں۔ محبت چیز ہی ایسی ہے۔ جب سارے فیصلے دل کے ہاتھ میں آجاتے ہیں تو بندے کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔

لیکن میری تمام تر کوششوں کے باوجود ایک چہرہ مجھ سے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ اکثر بند آنکھوں سے بھی پانی ٹپک پڑتا۔ ایسی ہی ایک رات میری بند آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے جب کسی کے کومل سے لبوں نے میری آنکھوں کو چھوا اور اس کے ساتھ ہی آنسوؤں کے چند قطرے میرے چہرے پر آگرے۔ میں آنکھیں کھولے بغیر ماہی کی خوشبو کو پہچان چکا تھا۔ اس شام وہ مجھے لان میں لے آئی۔ سبزے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی بھر گئی۔ یہاں گلاب، چنبیلی اور گیندے کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ میرا بایاں بازو اٹھا کر ورزش کروا رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر کوشش کی پھر اپنی تیز ہوتی سانسوں کو سنبھالنے کے لیے گھاس پر بیٹھ گیا۔ ماہی گھاس پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور پھر کتنی ہی دیر خود ہی بولتی رہی۔ میں بڑی خاموشی سے اس کی بے تکان اور بے ربط سی باتیں سنتا رہا۔ پتا نہیں وہ مجھے بہلا رہی تھی یا خود کو۔

''اوہو...... تمہاری دوا تو اندر ہی رہ گئی۔ میں ابھی لاتی ہوں۔'' ایک دم سے اسے خیال آیا تو وہ اٹھنے لگی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر سے بٹھا دیا۔ ایک غبار سا میرے ذہن پر چھا رہا تھا۔ کئی دنوں سے میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہر بار الفاظ لبوں پر آکر دم توڑ دیتے تھے مگر اب جانے کیوں اچانک ہی برداشت ختم ہو گئی۔

''ماہی! تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟ کیا تم بھول گئیں کہ میں کون ہوں؟''

''تم اس طرح کی فضول باتیں کیوں سوچتے رہتے ہو۔'' وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی لیکن میری گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔

''نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی۔ تم یہ کیوں نہیں دیکھتیں کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔ اسی جگہ پر تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیسے کر سکتی ہو۔'' میں چلایا۔ ''کم از کم مجھ پر چلاؤ تو سہی۔ مجھے ویسے ہی دھتکارو جیسے میں نے تمہیں دھتکارا تھا۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اگر مجھ سے نفرت نہیں کر سکتیں تو یہ ہمدردی کا ڈھونگ رچانا بھی بند کرو۔ چلی جاؤ یہاں سے۔" میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر وہیں گم صم کھڑی اپنی کلائی کو مسلتی رہی پھر بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

رات کو میں نے نازو سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے گھر چلی گئی۔

☆☆☆

اس کے بعد تین دن گزر چکے تھے، سبھی میرے قریب تھے لیکن ماہی کے جانے کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے وہ وقت کی رفتار کو ٹھہرا گئی ہو۔ کبھی کبھی ایک ایک منٹ گھنٹے پر بھاری لگتا۔ سارا دن ایک ہی جیسے مناظر دیکھ کر میری آنکھیں تھک سی گئی تھیں۔ نازو نے میری بیزاری محسوس کرتے ہوئے میرا لیپ ٹاپ مجھے تھما دیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے آن کیا، سامنے ہی میری ادھوری رپورٹ کی فائل نظر آئی۔ میں نے بے دلی سے پڑھا اور اسے ادھورا چھوڑتے ہوئے بند کر دیا۔ میرے ذہن میں مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل باقی نہیں بچا تھا۔ باوجود شدید کسلمندی کے میں بستر پر ہی پڑا رہتا۔ کئی دنوں سے شیو نہیں کی تھی اور نہ ہی نیا لباس پہنا تھا۔ یہ وہ لمحات تھے کہ میں خود کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام میں جیپ لے کر نکلا اور غائب دماغی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا مراد آباد سے باہر نکل آیا۔ پہلے میں ہیڈ سلیمانکی کی طرف آیا لیکن یہاں پر موسم اچھا ہونے کی وجہ سے خوب رونق تھی لیکن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ پھر میرا رخ ساہیوال کی طرف ہو گیا مگر پاکپتن میں داخل ہونے کے بعد میں بابا فرید کے مزار کی جانب آ گیا۔

فاتحہ خوانی کرنے کے بعد میں عقبی صحن میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری نظر سامنے پہاڑی پر بنے چھوٹے چھوٹے گھروں پر تھی۔ میرے اردگرد رش نہیں تھا۔ ایک سکون آمیز خاموشی سرسراتی آواز کے ساتھ میرے جسم کے اندر تک اتر رہی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد میرے اندر کی ہلچل خاموشی کی تہ میں چھپ رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے اس سکون کو محسوس کرنے لگا جب اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ سبز چوغہ اور ڈھیر ساری مالائیں پہنے وہ روایتی سا ملنگ لگ رہا تھا جو کہ عموماً ایسے مزاروں پر پائے جاتے ہیں لیکن اس کی آنکھیں روایتی ہرگز نہیں تھیں۔ وہ مقناطیس کے مانند

وجۂ خاموشی...

ایک دعوت میں چند دوستوں کے درمیان گائیکی پر بحث چل نکلی۔ اس پر ایک صاحب نے کہا "بھئی میں تو صرف غلام علی کو سنتا ہوں۔" دوسرے صاحب نے نور جہاں کی تعریف کی تو کسی نے مہدی حسن، احمد رشدی، مسعود رانا کے فن کو سراہا۔ میزبان جو دورانِ گفتگو خاموش بیٹھے تھے جب ان سے یہ سوال پوچھا گیا آپ سب سے زیادہ کسے سنتے ہیں؟ تو انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صاحب کچھ بولتے، ایک دم آواز آئی ...... "ارے سودا لاتے ہو کہ نہیں، تمہیں سننے کی عادت ہی ہو گئی ہے۔"

☆☆☆

کوتاہی

اندلس کے بادشاہ عبدالرحمٰن ثانی سے ایک روزہ قضا ہو گیا۔ نیک نفس بادشاہ نے اپنی کوتاہی کو چیف جسٹس امام یحییٰ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فتویٰ دیا۔ بادشاہ اس قصور و کوتاہی پر ساٹھ روزے رکھے۔ علما بورڈ کے ایک رکن نے امام صاحب کو کہا شریعت کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم بھی ہے، آپ نے بادشاہ کو یہ اجازت کیوں نہیں دی۔ امام یحییٰ نے بڑے غصے سے اسے دیکھا اور کہا۔ بادشاہ کے لیے ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلانا کوئی سزا نہیں۔

☆☆☆

بخار

ایک مرتبہ ایک شاعر کو بہت تیز بخار چڑھ گیا جس کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا۔ غنودگی سی کیفیت میں پوچھنے لگے میں کہاں ہوں، کیا میں جنت میں آ گیا ہوں؟ پاس ہی ان کی زوجہ کھڑی تھیں۔ جھٹ ان کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ اللہ نہ کرے، کیا ہو گیا ہے آپ کو ...... دیکھتے نہیں میں آپ کے ساتھ کھڑی ہوں۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

چمکا لینے والی چمک دار آنکھیں تھیں جن کو دیکھتے ہوئے ارادے کے باوجود بندہ نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ پہلی نظر میں لگا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے پھر اچانک بجلی سی کوندی اور مجھے یاد آ گیا کہ مراد آباد میں شاہ مراد کے مزار پر میں اس ملنگ سے اس وقت ملا تھا جب میں وہاں آشتی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس ملنگ نے مجھے ''گیدڑ سنگھی'' نامی کوئی شے کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بتائی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی تھی۔ ''کیسے ہو بابو؟ بڑے عرصے بعد نظر آئے ہو۔''

''تمہیں یاد تھا میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... لیکن تیرے ماتھے کی روشنی یاد تھی جو تجھے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔'' وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا اور اپنی لمبی الجھی ہوئی زلفوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں سنوارنے لگا۔

''اچھا...... تو کیا وہ روشنی اب بھی نظر آتی ہے؟'' میں نے وقت ضائع کرنے کی نیت سے بحث شروع کر دی۔

''ہاں بالک! یہ سرکار کی دی ہوئی روشنی ہے۔ اس میں لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی۔ ایک بار جل جائے تو جلتی رہتی ہے۔''

''اس روشنی کا کیا فائدہ بابا...... جو نظر ہی نہیں آتی۔''

''تجھے اس لیے نظر نہیں آتی کیونکہ یہ تیرے لیے نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو میں حیران سا رہ گیا۔

''کیا مطلب؟ پھر کس کے لیے ہے؟''

''تجھے شاید بھول گیا ہے مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے جو تجھ سے کہا تھا، قدرت تجھ سے بڑے کام لے سکتی ہے۔ بس تو اپنی راہ کھوٹی مت کر۔''

''بابا جی! مجھ سے روایتی بابوں والی باتیں مت کریں۔ نہ تو مجھے آپ کے وجدان میں دلچسپی ہے اور نہ مجھے خود میں دلچسپی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''پھر کہے گا مجھے اس لڑکی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی جو تجھے اس دن مزار کے عقب میں ملی تھی۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔ مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔'' میں نے غصے سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میں حیران سا اسے دیکھنے لگا کہ ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا ہے۔

''اگر یہ سچ ہے تو میں بھی سچا ہوں۔ میرا وجدان بھی سچا ہے۔''

''یہ تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔ بات کیا ہو رہی تھی، تم کیا کہہ رہے تھے اور اب...... تم میرا دماغ خراب کر کے رہو گے۔'' میں جھنجلا کر اٹھنے لگا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''اچھا۔ بات سن جا میری۔ اس بار اصلی گیدڑ سنگھی ہے میرے پاس۔ لینا چاہو گے؟''

''نہ تو مجھے تمہاری کوئی بات سننی ہے اور نہ کسی گیدڑ کی کہانی سننی ہے۔ چھوڑو میرا بازو......'' میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔

''گیدڑ سنگھی تو تجھے لے جانی ہی ہو گی۔ چاہے مفت میں لے جا۔ پر انکار مت کر۔'' اس کا عجیب سا اصرار شروع ہو گیا۔

''کیا چیز ہو تم...... کیوں میرا دماغ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو؟''

''میں دماغوں کا اسپیشلسٹ ہوں۔ نیورو سرجری کروا دوں گا۔ سائیکی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی ٹھیک کروا دوں گا مگر گیدڑ سنگھی تو لے جانی ہو گی تجھے۔'' وہ ضدی بچوں کی طرح پیش آ رہا تھا اور میں اس کے منہ سے انگریزی کے الفاظ سن کر دنگ رہ گیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

''اچھا لاؤ...... کہاں ہے گیدڑ سنگھی؟'' میں نے پوچھا تو اس نے جلدی سے ایک پوٹلی مجھے تھما دی۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

''نہ نہ بالک...... یہاں نہیں۔ یہاں بابا جی کی جلالی شعاعیں پھر رہی ہیں۔ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ گھر جا کے کھولنا۔''

''ٹھیک ہے...... تو کیا اب میں جاؤں؟'' میں نے اکتا کر پوچھا۔

''بس آخری بات سنتا جا۔'' پھر ایک توقف کے بعد وہ بولا۔ ''جب بندہ کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان کو بدہضمی ہو جاتی ہے۔ وہ خود تو لوٹے لے کر واش روم میں جا بیٹھتا ہے لیکن اس کے شاگرد اس بندے کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور پھر اسے ایسے کاموں میں الجھا دیتے ہیں کہ وہ بندہ اپنا نیک کام بھول جاتا ہے۔ اس طرح شیطان کی بدہضمی بھی دور ہو جاتی ہے۔ تو نے بھی شیطان کو بدہضمی کروانے کا پکا ارادہ کیا تھا لیکن افسوس اب خود ہی اسے چورن چٹا کر اس کی بدہضمی دور کر رہا ہے۔ سمجھ رہا ہے نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گیا۔ ''میری بعض باتیں میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ اس لیے میں تمہارے اور اپنے لیے اسے سلیس اردو میں بیان کیے دیتا ہوں۔'' اب کی بار وہ بولا تو بے حد سنجیدہ تھا۔

''تو نے کچھ اچھے کاموں کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن حالات نے تجھے ایسی کہانی میں جھونک دیا جو تیرے معاملے سے ہٹ کر تھی۔ اب وہ کہانی تو نہیں رہی لیکن وہ مقصد ضرور کامیاب ہوگیا جس کی خاطر تجھے اس کہانی میں سیکنڈ ہیرو کا رول دیا گیا تھا۔ تو کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے ارادوں اور منصوبوں سے بھی دور نکل گیا ہے۔ اپنی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔ اب تو سمجھ گیا ہوگا کہ میں کیا بات کر رہا ہوں۔''

اس کے لہجے میں ایسی سنجیدگی تھی کہ میں سن ہو کر رہ گیا۔

''تمہیں...... یہ سب کیسے پتا؟ مطلب تم تو......'' مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔ وہ فوراً پھر سے پٹڑی سے اتر گیا۔

''یہ سارا کمال گیدڑ سنگھی کی سنگت کا ہے۔ اب سے یہ تمہارے ساتھ بھی رہے گی تو تم بھی ایسے کشف جاننے لگو گے۔'' میں خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی مخمل کی سرخ پوٹلی کو گھورتا رہا۔ حویلی واپس آ کر اپنے کمرے میں تنہائی ملتے ہی میں نے ملنگ کی دی ہوئی پوٹلی کھولی تو اس میں گیدڑ سنگھی نہیں تھی۔ بس ایک عام سا پتھر تھا۔ ایسا وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ ساتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس پر کچی پنسل کے ساتھ اردو میں لکھا تھا۔

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ انصاف کے دن کا حاکم ہے۔ اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ ان لوگوں کے رستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔ نہ کہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور گمراہوں کے۔ (الفاتحہ)''

میرے ذہن میں سوچوں کا ایک بھونچال آ کر ٹھہر گیا...... ''تو اپنی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔ اپنے اردوں اور منصوبوں سے باہر نکل گیا ہے۔ تجھے بہکانے والے کامیاب رہے اور تو ناکام ہو رہا ہے۔ کامران چودھری! جو غلط نظام کے پہاڑوں سے ٹکرانے نکلا تھا۔ محبت کی ایک روایتی سی کہانی میں کسی ہارے ہوئے ہیرو کے مانند کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔''

شدید غصے کی ایک لہر اٹھی اور میں اندر سے جھلس کر رہ گیا۔ آشتی کی ساری کہانی جو دھوکے سے شروع ہو کر دھوکے پر ختم ہوئی تھی، ایک دم سے جیسے سارے جذبات بھسم ہو گئے۔ وہ سارے خیالات جو مجھے پریشان کیے جا رہے تھے، ایک دم سے بھاپ بن کر اڑ گئے۔ اس دہکتی آگ میں میرا سارا وجود جل گیا۔ کہتے ہیں آگ ہر شے کو پاک کر دیتی ہے۔ میرے اندر کی پراگندگی بھی صاف ہو گئی۔ میں وہی پرانا کامران چودھری بن گیا جس کا مقصد روایتی قسم کی محبت نہیں کچھ اور تھا۔

☆☆☆

وڈے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے اباجی کی گرج دار آواز گونج رہی تھی۔

''مجھے جواد چاہیے۔ زمین کھود کر نکال یا آسمان پر جا کر ڈھونڈ۔ ایک بار وہ مجھے زندہ حالت میں اسی کمرے میں چاہیے ماکھے۔''

''فکر نہ کریں چودھری جی۔ بہت جلد ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔'' ماکھے کی آواز گونجی۔ ''وہ اس ملک سے نکلنے کی کوشش میں ہوگا۔ سارے ائیرپورٹس پر تو میں نے بندے بٹھادیے ہیں۔ غیر قانونی طریقے سے بھی نکلنے کی کوشش کرے گا تب بھی ہمیں اطلاع مل جائے گی۔ چھپ کر بیٹھے گا تو کتنی دیر بیٹھا رہے گا۔ میرے آدمی کتوں کی طرح اس کی بو سونگھ رہے ہیں۔''

''مجھ سے لمبا انتظار نہیں ہوتا۔ اس نمک حرام کو جلد سے جلد ڈھونڈ اور ساتھ میں وہ کڑی (لڑکی) بھی تھی۔ اسے بھی ذہن میں رکھ۔ ان دونوں کو میں نے عبرت کا نشان بنا کے رکھنا ہے۔'' میں کمرے میں داخل ہوا تو خاموشی چھا گئی۔

''ہاں بھئی...... کیسی طبیعت ہے اب تیری؟'' اباجی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور میں شہر واپس جانا چاہتا ہوں۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش رہے پھر مسکرا کر بولے۔

''ہاں تو ٹھیک ہے۔ جوان بندہ ہے۔ جوانی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بس بندے کا جگرا مضبوط ہونا چاہیے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب آگے کی فکر کرنی چاہیے لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو اب یہیں رہ؟''

''شہر میں میرے کچھ کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا بہت ضروری ہے، اس کے بعد یہیں واپس آؤں گا۔'' میں نے کہا تو وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑائے۔

''ادھورے کام؟'' پھر حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... کام ادھورے بھی نہیں چھوڑنے چاہئیں۔ تجھے جانا ہے تو جا لیکن گاڑی لے کر جانا

بلکہ رشید (ڈرائیور) کو بھی ساتھ لے جانا۔''

''نہیں، میں صرف گاڑی لے کر جاؤں گا اور آج شام کو ہی چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور کچھ لمحوں بعد باہر نکل آیا۔ رات تک میں لاہور میں اپنے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں پہنچ چکا تھا۔

چودھری حشمت علی کے غیر قانونی کاموں سے متعلق ایک فہرست میرے سامنے تھی۔ نوادرات کی اسمگلنگ کے علاوہ چودھری حشمت علی نے کئی ایکڑ سرکاری زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ افسران کی مدد سے جنگل میں بیش قیمت لکڑی کی چوری ہو رہی تھی۔ کروڑوں روپے کے بینک قرضوں سے معافی لے رکھی تھی اور کروڑوں روپے کا ٹیکس ادا نہیں کیا گیا تھا۔ نجی جیلوں میں غریب مزارعے قید تھے۔ حکومتی سطح پر اربوں روپے کے ٹھیکے اور اپنی مرضی کے ٹینڈرز اپنے دوستوں کو نواز رکھے تھے۔ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے مل کر کئی طرح کی اجناس کو ذخیرہ کر کے مصنوعی قلت کے بعد مہنگے داموں فروخت کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور ان کاموں میں چودھری حشمت علی اکیلے نہیں تھے، ان کے ساتھ کچھ ایسے طاقتور لوگ بھی تھے جو سرکاری و نیم سرکاری عہدوں پر براجمان تھے۔ جو ان کے ہر غیر قانونی کام پر خاموش بیٹھے تھے اور اس خاموشی کے عوض انہوں نے بھاری تحائف وصول کیے تھے۔ ان لوگوں میں سے کچھ کے ساتھ تو میں فارم ہاؤس کی پارٹی میں مل بھی چکا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سب وہ کام تھے جن سے ہر آدمی آگاہ تھا۔ فیوڈل لارڈز اور بیوروکریسی وہ ستون ہیں جن کے سہارے حکومت کی چھت قائم ہوتی ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں ان ستونوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ان کے ہر غلط کام کی پردہ پوشی کی جاتی ہے تاکہ حکومت کے پیر ڈگمگا نہ جائیں۔ چنانچہ جو کام چودھری حشمت علی سرکاری افسران کی مدد سے کیے جا رہے تھے، وہ قانون میں کوئی بڑا جرم نہیں تھا کیونکہ ایسے کاموں سے ہی تو وڈیروں کا نام بنتا ہے۔ اس لیے میری ساری توجہ کا مرکز چودھری حشمت علی کی نوادرات میں دلچسپی تھی جنہیں وہ اسمگل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی میوزیم کا حصہ بھی بنا رہے تھے۔ میں نے شہر میں اپنے دیرینہ دوست اور صحافی فیصل بٹ کو کال کی۔ فیصل صحافیوں کے اس گروہ میں سے تھا جو حکومت سے مراعات لے کر ان کی تعریفوں بھرے کالم اور فیچر لکھتے رہتے ہیں لیکن اندرون خانہ دل وہ بہت اچھا دوست بھی تھا یہی وجہ تھی کہ ہمارے مزاج اور نظریات میں بے پناہ فاصلہ ہونے کے باوجود ہم بہت اچھے دوست بھی تھے۔ میں نے فیصل سے کسی ماہر آثارِ قدیمہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ڈاکٹر شہاب اقبال کا فون نمبر دیا۔ وہ اس فیلڈ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے فوراً فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج شام کو کالج آڈیٹوریم میں ان کا ایک لیکچر ہے، میں اس کے فوراً بعد ان سے مل سکتا ہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ قدرے چھوٹے قد کے دبلے پتلے انسان تھے۔ سر کے سارے بال اور بھویں تک سفید ہو چکی تھیں لیکن آواز ان کی اب بھی قابلِ رشک حد تک گونج دار تھی۔

''سر! میرا نام کامران ہے۔ بجائے گھما پھرا کے میں آپ کو بالکل سچ اور صاف بات کروں گا کیونکہ مجھ میں ایک ہی بری عادت ہے کہ میں ٹیچر کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں ایک صحافی ہوں اور ایک رپورٹ کے سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''رپورٹ...... کیسی مدد؟'' وہ چونکے۔

''سر! آپ آثار قدیمہ کے ماہر ہیں۔ میرے پاس چند نمونے ہیں۔ کیا آپ انہیں محض دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' وہ حیرانی سے بولے۔ ''لیکن یہ نمونے ہیں کہاں اور تمہیں کہاں سے ملے؟''

''نمونے میرے پاس نہیں ہیں بلکہ نیشنل میوزیم میں ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ میوزیم انتظامیہ نے اصلی نمونے بیچ کر وہاں نقلی نمونے رکھوائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار وہاں جا کر اس بات کی تصدیق کر دیں کہ وہ واقعی نقلی ہیں یا نہیں۔''

''اوہ...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کلچر منسٹری کی ذمے داری آرٹ کی حفاظت کرنا ہے نہ کہ انہیں ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سر! جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں...... وہاں سب کچھ ممکن ہے۔ ہم تو اپنا سارا ملک لٹیروں کی حفاظت میں دے کر رات کو سکون سے سوتے رہتے ہیں۔ یہ تو پھر بھی اس تہذیب کی چوری ہے جو پہلے سے ہی گم گشتہ ہے۔ پلیز سر! میں ان کرپٹ لوگوں کو بے نقاب کر رہا ہوں مجھے آپ کی بس یہ چھوٹی سی مدد درکار ہے۔''

وہ عینک صاف کرتے ہوئے سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔ ''پرسوں ایک چینی وفد کے ہمراہ میں نیشنل

میوزیم کا ہی دورہ کرنے والا ہوں۔ اتفاق سے تم بروقت مجھ تک پہنچ گئے ہو تو میں وہاں دیکھ لوں گا۔ تم چاہو تو میرے ساتھ ہی چلنا۔'' وہ راضی ہو گئے، یہ میرے لیے بڑی اہم بات تھی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا اور پھر پرسوں میں ان کے ساتھ ہی نیشنل میوزیم میں پہنچا۔

چینی وفد میں آٹھ لوگ شامل تھے جن میں تین پاکستانی تھے۔ جب ان سب کو ریفریشمنٹ کے لیے قریبی ریسٹورنٹ لے جایا گیا تھا تب میں ڈاکٹر شہاب کو لے کر واپس میوزیم میں پہنچا۔ میوزیم انچارج سے میری ایک دن پہلے ہی بات ہو گئی تھی۔ ایک خاص رقم کے عوض وہ نوادرات الماریوں سے نکل کر چند سیکنڈ کے لیے ہمارے ہاتھ میں آ سکتے تھے۔

''میں نے شوکیس میں سے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے تو وہ ایک دم اصلی ہی معلوم ہو رہے تھے۔'' ڈاکٹر شہاب کہہ رہے تھے۔ جب ہم واپس ہال میں پہنچے تو انچارج بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شوکیس کھول دیے۔ ڈاکٹر شہاب اقبال نے ہاتھوں پر دستانے پہن لیے اور وہی اسٹوپا اٹھالیا جو اس وقت حویلی کے تہ خانے میں موجود تھا لیکن ہاتھ لگتے ہی وہ چونک گئے۔ پھر انہوں نے اسے محدب عدسے سے چیک کیا اور ہونٹ چباتے ہوئے بولے۔

''یہ واقعی نقلی ہے۔ پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا۔ کمال کا ڈپلیکیٹ ہے۔ بظاہر دیکھنے سے معلوم ہی نہیں ہوتا۔'' وہ اگلی طرف بڑھے اور فاسٹنگ بدھا کا ہیڈ اٹھالیا۔

''یہ بھی نقلی ہے......'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمارا رخ اب واپس ریسٹورنٹ کی طرف تھا۔

''ساری دنیا میں لوگ اپنی پرانی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے...... اور ایک، ہم لوگ ہیں جو چند روپوں کے عوض اتنے نایاب اور نادر تہذیبی ذخیروں کو بیچ دیتے ہیں۔'' وہ افسردگی سے بولے جا رہے تھے۔

''کیا نہیں ہے اس ملک میں۔ کیسی کیسی قیمتی عمارتیں ہیں۔ آثار قدیمہ ہے۔ گزرے دور کی نشانیاں ہیں۔ یقین کرو تہذیب تمدن کا ایک سمندر ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ دنیا میں آج تک ہڑپہ جیسا جدید شہر دریافت نہیں ہو سکا اور ہم نے کیا کیا کہ اس تہذیب سے مالا مال شہر کی اینٹیں نکال نکال کر کچے پکے مکانات بنالیے۔ کیا کیا گنواؤں تمہیں اور کتنی بے دردی سے ہم یہ سب ضائع کر رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے یہ سب کچھ جو یہاں سے نکلتا ہے کہاں جا کر محفوظ ہوتا ہے؟ انگلینڈ میں، پیرس میں، پورے یورپ میں۔ وہ لوگ یہاں سے اسمگل کیا گیا، بیچا گیا، یا پھینکا گیا ایک ایک پیس اکٹھا کرتے ہیں اور اپنے میوزیم میں سجاتے ہیں۔ پھر ہم جیسے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے اسی ملک میں ان نوادرات کو دیکھنے جاتے ہیں اور اپنی آنکھیں خیرہ کرتے ہیں۔'' ریسٹورنٹ آ گیا۔ میں دروازے پر ہی رک گیا۔ ان کا لیکچر بھی ختم ہو گیا۔

''اندر نہیں چلو گے؟'' وہ چونکے۔

''جی نہیں...... آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ ان نقلی نوادرات کو اگر کسی لیبارٹری سے چیک کروا کر ان کی رپورٹ مطلوب ہو تو ایسی لیبارٹری کہاں ملے گی؟''

''اوہ...... لیکن پھر تو تمہیں انہیں یہاں سے اٹھا کر لیبارٹری لے جانا ہوگا...... اور یہ کیسے ہوگا؟''

''بالکل ایسے جیسے اصلی کی جگہ نقلی نے لی اور بالکل ایسے جیسے ابھی ابھی ہم نے شوکیس کھلوا کر انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا۔''

''صاحبزادے! تم کچھ اونچی اڑانیں نہیں بھر رہے؟'' انہوں نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورا۔

''میری عادت ہے، میں وہاں تک ضرور جاتا ہوں جہاں تک میری پہنچ ہو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔

''ہوں...... یہ لو کارڈ۔ یہ میرا شاگرد ہے۔ یہ ان کے نقلی ہونے کا...... سرٹیفکیٹ بنوا سکتا ہے۔ یہ بھی تمہاری ہی طرح سر پھرا ہے۔''

میں انہیں سلام کر کے وہاں سے واپس گھر آ گیا۔ کارڈ پر خالد شریف کا نام درج تھا۔ میں نے اس سے فون پر بات کی پھر ہماری ملاقات ایک کیفے میں طے ہوئی جہاں میں نے اس سے چند باتیں کر کے اس کے مزاج کو سمجھا کیونکہ اب معاملہ نازک سے نازک تر ہوتا جا رہا تھا۔ میری ایک چھوٹی سی غلطی سے اگر یہ بات لیک ہو جاتی کہ میں نیشنل میوزیم کے نقلی پیس کا راز آشکار کرنے والا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیس وہاں سے غائب ہی کر دیے جاتے۔ خالد ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میرے معاملے میں اس نے بہت دلچسپی لی اور پھر ہم نے ایک منصوبہ بنایا اور پھر اپنے رسک پر خالد کے لیے ایک رات ہی کافی تھی۔ اگلی شام تک اس نے نقلی مجسموں کی رپورٹس تیار کر کے مجھے پہنچا دیں۔ اگلے چند ہفتوں تک میں اپنی فائنل رپورٹ تیار کر چکا تھا۔

رپورٹ کی کاپی اپنے اخبار کے ایڈیٹر برکت صدیقی صاحب کو بھجوانے کے دو دن بعد ہی جب میں سو رہا تھا تو صدیقی صاحب کی کال آ گئی۔ انہوں نے رپورٹ ابھی پڑھی تھی اور اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ فوراً ہی مجھے فون کر دیا۔

''یہ کیا لکھ دیا ہے تم نے؟ میں تو سمجھا تھا کہ تم نے فیوڈل لارڈز کے حوالے سے عام سی رپورٹ لکھی ہو گی لیکن تم نے تو اس ضمن میں اپنے باپ سمیت کئی بڑے بڑے لوگوں کو ملوث کر دیا ہے اور یہ خفیہ رستے کا تذکرہ۔ یہ رپورٹ کم اور سنسنی خیز ناول زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔ کہیں نیند میں تو یہ سب نہیں لکھ دیا؟''

''میں نے جو لکھا ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے اور میرے پاس اس کے مکمل ثبوت موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہونہہ ثبوت۔ تم جانتے ہو کہ اس ملک میں ثبوت کی کتنی اہمیت ہے؟ تمہاری رپورٹ شائع ہوتے ہی وہ لوگ ان نقلی نوادرات کو اصلی میں بدل دیں گے پھر یہ ثبوت تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔''

''میرے پاس ثبوت بھی ہیں اور گواہ بھی۔ رہی بات نقل کو اصل میں تبدیل کرنے کی تو رپورٹ شائع ہونے سے قبل ہی میں سپریم کورٹ میں درخواست جمع کرواؤں گا کہ فوری طور پر میوزیم میں رکھے اسٹوپا کو تحویل میں لیا جائے اور ان کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا جائے۔ رہی بات خفیہ رستے کی تو اس کی جگہ بدل تو نہیں جائے گی۔ وہ جہاں موجود ہے، وہیں رہے گا۔''

''یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست لیکن اس بار تم بہت اونچی جگہ ہاتھ مار رہے ہو۔ دیکھو کامی! مجھے اپنے اخبارات کی فکر نہیں ہے۔ حکومت کیا کر لے گی؟ بس سرکاری اشتہارات دینا بند کر دے گی؟ سرکولیشن رکوا دے گی؟ ہتک عزت کے مقدمے کروا دے گی؟ میں یہ سب پہلے بھی برداشت کر چکا ہوں اور ایک بار پھر کر لوں گا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے۔''

''آپ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں یا خوفزدہ کرنے کی؟''

''نہیں...... میں تمہیں صرف آگاہ کر رہا ہوں کیونکہ جس ملک میں، میں اور تم رہتے ہیں، اس ملک میں قانون کو موم کی طرح موڑ کر اپنی من چاہی شکل میں بدل دیا جاتا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ دن درکار ہوں گے کہ میں اس رپورٹ کا ہر طرح سے جائزہ لے سکوں۔''

''یہ آپ کی مرضی ہے اور اگر اس ملک میں کسی بھی اخبار نے اسے شائع نہ کیا تو کیا باقی راستے بھی بند ہو جائیں گے؟ میرے پاس کئی اور ایسے پلیٹ فارم ہیں جہاں اس رپورٹ کو منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔ آپ شائع نہیں کریں گے تو کوئی اور ضرور کرے گا اور میں اسے شائع کروا کے ہی دم لوں گا۔'' میں نے قدرے ناراضی سے کہا۔

''ہوں...... تمہاری اس دھمکی سے مرعوب ہو کر میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ ٹھیک ہے کچھ دن سوچ بچار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' انہوں نے کہا تو میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ نیم رضامند ہو گئے تھے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اے سی کی خنکی میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو باہر گرمی تھی لیکن چھت پر ہوا محسوس ہو رہی تھی۔ میں چھت کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ یہاں ایک سکون دینے والی خاموشی تھی جس میں کہیں دور سے کوئی ریڈیو بج رہا تھا لیکن میری گھٹن کم نہیں ہو رہی تھی۔ سوچوں کی یلغار نے مجھے ہر سمت سے گھیر رکھا تھا جس میں مایوسی کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔

یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں اپنے ہی باپ کے خلاف ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جس سے ان کی بدنامی ہو۔ مجھے گاؤں میں رہ کر اس بات کا تو پتا چل ہی گیا تھا کہ ابا میری اس رپورٹ کے بارے میں جانتے ہیں اور پھر واپسی والے دن بھی وہ میرے ''ادھورے کام'' کے لفظ پر چپ سے ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ میری اس حرکت سے ان کی کتنی بدنامی ہو گی۔ وہ سب جانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کامران ایسا مت کر۔ کیا انہیں یقین تھا کہ میری اس رپورٹ سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ یا انہیں لگ رہا تھا کہ شاید میں ایسا نہیں کروں گا...... اور میں؟ میں کیا کر رہا ہوں؟ اس معاملے کو میں نے اتنا سیریس لے لیا کہ میری رپورٹ کی زد میں کئی اور بڑے بڑے نام آ گئے۔ وہ لوگ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ انہیں چھیڑ کر میں کتنی مشکلات میں پھنس جاؤں گا۔

(جاری ہے)

پارسی لڑکیوں کو دیکھنے ہم لوگ ماما پارسی اسکول کے سامنے کھڑے ہوجاتے تھے۔ میں اس وقت سندھ مدرسے میں پڑھتا تھا۔ دادو سے میرے والد نے مجھے کراچی پڑھنے بھیجا تھا۔ سولجر بازار میں بھگوان داس بلڈنگ میں ایک فلیٹ میرے دادا نے خریدا تھا۔ علاقے میں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی نہیں تھی مگر زمین دار خاندانوں کے مسلمانوں کے گھر تھے۔ میں وہاں اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں ہی سندھ مدرسے میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور اب

مکافات

ڈاکٹر شیر شاہ سید

الگ مذاہب یا جدا قوم ہونے کے باوجود عشق کا آفاقی جذبہ کسی بھی دل میں اپنی جڑیں مضبوط کرسکتا ہے اور... اتنا سا فلسفہ ان عقلمندوں کی سمجھ میں نہ آسکا جن کے نزدیک یہ سراسر بے راہ روی تھی اور جو خود کو بہت بڑے راہنما سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اور بات کہ بہت آخر میں رشتوں کی گمشدگی کا احساس انہیں خون کے آنسو رلا گیا۔

دوستوں کے روپ میں دشمنی

نبھانے والوں کا ماجرا

ہمارا آخری سال تھا۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی ہم لوگ چند دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پکڑ کر این جے وی اسکول کے سامنے اتر جاتے تھے۔ ٹراموے کمپنی کے زیادہ تر کنڈیکٹر ہمیں جان گئے تھے۔ کبھی وہ ٹکٹ کے پیسے مانگتے نہیں تھے اور جب مانگتے تھے تو ہم پیسے دے بھی دیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ غنڈا گردی اور بدمعاشی کا زمانہ نہیں تھا۔ کراچی میں قانون کی بڑی پاسداری تھی۔ ہر شہری کی بڑی عزت تھی۔ غریب ہو یا امیر، مسلمان ہو یا پارسی، عیسائی یا ہندو۔ قانون ایسے تھے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیسے ممکن تھا مثلاً محمد علی ٹراموے کمپنی کے یہاں ٹرام گرمیوں کے زمانے میں ساڑھے پانچ بجے چلتی تھی۔ شہر کی خوب صورت صاف ستھری سڑکوں کے درمیان چار اور پانچ منزلوں والی بلڈنگوں سے ہوتی ہوئی کیماڑی کی طرف جاتی تھی مگر شہر کے قانون کے مطابق سات بجے سے پہلے ڈرائیور کو گھنٹی بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ بلڈنگوں میں سوئے ہوئے شہریوں کا اتنا احترام ہوتا تھا، اب تو سڑکوں پر چلنے والے جاگتے ہوئے شہریوں پر دھواں، ہارن اور گالیوں کی بھرمار جس طرح سے ہوتی ہے وہ سب کو سہنا پڑتا ہے۔ شہر اب شہر نہیں، جنگل ہے جنگل۔

اس وقت کراچی میں فرنگی عورتوں کے علاوہ صرف پارسی لڑکیاں ہی اسکرٹ پہنتی تھیں۔ ماما پارسی اسکول کی عمارت اتنی ہی شان دار تھی جتنی اب ہے۔ یہ لڑکیاں مسکراتی، چھنکتی اور ہنستی ہوئی جب اسکول سے باہر آتی تھیں تو بندر روڈ پر ایک میلے کا سا سماں ہوجایا کرتا تھا۔ کچھ لڑکیاں گھوڑا گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنے گھروں کو جاتی تھیں اور کچھ لڑکیاں ٹراموں پر سوار ہوجاتی تھیں۔ چند ایک لڑکیوں کے لیے گاڑیاں بھی کھڑی ہوتی تھیں۔

ہم لوگ این جے وی اسکول کے سامنے اتر کر آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت کے سامنے پہنچ جایا کرتے تھے، جہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے گپ مارتے تھے اور کبھی کن انکھیوں سے، کبھی سر اٹھا کر بالمشافہ اسکول کی ان لڑکیوں کو دیکھا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ٹریفک کا مجمع چھٹ جاتا تھا تو صدر سے آنے والی پریڈی اسٹریٹ کو پار کرتے ہوئے ہم لوگ پلازا سینما کی جانب چلے جایا کرتے تھے جہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کا ایک معمول سا بن گیا تھا۔

یہ سارا کام ایک احساسِ جرم اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کلاس کے چند اور لڑکوں کو ہمارے اس معمول کا پتا تھا اور وہ لوگ ہمیں بدمعاش سمجھا کرتے تھے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم لوگ کچھ اچھا نہیں کرتے مگر کتنی دفعہ سوچنے کے باوجود کہ یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا، ہم یہ عادت نہیں چھوڑ سکے تھے کہ یکا یک نیلوفر اس تصویر میں آگئی تھی۔

وہ عام سی پارسی لڑکی تھی۔ گول سا چہرہ جس پر بہت نمایاں دو چمکدار آنکھیں اور پتلی سی ناک۔ وہ اسکول سے نکلتی تھی، چاروں طرف نگاہ ڈالتی تھی اور سڑک کے کنارے دو اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہوجاتی تھی۔ ٹن ٹن کرتی ہوئی ٹرام جو سولجر بازار کو جارہی ہوتی تھی، اس پر وہ تینوں بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

میں نے اسے پہلے دن سے ہی تاڑ لیا تھا...... اور لڑکے کیا کرتے تھے، مجھے خیال نہیں ہے لیکن میں بڑی بے چینی کے ساتھ نیلوفر کے آنے کا انتظار کرتا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کا نام پتا نہیں تھا مگر میں نے دل ہی دل میں اس کا نام آنکھوں والی رکھ دیا تھا۔ یہ یک طرفہ عشق خاموشی سے چلتا رہا اور آہستہ آہستہ وہ میرے حواس پر سوار ہوتی چلی گئی۔ نہ میرا دل پڑھائی میں لگتا تھا اور نہ کسی اور کام کاج میں۔ اسکول بھی میں اسی لیے جاتا تھا کہ جب اسکول کی چھٹی ہوگی تو ماما پارسی اسکول کے سامنے آنکھوں والی کو دیکھوں گا۔

اس دن لائٹ ہاؤس سینما اور سندھ جاگیردار ہوٹل کے سامنے ٹرام رک گئی تھی۔ ایک گھوڑا گاڑی میں گاڑی بان نے ایک زخمی گھوڑا جوتا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ٹرام کی پٹری کے ساتھ ہی وہ یکا یک گر گیا۔ گھوڑے بان اور ٹرام کے ڈرائیور کی مدد سے وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ کے ایم سی کا ایک آدمی آگیا تھا جس نے زخمی گھوڑا چلانے پر گاڑی بان کا چالان کردیا۔ جس کے بعد گھوڑا گاڑی کے مسافر تکرار کرتے ہوئے ٹرام میں سوار ہونے لگے۔ گاڑی بان نے گاڑی گلی میں کھڑی کی اور کراچی میونسپل کارپوریشن کے آدمی کے ساتھ گھوڑا لے کر جانوروں کے اسپتال کی طرف جانے لگا تھا۔ اس تمام کارروائی میں دس پندرہ منٹ لگ گئے ہوں گے مگر مجھے ایسا لگا تھا کہ آج کی تمام محنت پانی میں مل گئی اور وہ آنکھوں والی تو شاید چلی بھی گئی ہو۔

میں جب وہاں پہنچا تھا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑی تھی جیسے میرا انتظار کررہی ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے پہلی دفعہ ایسا لگا تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کرتی ہے، اسے بھی احساس ہے کہ اس کے لیے کوئی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ دن ایک خوب صورت دن ثابت ہوا تھا۔ جن لوگوں نے اسکول کی عمر میں محبت کی ہے وہی لوگ اس خوشی، اس اطمینان کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اس دن میں بے بات ہنسا اور بے وجہ مسکرایا تھا۔

میں نے اس دن اپنے کزن مراد کو بھی یہ بات بتائی۔ وہ

چلتا ہوا آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ یار آنکھ مچولی اور دیکھنا دکھنا صحیح لیکن یہ باضابطہ عشق نہیں چلے گا۔ تم مسلمان ہو اور وہ پارسی ہے۔ تمہارا باپ، میرا باپ کبھی نہیں مانیں گے۔ ہم دونوں مسکرا دیے اور دیر تک ہنستے رہے۔ میں نے کہا تھا یار ابھی تو اس نے صرف دیکھا ہے، تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو لیکن مجھے اندر سے پتا تھا کہ میں نے نیلوفر اور اپنے متعلق بے اندازہ، بہت سارے خواب دیکھ ڈالے ہیں۔

اسکول چلتا رہا، ٹرام چلتی رہی۔ اس طرح سے ہم دوست ماما پارسی اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر پارسی لڑکیوں کو تکتے رہے اور دل کی بے چینی دھیرے دھیرے بڑھتی رہی۔ ہمارے کلاس ٹیچر تھے ماسٹر غنی صاحب۔ ایک دن انہوں نے مجھے اسٹاف روم میں بلالیا۔ پرنسپل کے کمرے کے ساتھ ہی کشادہ سا اسٹاف روم تھا۔ انہوں نے کہا، پڑھنے پر توجہ نہیں دے رہا ہوں۔ وہ بہت شفیق استاد تھے، بہت مہربان۔ بہت دل چاہا کہ دل کھول کر رکھ دوں ان کے سامنے۔ اگر وہ پارسی نہ ہوتی تو شاید بتا ہی دیتا۔ سر جھکا کر ان کی بات سنی تھی اور ان سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

مراد نے تسلی دی مگر مشورہ بھی دیا کہ اب یہ کھیل ختم کیا جائے مگر کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک رات پہلے ہی تو میں نے نیلوفر کے نام خط لکھا تھا اور اسی روز میں لپک کر اس ٹرام پر چڑھ گیا تھا جس پر نیلوفر بیٹھتی تھی۔ کانڈا والا بلڈنگ کے سامنے، آگے جہاں وہ بیٹھی تھی، میں بالکل اسی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا، وہ اور اس کی سہیلی دونوں مسکرائے۔ بہت کوششوں اور خواہش کے باوجود عطر سے لگا ہوا وہ لفافہ میں اسے نہیں دے سکا تھا۔

چار پانچ دن ایسے ہی گزر گئے تھے۔ اس دن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ٹرام بالکل خالی تھی۔ میں، مراد اور دو تین اور آدمی پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نیلوفر کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی اور وہ مڑا تڑا ہوا لفافہ میں نے اس کے پیروں پر ڈال دیا اور اس نے مسکرا کر کچھ گھبرا کر اسے اٹھالیا۔

پھر خطوں کے تبادلے شروع ہوگئے۔ وہی دنیا جہان کی باتیں، جو محبت کرنے والے لکھتے ہیں۔

نیلوفر کے والد امیر نہیں تھے۔ وہ ایک پارسی وکیل کے آفس میں سیکریٹری کا کام کرتے تھے اور پارسی کالونی کی ایک بلڈنگ میں رہتے تھے۔ نیلوفر کی زندگی سادہ زندگی تھی مگر اس کا حسن سادہ نہیں تھا۔ اس کا انداز پیچیدہ تھا، اس کی ادائیں قاتل تھیں۔ اس سے بات کرنے سے قبل، صرف خطوں کے تبادلے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ میرے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ ہم دونوں وقت کے ساتھ ساتھ محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پر سفر کرتے کرتے زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔

پھر سب کچھ یکایک ہوگیا تھا۔ کئی سال پرانا واقعہ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ رات دیکھی ہوئی کوئی فلم، ابھی کسی کی سنائی ہوئی کہانی۔ ہوا یہ کہ نہ جانے کیوں میں نے یکایک فیصلہ کرلیا کہ نیلوفر سے کورٹ میرج کرلیتا ہوں۔ یہی سارے مسائل کا حل نظر آتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر میں نے سوچا تھا کہ قانون پڑھوں گا مگر میرے والد کا خیال تھا کہ مجھے پہلے بمبئی جا کر کچھ پڑھنا چاہیے۔ اس کے بعد چاہے میں انگلینڈ چلا جاؤں۔ مجھے نہ بمبئی جانے کا شوق تھا اور نہ ہی انگلینڈ جانے کی تمنا۔ میں تو کراچی میں رہنا چاہتا تھا۔ نیلوفر کے آس پاس۔ جن دو دوستوں سے مشورہ کیا، پہلے تو ان کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا مگر جب میں نے اپنی بات سمجھائی تو دونوں کا یہی مشورہ تھا کہ اگر نیلوفر راضی ہے تو کورٹ میرج کرلو۔ مراد بھی راضی ہوگیا اور طے یہ ہوا کہ میں نیلوفر سے بات کر کے اسے اپنے فلیٹ میں لے آؤں گا پھر کراچی کے سول کورٹ میں سب کچھ طے ہو جائے گا۔ چمن لال جو میرا بڑا گہرا یار تھا، اس نے اپنے وکیل ماموں سے بات کی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھانے لگ گئے تھے مگر جب انہوں نے مجھ سے بات کرلی اور انہیں اس کا اندازہ ہوگیا کہ میرے جذبے ہر طاقت سے زیادہ طاقتور ہیں تو انہوں نے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کرلیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ انہیں کسی بھی قسم کی کوئی فیس نہیں دی جائے گی۔

پھر سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہوا تھا۔ نیلوفر میرے ساتھ اس بلڈنگ کے فلیٹ میں چلی آئی اور دوسرے دن کی صبح کا وقت عدالت میں مقرر بھی ہوگیا مگر اسی شام میرے والد بھی نہ جانے کیسے پہنچ گئے۔ یہ مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ مراد نے انہیں خبر کی تھی، پھر میں نے کبھی بھی مراد سے بات نہیں کی تھی۔

وہ شام اور رات میری زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔ میں کمرے میں نیلوفر اور مراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور خوش تھا کہ معرکہ سر ہو چکا ہے اور کل صبح کے بعد سب کچھ بدل جائے گا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور میرے والد، میرے دو چچا اور ایک ماموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے نیلوفر سے کہا کہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ انہوں نے سب کچھ کہا اور ایک وہ تھپڑ تو میں آج تک نہیں بھولا ہوں، سالوں ان پانچ انگلیوں کی جلن میرے گالوں پر ہوتی رہی ہے۔ میری ضد، میرا غصہ، میری چیخ و پکار، میرا رونا کسی کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

مجھے میرے کمرے میں بند کر کے میرے دونوں چچا

باہر بٹھادیے گئے اور میرے والد میرے ماموں کے ساتھ چلے گئے۔ جب وہ دونوں نیلوفر کے گھر پہنچے تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ نیلوفر کی دوست جینو نے بتادیا تھا کہ نیلوفر کا سلسلہ کسی مسلمان سے چل رہا تھا اور وہ میرے ساتھ چلی گئی تھی۔ اسے میرے گھر کا تو پتا نہیں تھا، اسے جتنا پتا تھا اتنا ہی اس نے انہیں بتادیا تھا۔

نیلوفر کے گھر پر نیلوفر کے باپ کے دوست موجود تھے اور یقینی طور پر باتیں ہورہی تھیں کہ کس طرح سے اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ میرا باپ وہاں مجرم کی طرح گیا تھا۔ سر جھکا کر، آنکھیں نیچی کرکے میرے کیے پر معافی مانگنے کے لیے۔

رات کے اندھیرے میں میرے ماموں اور باپ کے ساتھ نیلوفر کا باپ اور کچھ رشتے دار آئے تھے۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر، مجھ سے کچھ سنے بغیر، انہوں نے نیلوفر کو اس کے باپ کے حوالے کردیا اور وہ لوگ خاموشی سے بھگوان داس بلڈنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہی مجھے لے کر میرے گھر کا قافلہ وادو واپس آ گیا۔

نیلوفر میرے دل سے نکلتی نہیں تھی اور سب کچھ میری زندگی سے نکل گیا تھا۔ میرا مستقبل کا پڑھنا، زندگی کے سارے پلان۔ میرا غصہ آہستہ آہستہ مجھے کھا گیا تھا۔ پھر ایک دن مجھے پتا لگا کہ نیلوفر کی شادی کسی بہرام جی سے ہوگئی تھی پھر پاکستان بن گیا تھا اور تھوڑی سی دیر میں اتنا کچھ ہوگیا تھا کہ وقت کا احساس تک نہیں ہوا۔ چھ سال کے بعد میں پھر کراچی گیا تھا۔

کراچی بہت بدل گیا تھا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے بے شمار مہاجروں نے کراچی کو پھیلا دیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں بن گئی تھیں۔ عجیب عجیب شکل کے لوگوں نے پان تھوک تھوک کر کراچی کی صاف ستھری سڑکوں کو گندگی کا ڈھیر بنادیا تھا۔

جہاں جانور پانی پیتے تھے، وہاں انسان نہا رہے تھے۔ چھ سال میں کراچی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور کیسا ہوگیا تھا...... مگر میرا غم ویسا ہی تھا، میری بے قرار نگاہیں نیلوفر کو تلاش کررہی تھیں۔

میں ماما پارسی اسکول کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہا اور بلڈنگ کو تکتا رہا۔ سڑکوں پر آوارگی کرتا رہا اور نیلوفر کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹرام پر بیٹھ کر سولجر بازار کے نہ جانے کتنے چکر کاٹے مگر وہ نہ ملی اور نہ ہی نظر آئی۔ دن ڈھلتے رہے۔ رات کا کیا ہے، رات تو گزر ہی جاتی ہے۔ سسکتی ہوئی۔ میں واپسی کا پروگرام بنا رہا تھا اور کینٹ اسٹیشن سے ٹرین کا ٹکٹ لے کر واپس آرہا تھا کہ صدر میں پارسیوں کی عبادت گاہ سے اسے نکلتے دیکھا۔ وہی چہرہ، وہی قامت، وہی انداز مگر اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ سڑک پر لمحوں کی وہ ملاقات نہ جانے کتنی طویل صدی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر تھرا گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے سرتاپا کانپ گئی ہو۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس نے بڑے زور سے اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ مجھے پتا لگ گیا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

وہ رات میری زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ اس رات میں نے نیلوفر کو کھویا تھا، وہ رات میری کراچی کی آخری رات تھی پھر میں کراچی نہیں آیا۔ چالیس پینتالیس سال گزر گئے مگر میں کراچی نہیں گیا۔ میرا تھا ہی کیا کراچی میں۔

میں نے مزید نہیں پڑھا۔ شادی نہیں کی اور باپ کی زمینیں دیکھتا رہا۔ میرے باپ نے کئی کئی بار مجھ سے معافی مانگی تھی۔ میں نے اس تھپڑ کو تو معاف کردیا تھا مگر نیلوفر سے میری جدائی کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ میرا بوڑھا باپ اس احساسِ گناہ کے ساتھ مرگیا لیکن میں نے اب اسے بھی معاف کردیا ہے۔ مراد کو بھی معاف کردیا ہے۔ اب تو مراد اور زیادہ قابلِ معافی ہوگیا ہے۔ اس حد تک کہ اسے تو مدد کی ضرورت ہے۔ پچھلے فسادات میں مراد کے بیٹے نواز بخش نے حیدرآباد سے ایک مہاجر لڑکی اغوا کرلی تھی۔ اسے محبت کا جھانسا دیا تھا پھر ایک رات اسے لے کر دادو چلا آیا تھا۔ جب مراد کو پتا چلا تو اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی زمینوں پر بنے ہوئے مکان میں اس کی مرضی سے نواز اور اس کے دوست اس مہاجر لڑکی کی عزت کو پامال کرتے رہے۔ پھر وہ لڑکی بھاگ گئی اور بھاگتے بھاگتے، چھپتے چھپتے، وہ ریل کی پٹری تک پہنچ گئی، جہاں سے اس کی کٹی ہوئی لاش ملی تھی۔

میں نے اس بچی کے ماں باپ کو دیکھا تھا۔ اخباروں میں ان کی تصویر چھپی تھی۔ ان کے چہرے کا کرب، ان کی زندگی کا درد، ان کی آنکھوں کی چمک، زندہ رہنے کی لگن، وہ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ موہن جو دڑو پر بھی وہ سناٹا، وہ مردنی نہیں ہے جو اس بوڑھے کے چہرے پر تھی۔

مجھے پھر نیلوفر کی یاد آئی تھی۔ کراچی میرے سامنے آ گیا۔ بھگوان داس بلڈنگ کا وہ فلیٹ۔ اس فلیٹ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی نیلوفر۔ وہ ہندو دوست جس نے مجھے منع کیا تھا۔ وہی مراد اور اس کا باپ جو میرے باپ کے ساتھ آکر مجھے دادو لے آئے تھے۔ یہ وہی کراچی تھا، جہاں میرے پُرکھوں نے ایک بچی کو بچایا تھا اور اب وہی کراچی ہے، جانے کیا ہوگیا ہے لوگوں کو۔ میں اپنے باپ کی قبر پر گیا تھا، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے مجھے نیلوفر مل گئی ہے۔

بے ضمیر

ثمر عباس

کبھی کبھی انسانی قدم اچھائی کی طرف اٹھنے کے لیے برائی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے میں ان کی اصل حقیقت اور فطرت کو جاننا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نے کیا... جو تمام عمر اذیتوں کا باعث بنا رہا اور آخر میں خود کو فنا کر کے اپنی نسل کو تباہی سے بچا گیا۔ اگر تباہی کا راستہ دکھانے سے پہلے تباہ کن حالات کے بارے میں سوچ لیا جائے تو شاید بچانے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ایک قاتل اور غافل انسان کی اپنے خاندان کی نگہبانی کا عجیب انداز

اس وقت میں پندرہ سال کا تھا اور ہم ایک کرائے کے فارم ہاؤس میں رہا کرتے تھے جو ریور روڈ کے بالکل ساتھ واقع تھا۔ یہ اسی کی دہائی کے وسط کی بات ہے۔ اس وقت ہماری ریاست کینٹو کی میں حالات بہت ابتر تھے جس دن صدر ریگن نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے دوسرے روز میرے باپ کو ہاکنز کنسٹرکشن کمپنی سے جواب مل گیا۔ اس کے بعد اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ میری ماں نے اسے سمجھایا، منتیں کیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجبوراً ماں کو گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملازمت کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے باغ میں پھلیاں، جو اور ٹماٹر کی بھی کاشت کی تاکہ ہماری سردیاں اچھی گزر جائیں۔ وہ میرے اسکول کے کپڑے ایک سنگر مشین پر سیتی تھی جو اتنی پرانی تھی کہ رک رک کر چلتی اور ہر سلائی پر جھٹکے لیتی۔

لوگ کہتے تھے کہ کسی زمانے میں میرا باپ بہت اچھا کاریگر تھا۔ شاید یہ بات سچ ہو لیکن مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے اسے غلے کے گودام میں بیئر کے خالی ڈبوں کا پہاڑ ہی بناتے دیکھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت ریڈیو سننے یا جنگلوں، کھیتوں اور پہاڑی نالوں پر شکار کرنے میں گزارتا۔

اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ شکار کا موسم ہے یا نہیں۔ جو بھی مل جائے وہی غنیمت ہے۔ خواہ وہ گلہری ہو یا خرگوش۔ اچھے دنوں میں اس نے ایک شاٹ گن اور ریمنگٹن رائفل خریدی تھی اور دونوں چیزیں اس کا قیمتی اثاثہ تھیں۔ ایک دفعہ میری ماں نے غلطی سے یہ کہہ دیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو فروخت کردو تاکہ ہمارا کرسمس اچھی طرح گزر جائے۔ میرے باپ نے غصے میں آکر اسے بالوں سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا عقبی دروازے تک لے گیا پھر اس نے دروازہ کھول کر اسے صحن میں دھکا دیا اور بولا۔

''اس وقت واپس آنا جب تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کردیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کچھ کہنا ہے ڈیوی؟''

اس وقت میری زبان پر بہت سے الفاظ تھے لیکن میں جانتا تھا کہ بولنے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا اور مار پیٹ اس کی فطرت میں شامل تھی۔ میں تو اس کا گھونسا بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ویت نام کی جنگ میں خدمات انجام دے چکا تھا لیکن اس کے بارے میں بہت کم گفتگو کیا کرتا۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک زخم کا نشان تھا جو جنگ میں نہیں بلکہ سائگان کے ایک بار میں لڑائی کے دوران اسے لگا تھا۔

میرا باپ وہاں کھڑا ہوا آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ شاید وہ امید کررہا ہوگا کہ میں کچھ بولوں۔ میں جانتا تھا کہ اسے میرا بہت خیال ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے پانچ ڈالر دیے تاکہ میں اپنے دوست کے ساتھ فلم دیکھنے جاسکوں۔ جب میں چوتھی جماعت میں تھا تو مجھے فلو ہوگیا تھا۔ وہ ساری رات پاس بیٹھ کر میرے ماتھے پر گیلا کپڑا رکھتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ صرف اس لیے میرا خیال رکھتا ہے کیونکہ ہمارے درمیان ایک تعلق ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے.... پالتو کتے کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ چند برس قبل خاردار تار پھلانگتے ہوئے اس کی ٹانگ زخمی ہوگئی تھی اور اس کے زخم میں انفیکشن ہوگیا۔ میرے باپ نے اس کا علاج کرانے کی خاطر گھر سے پیسے چرائے جس سے ایک ہفتے کا راشن آسکتا تھا۔ چند ماہ بعد وہ اس کتے کو گودام کے پیچھے لے گیا اور اسے گولی ماردی کیونکہ اس کتے نے اسے اس وقت کاٹ لیا جب وہ ایک تازہ شکار کیے ہوئے ہرن کو گھسیٹ کر لارہا تھا۔

اس نے کچن کاؤنٹر پر اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بولو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ذہن میں کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ میری ماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے گالوں کو بوسہ دیا اور اپنا ٹھنڈا کھانا لے کر اس کے ساتھ لیونگ روم میں چلی گئی جبکہ وہ مقامی خبریں دیکھنے لگا۔ میرے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ میں نے سوچا کہ فوج میں بھرتی ہوجاؤں گا یا لفٹ لے کر کیلی فورنیا چلا جاؤں گا۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنی منزل کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا، بس گھر چھوڑنے کی دھن سوار تھی۔

ہمارے مالکِ مکان کا نام بین ڈینیئل تھا۔ اس کی عمر غالباً ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ لمبے قد کا خوش شکل انسان تھا۔ وہ بہت وسیع جائداد کا مالک ہونے کے علاوہ گرین ویو میں سب سے بڑی انشورنس ایجنسی چلاتا تھا۔ اسے ورثے میں ایک درجن فارم اور سیکڑوں ایکڑ جنگلات سے بھری زمین ملی تھی جہاں سے حاصل ہونے والی لکڑی اس کی کمائی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ ہارپس کاؤنٹی کا امیر ترین آدمی ہے لیکن میرے باپ کا کہنا تھا کہ اس کی جیب ہمیشہ خالی ہوتی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ جب سے ڈینیئل نے جنگلات اور کھیتوں کا حساب کتاب اپنے ہاتھ میں لیا تھا اس سے پہلے ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مہینے میں ایک بار وہ اپنی نیلی لنکن کار میں سوار ہوکر ہمارے دروازے پر آتا اور انتظار کرتا کہ ہم اسے کرایہ دے دیں۔ اگر میری ماں آس پاس ہوتی تو ڈینیئل کی نظریں اسی کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ بتیس سال کی ایک خوش شکل عورت تھی۔ سیاہ بال، سبز آنکھیں اور پرکشش جسم جو کسی بھی مرد کو اپنی جانب متوجہ کرسکتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ میرا باپ حسد یا غصہ کرنے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتا کہ اس کی بیوی میں مردوں کے لیے کشش ہے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ ڈینیئل مقررہ وقت سے ڈیڑھ ہفتہ قبل ہی کرایہ لینے آگیا۔

میں اور ڈیڈی عقبی پورچ میں مچھلیاں صاف کررہے تھے جو میرا باپ دریا سے پکڑ کر لایا تھا جب ڈینیئل نے اپنی گاڑی ہمارے مکان کے باہر کھڑی کی اور چلتا ہوا ہماری طرف آگیا۔ میرے باپ نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ''کہو۔ کیسے آنا ہوا؟''

''لگتا ہے کہ آج تم نے کافی مچھلیاں پکڑی ہیں؟''
میرا باپ اس کی طرف چھری بڑھاتے ہوئے بولا۔
''کیا تم ان کی صفائی میں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟''
''نہیں شکریہ۔'' ڈینیئل نے کہا۔
''ابھی کرایہ دینے میں تو وقت ہے۔''
''میں کرایہ لینے نہیں آیا۔'' ڈینیئل نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل تم نے میرے جنگل سے بڑی تعداد میں گلہریاں پکڑی ہیں۔''

''ہاں۔'' میرے باپ نے اپنی جیب سے کپڑا نکال کر اپنے ہاتھ صاف کیے اور بولا۔ ''میرے کیلنڈر کے مطابق یہ گلہریاں پکڑنے کا سیزن ہے۔''
''میں نے سنا ہے کہ تم نے دو مرتبہ مقررہ حد کی خلاف ورزی کی۔''
''شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔'' میرے باپ نے کہا۔ ''لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم نے گالف کھیلنا چھوڑ دیا ہے اور فالتو وقت میں نگرانی شروع کر دی ہے۔''
ڈینیئل نے ناک کے ذریعے اپنی سانس خارج کی اور بولا۔ ''اس کی تشہیر بھی کی جا چکی ہے۔''
''ممکن ہے کہ میری نظر سے نہ گزری ہو۔'' میرے باپ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ان گلہریوں کی اتنی فکر کیوں ہے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان جنگلوں میں لوگ عرصہ دراز سے شکار کھیل رہے ہیں۔''
ڈینیئل نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''تم نے وہ ٹرالر دیکھے جو میں نے یہاں کھڑے کیے ہیں؟''
''ان کے بارے میں سنا ہے۔'' میرے باپ نے کہا۔
''بہت جلد ان میں شکاریوں کے لیے کیبن بنا دیے جائیں گے۔'' ڈینیئل بولا۔ ''میں ایک نیا کاروبار شروع کر رہا ہوں۔''

اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ باؤلنگ گرین، لوئیس ول، ناش ول، ایوانس ول اور انڈیانا سے تعلق رکھنے والے لوگ شکار کے سیزن میں ایک کیبن اور بیس یا تیس ایکڑ زمین کرائے پر حاصل کرنے کے لیے بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہاں بٹیر اور خرگوش کے شکار کے لیے آئیں گے لیکن سب سے زیادہ رش ہرن کے شکار کے سیزن پر ہوگا۔
''تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' ڈینیئل نے کہا۔ ''وہ شکار کے حقوق کے عوض بھاری رقم دیں گے۔

اس لیے یہ میرے مفاد میں ہے کہ سارا کھیل خوش اسلوبی سے آگے بڑھے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری زمین میں داخل ہو کر ہرنوں کو خوفزدہ کریں۔''
میرے ڈیڈی نے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ ''تم اس بارے میں سنجیدہ ہو؟''
''ہاں۔'' ڈینیئل نے کہا۔ ''وہ فارم پرائیویٹ ملکیت ہیں اور اس کی تشہیر بھی ہو چکی ہے۔'' اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ تمہیں معلوم نہیں تھا، اس لیے اس بار میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔''
ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ کیا پیو گے بیئر یا کافی؟''
''نہیں......شکریہ۔''
''اتنی جلدی کیا ہے۔ ڈارلین آج چھٹی پر ہے۔ اس سے مل کر جانا۔''
ڈینیئل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں جیسے کوئی بچہ چوری کرتا ہوا پکڑا جائے پھر ڈیڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔''
چند روز تک ایسا لگا کہ میرے باپ نے اپنی کوششیں ترک کر دی ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ ڈینیئل کا انتباہ نہیں بلکہ موسم کی تبدیلی تھی۔ خزاں کی آمد آمد تھی اور رات میں سردی کی وجہ سے کمبل لینا پڑ رہا تھا۔ اس موسم میں مچھلیاں بھی وافر مقدار میں ملتی ہیں چنانچہ پانچ دنوں میں میرے باپ نے ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑیں۔ ان میں ایک تو اتنی بڑی تھی کہ مجھے اس کو دونوں ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ ہم نے ہر روز رات کے کھانے میں فرائیڈ فش اور تلے ہوئے آلو کھائے۔ اس کے باوجود بھی اتنی مچھلیاں بچ گئیں کہ ہم نے انہیں فریزر میں رکھ دیا۔
چھٹے روز بارش شروع ہو گئی۔ جب میں کچن میں آیا تو میرا باپ کچن میں بیٹھا کافی اور سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔ وہ مجھے خوش نہیں لگ رہا تھا چنانچہ میں نے ایک سلائس اٹھایا تاکہ راستے میں اسے کھا لوں۔ میں دروازے سے باہر جانے ہی والا تھا کہ اس نے انگلی سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''مجھے اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
ماں انڈا تل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جلدی جاؤ۔ میرے پاس تمہیں چھوڑنے کے لیے وقت نہیں ہے۔''

"بیٹھ جاؤ۔" ڈیڈی نے کہا۔
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کتابوں کا بیگ زمین پر رکھا اور بیٹھ گیا۔ میری ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر اس کی بس نکل گئی تو تم اسے چھوڑ کر آؤ گے۔"
"آج یہ میرے ساتھ جائے گا۔" ڈیڈی نے کہا۔
"دیکھو وائن! اگر تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے تو مت کرو۔ میں کرلوں گی۔ میں نہیں جانتی کہ کیسے اور کس طرح یا پھر اسے بھول جاؤ۔"
"یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہم ہر وقت مچھلی نہیں کھا سکتے۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان باتوں کا میرے اسکول جانے سے کیا تعلق ہے۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں پھر میرے کانوں میں ڈیڈی کی آواز آئی۔
"میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ جاؤں گا، اب میں جارہا ہوں اور ڈیوی بھی میرے ساتھ جائے گا۔"
"وائن۔" میری ماں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسے اسکول جانے دو۔"
میرے باپ نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں مت بولو۔"
"اوہ میرے خدا۔" وہ بولی۔ "لگتا ہے کہ میں کسی پاگل خانے میں رہ رہی ہوں۔ جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔
مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے بدل گیا۔ صرف دو ہفتے پہلے ہی اسکول کے پرنسپل نے فون پر شکایت کی تھی کہ میں کلاس سے غیر حاضر رہتا ہوں، ٹیسٹوں میں فیل ہو رہا ہوں اور ٹیچرز سے بدزبانی کرتا ہوں۔ میری ماں نے کہا کہ اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی اور مجھے ٹیلی ویژن دیکھنے کے بجائے پڑھنے میں دل لگانا چاہیے جبکہ باپ کا ردعمل بہت شدید تھا۔ اس نے میرا ریکارڈ پلیئر توڑ دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ کی اور مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میرا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر ماں مداخلت نہ کرتی تو شاید وہ میرا گلا گھونٹ دیتا۔ ماں کی منت سماجت پر اس نے مجھے چھوڑ دیا تاہم یہ تنبیہ بھی کی کہ اگر آئندہ اسکول سے کوئی شکایت آئی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا اور اب وہ مجھے اسکول جانے سے روک رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا لیکن میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوگیا کہ ماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ہم واقعی پاگل خانے میں رہ رہے ہیں۔
"جلدی سے ناشتا کرلو۔ تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔" میرے باپ نے کہا۔ "میں باہر... بیٹھا ہوں۔"
گرین ویو جاتے ہوئے اس نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں راستے میں مختلف مناظر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر مجھے کہاں جانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ فلوریڈا چلا جاؤں۔ میں نے وہاں کے ساحلوں اور مگرمچھوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ویسے تو میں نے ہمیشہ نیویارک یا شکاگو جیسے بڑے شہروں میں رہنے کا خواب دیکھا تھا۔ جہاں اونچی اونچی عمارتیں تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے فلموں اور ٹیلی ویژن شوز میں کیلی فورنیا کے مناظر دیکھے تھے۔ وہ جگہ بھی مجھے اچھی لگتی تھی۔
قصبے کے مضافات میں ایک اسٹور کے باہر اس نے اپنا ٹرک روکا اور مجھے چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بیئر کے ڈبوں کا آدھا باکس اور گوشت کے بھنے ہوئے پارچوں کا ایک پیکٹ تھا۔ اس نے مجھے ایک پارچہ پکڑاتے ہوئے کہا۔
"مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں ناشتا کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔"
چند میل جانے کے بعد اس نے نیشنل گارڈ کے اسلحہ خانے کے سامنے ٹرک روک دیا۔ وہاں چھٹی کے دنوں میں سستی اشیاء کا بازار لگتا تھا اور سال میں دو مرتبہ کشتی کے مقابلے ہوتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم کام والے دن یہاں کیوں آئے ہیں۔ پارکنگ لاٹ تقریباً گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار نظر آرہی تھی۔ میرے باپ نے ایک مناسب جگہ پر ٹرک کھڑا کیا اور باکس میں سے بیئر نکال کر پینے لگا۔
"ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟" بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔
"میں قطار میں لگنے جارہا ہوں اور تم یہاں بیٹھ کر مجھے دیکھو گے۔"
"کیوں؟"
"یہاں ہر مہینے کے آخری جمعے کو حکومت کی طرف سے غریبوں میں کھانے پینے کی اشیاء مثلاً پنیر، خشک دودھ، چاول اور پھلیاں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا حصہ وصول کرنے آیا ہوں۔"
"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اب میں سمجھا کہ تم نے مجھے اسکول کیوں نہیں جانے دیا۔''
اس نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا اور قطار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ان میں سے کچھ لوگ میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتے تھے لیکن ہم نے کبھی تعلیم میں دلچسپی نہیں لی کیونکہ جانتے تھے کہ اسکول سے نکلنے کے بعد ہمیں کسی تعمیراتی کمپنی یا کان میں ہی مزدوری کرنا ہوگی۔ تم بے شک اسکول جا کر وقت ضائع کرتے رہو لیکن چند سال بعد تمہیں بھی اسی طرح، مفت راشن کے لیے قطار میں لگنا ہوگا۔''
میں نے سر ہلا دیا گو کہ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پیدائشی احمق ہوں۔
''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب تم کلاس چھوڑنے یا ٹیسٹ میں فیل ہونے سے پہلے ضرور سوچو گے اور مجھ سمیت ان لوگوں کو یاد کرو گے جو خیرات لینے کے لیے قطار میں کھڑے ہیں۔ اگر تم بالکل ہی احمق نہیں ہو تو اپنی تعلیم مکمل کرو اور اس قصبے سے نکل جاؤ۔''
''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہیں وظیفہ مل جائے گا۔ تم تو اپنے نام کے ہجے بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔''
میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں نے غصے سے کہا۔ ''میں احمق نہیں ہوں۔''
وہ ٹرک سے اترتے ہوئے بولا۔ ''پھر یہ حرکتیں چھوڑ دو۔''
وہ قطار کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنی نشست پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر میرے کسی دوست کے والدین میں سے کوئی یہاں سے گزرا اور اس نے ہمارا ٹرک یہاں دیکھ لیا تو یہ میرے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی۔
ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ایک بڑا گتے کا ڈبا لے کر واپس آیا۔ اس میں پانچ پونڈ پنیر، چاول کے تین تھیلے، پھلیوں کے تین پیکٹ اور خشک دودھ کا ایک باکس شامل تھا۔ اس نے لحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا مگر میں اس سے نظریں نہ ملا سکا لیکن میں نے اپنے آپ سے عہد کر لیا کہ ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میرے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ ہم فقیر ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری ماں سخت محنت کر کے کچھ پیسے کما لیتی ہے یا میرا باپ جنگ میں شریک ہوا تھا۔ ہم صرف فقیر تھے جو قطار میں لگ کر خیرات لیتے ہیں۔ اس وقت مجھے بین ڈینیئل، اس کی کار، زمین اور بڑے سے مکان کا خیال آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے امیر ہونے کی وجہ سے نفرت کروں یا تعریف کہ وہ کاؤنٹی کے ان چند لوگوں میں سے تھا جنہیں اس طرح کی قطار میں نہیں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔
اگلی صبح میں بیدار ہوا تو میرا باپ میز پر بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے شکاریوں والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی شاٹ گن ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔
میری ماں اپنے لیے ایک کپ میں کافی لے کر آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟''
''میں سوچ رہا تھا کہ تھوڑا سا شکار کر لوں۔''
''اس کے باوجود کہ وہ تمہیں منع کر چکا ہے۔''
ڈیڈی نے بیئر کا ڈبا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں وہاں اس وقت سے شکار کر رہا ہوں جب میں ڈیوی کی عمر کا تھا۔''
''وائن۔'' میری ماں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''اگر اس نے ہمیں یہاں سے نکال دیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کرائے پر دوسری جگہ لے سکیں۔''
اس نے ریفریجریٹر سے ایک اور بیئر کا ڈبا نکالا اور بولا۔ ''اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو نکلے گا۔ چاہے وہ کچھ بھی ہو۔''
''او میرے خدا۔'' میری ماں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کسی غار میں رہیں گے...... کسی میدان میں خیمہ لگائیں گے یا قصبے کے پل کے نیچے بستر لگانا ہوگا؟''
میں نے اپنی سانس روک لی اور اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب وہ ماں پر ہاتھ اٹھائے یا اس کے بال پکڑ کر کھینچے لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بیئر کا ڈبا کھولا اور قدرے پُرسکون آواز میں بولا۔ ''تم کچھ دیر آرام کر لو۔ رات تم کافی دیر سے گھر واپس آئی تھیں۔''
میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ جب ہم سامان لے کر واپس آئے تو وہ گھر سے نکل رہی تھی۔ اس نے میرے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ دیر تک کام کرے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ نصف شب کے بعد واپس آئی تھی۔ میں بستر پر لیٹا ہوا ان دونوں کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔
دو گھنٹے بعد میں نے ایک کار کے رکنے اور دروازہ پیٹنے کی آواز سنی۔ کوئی شخص غصے میں میرے باپ کا نام لے رہا تھا۔ میں جلدی سے باہر آیا اور ان کے کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ ماں ابھی تک سو رہی تھی۔ جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ بین ڈینیئل میرے باپ پر ناراض ہو رہا تھا۔
''میں نہیں جانتا کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔''

ڈیڈی نے کہا۔ ''میں کوئی وکیل نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ان خرگوشوں کا شکار کرنے کا حق ہے جو میرے گھر کے پچھواڑے آجائیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم خودسر اور مغرور ہو۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''اور اکثر و بیشتر حماقتیں کرتے رہتے ہو لیکن میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا تھا۔ میرے تین آدمیوں نے تمہارے ٹرک کو سائبرس کریک برج جانے والی سڑک پر کھڑے دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ ساری زمین میری ملکیت ہے۔ تم اتنے ہوشیار نہیں ہو جتنا کہ اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔''

''شاید۔''

''اس میں شاید کا کوئی سوال نہیں۔'' ڈینئل نے کہا۔ ''اگر تم نے یہ حرکت کی ہے تو اس کا اقرار کرلو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے حالات ان دنوں ٹھیک نہیں ہیں۔''

''یہاں سب ہی لوگوں کا گزارہ مشکل سے ہو رہا ہے۔''

''مجھے دوسروں سے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔ پہلی بار میں نصیحت کرنے آیا تھا۔ اب تنبیہ کر رہا ہوں۔ اگلی بار میں نے تمہیں ناجائز شکار کرتے ہوئے دیکھا تو شیرف کے ساتھ آؤں گا اور تمہیں بے دخلی کا نوٹس دے دوں گا۔ اگر تم کرایہ نامہ دیکھو تو تمہیں بے دخل کرنا میری صوابدید پر ہے۔ مجھے صرف دس دن کے نوٹس کے ساتھ تمہارا بقیہ کرایہ واپس کرنا ہوگا۔ تمہاری ایک بیوی اور بیٹا بھی ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں بھی سوچو اور انسان بن جاؤ۔''

وہ جانے کے لیے مڑا لیکن میرے باپ کے چلاّنے پر رک گیا۔ پھر وہ اپنی پک اپ پر گیا اور اس کے پچھلے حصے سے نصف درجن مردہ خرگوش نکال کر ڈینئل کے قدموں میں ڈال دیے۔

''تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے خرگوش ہیں۔ ٹھیک ہے۔ انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں بھی انہیں جنگل میں پھینکنے سے بچ جاؤں گا۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو اس موسم میں خرگوش کھائے۔''

ڈینئل کچھ دیر تک مردہ خرگوشوں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''بالکل۔'' میرے باپ نے کہا۔ ''میں نے اس کا ایک ٹکڑا بھی منہ میں نہیں رکھا۔''

''پھر تم نے ان کا شکار کیوں کیا؟''

''کبھی کبھی کچھ چیزوں کا شکار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔''

''کتیا کی اولاد۔'' ڈینئل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

ڈیڈی نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گالی مت دو۔ آئندہ کچھ کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

ڈینئل نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم اپنے آپ کو دیکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چند مہینوں کے لیے جیل کی ہوا کھانی پڑ جائے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور بیٹھنے سے پہلے اس نے مڑ کر ڈیڈی سے کہا۔

''میں نے جو کہا، وہ بالکل واضح ہے۔ میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔''

ڈیڈی نے ایک مردہ خرگوش اٹھایا اور اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں مارنا ضروری ہو جاتا ہے۔''

لیکن اس سے پہلے ہی کار کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہاں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ڈیڈی کے کہے ہوئے الفاظ ہمیشہ میرے دماغ میں گونجتے رہے۔

مجھے امید تھی کہ آئندہ چند دنوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسرے روز ہی میرا باپ درجنوں خرگوش شکار کر کے ایک نیا بحران پیدا کر دے گا یا جب ڈینئل کرایہ لینے آئے گا تو ان کے درمیان تلخ کلامی ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا باپ گھر میں بیٹھا بڑبڑاتا رہا اور اس نے اپنی بندوق الماری میں بند کر دی تھی۔ جب ڈینئل کرایہ لینے آیا تو وہ پہلے ہی گیری کے شراب خانے جا چکا تھا۔

اس دن میری ماں نیلے رنگ کی جینز اور آسمانی ٹی شرٹ میں بہت خوب صورت نظر آرہی تھی۔ ڈینئل کے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو گیا۔ اس نے ڈیڈی سے تلخ کلامی پر میری ماں سے معذرت کی جس پر اس نے کہا کہ بعض اوقات وائن اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا اور یہ اس کا مخصوص انداز ہے لیکن اسے یقین ہے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔

اگلے چند ہفتوں تک ماں کا یہ معمول رہا کہ وہ دوپہر کو کام پر جاتی اور اس کی واپسی دوسرے دن صبح کو ہوتی۔ اس دوران صرف دو مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ وقت پر گھر آگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہماری زندگی سے نکل گئی ہے۔ میں اور ڈیڈی اپنے لیے خود ہی کھانا بناتے اور گھر کی خاموشی کو ٹیلی ویژن کی آواز سے دور کرتے۔ تاہم ایک طرح سے ہمارے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میری ماں بہت زیادہ ''اوور ٹائم'' کر رہی تھی جس کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ

ہو گیا تھا۔ ہمارے بل وقت پر ادا ہونے لگے اور گھر میں کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں موجود رہنے لگیں۔ ایک دن میری ماں مجھے شاپنگ مال لے گئی اور مجھے ویسی ہی جیکٹ دلوائی جو امیر گھروں کے بچے پہنتے تھے۔

تب مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی میں تبدیلی آ گئی ہے۔

پھر ایک صبح میں نے رونے اور اپنے باپ کی ہلکی سرگوشیاں کرنے کی آواز سنی۔ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کچن میں بھی نہیں تھے اور لیونگ روم خالی پڑا ہوا تھا۔ میرے دماغ میں ایک ہی خیال سر اٹھانے لگا۔ اس بار اس نے میری ماں کو بہت بری طرح مارا ہے۔

''میں اسے قتل کر دوں گا۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

پھر مجھے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ باتھ روم سے نکل کر آئی تھی اور اس نے اپنے جسم کے گرد ایک بڑا سا تولیا لپیٹا ہوا تھا۔ وہ بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ ڈیڈی نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں یہ کام جاری نہیں رکھ سکتی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ٹرک اسٹاپ پر کھڑے ہوئے کلرک اور ویٹرس مجھے کس طرح دیکھتے ہیں۔ میرے خدا، مجھے ڈیزل کی بو سے نفرت ہے۔ چاہے میں کتنی بار سر دھولوں۔ میرے بالوں سے یہ بدبو نہیں جاتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میرے باپ نے کہا۔ ''بہت ہو چکا۔''

پھر اسے میری موجودگی کا احساس ہوا، وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''جا کر سو جاؤ۔ یہاں سب ٹھیک ہے۔''

''تم نے میری ماں کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم یہاں سے جاؤ۔''

مجھے اپنے الفاظ پر حیرت ہوئی جب میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''کمینہ۔''

ابھی میں صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔

''میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک زوردار لات رسید کر کے مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور میں درد سے چلانے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں اس سے معافی مانگنا اور التجا کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑا اور مجھے لیونگ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک بار پھر مجھے لات رسید کی اور

میرا سانس رکنے لگا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ جا کر سو جاؤ۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے میری بات نہیں سنی۔''

''آگے بڑھو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اور مارو تاکہ تمہیں سکون مل جائے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔''

اسی وقت میری ماں کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ بیڈ روم کے دروازے میں کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔''

میرے باپ نے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے ڈیوی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

چند گھنٹوں کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر آیا تو دیکھا کہ ماں لباس تبدیل کر کے صوفے پر بیٹھی ہوئی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی جبکہ باپ بیئر کا گلاس ہاتھ میں تھامے ٹیلی ویژن پر فٹ بال کا میچ دیکھ رہا تھا۔ اس رات ماں نے ہمارے لیے کھانا بنایا اور جب میں سونے کے لیے جانے لگا تو اس نے مجھے کچن میں بلا کر کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ وہ غصے میں آ گیا لیکن تم نے بھی غلط وقت پر مداخلت کی۔ حالات خراب تھے لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

مجھے یقین تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور اس کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی رہا۔ میرے زخم مندمل ہو گئے تھے اور میں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ میری ماں ہمیشہ کی طرح دیر سے گھر آتی۔ باپ نشے میں دھت رہتا اور رات گئے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا۔

ایک روز میں سہ پہر کے وقت گھر میں بیٹھا ہوم ورک ...... کر رہا تھا اور ماں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی کہ میرا باپ گھر میں داخل ہوا۔ وہ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ سیدھا فریج کی طرف گیا اور اس میں سے ایک بیئر کاٹن نکالتے ہوئے بولا۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈیوی۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' میری ماں نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو۔''

''پھر بھی معلوم تو ہو کہ تم اسے کہاں لے جارہے ہو؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بتایا کہ وہ ریور روڈ پر جارہا تھا کہ اس کی نظر ایک ہرنی اور اس کے بچے پر گئی جو کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ گاڑی میں گن موجود تھی۔

''یہ گوشت کرسمس تک کے لیے کافی ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن وہ دونوں جنگل میں کافی اندر پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں انہیں گھسیٹ کر لانا ہوگا۔''

''اوہ میرے خدا!'' میری ماں نے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کردیا وائن؟''

''کیا تم ہرن کا گوشت نہیں کھانا چاہتیں؟'' اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''سب ٹھیک ہے۔ کسی کو بھی اس بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔''

میری ماں نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور بولی۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ دو کے مقابلے میں تین زیادہ تیزی سے کام کرسکتے ہیں۔''

ایک ہرنی اور اس کا بچہ گرے ہوئے پتوں کے ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔ میری ماں نے ہرنی کے کندھے پکڑے اور میں اس کا پچھلا حصہ باندھنے لگا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہاں پر خون جمنا شروع ہوگیا تھا۔ میرے باپ نے ہرن کے بچے کو اپنے کندھوں پر ڈالا اور سڑک کی طرف چل دیا۔

''جلدی کرو ڈیوی۔'' ماں نے کہا۔ ''میں یہاں سے جلد از جلد نکلنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ کوئی ڈینیئل کو فون کردے۔''

ڈیڈی نے کہا کہ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس کا اشارہ پڑوسیوں اور ہم جیسے کرائے داروں کی جانب تھا جو جانتے تھے کہ کھانے کی میز پر گوشت نہ ہو تو دن کیسے گزرتے ہیں۔ ہم پک اپ کے قریب پہنچنے والے تھے کہ ڈینیئل کی کار ہماری گاڑی سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ہمارے ہاتھ سے ہرنی گر گئی لیکن میرا باپ چلتا رہا۔ پک اپ کے قریب پہنچ کر اس نے ہرن کے بچے کو پچھلے حصے میں ڈالا اور اس وقت ڈینیئل اسی کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے کہا۔

''میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا۔''

''مجھے اس سے کب انکار ہے۔'' میرے باپ نے اعتراف کیا اور ایک سگریٹ نکال لیا۔

''لیکن تمہارے پاس اب بھی بڑی تعداد میں ہرن موجود ہیں۔''

''میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرا گھر خالی کردو۔ مجھے چاہیے کہ سیزن کے بغیر ہرن کا شکار کرنے پر تمہاری رپورٹ کروں۔''

جب وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو میرے دل میں شدید خواہش ابھری کہ میرا باپ اس پر جھپٹ پڑے۔ اسے ٹھوکریں اور لاتیں مارے جیسا اس نے میرے ساتھ کیا تھا لیکن اس نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈینیئل تقریباً اپنی کار تک پہنچ چکا تھا جب میری ماں نے اس کا نام لے کر اسے پکارا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں فیصلہ کرچکا ہوں۔''

''پھر بھی ہم اس معاملے پر بات تو کرسکتے ہیں۔'' میری ماں نے کہا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میں ٹرک میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں پھر وہ تیزی سے ڈینیئل کی طرف لپکی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور ایڑیاں اٹھا کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگی۔ اس نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر میرے ڈیڈی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ڈیوی! گاڑی میں بیٹھو۔'' میرے باپ نے کہا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ مسٹر ڈینیئل تھوڑی دیر بعد تمہاری مما کو گھر پہنچا دیں گے۔''

میں پسنجر سیٹ کی طرف چلا گیا لیکن گاڑی میں سوار نہیں ہوا۔ ماں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ڈینیئل کا ہاتھ اس کی کمر تک گیا اور اس نے ماں کو اپنی جانب بھینچ لیا۔ اب میری سمجھ میں ساری کہانی آ گئی۔ ماں کا ''اوور ٹائم'' پر جانا۔ نصف شب کے بعد گھر آنا، پیسوں کی بہتات وغیرہ۔ ڈیڈی نے میرا نام لے کر پکارا، وہ تھکا ہوا اور شکست خوردہ لگ رہا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ یوں لگا جیسے متلی ہورہی ہے۔ پھر اچانک ہی میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور میں پُرسکون ہوگیا۔

''مام!'' میں چلّایا۔ ''میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

وہ ڈینیئل کی طرف مڑی جیسے اس سے اجازت مانگ رہی ہو۔ میرے دماغ میں باپ کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ ''کبھی کبھی کسی کو مارنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔'' میں نے انتظار کیا کہ وہ ایک تہائی فاصلہ طے کرے پھر میں نے گاڑی میں سے رائفل نکالی۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اس کی نال کا رخ عین ڈینیئل کے سینے کی

جاذب کرلیا۔

پہلا نشانہ خطا گیا لیکن وہ خوف کے مارے اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسری بار میں نے اس کا نشانہ لیا اور ٹریگر کو آہستہ سے دبایا جیسا کہ ڈیڈی نے مجھے سکھایا تھا۔ گولی سیدھی اس کے گلے کے نیچے جا کر لگی اور خون کے چھینٹے اس کی کار پر پھیل گئے۔ یوں لگا جیسے دنیا ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔ میرے کان بج رہے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ میں نے اپنے باپ کی آواز سنی جو میرا نام لے کر چلاّ رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے رائفل لے لی اور اس کی نال کا رخ آسمان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا پھر اس نے رائفل سڑک پر پھینک دی اور کانپتے ہاتھوں سے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ جب شیرف کے ڈپٹی اور پولیس والے آئے تو میں اور میری ماں گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے اور باپ اس کی پشت سے ٹیک لگائے بیئر پی رہا تھا۔

ایک پولیس والے نے چلاّتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”میں نے بین ڈینئیل کو قتل کر دیا ہے۔“

اس نے کم از کم چھ مرتبہ یہ بات دہرائی کہ شکار کے حقوق اور مداخلتِ بے جا پر ڈینئیل کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ آج جب اس نے ہرنی اور اس کے بچے کو دیکھا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے سوچا کہ اس شکار سے ان کی دو ماہ کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ وہ ان مُردہ جانوروں کو لے جا رہا تھا کہ ڈینئیل وہاں پہنچ گیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ انہیں گھر سے بے دخل کرنے کی دھمکی دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع متعلقہ حکام کو دے گا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گیا اور اس نے ڈینئیل پر فائر کر دیا۔

ایک سراغ رساں نے اس سے پوچھا کہ میری ماں کے لباس پر خون کے چھینٹے کیسے آئے؟ میرا خیال تھا کہ میرا باپ اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گا اور اس کا پورا بیان مشکوک سمجھا جائے گا لیکن ڈیڈی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جب اس نے گولی چلائی تو وہ ڈینئیل کے پاس کھڑی اسے منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سراغ رساں اور اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے میری ماں پر بھرپور نظر ڈالی اور اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور سراغ رساں یہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ ڈینئیل اور ڈیڈی کے درمیان تلخ کلامی کی وجہ کوئی اور تو نہیں تھی۔

انہوں نے میرے باپ کو ہتھکڑی لگائی اور گاڑی میں ڈال دیا۔ ایک ڈپٹی نے ہماری گاڑی سے ہرن کا بچہ اتار کر سڑک کے کنارے ڈال دیا اور ہرنی کے ساتھ ساتھ اسے بھی ان شکروں کے لیے چھوڑ دیا جو کھیت کے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔

میرے باپ پر مقدمہ چلا اور اسے بیس سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ جس رات اسے ایڈی ویل منتقل کیا جا رہا تھا، میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا اور اس کے بعد بھی اس کا یہی رویہ رہا۔ پانچ سال بعد دل کا دورہ پڑنے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت وہ جیل کے کیفے ٹیریا میں کام کر رہا تھا۔

میری ماں زندہ ہے اور ہارپس کاؤنٹی میں ہی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ تو وہ میرے باپ کو یاد کر کے روتی رہی پھر اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ جیل میں قید کے دوران اس نے ڈیڈی سے ملنا، فون کرنا اور خط لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ بین ڈینئیل کے مرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک اور مرد آ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسرا پھر تیسرا، یہاں تک کہ مجھے ان کی گنتی سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ کبھی کبھی میں اسے وال مارٹ یا میکڈانلڈ پر دیکھتا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلا دیتے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

ڈیڈی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کچھ جاندار ایسے ہوتے ہیں، جنہیں مار دینا چاہیے۔ ان کا اشارہ جانوروں کی طرف تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے میں نے ڈینئیل کو مار دیا اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو بھی گولی مار دوں لیکن میں ڈیڈی کی طرح ساری زندگی جیل میں بسر نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت تو ڈیڈی نے میرا جرم اپنے سر لے کر نئی زندگی دے دی تھی، اب کون بچائے گا۔ مجھے یہ بات بہت دیر سے سمجھ آئی کہ میری ماں جو کچھ کر رہی تھی، اس میں ڈیڈی کی مرضی شامل تھی۔ ماں نے ڈینئیل سے تعلقات استوار کیے تا کہ ہم ایک آسودہ زندگی بسر کر سکیں اور ڈیڈی خاموش تماشائی بنے رہے اور ان کے جیل جانے کے بعد ماں نے یہی راستہ اختیار کیا۔

میری نظر میں دونوں ہی بے حس ہیں لیکن ڈیڈی کا جرم زیادہ سنگین ہے، جنہوں نے عیش و آرام کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کاش میں ان کی اولاد نہ ہوتا...... کاش میں نے کسی اور گھر میں جنم لیا ہوتا......!

امیدوار

مرزا امجد بیگ

اکثر لوگ امید کو بھی زندگی کا دوسرا رخ قرار دیتے ہیں... اور دینا بھی چاہیے کیونکہ امید ہی گویا مردہ تن میں جان ڈالنے کا باعث بنتی ہے اس نے جسے زندگی کا ساتھی سمجھا وہ ساتھ نہ نبھا سکا مگر جو امیدوار تھے اس کی نظروں کی سمت بدلنے کا باعث بن بیٹھے اور وہ جو زندگی کے نام پر رسوائیوں کا طوق گلے میں ڈالنے پر مجبور تھی کہ کسی کی نگاہِ خاص کا مرکز بن گئی اور پھر برائے نام جیون ساتھی کے جیون کی ناؤ کچھ ایسے ڈبوئی کہ اسے سانس لینے کی مہلت تک نہ ملی کیونکہ... جب کوئی کسی کی امید اجاڑنے کا باعث بن جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے اپنے دل کی دنیا بھی جلد ہی ویران ہونے والی ہے اور یہ سچ ہے کہ لالچ سے بندھی ذلت کی زنجیر ہمیشہ اسے اپنے دامن میں قید رکھتی ہے۔ ایسے میں جب بے بسی اپنے عروج پر ہو اور بیگ صاحب جیسے مددگار کا ساتھ مل جائے تو کیوں نہ اس کی نیّا پار لگ جاتے۔

محبت کے ساحل پر بے آسرا اور بے بس حسینہ کا عبرت ناک ماجرا

زندگی دھوپ چھاؤں کا مرقع ہے۔ یہ دکھ سکھ سے عبارت ہے۔ انسان تا حیات کسی بھی صورت خوشی وغم سے دامن بچا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کی زندگی میں دکھ کم اور سکھ زیادہ ہوتے ہیں جبکہ کسی کی زندگی میں سکھ کم اور دکھ زیادہ۔ یہی انسان کا نصیب ہے۔ ہمیں ہر حال میں اپنے نصیب پر صابر و شاکر رہ کر مالکِ تقدیر سے رحمت کا امیدوار رہنا چاہیے۔

آج سے لگ بھگ پینتیس سال پہلے ماہ ستمبر کی ایک ٹھنڈی ٹھار شام میں اپنے آفس میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا۔ اس دن میرے آفس میں کلائنٹ کا رش نہیں تھا۔ ایک تو موسم سرما اپنے جوبن پر تھا، اوپر سے پچھلے دو دن سے جاری بارش نے موسم کی شدت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ کراچی میں سردیوں کا موسم برائے نام چند دن کے لیے آتا ہے۔ یہ جتنے دن کے لیے بھی وارد ہوتا ہے، لوگ رنگ برنگے گرم اونی کپڑے پہن کر بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔

وہ ایک یخ بستہ اور اداس شام تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا، اس دن کلائنٹس کی آمد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس وقت آفس میں میرے علاوہ سیکریٹری ماہم موجود تھی۔ آفس بوائے نوید کو تھوڑی دیر پہلے میں نے چھٹی دے دی تھی۔ نوید کورنگی میں رہتا تھا۔ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، جبھی وہ آج جلدی چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ میں اور ماہم بھی آفس کو بند کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک دراز قامت شخص اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم وکیل صاحب۔'' اس نے بہ آوازِ بلند مخصوص سندھی لہجے میں مجھے سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنی میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔''

وہ بیٹھ گیا۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو قدرے جھک کر چل رہا تھا۔ غالباً اس کی کمر میں کوئی تکلیف تھی یا پھر اس جھکاؤ کا سبب اس کی دراز قامتی تھی۔ میرے محتاط

اندازے کے مطابق، اس کا قد چھ فٹ سے متجاوز تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں رول کیا ہوا ایک اخبار بھی دیکھا تھا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے مذکورہ اخبار کو اپنے سامنے میز پر رکھ دیا۔

وہ تنقیدی نگاہ سے میرے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

میرے سوال کا کوئی معقول جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آج کچھ زیادہ ہی سردی نہیں ہورہی؟''

''جی، ایسا ہی ہے۔'' میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ ناظم آباد میں رہتے ہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں؟'' میرے انداز میں بیزاری در آئی تھی۔

اس شخص نے گفتگو کا آغاز ایسے نامعقول طریقے سے کیا تھا کہ مجھے اس کی موجودی سے خاصی کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مجھے کوئی جھکی اور کھسکا ہوا بندہ لگا تھا حالانکہ اس نے معقول تراش کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے سے بھی تعلیم یافتہ نظر آتا تھا مگر اس کا طرزِ گفتگو چبھنے والا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ میرے پاس کسی قانونی مدد کے حصول کے لیے نہ آیا ہو بلکہ میرا انٹرویو کرنے تشریف لایا ہو......!

وہ موٹے گلاسز والے چشمے کے پیچھے سے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''نہیں جناب! فرق پڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو ناظم آباد میں دو تین بار دیکھا ہے، اس لیے پوچھ لیا......!''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں دو تین مرتبہ کراچی کے کسی علاقے میں دیکھا جاؤں تو میری رہائش اسی علاقے میں ہوگی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اکتاہٹ بھرے انداز میں پوچھا۔

''لگتا ہے، آپ ناراض ہوگئے ہیں......!'' وہ اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا۔ جناب! میرا نام آفتاب شگفتہ ہے۔''

میرے سامنے تشریف فرما آفتاب شگفتہ سر سے ''فارغ البال'' ہوچکا تھا۔ بس کھوپڑی کے گرد ایک چلمنی جھالر سی بتاتی تھی کہ کبھی اس نگری میں بالوں کا نخلستان یعنی ''بالستان'' شادو آباد ہوا کرتا تھا۔ اس شخص نے اپنا نام بھی بڑا عجیب سا بتایا تھا جیسا کہ عموماً شاعروں اور ادیبوں کا ہوا کرتا ہے۔ وہ بندۂ خدا کہیں سے بھی مجھے شگفتہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی آفتاب البتہ اس کے سر پر چندیا کسی آفتاب کے مانند ضرور چمک رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس کے آس پاس قائم کیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''آفتاب صاحب! میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ آپ بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''دراصل میرا تعلق صحافت سے ہے۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ''لیکن اس وقت میں کسی اور کے کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''اوہ...... تو آپ جرنلسٹ ہیں۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کون سے اخبار سے منسلک ہیں؟''

''میں ایک فری لانس جرنلسٹ ہوں۔'' وہ ایک شانِ بے نیازی سے بولا۔ ''میں مختلف اخبارات کے لیے کام کرتا ہوں۔ جس کو میری ضرورت ہوتی ہے، مجھے بلا لیتا ہے۔''

''آپ کی فیلڈ کیا ہے!'' میں نے پوچھا۔ ''مطلب، آپ کس قسم کی جرنلزم کرتے ہیں؟ آپ کا خصوصی شعبہ کون سا ہے؟''

''میں عموماً ریسرچ کا کام کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میری تیار کردہ سنسنی خیز اسٹوریز آگ لگا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں فیچرز اور کالم وغیرہ بھی لکھتا ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ بتا رہے تھے کہ کسی کے کام سے آئے ہیں......؟''

سچی بات تو یہ ہے کہ آفتاب شگفتہ سے مل کر مجھے قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت نے مجھ پر خاصا بیزار کن تاثر مرتب کیا تھا۔ صحافی برادری سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور میں ایسے کئی صحافیوں کو جانتا تھا جن کی نکالی ہوئی اسٹوریز ملک کے طول و عرض میں واقعی آگ لگا دیتی تھیں۔ آفتاب شگفتہ کا نام میں نے آج پہلی مرتبہ سنا تھا۔ یقیناً یہ کوئی جید صحافی نہیں تھا۔

''جی...... وہ ایک خاتون ہیں۔'' آفتاب شگفتہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اور کافی مشکل میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ اس دکھیاری کی قانونی مدد کریں۔ آپ کی فیس اور جو بھی عدالتی اخراجات ہوں گے، وہ میں ادا کروں گا۔''

میں نے رف پیڈ اور پین سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس خاتون کی پریشانی بیان کریں۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ میں اس کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''اس خاتون کا نام جویریہ ہے۔'' وہ اپنے عدسہ نما شیشوں والے چشمے کو درست کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''جویریہ کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ایک سال سے اپنی بہن کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں، جویریہ کو اس کمینے شخص سے نجات مل جائے۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''گویا آپ جویریہ کو خلع دلوانا چاہتے ہیں؟''

''خلع ہو یا طلاق، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''بس کسی طرح جویریہ کو اس بدذات سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔''

چھٹکارے والی بات اس نے دوسری بار کی تھی۔ میں نے وضاحت ضروری جانی اور کہا۔ ''خلع اور طلاق دو مختلف چیزیں ہیں آفتاب صاحب۔ خلع لینے والی خاتون کو اپنے بہت سارے حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ آپ ایک پڑھے لکھے صحافی ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا سمجھاؤں گا......''

''جی جی......'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ سب اچھی طرح جانتا ہوں۔ جویریہ کے سکون کی خاطر نقصان اٹھایا جا سکتا ہے۔''

''آفتاب صاحب!'' میں نے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے آفتاب کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس بدبخت کمینے کا نام کیا ہے؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آصف!''

''آفتاب صاحب! کیا میں جان سکتا ہوں کہ جویریہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

میرے سوال پر وہ بدکا۔ لمحہ بھر متذبذب رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''آپ اسے ہمدردی کا رشتہ سمجھ لیں۔''

میرے تئیں یہ ایک انتہائی فضول اور واہیات جواب تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جویریہ آپ کی اور آپ جویریہ کے کچھ نہیں لگتے۔ آپ محض انسانیت کے ناتے اس دکھی عورت سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسے اس کے ظالم شوہر آصف سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

''جی...... آپ سولہ آنے درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے نزدیک انسانیت کا رشتہ اس دنیا کا سب سے اہم اور مضبوط رشتہ ہے۔''

''بے شک! اس رشتے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ قانونی معاملات ہیں۔ اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں جویریہ کی طرف سے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کروں تو جویریہ کو بہ نفسِ نفیس میرے پاس آنا ہوگا۔ بعض باتیں صرف جویریہ ہی سے ہو سکتی ہیں۔''

''بہ وقتِ ضرورت میں جویریہ کو بھی آپ سے ملوانے لے آؤں گا۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''آپ ذرا اس کیس کا پس منظر سن لیں تو آپ کے لیے آسانی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے...... سنا دیں۔'' میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

وہ شروع ہو گیا۔ میں اس کی بیان کردہ کہانی کے اہم پوائنٹس نوٹ کرتا چلا گیا۔ آفتاب شگفتہ مختلف انداز میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ جویریہ کا شوہر بہت کم ظرف اور ظالم شخص ہے جس نے اپنی بیوی کو پچھلے ایک سال سے اپنے گھر سے بے دخل کر رکھا ہے اور بے چاری جویریہ اپنی بڑی بہن کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ آفتاب کے خیال میں اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا کہ جویریہ کو آزادی مل جائے۔ اس سلسلے میں اسے میری مدد درکار تھی۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اسے رکھ لیں اور اگلی بار جب مجھ سے ملاقات کا پروگرام ہو تو جویریہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئیے گا۔''

اس نے چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی فیس......''

''فیس کا ابھی وقت نہیں آیا۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں جویریہ سے ایک بھرپور ملاقات کر کے اپنا اطمینان کر لوں گا، تب آپ سے فیس بھی وصول کر لوں گا۔''

''تو گویا میری باتوں سے آپ مطمئن نہیں ہوئے؟'' اس نے استفساریہ انداز میں مجھے دیکھا اور جیب کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک کر بولا۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے ابھی تک یہ کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیا؟''

''عملاً یہی بات درست ہے آفتاب صاحب۔'' میں نے بڑی رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جب میں جویریہ سے تفصیلی ملاقات کر لوں گا اور بعض اہم قانونی کاغذات پر میں ان کے دستخط لے لوں گا تو زمینی حقائق کے مطابق، اس وقت یہ کیس میرے ہاتھ میں ہوگا۔ جبھی مجھے فیس وصول کرنے کا بھی حق ہوگا۔''

''سمجھ گیا......!'' وہ مدبرانہ انداز میں گردن کو حرکت دیتے ہوئے بولا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''وکیل صاحب! آپ سے جلد ملاقات ہو گی۔''

''ان شاء اللہ!'' میں نے الوداعی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے سرد مہری سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر میرے دفتر سے نکل گیا۔ اس کے رخصت ہوتے وقت میرے ذہن میں یہی تاثر تھا کہ وہ دوبارہ میرے دفتر کا رخ نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی توقعات کے برعکس رویہ اختیار کر کے ایک لحاظ سے اسے خاصا مایوس کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرے پیشے کا تقاضا تھا۔ آفتاب شگفتہ کا جویریہ نامی اس مظلومہ سے باقاعدہ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کی فرمائش نما خواہش پر کسی ایسی عورت کا کیس نہیں لے سکتا تھا جسے میں جانتا تک نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اسے دیکھا تھا۔ ''انسانیت کا ناتا اور ہمدردی کا رشتہ'' اپنی جگہ مگر پرائے پھڈے میں ٹانگ پھنسانے کا مجھے کبھی شوق نہیں تھا۔ میرا پیشہ کوئی ''محفلِ لطیفہ بازی'' یا ''تفریحی پروگرام'' نہیں تھا جو میں محض دل پشوری کے لیے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر آفتاب کی خواہش کی تکمیل میں لگ جاتا۔

''آفتاب شگفتہ'' نامی اس کیریکٹر کے بارے میں، میں یہی سمجھتا تھا کہ جویریہ اس کی کوئی جاننے والی تھی۔ وہ جویریہ کو مصیبت زدہ سمجھتا تھا اور انسانی ہمدردی کے ناتے میرے توسط سے وہ جویریہ کو اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اگر میں آفتاب کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوتا تو بھی میں جویریہ سے ملے بغیر یہ کیس کبھی اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔ اصول، اصول ہوتا ہے اور یہ کبھی ٹوٹنا پسند نہیں کرتا۔ جو شخص بھی اصول کو توڑتا ہے، اصول بہت جلد اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، صحافی برادری میں کئی معتبر افراد سے میرے گہرے مراسم تھے۔ میں نے اس حلقے میں بعض صحافیوں سے آفتاب کا ذکر کر کے اس کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ اکثر افراد اسے نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ نے اس سے شناسائی ظاہر کی اور مجھے بتایا کہ وہ ایک چلتا پھرتا برساتی کھمبی ٹائپ صحافی تھا۔ بنیادی طور پر وہ مترجم تھا۔ وہ سندھی ادب سے مختلف چیزیں ترجمہ کر کے چھوٹے موٹے اخبارات کو دیتا رہتا تھا اور کبھی کبھار اس کے آرٹیکل شائع بھی ہو جاتے تھے۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی شناخت نہیں تھی۔ گویا وہ ایک بہ زعم خود قسم کا صحافی تھا!

☆☆☆

دو روز کے بعد آفتاب شگفتہ ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اب کی بار وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی جس نے اپنے پورے بدن کو ایک سیاہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا، صرف اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قدوکاٹھ کی مالک ایک گوری چٹی اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص نوعیت کا تیکھا پن پایا جاتا تھا جو اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا تاہم اس وقت وہ خاصی سنجیدہ اور فکرمند دکھائی دیتی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ جویریہ ہے۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچیس اور تیس کے بیچ لگایا۔ بعدازاں میرے یہ دونوں اندازے درست ثابت ہوئے۔ وہ جویریہ ہی تھی اور اس کی عمر چھبیس سال تھی۔

ابتدائی رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے جویریہ کو اپنے سوالات کی باڑ پر رکھ لیا اور پوچھا۔ ''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''لگ بھگ ڈیڑھ سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے پتا چلا ہے، پچھلے ایک سال سے آپ اپنی بڑی بہن کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے شوہر آصف کے ساتھ صرف چھ ماہ ہی رہی ہیں؟''

''جی...... یہی حقیقت ہے؟''

''آپ نے اپنے شوہر کا گھر خود چھوڑا تھا یا اس نے آپ کو نکال دیا تھا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آصف اپنی بہنوں کی مٹھی میں ہے۔ یوں سمجھیں کہ وہ ان کا منّا بنا ہوا ہے۔'' جویریہ نے بتایا۔ ''قمر النساء اور خیر النساء مجھے پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے وہ اپنے بھائی کے کان میرے خلاف بھرتی رہتی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں دوسروں کو ورغلانے والوں کی کمی نہیں۔ قمر النساء ایک پرائیویٹ بینک میں جاب کرتی ہے اور خیر النساء ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر ہے۔ ان کی عمریں علی الترتیب اڑتیس اور چالیس سال ہیں اور دونوں کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ سارے گھر کا نظام انہی دونوں عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ آصف ان سے چھوٹا ہے لہٰذا وہ آصف کو اپنے اشاروں پر نچاتی ہیں۔ وہ دونوں چونکہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں اس لیے انہوں نے میری طرف سے آصف کا دل بھی کھٹا کر دیا ہے۔ پہلے وہ مجھ سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا، پھر ہمارے بیچ باقاعدہ لڑائی جھگڑا ہونے لگا اور ایک روز اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ اسے میری ضرورت نہیں۔ میں

جہاں جی چاہے، دفع ہوجاؤں......‘‘

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے استفسار کیا۔

’’کیا آصف کے گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہیں ہے جو اس بے ہودہ صورتِ حال کو ہینڈل کرسکتا؟‘‘

’’نہیں......‘‘ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ’’آصف کے والدین کا کافی عرصے پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے یہی دونوں حرافہ گھر کا ہر فیصلہ کرتی ہیں۔ آصف ان کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے اور اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ مجھ سے جب تک ان کنواری بوڑھیوں کا ناروا سلوک برداشت ہوتا رہا، میں ہر ظلم وستم چپ چاپ سہتی رہی۔ میں اگر شکایت کرتی بھی تو کس سے؟ وہاں کوئی میری سننے والا نہیں تھا۔ آصف جسے کہ میرے حقوق اور عزت کا تحفظ کرنا چاہیے تھا، وہ ان شیطان عورتوں کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ انسان کی خودداری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے وکیل صاحب...... جب وہاں میری بے توقیری بہت زیادہ بڑھ گئی اور آصف بھی صبح وشام مجھے دفع ہونے کے لیے کہنے لگا تو میں باجی کے گھر آگئی۔‘‘

جویریہ ایک پڑھی لکھی اور مہذب عورت تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنی دونوں نندوں کے لیے دل میں بہت غبار رکھتی تھی۔ اس کے آخری جملے کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

’’باجی کے گھر کیوں؟‘‘

’’تو پھر میں کہاں جاتی؟‘‘ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ’’تمہارے والدین کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔‘‘ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ’’امی کا تو دس سال پہلے انتقال ہوگیا تھا اور ابو میری شادی کے ایک ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اب اس جہان میں میرا کوئی اپنا ہے تو وہ باجی عارفہ ہی ہے۔‘‘

پھر اس کی زبانی مجھے پتا چلا کہ عارفہ چھتیس سال کی ایک مفلوج عورت تھی۔ دو سال پہلے اس پر فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ زندہ بچ گئی مگر ہمیشہ کے لیے وھیل چیئر کی ہوکر رہ گئی تھی۔ عارفہ کی شادی کو چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی حنا دس سال کی، اس سے چھوٹی منی آٹھ سال کی تھی جبکہ ان کا اکلوتا بھائی فرحان محض پانچ سال کا تھا۔ عارفہ کا شوہر شکیل احمد ایک بلدیاتی ادارے میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ تو زیادہ نہیں تھی تاہم ان کا گزارہ ہو رہا تھا۔ عارفہ کی معذوری نے گھر کے نظام کو درہم برہم کردیا تھا، خاص طور پر بچے بری طرح رُل گئے تھے تاہم پچھلے ایک سال سے جویریہ کی موجودگی کے باعث یہ گھر دوبارہ نارمل انداز میں چلنے لگا۔

’’کیا آصف سے آپ کی شادی کے لیے اس کی یہ دونوں فتنہ پرور بہنیں راضی نہیں تھیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہ شادی ان کی مرضی ہی سے ہوئی تھی۔‘‘ جویریہ نے بتایا۔ ’’ان دونوں نے ابو سے تمام معاملات طے کیے تھے بلکہ جب جہیز کی بات ہو رہی تھی تو خیرالنساء نے یہ تجویز دی تھی کہ گھر میں فرنیچر اور استعمال کا دیگر سب سامان موجود ہے لہٰذا اس سلسلے کا بجٹ بہ صورتِ کیش آصف کو دے دیں تاکہ وہ اس رقم کو کسی سودمند اسکیم میں لگا سکے۔ ابو نے چپ چاپ بیس ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے تھے کہ میں جس طرح چاہوں انہیں استعمال کرلوں۔‘‘

’’جب سب کچھ نارمل انداز میں خوش اسلوبی سے انجام پا گیا تھا تو پھر آصف کی بہنوں کو کیا ہوا؟‘‘ میں نے جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ’’انہوں نے اپنے بھائی کا گھر تباہ کرنے کے لیے یہ فساد کیوں جگایا؟‘‘

’’مجھے تو لگتا ہے، ان کی نیت شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھی۔‘‘ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ’’ابو کی رقم پر ان کی نظر لگی ہوئی تھی۔ ادھر ابو کی آنکھ بند ہوئی، ادھر ان دونوں شیطان کی چیلیوں نے پر پرزے نکال لیے اور ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑگئیں۔ میں نے......‘‘

’’ایک منٹ!‘‘ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ’’آپ اپنے ابو کی کون سی رقم کا ذکر کر رہی ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہی بیس ہزار روپے جو جہیز کی مد میں انہوں نے کیش وصول کیے تھے۔‘‘ جویریہ نے بتایا۔

’’کیا آپ کے ابو نے مذکورہ رقم خیرالنساء یا قمرالنساء کے حوالے کی تھی؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔

’’نہیں...... ابو نے وہ بیس ہزار روپے مجھے دیے تھے۔‘‘ جویریہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ’’اور میں نے یہ رقم آصف کے پاس رکھوادی تھی۔ اس نے مجھ سے رقم لے کر اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی اور کہا تھا...... یہ روپے میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر رکھے ہیں۔ میں انہیں کسی کاروبار میں لگاؤں یا کچھ اور کروں، مجھے اس سلسلے میں فائدہ ہو یا نقصان، میں یہ بیس ہزار روپے تمہیں

واپس کرنے کا پابند ہوں گا۔''

''مجھے تو یہ بندہ اپنی بہنوں سے بھی دو ہاتھ آگے کا کوئی شاطر لگتا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تو کیا آصف نے تمہاری امانت لوٹا دی تھی؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں وکیل صاحب۔''

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ''کیا تم لوگوں کی طرف سے کوئی زیور وغیرہ بھی بنایا گیا تھا؟''

''جی۔ ابو نے میرے لیے تیس ہزار روپے کے طلائی زیورات بنوائے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ زیورات کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آصف کے گھر میں۔''

''اور آپ خالی ہاتھ وہاں سے چلی آئی تھیں؟''

''میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''اس لیے میں نے اس حوالے سے کبھی سوچا ہی نہیں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آصف نے تمہارے لگ بھگ پچاس ہزار روپے دبا رکھے ہیں۔ بیس ہزار نقد رقم اور تیس ہزار کے طلائی زیورات......!''

''میں سمجھتی ہوں، آصف اتنا بُرا بھی نہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''وہ اپنی بہنوں کے سکھائے میں ہے۔ وہ سانس بھی ان کی مرضی ہی سے لیتا ہے۔''

جویریہ کی سادگی بہ الفاظ دیگر حماقت پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اپنی خفگی کا اظہار کیے بغیر معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا اس اچھے انسان نے پچھلے ایک سال میں آپ کو منانے یا واپس لے جانے کی کوئی کوشش کی؟''

اس نے کچھ بولنے کے بجائے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ''ایسے اچھے آدمی کا تو اچار بھی نہیں ڈالنا چاہیے جو نامعقول بہنوں کی پٹیوں پر چل کر اپنی ازدواجی زندگی کو برباد کر ڈالے۔ بہرحال، یہ دنیا ہے اور...... اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔''

جویریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس پہلو بدل کر رہ گئی۔

''آپ کا حق مہر کتنا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے بتایا۔ ''پچیس ہزار روپے۔''

''موجل یا معجل......؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''معجل حق مہر وہ ہوتا ہے جو دولہا کو فوراً ادا کرنا ہوتا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ موجل حق مہر کا مطلب یہ ہے کہ جب دُلہن مانگے تو اس وقت دولہا ادا کرے۔ موجل حق مہر کو عندالطلب بھی کہا جاتا ہے۔ کیا آصف نے شبِ عروس میں آپ کا حق مہر ادا کر دیا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ کا حق مہر عندالطلب یعنی موجل ہوگا جو آپ کے مطالبے پر آصف کو ادا کرنا ہوگا۔ ویسے نکاح نامے پر یہ تمام تفصیل درج ہوتی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''حق مہر والے پچیس ہزار روپے بھی آصف پر واجب الادا ہیں...... زیورات اور نقد رقم والے پچاس ہزار کے علاوہ۔''

آفتاب شگفتہ کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو لقمہ دینے والے انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''وکیل صاحب! اگر ہم خلع کا مقدمہ دائر کریں تو پھر ہمیں حق مہر والی رقم سے تو دست کش ہونا پڑے گا۔ آپ نے یہی بتایا تھا نا......؟''

''جی۔ میں نے ایسی ہی بات کی تھی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جویریہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اور اگر آصف اس بندھن کو توڑنے کے لیے آپ کو طلاق دیتا ہے تو پھر وہ حق مہر والی رقم ادا کرنے کے لیے پابند ہوگا۔ ویسے آپ کو کیا لگتا ہے، آصف نے اس حوالے سے کیا سوچ رکھا ہے؟''

''نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، وہ آخر چاہتا کیا ہے۔''

''میں بتاتا ہوں وکیل صاحب!'' آفتاب شگفتہ ایک بار پھر ہمارے بیچ کود پڑا۔ ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ آصف نے اگر جویریہ کو طلاق دینا ہوتی تو اس معاملے کو وہ ایک سال تک لٹکائے نہ رکھتا۔ وہ پچیس ہزار بچانے کے لیے اس تنازع کو طول دے رہا ہے تاکہ یہ تنگ آ کر خلع کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جائے اور آپ یقین کریں وکیل صاحب، جویریہ اسی قسم کے حالات سے گزر رہی ہے لہٰذا ہمیں فوراً خلع کا مقدمہ دائر کر دینا چاہیے...... پچیس ہزار جائیں جہنم میں!''

یوم آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لیے اگست 2017ء کا جشن آزادی نمبر
ماہنامہ پاکیزہ کراچی
شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں...... قسط وار ناول کی صورت
سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا دلنشیں اختتام
سیما رضا ردا اپنے منی ناول...... ہم کو عبث بدنام کیا...... کو ایک دلکش انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے
14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانہ اختر، دردانہ نوشین خان،
منشا محسن علی اور نرمین سرھیو کی خصوصی تحریریں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روح پرور مضامین
نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب...... فکاهیہ کالم کی صورت
وہ آئے بزم میں......
نزہت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب
کی پُرلطف باتیں
اس کے علاوہ
طیبہ عنصر مغل، فرح بھٹو، غزالہ عزیز، ہاجرہ ریحان،
افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں
دیارِ غیر میں بسنے والے اپنا یومِ آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شائستہ زریں کے خصوصی سروے میں......
اس کے ساتھ ساتھ مسحور کن شاعری، خوش ذائقہ پکوان، قابلِ غور تراشے اور دلچسپ و پُراثر مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

آفتاب شگفتہ کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے جویریہ سے بھی زیادہ خلع کی جلدی تھی۔ اس سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آتی تھی کہ اس خلع کے ساتھ آفتاب کا کوئی مفاد جڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر آفتاب ہمارے ساتھ بیٹھا رہا تو میں جویریہ سے راز داری والی کوئی بات نہیں کرسکوں گا۔ اسے کٹانے کے لیے میں نے جویریہ سے کہا۔

''یہ تو بہت ہی پیچیدہ صورت حال ہے۔ اس مشکل کا کوئی حل نکالنے کے لیے مجھے تنہائی میں آپ سے چند باتیں کرنا ہوں گی۔'' پھر میں نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اگر آپ چند منٹ کے لیے دوسرے کمرے یعنی انتظار گاہ میں چلے جائیں تو مہربانی ہوگی۔''

وہ چپ چاپ اٹھا اور میرے چیمبر سے نکل گیا۔

''معذرت چاہتا ہوں۔'' آفتاب کے جانے کے بعد میں نے جویریہ سے کہا۔ ''ایک مخلص اور ہمدرد انسان کو میں نے اس اہم گفتگو سے باہر کردیا۔ آپ اسے میرے پیشے کی مجبوری یا تقاضا سمجھ لیں۔ امید ہے، آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔''

وہ پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔ آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

''ویسے یہ صاحب ہیں کون؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''کون صاحب......؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

موجودہ حالات نے اسے کافی الجھا رکھا تھا اسی لیے وہ میرے سوال پر دھیان نہیں دے پائی تھی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا......کون صاحب؟

میں نے جویریہ کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے......میں آفتاب صاحب کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ اچھا......'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے بولی۔ ''یہ ہمارے محلے ہی میں رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر کا بالائی حصہ آفتاب صاحب نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ ان کا تعلق اندرونِ سندھ کے علاقے لاڑکانہ سے ہے۔ یہ کسی اخبار میں کام کرتے ہیں۔''

پھر جویریہ نے مجھے اپنی رہائش کی تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ وہ ناظم آباد کے علاقے میں ایک سو بیس گز کے ایک گھر میں رہتی تھی یعنی اپنے بہنوئی شکیل احمد کے گھر میں۔

اب میں سمجھا کہ آفتاب شگفتہ نے پہلی ملاقات میں مجھ سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ......کیا میں ناظم آباد میں رہتا ہوں؟ اس نے یقیناً مجھے اس علاقے میں کہیں دیکھا ہوگا۔ ان دنوں جب کا یہ واقعہ ہے، میری رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی۔

''میں نے آفتاب کو اس لیے دوسرے کمرے میں بھیجا ہے تاکہ میں آپ سے ذاتی نوعیت کی چند اہم باتیں کرسکوں۔'' میں نے جویریہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''ایسی باتیں جو آفتاب کی موجودگی میں کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا اور آپ سے بھی یہی توقع کرتا ہوں کہ آپ بھی یہ گفتگو اپنے تئیں ہی رکھیں گی۔''

''آپ مطمئن ہوجائیں۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کی توقع پر پوری اتروں گی۔''

''گڈ......!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے آپ جیسی ذہین خاتون سے ایسے ہی اعتماد کی امید تھی۔'' لحاتی توقف کر کے میں نے گہری نگاہ سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آفتاب صاحب آپ کی ذات میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں حالانکہ آپ سے ان کی کوئی رشتے داری بھی نہیں ہے......؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''آفتاب صاحب سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں، وہ ایک بھلے انسان ہیں اور انسانی ہمدردی کے ناتے وہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔''

''انسانی ہمدردی کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس نازک موقع پر کسی غیر متعلقہ شخص کے بجائے اگر آپ کی بہن اور بہنوئی بھلے انسانوں کا کردار ادا کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کے پلیٹ فارم سے آپ کا معاملہ لے کر میرے پاس آتے تو سب کچھ کتنا نیچرل محسوس ہوتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''آپ کی سوچ غلط نہیں ہے وکیل صاحب مگر......''

وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے پوچھا۔ ''مگر کیا جویریہ صاحبہ؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا، عارفہ باجی پچھلے دو سال سے معذوری کی زندگی گزار رہی ہیں۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''یہ عدالتی بھاگ دوڑ ان کے بس میں کہاں ہے وکیل صاحب۔''

اس کی دلیل میں اچھا خاصا وزن تھا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ آفتاب شگفتہ، جویریہ کے حوالے سے ایک غیر متعلقہ شخص تھا۔ خلع والے معاملے میں اس کی دلچسپی اور سرگرمی سے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ خود جویریہ کے چکر میں ہے اور اس کی کوشش ہے کہ جویریہ جلد از جلد آصف کے نکاح کی گرفت سے نکل آئے تاکہ اسے اپنا الو سیدھا کرنے میں آسانی حاصل ہو جائے۔ اگرچہ جویریہ کی کسی بات سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا لیکن آفتاب کے انداز سے مجھے اس کے عزائم ایسے ہی نظر آرہے تھے تاہم شکیل احمد کی بے حسی نما غیر جانب داری اور پراسرار خاموشی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسی روشنی میں، میں نے جویریہ سے پوچھ لیا۔

''آپ کی باجی کی مجبوری تو بڑی واضح نظر آرہی ہے لیکن شکیل کیوں لاتعلق بنا بیٹھا ہے۔ وہ آپ کا بہنوئی ہے۔ مشکل کی اس گھڑی میں تو اسے سب سے آگے ہونا چاہیے۔ اس کا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے؟''

''دولہا بھائی بس ایسے ہی ہیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''ایسے ہی ہیں...... کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اسے آپ کے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟ شکیل احمد تو سرکاری ملازم ہے۔ اس موقع پر تو اسے پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔''

''میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گی۔'' وہ بوجھل انداز میں بولی۔ ''مگر سچائی یہ ہے کہ دولہا بھائی کی نیت میں فتور آگیا ہے۔''

جویریہ نے بڑی اہم بات کی تھی۔ میں اس کی طرف سے کسی ایسے ہی سنسنی خیز جواب کی توقع کر رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے بہ خوبی سمجھ چکا تھا کہ اگلنے کے لیے اس کے پاس بہت سا زہریلا مواد موجود تھا۔ بس، اس زہر آلود خزانے میں ایک پن چبھونے کی دیر تھی پھر بہت سی کڑوی اور کسیلی مگر کارآمد معلومات نکل کر سامنے آسکتی تھیں۔ میں نے اپنے الفاظ کی پن کو بڑے محتاط اور غیر محسوس انداز میں استعمال کرتے ہوئے پوچھا۔

''جویریہ! آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟''

''آپ ایک وکیل ہیں۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''ایک وکیل اپنے کلائنٹ کے رازوں کا امین ہوتا ہے۔'' میں نے دھیمے انداز میں کہا۔ ''کیا آپ خود کو میرا کلائنٹ تصور کرتی ہیں؟''

''ظاہر ہے...... میں اپنے مسئلے کے لیے چل کر آپ کے پاس آئی ہوں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ میرے وکیل اور میں آپ کی کلائنٹ ہوں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جویریہ صاحبہ! مریض کو اپنے ڈاکٹر سے اور موکل کو اپنے وکیل سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسا ہے تو بتائیں کہ آپ کے دولہا بھائی شکیل احمد کی نیت میں کیا فتور آگیا ہے...... اس امر کا اطمینان رکھیں کہ ہمارے درمیان ہونے والی یہ گفتگو کسی تیسرے شخص تک نہیں پہنچے گی۔''

''جی...... مجھے آپ پر اعتماد ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''پھر آپ مجھے شکیل احمد کی نیت کے فتور کے بارے میں بتائیں......؟''

''وہ چاہتا ہے، میں خلع نہ لوں......'' وہ اپنے بہنوئی کے لیے ''آپ، جناب'' سے نکل کر ''تم، تو'' کے انداز پر آتے ہوئے بولی۔

''تھوڑی وضاحت کریں، وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟''

''اگر میں نے خلع لے لی تو باجی دوبارہ میرا گھر بسانے کی کوشش میں لگ جائیں گی۔'' جویریہ نے بتایا۔ ''شکیل کی خواہش ہے کہ میں اس کے گھر ہی میں پڑی رہوں۔''

''بڑی عجیب خواہش ہے اس کی۔'' میں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر آصف نے آپ کو طلاق دے دی تو اس صورت میں بھی تو عارفہ آپ کی دوسری شادی کے لیے تگ و دو شروع کردے گی اور آپ کو ایک دن اس گھر سے جانا پڑے گا۔ کیا شکیل آپ کی طلاق کے بھی خلاف ہے؟''

''جی...... ایسا ہی سمجھ لیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے جویریہ کی طرف دیکھا۔

اس نے اذیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ چاہتا ہے، میں آصف کی بیوی بھی رہوں اور اس کے گھر میں بھی پڑی رہوں۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جویریہ کی بات نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ شکیل احمد کی نیت کا فتور بڑی وضاحت کے ساتھ میرے سامنے کھل گیا تھا تاہم میں نے جویریہ کے نازک جذبات کا خیال کرتے ہوئے ذرا ہاتھ ہلکا رکھا اور ایک امکان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ شکیل احمد محض اس لیے آپ کو اپنے گھر میں رکھنے پر بہ ضد ہے کہ آپ کی شکل میں اسے مفت کی ایک نوکرانی میسر آ گئی ہے جو اس کی مفلوج بیوی اور بچوں کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ پورے گھر کے نظام کو بھی بڑے طریقے سلیقے سے چلا رہی ہے......؟''

''پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی وکیل صاحب......!'' وہ کرب ناک آواز میں بولی۔

میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔''اور اب؟''

''اب میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' وہ جی کڑا کر کے سچائی کو منظر عام پر لاتے ہوئے بولی۔''پچھلے ایک ماہ سے شکیل اشاروں کنایوں میں مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ......''

یہاں تک بولنے کے بعد وہ تھم گئی۔ یقیناً اس کے بیان میں آگے کوئی ایسا خطرناک موڑ تھا جہاں سے مڑنے کے لیے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ میں منتظر نگاہ سے یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ چند لمحات تک خاموش رہ کر وہ اپنے اندرون سے لڑتی رہی پھر مجھ پر کامل اعتماد کا ثبوت دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

''شکیل کا کہنا ہے کہ پچھلے دو سال سے عارفہ اس کے کسی کام کی نہیں رہی۔ اگر میں اپنی باجی کی جگہ لے لوں تو وہ مجھے بہت خوش رکھے گا۔''

''مطلب...... وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میری شکیل سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے وکیل صاحب؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔''میں...... آصف کے نکاح میں ہوں اور شکیل خلع یا طلاق کے حق میں بھی نہیں ہے۔ ایک عورت دو مردوں کی بیوی کیسے بن کر رہ سکتی ہے......؟''

''یہ نکتہ میرے ذہن میں ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔''اس کے علاوہ ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ دو سگی بہنیں شرعاً بہ یک وقت کسی ایک شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں۔'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''میرے سوال کا تعلق شکیل کے ارادے سے تھا۔ کیا وہ ایسا چاہتا ہے؟''

''نہیں......'' اس نے پوری قطعیت سے نفی میں گردن جھٹکی اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔''شکیل کا منصوبہ یہ ہے کہ میں قانوناً وشرعاً آصف کی بیوی رہوں اور عملاً عارفہ باجی کی جگہ لے کر اس کی ہوس کی تسکین کرتی رہوں۔''

بات کے اختتام پر جویریہ نے گردن جھکا دی۔ میرے ذہن نے جیسا سوچا تھا، نتیجہ اس کے عین مطابق ہی نکلا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس وقت کس جذباتی صدمے سے گزر رہی ہو گی۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد اور زیادہ دکھی ہو جاتا ہے۔ ان لمحات میں جویریہ بھی اذیت اور کرب کی ایسی ہی منازل سے گزر رہی تھی۔

اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے ہمدردی بھرے انداز میں پوچھا۔''کیا آپ کی باجی کو اس صورتِ حال کا علم ہے؟''

''نہیں!'' وہ سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔''شکیل نے خاصے دھمکی آمیز انداز میں مجھ پر واضح کر دیا ہے کہ اگر میں نے اس بارے میں عارفہ باجی کو کچھ بتایا تو وہ صاف مکر جائے گا۔ اس طرح سارا ملبا مجھ پر آ گرے گا کہ میں اپنے فرشتہ صفت دولہا بھائی پر گھناؤنا الزام لگا رہی ہوں۔ شکیل نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند نہ رکھی تو وہ آصف کو میرے بارے میں بتائے گا کہ میں صبح وشام اسے دعوتِ گناہ دیتی رہتی ہوں۔ کوئی میری تردید کو تسلیم کرے گا اور نہ ہی مجھے صفائی کا موقع دیا جائے گا۔ میں پچھلے ایک سال سے اپنے گھر سے نکل کر میکے میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ سب مجھے ہی غلط سمجھیں گے۔''

''ایک طرح سے یہ آپ کا میکا ہی ہے، یہ الگ بات کہ یہاں آپ کی عزت کو میکے ایسا تحفظ حاصل نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''میں سمجھتا ہوں، طلاق یا خلع سے بھی زیادہ اہم اور ضروری یہ ہے کہ آپ اس گھر سے نکل جائیں۔''

''میں بھی اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔''ساری صورتِ حال آپ کے سامنے ہے۔

آپ بتائیں، میں کیا کروں؟''

اس نے فیصلے کی گیند میری کورٹ میں پھینکی تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتی ہیں...... خلع یا طلاق؟''

''نہ طلاق اور نہ ہی خلع۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔

میں نے استفساریہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''پھر......؟''

''میں چاہتی ہوں کہ میرا شوہر اور میرا گھر مجھے واپس مل جائے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''زیورات، نقدرقم...... مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

''سو گریٹ......'' میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جویریہ جی! آپ بہت ہی دانش مند خاتون ہیں۔ آپ کے فیصلے نے میرا دل خوش کر دیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آصف عزت و آبرو کے ساتھ آپ کو اپنے ساتھ لے جائے۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''لیکن اس کے لیے آپ مجھے تھوڑا وقت دیں گی۔'' میں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''آصف کی ڈوریاں ہلانے والی دو بہنوں سے نمٹنے کے لیے مجھے بڑی مضبوط پلاننگ کرنا پڑے گی۔ بہر حال، میں کوئی ایسی قانونی چال چلوں گا کہ میرے پیترے کے سامنے وہ لوگ بے بس ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں۔''

''آپ کو اندازاً کتنا وقت درکار ہوگا؟'' اس نے پُراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔ ''اپنے اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے؟''

میں نے جب سے اسے حوصلہ دلایا تھا، اس کے لہجے میں مایوسی کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔ وہ خاصی مطمئن اور بے فکر دکھائی دینے لگی تھی۔

''زیادہ سے زیادہ ایک ماہ۔'' میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''لہٰذا اس ایک ماہ کے دوران میں آپ نے اپنی عارفہ باجی کے گھر میں بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رہتے ہوئے شکیل احمد سے کوئی جھگڑا پھڈا نہیں کرنا۔ اگر وہ اپنی غلیظ خواہش کا دوبارہ اظہار کرے تو اس کو یہی تاثر دینا ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں سوچ رہی ہیں اور اچھی طرح غور و خوض کے بعد اسے جواب دیں گی۔ نہ صاف انکار کریں اور نہ ہی اقرار۔ اس خبیث شخص کو ''ہاں'' اور ''نہ'' کے بیچ لٹکا کر رکھیں۔ یہ ساری پیش بندی آپ کی عزت کی حفاظت کی خاطر ہے...... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟''

''جی...... بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایت پر من وعن عمل کروں گی۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''ایک اور بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے آپ کو......!''

''کون سی بات وکیل صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر آپ واقعی واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہیں تو آفتاب شگفتہ سے تھوڑا فاصلہ رکھیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ لاکھ بھلا انسان سہی لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ بندہ آپ کے خلع کے حق میں اپنا پورا زور لگا رہا ہے۔ یہ آپ کو آصف کے نکاح سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اس نوعیت کی کوشش وہی شخص کر سکتا ہے جو خود اپنے کسی مفاد میں ہو۔ ہو سکتا ہے، آپ کو میری یہ بات بری لگے لیکن میں نے جو محسوس کیا ہے وہ آپ کے گوش گزار کر دیا۔''

''آپ کی مہربانی جو آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔'' وہ شکر گزاری کے تاثرات اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔ ''میں اس حوالے سے محتاط رہنے کی کوشش کروں گی۔''

جویریہ کے ساتھ تمام اہم باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے آصف کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں پھر چند ہدایات کے بعد اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔

''اس کارڈ پر میرے آفس اور گھر دونوں کے نمبرز درج ہیں۔ دن کا پہلا حصہ میں عدالت میں گزارتا ہوں۔ لنچ کے بعد میں اس آفس میں آ جاتا ہوں۔ آپ جب بھی ملاقات کی ضرورت محسوس کریں، مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں اور اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو گھر کے نمبر پر بھی فون کر سکتی ہیں۔ میں عموماً نصف شب کے بعد ہی سوتا ہوں۔''

''تھینک یو بیگ صاحب!'' اب کی بار وہ مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں جلد ہی آپ سے ملنے آؤں گی۔ آپ بھی میرا نمبر نوٹ کر لیں۔''

اس کے بعد جویریہ نے مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دیا جو یقیناً اس کی عارفہ باجی کے گھر کا نمبر تھا۔ میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے آصف کے نام ایک نوٹس رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوادیا۔ مذکورہ نوٹس کا نفسِ مضمون یہ تھا۔

''میری مؤکلہ مسمات جویریہ آصف تمہاری قانونی اور شرعی بیوی ہے اسی لیے اس کے نام کے ساتھ تمہارا نام جڑا ہوا ہے۔ از روئے قانون و شرع تم پر میری مؤکلہ کے من جملہ حقوق کی ادائی واجب ہے لیکن میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ ایک سال سے تم نے اسے اپنے گھر سے نکال رکھا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں نہ تو تم نے اس کے حقوقِ زوجیت ادا کیے ہیں اور نہ ہی اسے نان ونفقہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں، مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تم نے میری مؤکلہ کے طلائی زیورات مالیت تیس ہزار روپے اور نقد رقم مبلغ بیس ہزار روپے بھی اپنے پاس دبا رکھے ہیں۔ تمہارا یہ فعل اخلاقی اور شرعی اعتبار سے سراسر غیر قانونی ہے اور قابلِ مذمت یعنی قانونی زبان میں قابلِ تعزیر ہے چنانچہ اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ اس نوٹس کی وصولی کے بعد عرصہ دس یوم کے اندر تم اپنی منکوحہ مسمات جویریہ آصف کو اپنے گھر میں آباد کردو ورنہ تمہارے خلاف بڑی سخت نوعیت کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور متذکرہ بالا پچاس ہزار روپے (نقد رقم + زیورات) کے علاوہ تمہیں درج ذیل مزید واجبات بھی ادا کرنا پڑیں گے......

1۔ حق مہر مؤجل مبلغ پچیس ہزار روپے سکہ رائج الوقت پاکستان۔

2۔ نان ونفقہ مبلغ اٹھارہ ہزار روپے بہ حساب پندرہ سو روپے ماہانہ۔

3۔ عدالتی ہرجہ وخرچہ۔''

اس نوٹس میں بعض قانونی موشگافیاں بھی تھیں۔ ایسی ٹیکنیکل باتوں میں قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ الٹا کہانی پڑھنے والے کو بیزار کرتی ہیں لہٰذا میں ان کا ذکر حذف کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہوں۔

نوٹس کی ترسیل کے ایک ہفتے بعد ایک مائل بہ فربہی بدن کا مالک دراز قامت شخص مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے چہرے پر اچھی خاصی برہمی پائی جاتی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا مگر اس کی شخصیت میں صنفِ نازک کے لیے ایک خاص کشش پائی جاتی تھی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا پھر ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے خفگی آمیز انداز میں مستفسر ہوا۔ ''وکیل صاحب! یہ کارنامہ آپ نے انجام دیا ہے؟''

میں نے اس کے ہاتھ میں اپنے آفس کے لفافے کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا تاہم انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''لگتا تو میرے ہی آفس کا ہے مگر اس سے میرے کسی کارنامے کا کیا تعلق واسطہ......!''

''تعلق واسطہ سب سمجھ میں آجائے گا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اسے کھول کر دیکھیں۔ اپنے کارنامے سے آپ کی ملاقات ہوجائے گی۔''

میں اس لفافے کو ہاتھ میں لیتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہ نوٹس تھا جو ہفتہ بھر پہلے میں نے جویریہ کے شوہر آصف کے نام رجسٹرڈ ڈاک سے پوسٹ کروایا تھا۔ گویا، اس وقت آصف میرے سامنے موجود تھا۔

میں نے اس کی فرمائش پر مذکورہ لفافے کو کھولتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''غالباً آپ آصف صاحب ہیں......!''

''غالباً نہیں ...... یقیناً!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں وہی آصف ہوں جس کے نام آپ نے یہ نوٹس بھیجا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! میں اس قسم کے مذاق کو پسند نہیں کرتا۔'' وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی اس منحوس عورت کی باتوں میں آگئے اور مجھے یہ نوٹس بھیج ڈالا۔''

''آپ کس منحوس عورت کا تذکرہ کررہے ہیں آصف صاحب۔'' میں نے انجان بن کر اسے گھسنے کی کوشش کی۔

میرا اصل ٹارگٹ یعنی جویریہ کا نامعقول شوہر اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں آصف کی نفسیات اور مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ سارا ناٹک کررہا تھا۔

''میں اس عورت کی بات کررہا ہوں جس کا نام جویریہ ہے۔'' وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میری بیوی جویریہ جو آپ کی مؤکلہ بننے کی کوشش کررہی ہے۔''

''اے ہینڈسم جوان!'' میں نے اسے مردانگی کے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ جویریہ میری مؤکلہ بننے کی کوشش نہیں کررہی بلکہ وہ میری مؤکلہ بن چکی ہے۔ یہ نوٹس اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جویریہ کا وکیل ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے یہ نوٹس بھیج کر آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا۔ ہمارے بیچ مذاق والا کوئی تعلق نہیں

ہے لہٰذا آپ اس نوٹس کو ایک کڑوی حقیقت سمجھیں اور یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ اگر آپ کی طرف سے خاطر خواہ تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تو آپ کے خلاف واقعتاً قانونی کارروائی کی جائے گی اور آخری بات......"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

"میں آپ کو دھمکی نہیں دے رہا بلکہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں آصف صاحب۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔ "آپ مجھے کافی سمجھدار انسان دکھائی دیتے ہیں۔" میں نے اسے مسکا لگایا۔ "آپ کے مقابلے میں جویریہ مجھے عقل سے پیدل ایک کھسکی ہوئی عورت لگی ہے لیکن وہ جو میں آپ سے آخری بات کہنے والا تھا نا، وہ جویریہ ہی کے بارے میں تھی......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ "کون سی آخری بات؟"

میں نے آصف کی شان میں چند تعریفی کلمات ادا کیے تھے اور اس کے ساتھ ہی جویریہ کی ہلکی پھلکی برائی بھی کی تھی۔ یہ میری ایک نفسیاتی اور سیاسی چال تھی جس کا آصف پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں بڑی حد تک اسے اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے لہجے کی برہمی اور اکھڑ پن غائب ہو گیا تھا اور اس نے "آخری بات" کے حوالے سے بڑے مہذب انداز میں مجھ سے استفسار کیا تھا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا کہ وہ میری بات کو توجہ سے سننے پر آمادہ ہو جائے۔

"تھوڑی دیر پہلے آپ نے جویریہ کے لیے "منحوس عورت" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔" میں نے سراسر غلط بیانی کے توسط سے اسے آخری بات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھے جویریہ کی نحوست کی کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے۔ دراصل، آپ کی بات نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں "سعد اور نحس" اثرات پر بڑا پختہ یقین رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس عورت کا کیس لے کر میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں......!"

اپنے مطلب کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ میں اس وقت آصف کے دل کی زبان بول رہا تھا۔ وہ خوش ہو گیا اور خاصے دوستانہ انداز میں مجھے ہمدردی بھرا مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

"وکیل صاحب! میں تو کہتا ہوں، آپ پہلی فرصت میں یہ کیس چھوڑ دیں ورنہ آپ کوئی بہت بڑا نقصان اٹھالیں گے۔"

"یار...... ڈراؤ تو نہیں......!" میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں وکیل صاحب۔"

"آپ مجھے جویریہ کی نحوست کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔" میں نے آصف کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے اپنی باتوں سے متاثر کر لیا ہے۔ اس کا ایسا سمجھنا میرے حق میں جاتا تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ جو ہینڈ کرنے جا رہا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ چپ چاپ میری باتوں پر عمل کرتا جائے اور یہ اسی صورت ممکن تھا کہ وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگے۔

"کوئی ایک واقعہ ہو تو بتاؤں وکیل صاحب۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اس کی نحوست نے صرف چھ ماہ کے اندر ہمارے گھر کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ......" لمحاتی توقف کر کے اس نے پراسرار انداز میں مجھے دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "جویریہ نے میری بہنوں پر بندش کر دی ہے۔"

"اوہ...... ویری بیڈ!" میں نے خوفزدہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا جویریہ سفلی وغیرہ بھی کرتی ہے؟" میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کوئی ایسا ویسا سفلی وکیل صاحب۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اس بدبخت نے میری بہنوں کے لیے شادی کی بندش کی ہے۔ جب سے اس نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے، میری بہنوں قمر النساء اور خیر النساء کے رشتے آنا بند ہو گئے ہیں اور آپ نے یہ تو سن ہی رکھا ہوگا کہ جادو ٹونا کرنے والوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو بچے ایب نارمل پیدا ہوتے ہیں......"

"ہاں، میں نے ایسا سنا تو ہے۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا واقعی ایسا ہوتا بھی ہے؟"

"بالکل جناب! یہ حقیقت ہے۔" وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ "آپ جویریہ ہی کو دیکھ لیں نا۔ یہ عورت چھ ماہ تک میرے ساتھ رہی۔ ہم ایک بیڈروم میں، ایک بیڈ پر سوتے رہے اور ہمارے درمیان ازدواجی تعلقات بھی عروج پر تھے مگر نتیجہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے،

گندے عملیات کے اثرات سے جویریہ بانجھ ہو چکی ہے۔ اس کی گود کبھی ہری نہیں ہو سکے گی۔''

''اوہ......!'' میں نے اپنے چہرے پر فکر مندی کو سجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ جویریہ تو بڑی خطرناک عورت ہے۔ میں اس سے جان چھڑانے کی کوشش کروں گا......''

آصف جیسا جاہل انسان میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ توہم پرستی کا شکار تھا۔ وہ جن بہنوں کے رشتوں میں رکاوٹ کا سبب جویریہ کو بتا رہا تھا، میں ان سسٹرز کے کارناموں سے کماحقہ، آگاہ ہو چکا تھا لہٰذا میرا ذہن جویریہ کے خلاف ہرگز نہیں سوچ سکتا تھا۔ جویریہ نے تو محض چھ ماہ اس گھر میں گزارے تھے قبل اس کے وہ آصف کی عمر رسیدہ کنواری بہنوں کو جانتی تک نہیں تھی اس کے باوجود بھی وہ دونوں پچھلے اڑتیس چالیس سال سے بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ آصف کی جہالت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگر چھ ماہ میں جویریہ امید سے نہیں ہوئی تھی تو اس نے اپنی مفتی بہنوں کے ایما پر اس بے چاری کو بانجھ بھی قرار دے دیا تھا۔ غضب خدا کا، آصف کو اپنے بیان کے ایک ایک لفظ پر کامل یقین بھی تھا۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے یا قائل کرنے میں محض وقت ہی ضائع ہوتا ہے لہٰذا میں نے بھی اس کی حماقت سے بھرپور کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں جلد از جلد جویریہ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کروں گا۔

وہ خوش ہو گیا۔ میری بات اسے بہت پسند آئی تھی۔ جوش میں آ کر اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ترنگ میں، اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو میرے لیے اس کیس میں ''ماسٹر کی'' کی حیثیت رکھتی تھی یعنی ایسی چابی جس کی مدد سے ہر تالا کھولا جا سکتا ہو......!

''وکیل صاحب! آپ تو اس منحوس عورت سے اپنی جان چھڑانے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے ہیں۔'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ''اور مجھے قدرت نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس حوالے سے میں بڑا لکی ثابت ہوا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گولڈن چانس مجھے اس لیے ملا ہے کہ میں ان دنوں جویریہ کی نحوست سے دور ہوں۔''

اس کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور قدرے آگے جھک کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''کیسا گولڈن چانس آصف صاحب......؟''

''ابھی یہ معاملہ راز میں ہے۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے آصف صاحب!'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی خاطر جویریہ کو یہاں سے بھگانے اور اس منحوس عورت سے اپنی جان چھڑانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ مجھے غیر سمجھ رہے ہیں......؟''

''آپ ناراض نہ ہوں۔ میں بتاتا ہوں......'' وہ جلدی سے بولا۔

ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پوری طرح میرے شیشے میں اتر چکا تھا۔ اگر میں اسی طرح اسے اعتماد میں لیے رہتا تو اس کے دل کا ہر احوال بہ آسانی مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ آصف ایک بے وقوف، احمق، جاہل اور توہم پرست انسان تھا یا وہ کوئی نامعقول، شاطر اور چالاک شخص تھا۔ میرا مطمحِ نظر صرف اتنا سا تھا کہ مجھے اس کے اندر سے وٹامن مفید معلومات سے بھرپور گھی نکالنا تھا اور میرا یہ مقصد انگلی ٹیڑھی کیے بغیر بہ خوبی پورا ہو رہا تھا۔

''اگر کوئی حرج ہے تو نہ بتائیں......'' میں نے بہ دستور ناراض لہجے میں کہا۔ ''ہر انسان کی اپنی ایک پرائیویسی ہوتی ہے۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ......''

''اب غصہ تھوک بھی دیں وکیل صاحب۔'' وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے تو دوستی ہو گئی ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ''...... اس نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''جویریہ کے جانے کے بعد سے میری دونوں بہنیں میرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھنے کی مہم میں لگی ہوئی تھیں اور اتفاق سے انہیں ایک بہت شاندار رشتہ مل گیا ہے۔'' بات کے اختتام پر اس نے دادطلب نظر سے مجھے دیکھا۔

''بھئی واہ...... مبارک ہو...... ماشاء اللہ......'' میں نے اس کی توقعات کی تسکین کی غرض سے داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو واقعی بہت خوش قسمت ہیں آصف صاحب۔ لڑکی یقیناً اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو گی اور اس کا نام بھی باکمال ہو گا......!''

آخری دو جملے میں نے اس کی زبان کو رواں کرنے کے لیے بہ طور لبریکیٹ استعمال کیے تھے۔ فرطِ جذبات

میں الفاظ اس کے منہ سے پھسلنے لگے۔

"اس کا نام روبی ہے۔" وہ بڑے فخر سے بتانے لگا۔ "روبی اپنے والدین...... بلکہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد ہے۔ طویل عرصہ پہلے روبی کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔" پھر وہ ایک آنکھ دبا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ "پیسے والی پارٹی ہے وکیل صاحب......!"

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ قمر النساء اور خیر النساء بڑی خودغرض اور مفاد پرست عورتیں تھیں لیکن ان کا یہ گھوڑے مافق چھوٹا بھائی بھی لالچ اور طمع میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھا۔

"روبی کے والد صاحب کا نام کیا ہے؟" میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بہتی گنگا میں محض ہاتھ دھونے پر اکتفا کرنے کے بجائے غوطہ زن ہوتے ہوئے پوچھا۔ "اور ان کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟"

"روبی کے والد صمد بھائی بزنس مین ہیں۔" اس نے خاصے متکبرانہ انداز میں بتایا۔ "سائٹ ایریا میں ان کی گارمنٹس کی فیکٹری ہے جس کے ایک شعبے میں ایکسپورٹ معیار کی قیمتی لیدر جیکٹس بھی تیار کی جاتی ہیں۔ صمد صاحب کی عمر ستر کے آس پاس ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عمر میں تو انسان کے پاس مہمان اداکار ہی کا رول ہوتا ہے......" وہ ذرا دیر کو رک کر ذومعنی انداز میں مسکرایا اور پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو قینچی کے انداز میں چلاتے ہوئے بولا۔ "ڈائریکٹر کی مرضی کہ وہ آنے والے سین میں اسے رکھے یا کٹ کردے......!"

اس نے ایک بار پھر انگلیوں کو قینچی کے مانند حرکت دیتے ہوئے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے والے سین میں اگر صمد بھائی موجود ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ شادی کے بعد والے کسی سین میں بھی وہ نظر آئے۔ گویا آصف ابھی سے "پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں" کی سوچ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بفرزون کے علاقے میں صمد بھائی کا عالی شان بنگلا تھا جہاں وہ اپنی اکلوتی بیٹی روبی کے ساتھ رہتا تھا۔ روبی فیکٹری کے معاملات کو بھی دیکھتی تھی۔ شادی کے بعد اسے بھی روبی کے ساتھ مل کر فیکٹری کے انتظام کو سنبھالنا تھا...... وغیرہ وغیرہ!

آصف نے انتہائی قیمتی راز میرے سامنے اگل دیا تھا۔ اس کی بنا پر اسے احمق کہا جاسکتا تھا لیکن دوسری جانب وہ اور اس کی کنواری بوڑھی بہنیں جس انداز میں صمد بھائی کو مونڈ کر اس کے گھر، جائداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کا سوچ رہے تھے اس سے ان کی عیاری اور چالاکی جھلکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی آصف کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کو میں اسی کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آصف صاحب! مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک محسوس ہورہا ہے۔ میری دعا ہے کہ جلد از جلد آپ کے سر پر سہرا سج جائے!"

میں نے اس کی تمنا میں ہوا بھری تو وہ پھول گیا پھر متشکرانہ انداز میں بولا۔ "اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔"

"آصف صاحب!" میں نے بڑی اپنائیت سے اسے مخاطب کیا پھر بڑی ہوشیاری سے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک نئی، خوشیوں سے بھرپور اور آسائشوں سے مزین زندگی کی شروعات کرنے جارہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لگے ہاتھوں اس نوٹس والے معاملے کو بھی نمٹا ہی دیں......"

اتنی دیر سے میں نوٹس کے ذکر کو پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ اس کی مرضی کی باتیں کررہا تھا۔ میں نے اچانک نوٹس کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی تو وہ بدک کر بولا۔

"نمٹا دوں...... سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے، جویریہ کو تو آپ نے ویسے بھی نہیں رکھنا۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا...... "خوامخواہ اس کی نحوست سے آپ کا روبی والا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے گا لہٰذا اسے فارغ ہی کردیں تو اچھا ہے۔"

"کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جویریہ کو تو اس معاملے کی ہوا تک نہیں لگنا چاہیے لیکن میں اسے فارغ کیسے کروں؟"

"بھئی، سیدھی سی بات ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کے واجبات ادا کردیں۔ جویریہ ایک لالچی عورت ہے۔ وہ اسی میں خوش ہوجائے گی اور یہ معاملہ خود بہ خود ختم ہوجائے گا۔ ویسے بھی یہ کون سی اتنی بڑی رقم ہے۔ تیس ہزار کے طلائی زیورات، بیس ہزار نقد اور پچیس ہزار حق مہر ہے۔ اس کے علاوہ نان ونفقہ کے ذیل میں ایک سال کی رقم اٹھارہ ہزار روپے بنتی ہے۔ یہ کل ملا کر ترانوے ہزار روپے ہوجاتے ہیں۔ آپ یہ اماؤنٹ

جویریہ کو دینے کے لیے تیار ہو جائیں، میں اسے آفس میں بلا کر آپ لوگوں کا تصفیہ کرا دیتا ہوں۔ کیس کورٹ میں جائے بغیر ہی نمٹ جائے گا...... اللہ اللہ، خیر سلا!"

"تجویز تو آپ کی زبردست ہے۔" وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایک پرابلم ہے......"

"کیسی پرابلم آصف صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے۔" وہ اپنی مجبوری سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "جویریہ سے میں نے جو بیس ہزار روپے لیے تھے، وہ میں نے ایک کاروبار میں لگائے تھے اور اس کاروبار میں مجھے نقصان ہو گیا یعنی وہ بیس ہزار ڈوب گئے۔ جہاں تک طلائی زیورات کا معاملہ ہے تو وہ بھی میں نے جویریہ کے غیاب میں فروخت کر دیے ہیں۔ اس وقت میری مالی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں جویریہ کو دس ہزار روپے بھی ادا کر سکوں۔"

میرے جی میں تو یہی آئی کہ ابھی اٹھوں، جوتا اتاروں اور سانس روک کر اس کمینے انسان کے سر پر چھترول شروع کر دوں لیکن میرا یہ عمل بنے بنائے کھیل کا سوا ستیاناس مار دیتا لہٰذا میں نے ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور بڑی رسان کے ساتھ کہا۔

"آپ کہیں سے قرض ادھار نہیں پکڑ سکتے......؟"

"ترانوے ہزار کیا، میں تو آٹھ دس لاکھ بھی پکڑ سکتا ہوں۔" وہ فخریہ انداز میں سینہ تان کر بولا۔ "مگر ابھی یہ مناسب نہیں لگتا۔ صمد صاحب بھی کیا سوچیں گے کہ شادی ابھی ہوئی نہیں اور داماد جی نے فرمائشیں شروع کر دیں۔"

میں اس کی مکاری کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا۔ وہ اپنے ہونے والے سسر کو چونا لگا کر جویریہ کے واجبات ادا کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آصف صاحب۔ سسرالی رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی خودداری پر کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے وکیل صاحب! آپ ماشاء اللہ کافی سمجھ دار انسان ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ایک بات سچ سچ بتائیں گے؟"

"جی پوچھیں......" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"آپ میرے وکیل ہیں یا جویریہ کے؟" اس نے پوچھا۔

"آپ سے ملاقات سے قبل میں جویریہ کا وکیل تھا۔" میں نے اس کے اعتماد کو ہمدردی کا بگھار لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب میں آپ کا وکیل ہوں۔"

"آپ کا یہ فیصلہ خاصا دانش مندانہ ہے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ "میرے وکیل ہونے کے ناتے آپ کو میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

"جی بتائیں...... کون سا کام؟"

"کیا آپ کسی طرح جویریہ کو واجبات کے مطالبے سے دو تین ماہ تک روک سکتے ہیں؟" اس نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔ "جویریہ کو ہر صورت میں فارغ کرنا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی بدمزگی کے بغیر روبی سے میری شادی ہو جائے۔ اس کے بعد میرے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ ترانوے ہزار کیا، میں کچھ زیادہ ہی اسے دے دوں گا۔ اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

یہ بات بہ خوبی میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ جویریہ کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکالنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن محض فنڈز کی کمی کے باعث وہ فی الحال اس معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔ جب اس نے کسی صورت جویریہ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے رکھنا ہی نہیں تھا تو پھر مجھے اپنی مؤکلہ کے تحفظات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا تھا۔ میں نے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا۔

"میرے لیے یہ بہت آسان کام ہے آصف صاحب۔ دو تین ماہ کیا، میں تو ایک لمبے عرصے تک جویریہ کو اپنے آفس کے چکر لگانے پر مجبور کر سکتا ہوں لیکن......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "لیکن کیا وکیل صاحب؟"

"میں چاہتا ہوں، آپ اس نوٹس کا جواب دے دیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جواب......!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "جواب کی کیا ضرورت ہے وکیل صاحب؟"

"ضرورت ہے، جبھی تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک طرح کی خانہ پری ہے۔ ہمیں ریکارڈ کی درستی کے لیے اپنی فائلوں کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ آپ کے جواب سے میں جویریہ کو بھی مطمئن کر کے زیادہ عرصے تک ٹال سکتا ہوں۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میرا نوٹس ملتے ہی آپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور آپ ترانوے ہزار روپے کا انتظام کرنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

یہ ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میرے اطمینان دلانے پر وہ پُرسکون ہو گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جواب میں کیا لکھنا ہو گا؟"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں ہوں نا آپ کا وکیل۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں جواب کا مضمون تیار کر کے آپ کو پڑھوا دیتا ہوں۔ آپ اس پر دستخط کر دیجیے گا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کیس کے پس منظر اور پیش منظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک ایسا مضمون ٹائپ کروا دیا جو بعدازاں میری مؤکلہ کے لیے معاون اور مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ آصف کی جانب سے نوٹس کا جواب کچھ اس طرح تھا۔

"وکیل صاحب! آپ کا بھیجا ہوا نوٹس بہ تاریخ...... دسمبر موصول ہوا۔ آپ کی مؤکلہ جویریہ نے آپ سے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا بلکہ یہ خود اپنی مرضی سے گئی ہے اور سارا زیور بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ خیر، اس نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جویریہ ابھی تک قانوناً اور شرعاً میری بیوی ہے لیکن وہ اس لائق نہیں کہ بیوی کی حیثیت سے میں اسے اپنے گھر میں رکھوں اور اس کا سبب یہ ہے کہ جویریہ گندے عملیات کرتی اور کراتی ہے۔ جب تک یہ میرے گھر میں رہی، ہمارے گھر کا نظام درہم برہم رہا۔ اس کے سفلی عملیات کی وجہ سے میری بہنوں کے رشتوں میں شدید نوعیت کی رکاوٹ پیدا ہو گئی اور ایک خاص بات یہ کہ جویریہ بانجھ بھی ہے۔ ایسی عورت کا میں کیا اچار ڈالوں گا جو میری نسل کو آگے نہ چلا سکے اور ہاں...... میں اس طرح کے نوٹس کی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ کو ہمارے بیچ نہیں آنا چاہیے۔ آپ نے سنا تو ہو گا...... جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی ...... آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں پیسوں کے انتظام میں لگا ہوا ہوں۔ ان شاء اللہ! بہت جلد میں جویریہ کا حساب چکتا کر دوں گا...... آصف!"

وہ نوٹس کا جواب پڑھ کر خوش ہو گیا اور تعریفی انداز میں بولا۔ "آپ نے بڑا زبردست مضمون بنایا ہے۔"

"میں تو ایسے ہی زبردست کام کرتا ہوں جناب۔" میں نے قلم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اس پر چڑیا بٹھا دیں۔"

"چڑیا بٹھا دوں؟" اس نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "مطلب یہ کہ آپ دستخط کر دیں۔"

"اوہ......!" اس نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی پھر جلدی سے میری بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کر دیے اور بولا۔

"یہ آپ نے اچھا کیا کہ نوٹس کے جواب میں آپ نے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں روبی سے شادی کرنے والا ہوں۔"

کسی وقت آصف انتہائی احمق اور الو کا پٹھا نظر آتا تھا اور کبھی وہ بڑی عیارانہ باتیں کرتا تھا۔ بہرحال، مجھے اس کے اسی فطری یا جبلّی یا طبعی تضاد سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے اسے خوش فہمی کے کھمبے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"آصف صاحب! جب میں آپ کا وکیل ہوں تو پھر آپ ہی کے مفادات کی نگرانی کروں گا نا...... جویریہ تو خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی کہ آپ ایک شاندار زندگی کا آغاز کرنے والے ہیں......!"

لگژری لائف کے تصور سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ روبی کی سنگت میں کیف و انبساط کی نگری کے دورے پر ہو۔ میں نے اس کی لذت سے بھرپور، سرور سے پُرنور خیالی دنیا میں ذرا سا بھی خلل پیدا نہیں ہونے دیا اور اسے ساتھ لے جا کر نوٹری پبلک سے اس کے جواب میں تصدیقی مہر ثبت کروا لی۔

"اب آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں اور روبی سے شادی کی تیاریوں میں جت جائیں۔" میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "سمجھ لیں کہ کام ہو گیا۔ میں اس جواب کے سہارے جویریہ سے ٹال مٹول کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔ وہ آپ کے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ویسے آپ کا شادی کا کب تک ارادہ ہے؟"

"یہ اس سال کا آخری مہینا ہے۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے، اس ماہ کے آخری ہفتے میں یا زیادہ سے زیادہ جنوری کے پہلے ہفتے میں روبی سے میرا نکاح ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔" میں نے الوداعی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی

جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ...... اب آپ کی شادی کے بعد ہماری ملاقات ہوگی۔''

''ان شاء اللہ......!'' وہ میرے ہاتھ کو پوری قوت سے دباتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز فورِ مسرت سے کانپ رہی تھی۔ روبی کے تصور نے اسے نہال کر رکھا تھا۔

میں نے بہ مشکل اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا۔ ''میری جانب سے آپ کو ایڈوانس میں ڈھیروں مبارک۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا پھر بٹوے کے اندر سے سو سو والے پانچ کرارے نوٹ برآمد کر کے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ پانچ سو روپے میری طرف سے فیس رکھ لیں۔''

میں نے لکشمی دیوی کی دستک کو نظر انداز کرنا مناسب نہ جانا اور وہ پانچ سو روپے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ آصف میرا کلائنٹ نہیں تھا لیکن میں نے اس سے مغز ماری میں اپنا اچھا خاصا وقت صرف کیا تھا۔ اس سے فیس لینا تو میرا حق بنتا تھا۔ یہ پانچ سو روپے میری اصل فیس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھے لیکن کسی نے بہت خوب کہا ہے...... کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے!

☆☆☆

اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ آصف کے دل میں اور اس کے گھر میں جویریہ کے لیے شمّہ بھر بھی جگہ نہیں تھی لہٰذا جویریہ کی اس سے جان چھڑانا ناگزیر ہو گیا تھا اور وہ بھی تمام واجبات کی وصولی کے ساتھ......!

دوسری جانب مجھے اپنے تجربے کی روشنی میں آفتاب شگفتہ، جویریہ کا امیدوار دکھائی دیتا تھا اور اس کی اول و آخر یہی کوشش بلکہ یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد جویریہ، آصف کے نکاح سے نکل آئے۔ خواتین، حضرات کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو معاملہ میں دیکھ رہا تھا، وہ جویریہ نے محسوس نہ کیا ہو جبکہ آفتاب شگفتہ اس کا محلے دار، اس کا پڑوسی بھی تھا۔ میں نے اس حوالے سے جب جویریہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی تو اس نے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ اس کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اگر آفتاب شگفتہ ایسا سوچ رہا ہے تو کسی مناسب موقع پر وہ اس کا ذہن صاف کر دے گی۔ میں جویریہ کے جواب سے یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اگر واقعتاً جویریہ بھی آفتاب کی ذات میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے اور اسے معلوم ہے کہ آفتاب کے ذہن میں اس کے لیے کس نوعیت کے جذبات ہیں اور ...... جویریہ نے دانستہ یہ معاملات مجھ سے چھپانے کی کوشش کی ہے تو اس میں خرابی والی کوئی بات نہیں۔ یہ جویریہ کا حق ہے کہ وہ اپنی بہتری کے لیے جو بھی فیصلہ کرے، خاص طور پر ان حالات میں کہ مارکیٹ میں اس کا ایک اور امیدوار بھی موجود تھا۔ میرا اشارہ جویریہ کے بہنوئی شکیل احمد کی جانب ہے جو جویریہ کو گناہ کی آڑ میں مسلسل اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھائے رکھنا چاہتا تھا۔ یہ گھٹیا پن کی انتہا تھی۔ شکیل نے اپنی بیوی عارفہ کو کسی کمپنی کی فروخت شدہ پروڈکٹ سمجھ رکھا تھا اور وہ اس چیز کے ناکارہ ہونے (قابلِ استعمال نہ رہنے) کی صورت میں ''بعد از فروخت سروس کی ضمانت'' والا وارنٹی کارڈ استعمال کرتے ہوئے کمپنی سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ اس کی سہولت اور اس کے مکروہ جذبات کی تسکین کے لیے ریپلیسمنٹ کے طور پر جویریہ کو اس کی کسٹڈی میں دے دیں۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں آپ کو ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔ پاکیزہ کردار کے مالک مینارۂ نور بھی اور غلاظت سے لتھڑی سوچ کے حامل شکیل احمد جیسے ناسور بھی......!

میں نے آئندہ دو روز تک صمد بھائی اور اس کی بیٹی روبی کے بارے میں اہم معلومات جمع کر لیں پھر جویریہ کو اپنے آفس بلا لیا۔ اب کی بار بھی آفتاب شگفتہ اس کے ہمراہ تھا۔ میں نے اپنی سیکریٹری ماہم سے کہا کہ وہ آفتاب شگفتہ کو انتظار گاہ میں بٹھائے اور جویریہ کو میرے پاس بھیج دے۔

تھوڑی دیر کے بعد جویریہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آج آپ کا موڈ آف لگ رہا ہے اور میں اس کا سبب بھی جانتی ہوں۔''

یہ سچ ہے کہ آفتاب شگفتہ کی آمد کا سن کر میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی اور یقیناً جویریہ نے میرے چہرے سے جھلکتے ہوئے اس تکدر کو بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''جانتی ہیں...... پھر بھی؟'' میرے لہجے میں شکایت پائی جاتی تھی۔

''آپ ٹینشن نہ لیں۔'' وہ خاصے خوشگوار لہجے میں بولی۔ ''میں بہت جلد آفتاب کی خوش فہمی بھی دور کر دوں گی۔ ابھی اسے چلنے دیں۔ میں اکیلی جان کہاں کہاں خوار ہوں گی۔ بھاگ دوڑ کے کاموں کے لیے بھی تو کوئی چاہیے نا......!''

میں نے کسی جرح یا اعتراض کی ضرورت محسوس نہ کی

اور فراخ دلی سے کہا۔ ''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ بھاگ دوڑ کا زبردست کام شروع ہونے والا ہے اور اس مقصد کے لیے آفتاب سے زیادہ کارآمد بندہ ہمیں کہیں نہیں ملے گا۔ ایسا کرتے ہیں، اسے بھی اندر بلا لیتے ہیں......'' میں نے انٹرکام پر ماہم کو ہدایت دی کہ وہ آفتاب کو میرے پاس بھیج دے پھر میں نے جویریہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تو خوش ہیں نا......!''

جواب دینے کے بجائے وہ کسمسا کر رہ گئی۔

جویریہ کے ذہن میں آفتاب شگفتہ کے لیے جو بھی تھا اس سے قطع نظر میں نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ آفتاب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی لہٰذا مجھے جویریہ کی اس خواہش پر معترض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب آفتاب شگفتہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہو چکا تو میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

پوری بات سننے کے بعد جویریہ نے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ میری اجازت کے بغیر آصف دوسری شادی کیونکر کر سکتا ہے؟ میں نے اس قانون کے بارے میں سن رکھا ہے......!''

''یقیناً ایسا قانون تو موجود ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن یہ خاصا کمزور قانون ہے جو کسی بیوی کے حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے اس کے لیے مسائل کا انبار کھڑا کر دیتا ہے۔ جو مرد دوسری شادی کا اٹل فیصلہ کر لیتا ہے، وہ پہلی بیوی سے اجازت حاصل کرنے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اگر پہلی بیوی اس کی دوسری شادی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرے تو وہ اسے طلاق دے کر، اپنی راہ کو صاف کر کے دوسری شادی کر لیتا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے، آصف کی بہنوں نے صمد بھائی اور اس کی بیٹی روبی کو آصف کی پہلی شادی کے بارے میں بتایا ہی نہ ہو۔''

''لیکن اس بات کا پتا کیسے چلے گا؟'' جویریہ تفکر آمیز انداز میں بولی۔

''یہ راز آفتاب صاحب کی مدد سے حاصل کیا جائے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں انہیں سمجھا دوں گا کہ کرنا کیا ہے۔'' پھر میں نے جویریہ سے کہا۔ ''ہم بروقت قانونی چارہ جوئی کر کے آصف کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر سکتے ہیں۔ آپ مجھے اپنا نکاح نامہ، طلائی زیورات کی رسیدیں اور ان بیس ہزار روپے کا کوئی ٹھوس ثبوت لا دیں جو آپ کے ابو نے جہیز کے سامان کی مد میں آپ کو دیے تھے اور آپ نے آصف کے حوالے کر دیے تھے۔''

''میں آپ کو نکاح نامہ اور اپنی زیورات کی رسیدیں دے سکتی ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''لیکن نقد بیس ہزار والی رقم کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ آصف نے وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کو آصف کا اکاؤنٹ نمبر یاد ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''بینک کا نام اور برانچ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''یہ وہی بینک ہے جس میں آصف کی بہن قمرالنساء کام کرتی ہے۔'' اس نے کہا پھر بینک کا نام بھی بتا دیا۔

''آپ کے نکاح کی تاریخ تو نکاح نامے سے پتا چل جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کو یاد ہے کہ شادی کے کتنے دن بعد آصف نے وہ بیس ہزار کی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی؟''

اس نے مجھے مذکورہ تاریخ بتا دی جو شادی کے چند روز بعد کی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اس سے کام چل جائے گا۔ میں آفتاب صاحب کو گائیڈ کروں گا اور انہیں بینک بھیج کر ہم آصف کی اس ماہ کی اسٹیٹ منٹ نکلوا لیں گے جب آصف نے مذکورہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی۔''

''جی......'' آفتاب شگفتہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ آپ نے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے آصف کی روزمرہ سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھنا ہے تاکہ جب وہ شادی کرے تو ہمیں فوراً پتا چل جائے۔''

''یہ تو خاصا مشکل کام ہے وکیل صاحب۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

''کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''میں بیٹھا ہوں نا آپ کی راہنمائی کے لیے۔ وہ سیانے کہتے ہیں نا...... کسی نے کسی سے پوچھا،

تو کون؟ کسی نے کسی کو جواب دیا، میں خوامخواہ!...... تو آفتاب صاحب! جو خوامخواہ ہوتا ہے نا، اسے خوامخواہ ہی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تو آپ نے......" میں نے لحاتی توقف کر کے ان دونوں کے چہروں کو باری باری دیکھا پھر آفتاب سے کہا۔

"ابھی تو آپ نے ایک اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے روبی کی فیکٹری اور گھر بھی جانا ہے اور روبی کا انٹرویو کرنا ہے۔ روبی کو بتایا جائے گا کہ آپ کا اخبار فیمیل صنعت کاروں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر رہا ہے اور اس کام کا آغاز روبی صاحبہ سے کیا جا رہا ہے۔ وہ بہت خوش ہوگی اور پوز مار مار کر تصویریں بھی کھنچوائے گی۔ اس طرح آپ کو اس کے قریب ہونے کا موقع ملے گا اور آپ شادی کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے روبی کے منہ سے آف دی ریکارڈ بھی بہت کچھ اگلوا سکتے ہیں۔ آپ تو ایک جید صحافی ہیں۔ یہ کام تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے...... ہے کہ نہیں؟"

"جی...... بالکل ہے......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"بس تو پھر آپ کل ہی سے کمر کس کے کام پر لگ جائیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس سفر میں آپ نے خود کو تنہا نہیں سمجھنا۔ میں ہر مرحلے پر شانہ بہ شانہ آپ کے ساتھ ہوں...... بلکہ دیکھیں، میں بھی آپ کے سامنے ہی کام کا آغاز کر رہا ہوں۔"

میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے صمد بھائی کی فیکٹری اور گھر دونوں جگہوں کے ٹیلی فون نمبرز حاصل کر لیے تھے۔ میں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ سے صمد بھائی کے بنگلے کا نمبر ملایا کیونکہ میری معلومات کے مطابق، اس وقت تک وہ فیکٹری سے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔

تیسری گھنٹی پر میری کال ریسیو کر لی گئی پھر ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

"ہیلو......!"

"ہیلو...... کیا آپ صمد بھائی بول رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی...... آپ کون؟"

"صمد بھائی! میں سردار علی بات کر رہا ہوں۔" میں نے تبدیل شدہ آواز کے ساتھ کہا۔

"جی سردار بھائی!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"صمد بھائی! پیراڈائز مارکیٹ میں میری عروسی ملبوسات کی دکان ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک صاحب جو اپنا نام آصف بتاتے ہیں، اس وقت میری دکان کے اندر موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے میری دکان سے بنارسی ساڑیاں اور دیگر قیمتی ملبوسات خریدے ہیں۔ بل کی ادائی کے لیے ان کے پاس نقد رقم کم پڑ گئی ہے۔ بقایا رقم کے لیے وہ دس ہزار کا چیک دینا چاہتے ہیں۔ میں عموماً چیک نہیں لیتا ہوں لیکن آصف صاحب نے آپ کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ آپ کی بیٹی روبی سے ان کی شادی ہونے والی ہے۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ پیراڈائز مارکیٹ میں آپ کی فیکٹری کی تیار کردہ گارمنٹس اور لیدر جیکٹس بھی فروخت ہوتی ہیں۔ بس، اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ آصف صاحب کا چیک لینے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے......؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا، میں نے "شکریہ صمد بھائی" کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

جویریہ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بے یقینی سے بولی۔ "بیگ صاحب! آپ اتنی صفائی سے کیسے جھوٹ بول لیتے ہیں؟"

"وکیلوں کے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "ہمارے پیشے میں بعض اوقات سچ کی تلاش کے لیے بہت سے جھوٹوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جیسا کہ ابھی ہوا ہے۔ میرے جھوٹ نے یہ سراغ لگا لیا کہ صمد بھائی کی بیٹی روبی کی شادی واقعی آصف سے ہو رہی ہے۔"

"بہت خوب!" وہ سراہنے والے انداز میں بولی۔ "اسے کہتے ہیں، سفید جھوٹ۔"

"اگر سفید میں سے سین کو ہٹا کر اس کی جگہ میم لگا دیا جائے تو یہ مفید جھوٹ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ویری ویری فائدہ مند جھوٹ......!"

"ایک ہی بات ہے بیگ صاحب......" وہ خوشگوار...... انداز میں بولی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حزن و ملال کی اس دیوی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی کلیاں کھلی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں امیدوں کے جگنو جاگ اٹھے تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''یہ اپنے آفتاب صاحب زبردست اسٹوری میکر ہیں۔ ان کی نکالی ہوئی اسٹوریز ملک کے طول وعرض میں تہلکہ ڈال دیتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے ان کے ذمے جو کام لگائے ہیں اس میں سے یہ کیا ڈگ آؤٹ کرتے ہیں......!''

''آپ فکر نہ کریں وکیل صاحب۔'' آفتاب شگفتہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ میری کارکردگی سے یقیناً آپ خوش ہوں گے۔''

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ آئندہ چند روز میں آفتاب شگفتہ نے کافی مفید اور کارآمد معلومات مجھ تک پہنچائیں۔ مثال کے طور پر...... آصف کی ہونے والی بیوی روبی کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ وہ موٹے نقوش اور سانولے رنگ کی ایک پستہ قامت واجبی شکل وصورت کی مالک عورت تھی۔ اس کی شخصیت کی امتیازی ''خوبی'' اس کا غیر معمولی وزن تھا۔ وہ ماشاء اللہ سو کلوگرام وزن کی مالک تھی۔ انہی من جملہ خصائل کے باعث ابھی تک وہ کنواری بیٹھی تھی۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ قمر النساء اور خیر النساء کس بنا پر جویریہ سے نفرت کرتی تھیں۔ انہیں دراصل اپنے ہی کینڈے اور ایج گروپ کی بھابی درکار تھی......!

آفتاب نے مجھے روبی کی ایک دو تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی کسی بھی چیز کو حقیر جاننا یا اس کی برائی کرنا کسی انسان کو زیب نہیں دیتا۔ میں بس، اتنا کہوں گا کہ اگر روبی کے ساتھ کروڑوں کی جائداد، کاروبار اور دولت و مال نتھی نہ ہوتا تو شاید وہ زندگی بھر غیر منکوحہ ہی رہتی۔

چند روز بعد جویریہ اور آفتاب شگفتہ مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ آصف نے روبی سے شادی کرلی ہے اور گھر داماد بن کر وہ صمد بھائی کے بفرزون والے بنگلے میں شفٹ ہوگیا ہے۔ گویا...... آصف کی رخصتی ہوئی تھی!

''اب کیا ہوگا بیگ صاحب؟'' جویریہ نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا......!'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''میں تو اسی وقت کا انتظار کررہا تھا۔ میں اپنے ذرائع استعمال کرکے آصف اور روبی کے نکاح کی تفصیلات معلوم کرلوں گا۔ اب آپ دونوں کو تماشا دیکھنا ہے اور میرا عملی کام شروع ہوتا ہے۔''

''آپ میرا کیس کب تک عدالت میں دائر کریں گے؟'' اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''کل صبح ہی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''حقِ زوجیت اور نان ونفقہ کا کیس تو تیار رکھا ہے۔ اس میں مزید کچھ چیزوں کا اضافہ کرکے کل حوالۂ عدالت کردوں گا۔''

میری وضاحت کے بعد وہ مطمئن ہوگئی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے عائلی قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ کے تحت عائلی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ فیملی کورٹ نے اگلے دن مدعا علیہ کو درخواست دعویٰ کی نقل کے ساتھ سمن جاری کردیا۔ سماعت کی تاریخ دو ہفتے بعد کی رکھی گئی تھی۔ میں نے ایک ہوشیاری یہ کی تھی کہ درخواست دعویٰ میں آصف کی رہائش گاہ کا پتا، صمد بھائی کے بنگلے واقع بفرزون کا دیا تھا۔ اس کارگزاری کا مقصد یہ تھا کہ روبی یا صمد بھائی کو بھی آصف کی پہلی شادی کا علم ہوجائے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ صمد بھائی جانتے بوجھتے ہوئے ایک شادی شدہ شخص سے اپنی بیٹی کی شادی کردیتا جبکہ اس شادی کے ساتھ کروڑوں کے معاملات بھی جڑے ہوئے تھے۔ صمد بھائی ایک جہاں دیدہ شخص تھا۔ یقیناً آصف کی پہلی شادی کی بات اس سے چھپائی گئی ہوگی اور آصف کی فتنہ پرور سسٹرز اس نوعیت کی کارروائیوں میں خاصی مشاق تھیں۔

میں نے سمن کی تعمیل کرانے والے بیلف سے ملاقات کرکے ذاتی طور پر اس خواہش کا اظہار کیا۔ ''جناب! اس سمن کی تعمیل ایک خاص انداز سے کرانا ہے۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سے خاص انداز میں؟''

مجھے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ کن اوقات میں روبی اور آصف بہ یک وقت گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ میں نے بیلف کو وہ اوقات نوٹ کروانے کے بعد کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان اوقات میں مذکورہ ایڈریس پر جاکر اس سمن کی تعمیل کرائیں۔''

''ہوجائے گا بیگ صاحب۔'' وہ فراخ دلی سے بولا پھر پوچھا۔ ''کوئی اور فرمائش؟''

''آپ متعلقہ ایڈریس پر جاکر پہلے روبی کے بارے میں استفسار کریں گے۔'' میں نے اپنا منصوبہ اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''جب روبی گیٹ تک آجائے تو پھر آپ اس سے کہیں گے کہ اس کے شوہر آصف کے نام سمن آیا ہے۔ اس سے کہیں، وصول کرلے۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ سمن کی وصولی کے وقت آصف کی بیوی اس کے برابر میں کھڑی ہو۔'' وہ معنی خیز نظر سے

مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہوجائے کہ عدالت نے کس سلسلے میں اس کے شوہر کے نام یہ سمن بھیجا ہے؟''

''ایگزیکٹلی......!'' میں نے توصیفی انداز میں بیلف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل یہی چاہتا ہوں۔''

''میں نے سنا ہے......'' وہ بفرزون کے علاقے میں مٹھائی کی ایک معروف دکان کا نام لے کر بولا۔ ''وہاں کی مٹھائیاں بہت خوش ذائقہ، مزے دار اور معیاری ہوتی ہیں۔''

میں اس کی بات میں پوشیدہ رمز تک پہنچ گیا۔ ''ہاں، سنا تو میں نے بھی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے بٹوے میں سے سو روپے والا ایک نوٹ نکال کر سمن کی تعمیل کرانے والے بیلف کی جانب بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''جب آپ آصف کو سمن دے کر فارغ ہوجائیں تو واپسی پر اپنے گھر والوں کے لیے مذکورہ سوئٹ ہاؤس سے عمدہ قسم کی مٹھائی بھی لے جایئے گا۔''

وہ خوش ہوگیا اور میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کا ہر مسئلہ پیسے سے حل نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زندگی کے ننانوے فیصد مسائل دولت کے جادو سے حل ہوجاتے ہیں۔ کوئی اس فارمولے پر یقین کرے یا نہ کرے مگر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت، سب سے بڑی سچائی یہی ہے جو کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے بدل نہیں سکتی۔ ایسے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو مثبت اندازِ فکر کے ساتھ ایک فیصد کی امید کے سہارے جی لیتے ہیں ورنہ انسانوں کا عمومی چلن تو یہی ہے کہ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

بیلف نے ایک سو روپے کی چمتکارانہ قوت کے طفیل نہ صرف یہ کہ میری خواہش کے عین مطابق سمن کی تعمیل کرائی بلکہ اگلے روز عدالت کے احاطے میں کھڑے ہو کر مجھے اس قانونی کارروائی کی روداد بھی سنائی۔ آپ کی تفریحِ طبع کے لیے خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

بیلف کی طلبی پر جب روبی اس کے سامنے پہنچی اور اس نے یہ تصدیق کرلی کہ وہ کنگ سائز عورت آصف کی بیوی روبی ہی ہے تو اس نے روبی سے کہا۔

''میڈم! آپ اپنے شوہر آصف کو بلائیں۔''

''خیریت......'' روبی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آصف سے آپ کو کیا کام ہے؟''

''اس کے نام عدالت سے سمن آیا ہے۔'' بیلف نے بتایا۔

روبی کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کیسا سمن؟''

''آصف...... کی پہلی بیوی نے اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کردیا ہے۔''

''پہلی بیوی!'' وہ بے یقینی سے بیلف کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیسا مذاق ہے؟''

''یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔'' بیلف نے اسے خوفزدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مذاق تو آصف نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں اس نے دولت کے لالچ میں آپ سے شادی کرلی اور وہ بھی خود کو کنوارا بتلا کر......''

''یہ آپ کیسی بکواس کررہے ہیں؟'' روبی بھڑک اٹھی۔

''میڈم! میں تو عدالت کا ادنیٰ سا کارندہ ہوں۔'' بیلف عاجزی سے بولا۔ ''اور اتنا جانتا ہوں کہ اگر آصف نے اس سمن کا کوئی معقول جواب نہ دیا تو اس کے بعد عدالت سے اس کے لیے وارنٹ جاری کیا جائے گا اور آپ کو اتنا تو پتا ہی ہوگا کہ وارنٹ کی صورت میں گرفتاری لازمی ہے۔''

''لائیں...... یہ سمن مجھے دیں۔'' روبی نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں اپنا ہاتھ بیلف کی جانب بڑھایا۔ ''میں دیکھتی ہوں، اس کے اندر کیا ہے!''

''سوری میڈم!'' بیلف نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں اپنی ذمے داری کے سامنے مجبور ہوں۔ یہ سمن میں اسی شخص سے وصول کراؤں گا جس کے نام ہے۔ آپ پلیز آصف کو یہاں بلائیں۔''

اسی لمحے بنگلے کے اندر سے آصف کی آواز سنائی دی۔ ''ہنی!'' وہ بڑے دلار سے اپنی نئی نویلی دلہن کو پکارتے ہوئے بولا۔ ''آپ گیٹ پر کس سے بات کررہی ہیں؟''

''آ کر خود ہی دیکھ لو۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''عدالت سے کوئی صاحب تمہارے لیے ایوارڈ حسنِ کارکردگی لے کر آئے ہیں۔''

''یو مین...... پرائیڈ آف پرفارمنس؟'' وہ چہک کر بولا۔

''زیادہ انگلش بگھارنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''فوراً ادھر آؤ۔''

آصف کو صورتِ حال کی سنگینی کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا اسی لیے اس کے لہجے میں چہک شامل تھی۔ وہ کسی بے فکرے نوجوان کی طرح سیٹی بجاتے ہوئے گیٹ پر پہنچا تو بیلف کے استقبالیہ جملے نے اس کی سٹی گم کردی۔

''آصف صاحب! جویریہ نے آپ کے خلاف

عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میں اس کا سمن لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''کک...... کون جویریہ......'' آصف کے حواس پر گویا بجلی سی گری۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ''تم...... غلط جگہ پر...... آ گئے ہو...... میں کسی جویریہ کو...... نہیں جانتا...... تم یہ سمن واپس لے جاؤ......'' پھر وہ روبی کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''آؤ ہنی! اندر چلتے ہیں۔ پتا نہیں، کیسے کیسے لوگ وقت برباد کرنے آ جاتے ہیں۔''

روبی نے متعدد ہارس پاور کے ایک جھٹکے سے آصف کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا پھر غضب ناک نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ادھر ہی رکو اور غور سے سنو، عدالت سے آنے والا یہ بندہ کس عظیم کارنامے پر تمہیں.... ''پرائیڈ آف پارفامنس...'' دینے آیا ہے۔''

''میں آپ کی پہلی بیوی جویریہ کی بات کر رہا ہوں۔'' روبی کی خوفناک چنگھاڑ کے اختتام پر بیلف نے سونے پہ سہاگا کی عملی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا اکام عدالت کے حکم کی تعمیل کرانا ہے۔ جویریہ آپ کی بیوی ہے یا نہیں، اس بات کا فیصلہ کرنا جج کا کام ہے۔ آپ برائے مہربانی یہ سمن وصول کریں اور کسی وکیل کی وکالت میں مقررہ تاریخ پر عدالت میں حاضر ہو کر جوابِ دعویٰ داخل کر دیں۔''

بیلف نے مجھے بتایا کہ آصف ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال میں گھر کر بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے آناً فاناً میں رسید پر دستخط کر کے بیلف سے سمن والے کاغذات وصول کیے اور اپنی بیوی ڈیوٹی نیو برانڈ وائف کا ہاتھ پکڑ کر اسے بنگلے کے اندر لے گیا تھا۔

بیلف کی کارکردگی نے میرا مقصد پورا کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس رات صمد بھائی کے بنگلے کے کسی بیڈروم میں گھمسان کا رن پڑنے والا تھا اور عین ممکن تھا کہ بفرزون میں واقع وہ بنگلا پورے کا پورا ہی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ اب تو آپ بھی مان گئے ہوں گے کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، بہ شرط یہ کہ آپ کو پیسے کے استعمال کا ڈھنگ آتا ہو...... سو روپے والے ایک نوٹ نے آصف کی نئی سسرال میں فساد کی چنگاری گرا کر اس کیس میں میری جیت کے امکانات کو رخشندہ و تابندہ کر دیا تھا۔

اگلے دو روز میں، میں نے اپنے تعلقات استعمال کیے اور متعلقہ یونین کونسل کے دفتر سے آصف اور روبی کے نکاح نامے کی کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران میں آفتاب شگفتہ نے بھی ہاتھ پاؤں مار کر اس کیس کے حوالے سے کچھ مزید مفید معلومات مجھ تک پہنچا دی تھیں۔

پہلی پیشی پر آصف نے اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں جوابِ دعویٰ داخل کر دیا۔ ''اپنے وکیل'' سے میری مراد ہرگز میں نہیں ہوں۔ میں تو اس کیس میں وکیل استغاثہ یعنی آصف کی حریف جویریہ کا وکیل تھا۔

اس روز عدالت کے برآمدے میں آصف سے میری سرسری سی ملاقات ہوئی۔ اس نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وکیل صاحب! آپ تو بڑے کاریگر نکلے......!''

''کیوں...... میں نے کیا کیا ہے؟'' میں انجان بن گیا۔

''آپ نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مگر آپ کی سمن والی چال میرے حق میں چلی گئی۔ روبی کو ایک نہ ایک دن تو میری پہلی شادی کا پتا چلنا ہی تھا۔ خیر...... میں نے اسے سیٹ کر لیا ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ تو میرے وکیل تھے لیکن آج آپ میرے خلاف کھڑے ہیں حالانکہ میں نے آپ کی فیس بھی ادا کی تھی۔ یہ تو چیٹنگ ہے نا......!''

''اسے چیٹنگ نہیں فیکٹس کہا جاتا ہے مسٹر آصف!'' میں نے حقیقتِ حال اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، میں نے جویریہ کو آپ کے حق میں ہموار کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس نے میری ایک نہیں مانی اور کیس کرنے پر بہ ضد رہی۔ میں گن پوائنٹ پر تو اسے راضی کرنے سے رہا...... نمبر دو، میں نے آپ کو تباہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی البتہ میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ مظلوم جویریہ کی ''آہ'' آپ کو عنقریب تباہ و برباد کر ڈالے گی...... نمبر تین، آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میری جانب سے دائر اس کیس نے ابتدائی مرحلے پر ہی آپ کی مشکل آسان کر دی۔ اگر کچھ عرصے کے بعد روبی کو آپ کی دوسری شادی کا علم ہوتا تو پھر آپ کو اسے سیٹ کرنے کا موقع نہ ملتا بلکہ وہ آپ کو بری طرح اپ سیٹ کر دیتی...... نمبر چار، سمن والی چال میری نہیں تھی۔ یہ کارنامہ عدالت کا ہے۔ وہ عدالت جہاں اگلی پیشی پر آپ کو حاضر ہو کر میری جرح کا سامنا کرنا ہے...... نمبر پانچ، اب رہ گئی فیس کی بات تو...... آپ نے مجھے جو پانچ سو روپے دیے تھے، اس کے بدلے

میں، میں نے آپ کو سروس بھی فراہم کی تھی۔''

''سروس...... مائی فٹ!'' وہ برہمی سے بولا۔''وہ جو آپ نے اپنی مرضی کا نوٹس کا جواب ٹائپ کر کے دیا تھا؟''

''میں نے وہی جواب لکھا جو آپ کے خیالات اور دعوؤں سے لگا کھا تا تھا۔'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''اور وہی ساری باتیں وکیلِ صفائی نے جوابِ دعویٰ میں بھی لکھی ہیں۔ اگر روبی کو ''ہنی ہنی'' کہنے سے فرصت میسر آجائے تو جوابِ دعویٰ کی اسٹڈی کر لیجیے گا۔''

وہ معاندانہ انداز میں مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔'' آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ ......''بھائی! اتنے میں اتنا ہی آتا ہے......'' تو آصف صاحب! آپ کے دیے ہوئے پانچ سو روپے میری فیس کا پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ کو میری فیس کے بارے میں کچھ جاننا ہے تو کسی پٹے والے سے یا کسی اسٹیمپ فروش سے یا کسی وثیقہ نویس سے یا کسی نوٹری پبلک سے جا کر پوچھ لیں مگر پھر بھی بھائی بندی میں کہہ رہا ہوں......''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ تلملاہٹ آمیز انداز میں مستفسر ہوا۔''کیا......؟''

''آپ کہیں تو میں وہ پانچ سو روپے آپ کو واپس کر دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس نے غصے سے پاؤں پٹخا اور غراہٹ بھرے انداز میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔''میں آپ کو دیکھ لوں گا!''

''تو کیا اتنی دیر سے یہاں کھڑے مجھے سونگھ رہے تھے۔'' میں نے چوٹ کی۔''جو مجھے بعد میں دیکھنے کا فیصلہ سنا کر جا رہے ہیں......؟''

اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے آج کیس کی ابتدا ہی میں آصف کو خاصا ہیوی ڈوز دے دیا تھا۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک ماہ کے بعد کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ وکیلِ صفائی نے جوابِ دعویٰ میں کم و بیش وہی باتیں لکھی تھیں جو میں نے اپنے نوٹس کے جواب میں آصف کی جانب سے ٹائپ کی تھیں۔ جوابِ دعویٰ انیس بیس کے فرق سے میرے تیار کردہ جواب کا ''کاپی پیسٹ'' ورژن تھا۔

آصف نے اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑے ہو کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس بیان کی جھلکیاں دورانِ سماعت میں میرے سوالات کے جوابات میں آپ کو گاہے بہ گاہے دیکھنے کو ملتی رہیں گی۔

جج کی اجازت سے میں جرح کے لیے آصف والے کٹہرے کے قریب چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

''آصف صاحب! آپ کی شادی کون سے سن میں ہوئی تھی؟''

''اکیاسی میں۔'' اس نے جواب دیا۔''اور مہینا جون کا تھا۔''

''جوابِ دعویٰ اور آپ کے حلفیہ بیان کی روشنی میں بڑے واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ آپ کی بیوی سوری...... آپ کی زوجہ اول مسمات جویریہ لگ بھگ چھ ماہ تک آپ کے ساتھ رہی پھر یہ اپنے میکے چلی گئی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ کیس فائل ہونے سے پہلے وہ کم و بیش ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی یعنی بیاسی کا پورا سال۔ آپ کو میری مؤکلہ کے اس بیان پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''ٹیکنیکلی اعتبار سے ''میکے'' کی ٹرم غلط ہے۔'' ملزم کے بجائے اس کے وکیل نے لقمہ دیا۔''لغت کے مطابق ماں باپ یعنی والدین کا گھر میکا کہلاتا ہے جبکہ اس کیس کی مدعی اپنی بہن کے گھر میں قیام پذیر ہے۔''

''میں آپ کے ''ٹیکنیکلی اعتبار'' اور اس کی وضاحت'' کو سلام پیش کرتا ہوں میرے فاضل دوست!'' میں نے ڈیفنس کونسلر کو آڑے ہاتھوں لیا۔''اس کے ساتھ ہی میں آپ کے علم میں اضافے کی غرض سے یہ عرض بھی کروں گا کہ جن لڑکیوں کے ماں باپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہوں اور ان یتیم بچیوں کا کوئی بھائی بھی نہ ہو اور ان کا شوہر انہیں گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دے تو پھر بہن کا گھر ہی ان کا آخری ٹھکانا، ان کا میکا ہوتا ہے!''

وکیلِ صفائی میرے اس مہلک وار پر تلملا کر رہ گیا مگر کچھ بولا نہیں۔ میں ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آصف صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''جی...... اس نے بیاسی کا پورا سال اپنی بہن عارفہ

کے گھر میں گزارا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور ابھی تک وہیں بیٹھی ہوئی ہے۔''

''وہ اپنی مرضی سے وہاں بیٹھی ہوئی ہے یا آپ نے اسے وہاں بیٹھنے پر مجبور کر رکھا ہے؟''

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''ایک ہی بات نہیں ہے آصف صاحب......!'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے اور آپ کی دو ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز VIRGIN SENIOR CITIZEN SISTERS) کے رویّے سے مجبور ہو کر وہ اپنی بہن کے گھر میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ کیا آپ میری مؤکلہ کے اس دعوے کو جھٹلا سکتے ہیں کہ وہ تا حال آپ کی قانونی اور شرعی بیوی ہے اور آپ اس کے قانونی و شرعی شوہر؟''

''میاں بیوی کا رشتہ ایک ساتھ رہنے سے برقرار رہتا ہے۔'' وہ اپنے تئیں بہت دور دراز کی کوڑی لایا۔ ''جو عورت ایک سال سے زیادہ عرصے سے اپنے شوہر سے دور رہ رہی ہو، اس کا بیوی ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات ہے۔''

''سبحان اللہ...... ماشاء اللہ......'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آصف صاحب! آپ تو اپنی اس اِرریلیٹیوٹی (IR-RELATIVITY) تھیوری آف سوشل رشتہ و پیوند سے سماجیات کی دنیا میں انقلاب برپا کر رہے ہیں۔ از روئے آپ کی تھیوری، جتنی بھی بیویوں کے شوہر رزق روزگار کی غرض سے مڈل ایسٹ، فار ایسٹ، یورپ اور امریکا گئے ہوئے ہیں اور کئی کئی سال تک انہیں گھر آنے کی چھٹی نہیں ملتی ان بے چاریوں کا بیوی ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات ہے......!''

آصف کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ یقیناً وہ میری بات کو سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے ہونقانہ انداز میں بولا۔ ''آپ جو بھی سمجھ لیں......!''

''بات میرے سمجھنے کی نہیں بلکہ آپ کے بتانے کی ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس عدالت کو بتائیں کہ میری مؤکلہ آپ کی بیوی ہے یا نہیں؟''

وہ میرے انداز کی سختی سے قدرے نرم پڑ گیا اور بولا۔ ''جویریہ شرعی لحاظ سے میری بیوی ہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور قانونی اعتبار سے؟''

''جی ...... قانونی اعتبار سے بھی ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن عملاً وہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری مؤکلہ کو قانوناً و شرعاً تو اپنی پہلی بیوی تسلیم کرتے ہیں مگر عملاً اسے بیوی کا مرتبہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ آپ کی منکوحہ ثانی مسمات روبی کو یہ مقام حاصل ہے۔'' میں نے چٹکی لینے والے انداز میں کہا۔

''جی......جی ہاں......'' وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''آصف صاحب! آپ کے وکیل کی جانب سے دائر کیے گئے جواب دعویٰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ میری مؤکلہ یعنی آپ کی پہلی بیوی جویریہ کو آپ نے گھر سے نہیں نکالا بلکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس کم از کم ایک سال کے عرصے میں آپ نے اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی؟ اگر نہیں......تو کیوں نہیں؟''

''وہ خود گئی تھی، اسے خود ہی واپس آنا چاہیے تھا۔'' وہ خاصی ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''یہ مرد کی شان کے خلاف ہے کہ وہ عورت کی منت خوشامد میں لگا رہے۔''

''تو آپ کی نظر میں یہ مرد کی شان ہے کہ اس کی عورت اسے چھوڑ کر چلی جائے......'' میں نے اس کے احساس میں اپنے الفاظ کا نشتر چبھوتے ہوئے کہا۔ ''اس سے اس کی مردانگی کو کیس توپوں کی سلامی ملتی ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آصف صاحب! سیانے کہہ گئے ہیں کہ سواری اسی کی جس کے نیچے ہو، دولت اسی کی جس کی جیب میں ہو اور عورت اسی کی جس کے پہلو میں ہو...... آپ کس برتے پر میری مؤکلہ کا شوہر ہونے کے دعوے دار ہیں؟''

''یہ ضروری تو نہیں کہ میں کسی سیانے کے قول سے اتفاق کروں......!'' وہ جاہلانہ انداز میں بولا۔

''بالکل ضروری نہیں اور میں اس اتفاق کے لیے آپ سے اصرار بھی نہیں کروں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ اس کیس کے فائل ہونے سے کچھ عرصہ قبل میری مؤکلہ اور آپ کی پہلی بیوی جویریہ کی جانب سے واجبات کی ادائیگی کے ذیل میں آپ کو ایک نوٹس بھیجا گیا تھا جس کا آپ نے جواب دیا تھا......!''

میں جب بھی جویریہ کے لیے ''پہلی بیوی'' کے الفاظ استعمال کرتا تھا تو اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا اور وہ ہراساں فراری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ اب کی بار نوٹس کے ''جواب'' کے ذکر نے سونے پہ سہاگا کا کام کیا تھا۔ اس نے کینہ توز انداز میں مجھے گھورا اور برہمی سے بولا۔

”جی...... بڑی اچھی طرح یاد ہے وکیل صاحب......!“

میں نے مذکورہ جوابِ نوٹس، عرضی دعوے کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔ میں نے یہ جواب موجودہ کیس کے تمام زاویوں اور تمام اضلاع کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کیا تھا جسے استعمال کرنے کا موقع اب آیا تھا۔ زاویے اور اضلاع جیومیٹری کی معروف اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذکر سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں!

”آصف صاحب!“ میں نے زنگ آلود کند چھری سے اس کے پوسٹ مارٹم کا آغاز کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”آپ نے میرے نوٹس کے جواب میں لکھا تھا کہ آپ کی بیوی جویریہ اس لائق نہیں کہ بیوی کی حیثیت سے آپ اسے اپنے گھر میں رکھیں اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ میری مؤکلہ سفلیات کی ماہر ہے۔ اس نے آپ کی ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز کے رشتوں پر بندش لگا دی ہے...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا آصف صاحب؟“

”آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ کسی دانشور کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں۔ لگتا ہے، آپ کا بھی ایسے معاملات سے واسطہ نہیں پڑا......!“

”آپ کے دم قدم سے واسطہ پڑ گیا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میری ریسرچ کے مطابق، آپ کی بڑی بہن خیر النساء انیس سو بیالیس میں اور ان سے چھوٹی بہن قمر النساء انیس سو چوالیس میں پیدا ہوئی تھیں۔ دونوں کی عمروں میں دو سال کا فرق ہے اور اس وقت قمر النساء اڑتیس جبکہ خیر النساء چالیس سال کی ہیں۔“

”آپ کی ریسرچ بالکل درست ہے۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

”اب آپ لگے ہاتھوں میری اس ریسرچ کی تصدیق کر دیں کہ آپ کی پہلی بیوی یعنی میری مؤکلہ جویریہ جون اکیاسی میں بیاہ کر آپ کے گھر آئی تھیں؟“

”اس میں ریسرچ والی کون سی بات ہے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہ تاریخ تو نکاح نامے میں درج ہے۔“

”ریسرچ والی بات بال سے زیادہ باریک ہے آصف صاحب...... اسی لیے آپ کی ہاتھی سے زیادہ موٹی عقل کو دکھائی نہیں دے رہی۔“ میں نے اس کے طنز کے جواب میں ترشی سے کہا۔ ”یہ بتائیں، کیا آپ شادی سے پہلے میری مؤکلہ کو جانتے تھے؟“

”نہیں!“ وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

”میری مؤکلہ آپ کو یا آپ کی بہنوں کو پہلے سے جانتی تھی؟“

”قطعی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”آپ اس امر کی بھی تصدیق کرتے ہیں ناکہ میری مؤکلہ صرف چھ ماہ تک آپ کے گھر میں رہی ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔ ”جون اکیاسی سے جنوری بیاسی تک......!“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آصف صاحب! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ جون اکیاسی، یعنی آپ کی شادی، مطلب میری مؤکلہ جویریہ کی آپ کے گھر آمد سے قبل آپ کی ہمشیران کبیر قمر النساء، اینڈ خیر النساء کے کتنے رشتے آئے تھے؟“

”آپ کیا میری بہنوں کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں......؟“ وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے آصف صاحب! مجھے آپ کی ہمشیران سے کیا لینا دینا۔ میں تو اپنی مؤکلہ کی سفلی قوت کو ناپنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو بتانا پڑے گا کہ میری مؤکلہ اور اس کیس کی مدعی مسماۃ جویریہ کی طرف سے کی جانے والی مبینہ نام نہاد بندش سے پہلے آپ کی آپاؤں یا باجیوں کے کتنے رشتے آئے تھے؟“

”رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔“ وہ احمقانہ انداز میں بولا۔ ”خدائی کاموں میں کسی کا کیا عمل دخل......!“

وہ اپنی بے وقوفی میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”شکریہ آصف صاحب!“

مدعا علیہ کی اس حماقت پر وکیلِ صفائی اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے آصف کو خود سے یہ پوچھتے پایا۔

”شکریہ کس بات کا وکیل صاحب؟“

”آصف صاحب! آپ نے نوٹس کے جواب میں لکھا تھا......“ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ترش لہجے میں استفسار کیا۔ ”کہ آپ کی پہلی بیوی یعنی میری مؤکلہ جویریہ بانجھ ہے۔ آپ نے جویریہ کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے تھے...... ایسی عورت کا میں کیا اچار ڈالوں گا جو میری نسل کو آگے نہ چلا سکے...... کیا آپ نے بانجھ پن کے حوالے سے جویریہ کا کوئی میڈیکل چیک اپ کرایا تھا؟ اگر اس سلسلے میں ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تھے تو کیا

آپ ان کی رپورٹس وغیرہ پیش کر سکتے ہیں؟''

''ایسا کوئی چیک اپ نہیں ہوا تھا.....'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''تو آپ نے یہ جاہلانہ فتویٰ ٹکالوجی کی روشنی میں جاری کیا تھا؟''

''انسان کا تجربہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''سبحان اللہ!'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''معزز عدالت اس گراں قدر انسانی تجربے سے بہرہ مند ہونے کی مشتاق ہے آصف صاحب.....جس کے بل بوتے پر آپ نے میری مؤکلہ یعنی اپنی زوجۂ اول کو بانجھ قرار دے دیا تھا؟''

''وہ چھ ماہ تک میرے ساتھ رہی مگر امید سے نہ ہو سکی۔'' وہ پے در پے حماقت کی منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ ''اس کے بانجھ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''ماشاء اللہ..... آپ نے خاصا ٹھوس ثبوت فراہم کیا ہے۔'' میں نے گھور کر آصف کی طرف دیکھا پھر ''آپ'' سے تم پر آتے ہوئے کہا۔ ''میں اس فارمولے کو آپ کی فیملی پر آزما رہا ہوں۔ اب چیخنا نہیں.....'' لحاتی توقف کر کے میں نے فاتحانہ نظر سے وکیلِ مخالف کو دیکھا پھر آصف کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''تمہارے والدین کی شادی انیس سو چالیس میں ہوئی۔ تمہارے وضع کردہ تجرباتی فارمولے کی رو سے تمہاری والدہ دو سال تک بانجھ تھیں پھر ایک معجزے کے تحت انیس سو بیالیس میں خیر النساء پیدا ہوئیں تو تمہاری والدہ کا بانجھ پن ختم ہو گیا لیکن بدقسمتی سے ایک بار پھر وہ دو سال کے لیے بانجھ ہو گئیں کیونکہ قمر النساء، خیر النساء کے دو سال بعد انیس سو چوالیس میں پیدا ہوئی تھیں۔ بانجھ پن اور زرخیزی کا یہ سلسلہ یہیں پر رکا نہیں بلکہ اب کی بار تمہاری والدہ ماجدہ کو بانجھ پن کا آٹھ سال کا دورہ پڑا پھر انیس سو باون میں تم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب تم تیس سال کے ہو چکے ہو۔ تمہاری والدہ صاحبہ تمہارے تجرباتی فارمولے کے مطابق، اپنے دامن پر سے بانجھ پن کا داغ دھوتے دھوتے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میری مؤکلہ بے چاری تو کل کی بچی ہے۔ تم اور تمہاری علامہ بہنیں اس معصوم کا کیا حشر کرنے کا ارادہ رکھتے ہو.....؟''

اس نامعقول انسان کے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ خجالت آمیز انداز میں بغلیں جھانکنے لگا تو وکیلِ صفائی حقِ فیس ادا کرتے ہوئے اس کی مدد کو لپکا۔

''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست غیر ضروری بحث میں الجھ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے تاخیری حربوں سے روکا جائے۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے ڈیفنس کونسلر کی درخواست کو اہمیت دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ اس بانجھ پن کے ذکر کو اختتام سے ہم کنار کر سکتے ہیں؟''

''یور آنر! معزز عدالت کا حکم سر آنکھوں پر۔'' میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس تذکرے سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مدعا علیہ ایک توہم پرست شخص ہے اور اس نے اپنے جاہلانہ خیالات کو بنیاد بنا کر میری مؤکلہ کو بانجھ قرار دے کر اپنے گھر سے باہر نکال رکھا ہے جو کہ سراسر ظلم اور جہالت ہے۔ اگر میری مؤکلہ واقعتاً سفلی علم کی ماہر ہوتی اور وہ بندش کے ذریعے کسی کا رشتہ آنے سے روکنے کی قدرت رکھتی تو وہ اپنے کسی زبردست سفلی عمل سے مدعا علیہ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکی ہوتی اور جہاں تک بانجھ پن کا تعلق ہے تو اگر یہ میری مؤکلہ کے ہاتھ میں ہوتا تو خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ منہ مانگی تنخواہ پر لاکھوں روپے ادا کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیتا اور کہتا..... بی بی! ایک جگہ آرام سے بیٹھ کر اپنا سفلی علم استعمال کرو اور ملک بھر کی بیویوں کو اپنی بندش سے بانجھ بنا دو......!''

جج نے میری وضاحت کو ستائشی نظر سے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں دوبارہ آصف کی جانب متوجہ ہو گیا اور سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''تمہارا یہ دعویٰ ہے اور تم نے میرے نوٹس کے جواب میں بھی لکھا تھا کہ تم نے میری مؤکلہ یعنی اپنی پہلی بیوی مسمات جویریہ کو گھر سے نہیں نکالا بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے گئی تھی اور جاتے ہوئے اپنا سارا زیور بھی ساتھ لے گئی تھی۔ کیا تم ابھی تک اس بیان پر قائم ہو؟''

''جی، یہی حقیقت ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔'' وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے اپنی فائل میں سے جویریہ کی فراہم کردہ طلائی زیورات کی رسیدیں نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! یہ زیور سن اکیاسی ماہ مارچ میں میری مؤکلہ کے والد نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے خریدا تھا۔ اس وقت اس زیور کی قیمت لگ بھگ تیس ہزار روپے تھی۔ جب مدعی کو مدعا علیہ نے جنوری بیاسی میں اپنے گھر سے نکال باہر کیا تو یہ زیورات مدعا علیہ کے گھر پر ہی رہ گئے تھے جنہیں

مدعا علیہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ماہ اگست بیاسی میں اسٹار جیولرز کو فروخت کر دیا تھا۔''

''آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے اسٹار جیولرز کو وہ زیور بیچ دیا ہے؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آصف نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

''تمہارا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدم بہ قدم اپنی منزل کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

''ایک دم جھوٹ......!'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اور وکیلوں کے لیے جھوٹ بولنا کون سا مشکل کام ہے۔''

''مسٹر آصف! آپ غیر متعلقہ تبصروں سے گریز کریں۔'' جج نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے، اس کا ٹو دی پوائنٹ جواب دیں۔''

''او کے سر!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں جس کی بنا پر آپ ثابت کرسکیں کہ میں نے وہ زیورات اسٹار جیولرز کو فروخت کیے تھے۔'' آصف نے میری جانب دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔

میں نے اس کی شہ رگ کو اپنے الفاظ کا تختۂ مشق بناتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر تم ہی کوئی ایسا ثبوت فراہم کردو کہ وہ زیورات تم نے اسٹار جیولرز کو نہیں بیچے تھے......!''

''میں آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کلیم عثمانی صاحب کو بہ طور گواہ عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔'' وہ حقارت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کلیم عثمانی صاحب کون ذاتِ شریف ہیں؟'' جج نے چونک کر آصف سے استفسار کیا۔

''سر! یہ زیب جیولرز کے مالک ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کلیم عثمانی کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟'' جج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ انہیں بہ طور گواہ کیوں پیش کرنا چاہتے ہیں؟''

''کلیم عثمانی صاحب کی شہادت سے وکیلِ استغاثہ کا یہ دعویٰ جھوٹا ثابت ہوجائے گا کہ میں نے وہ زیورات اسٹار جیولرز کو فروخت کیے ہیں۔'' آصف نے جواب دیا۔

''تو دراصل تم معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم نے میری مؤکلہ اور اپنی زوجۂ اول مسمات جویریہ کے زیورات زیب جیولرز کو فروخت کیے تھے؟'' میں نے اسے سوچنے کی مہلت دیے بغیر جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''اب آئی نا بات آپ کی سمجھ میں......!'' وہ مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا جھوٹ میں نے بھری عدالت میں کھول دیا ہے۔''

''مجھے جھوٹا ثابت کرنے کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یور آنر! پوائنٹ از ٹو بی نوٹیڈ...... مدعا علیہ نے معزز عدالت کے روبرو بڑے فخر سے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اس نے گزشتہ سال کے ماہ اگست میں میری مؤکلہ کا زیور مالیت تیس ہزار روپے زیب جیولرز کے مالک کلیم عثمانی کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ وہی طلائی زیور ہے جس کے بارے میں مدعا علیہ کا دعویٰ ہے کہ میری مؤکلہ اس کے گھر سے جاتے وقت یہ زیور اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''

''تم کیا کہتے ہو؟'' جج نے تصدیق طلب نظر سے آصف کو گھورا۔ ''مذکورہ زیور تم نے فروخت کیا تھا یا مدعی اپنے ساتھ لے گئی تھی......!''

''وہ سر...... مجھ سے غلطی...... ہوگئی......'' وہ جج کے استفسار پر بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''مجھے معاف کردیں سر......''

جج غصے سے بولا۔ ''کس بات کی غلطی...... زیورات فروخت کرنے کی یا غلط بیانی کرنے کی؟''

وہ خجالت بھرے انداز میں بولا۔ ''دونوں کی سر۔''

جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالنے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔

''بیگ صاحب! آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ میری اب تک کی جرح نے آصف کا پتّا پانی کر دیا تھا۔ وہ اندر سے خزاں رسیدہ پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ بس، اب مجھے اس کی دروغ گوئی اور ظلم و زیادتی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا تھی۔

''بس، ایک اہم پہلو سے چند سوال جناب عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا پھر آصف کو اپنے سوالات کے نشانے پر رکھ لیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم نیو چالی کے علاقے میں کسی امپورٹر کے پاس ملازم ہو۔'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ''وہاں سے تمہیں ایک ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے؟''

''ہاں۔ یہ درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ تم چھوٹی موٹی بروکری بھی کرتے

رہتے ہو جس سے ماہانہ کم و بیش تنخواہ کے برابر تمہاری آمدنی ہو جاتی ہے؟''

''جی...... ایسا ہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''اس کے علاوہ تمہاری کہیں سے کوئی اور آمدنی ہے؟''

''بالکل نہیں!'' وہ پوری قطعیت کے ساتھ بولا۔

''کیا تمہارا اکاؤنٹ اس بینک میں ہے؟''

سوال کے اختتام پر میں نے اس کے بینک اور برانچ کا نام دہرایا۔

اس نے سر کو اثبات میں حرکت دینے پر اکتفا کیا۔

''تمہاری باجی قمر النساء بھی تو اسی بینک میں جاب کرتی ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر چبھتے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔ ''لگتا ہے، آپ نے ہماری فیملی پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے!''

''کوئی ایسی ویسی ریسرچ......'' میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''یوں سمجھیں کہ یہ کیس پکڑنے کے بعد میں نے تمہاری فیملی پر پی ایچ ڈی کر لیا ہے اور میری مؤکلہ بھی تا حال تمہاری فیملی ہی کا ایک فرد ہے۔''

میں نے ذو معنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''تو پھر......؟''

''تو پھر یہ کہ......'' میں نے انتہائی سادگی سے کہا۔ ''میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ شادی کے چند روز بعد اس نے آپ کو بیس ہزار روپے دیے تھے۔ یہ وہ رقم ہے جو میری مؤکلہ کے والد مرحوم نے جہیز کی خریداری کی مد میں دی تھی کیونکہ آپ کی دونوں ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز کا یہی مطالبہ تھا۔ آپ نے بیس ہزار روپے کی یہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے آپ کی شادی والے مہینے کی بینک اسٹیٹ منٹ حاصل کر لی ہے۔ اگر آپ اس رقم سے انکار کریں گے تو بری طرح پھنس جائیں گے کیونکہ میں یہ اسٹیٹ منٹ جج صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے ...... جو بھی بولو، بہت سوچ سمجھ کر بولنا......!''

پھر میں نے مذکورہ بینک اسٹیٹ منٹ اپنی فائل میں سے نکال کر جج کی میز پر سجا دی۔ آصف نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا...... ہاں، وہ بیس ہزار روپے میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کرائے تھے۔''

''یہ بیس ہزار روپے میری مؤکلہ کے والد صاحب نے فرنیچر وغیرہ کی خریداری کے لیے دیے تھے۔'' میں نے اپنی جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تم نے مذکورہ رقم سے کون کون سی چیز خریدی تھی۔ عدالت ان اشیا کی خریداری کی رسیدیں دیکھنے سے بھی گہری دلچسپی رکھتی ہے......!''

''یہ بہت پرانی بات ہے۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''اتنے عرصے تک کون رسیدیں سنبھال کر رکھتا ہے......!''

وہ غیر محسوس طور پر میرے پھیلائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

''رسیدوں کو گولی مارو۔ تم صرف ان چیزوں کے نام ہی بتا دو۔ تمہارے جواب سے عدالت کی تسلی ہو جائے گی۔''

اس دوران میں غالباً اسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنی غلطی کو نبھاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''جب میری بہنوں نے جویریہ کے باپ سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے گھر میں استعمال کی ہر ضروری چیز موجود ہے تو پھر کیا پاگل کتے نے مجھے کاٹا تھا کہ میں بیس ہزار کا فرنیچر اور دیگر سامان لا کر گھر میں بھر دیتا......؟''

''یہ تو اس پاگل کتے سے پوچھنا پڑے گا کہ اس نے تمہیں کاٹا تھا یا نہیں، بہ شرط یہ کہ وہ ابھی تک بہ قید حیات ہو۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری طیش بھری وضاحت سے میں یہی سمجھا ہوں کہ اپنی دو عدد ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز کی خوشنودی کی خاطر تم نے بیس ہزار کی اس رقم سے کسی قسم کی کوئی خریداری نہیں کی تھی!''

میں نے اس کہانی میں آصف کی بہنوں قمر النساء اور خیر النساء کے لیے متعدد بار ''ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ خواتین اپنی عمر عزیز کی ساٹھ سیڑھیاں پھلانگ چکی تھیں یا یہ کہ مجھے ان سے کوئی ذاتی بیر تھا...... قطعاً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان دونوں بہنوں کے جو لچھن میرے علم میں آئے تھے، ان کی روشنی اور فیوض و برکات کے طفیل ایک دن انہوں نے ورجن سینئر سٹیزن بن جانا تھا۔ جس طرح ہم عید کی چھٹیاں پڑتے ہی اپنے... کولیگز کو پیشگی عید مبارک کہہ دیتے ہیں، اسی طور میں نے قمر النساء اینڈ خیر النساء کو ایڈوانس میں ''ورجن سینئر سٹیزن سسٹرز'' کے اعزاز سے نواز کر کسی حد تک ''قتل الموذی قبل الایذا'' کا تقاضا پورا کر دیا تھا۔

آصف نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''جی بالکل ایسا ہی ہے۔''

''کیا ابھی تک وہ بیس ہزار روپے تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ہیں؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر تم نے اس رقم کا کیا کیا؟''

''میں نے وہ بیس ہزار ایک کاروبار میں انویسٹ کیے تھے۔'' اس نے میری توقع اور معلومات کے مطابق جواب دیا۔ ''اس کاروبار میں نقصان ہوگیا اور...... میری رقم ڈوب گئی۔''

''اوہ...... بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے اس مالی نقصان کے بارے میں میری مؤکلہ کو بتایا تھا؟''

''ن...... نہیں!'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

قبل اس کے کہ آصف میرے ''کیوں'' کا جواب دیتا، عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ میں نے جج سے درخواست کی۔

''جناب عالی! چونکہ میری جرح ابھی مکمل نہیں ہوئی اور عدالتی کارروائی بھی اپنے عروج پر ہے اس لیے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ کوئی نزدیکی تاریخ دے دی جائے۔''

جج نے میری درخواست کو جائز اور معقول جانتے ہوئے دو روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

اگلی پیشی سے پہلے جویریہ مجھ سے ملنے میرے آفس آئی۔ ٹن ٹنا باجا یعنی آفتاب شگفتہ بھی گزشتہ سے پیوستہ کی طرح اس کے ہمراہ تھا۔ جویریہ نے مجھے بتایا کہ آصف نے کسی تھرڈ پارٹی کے ذریعے معاملات کو ختم کرانے کا پیغام بھیجا ہے۔

''معاملات کو ختم کرانے یا سیٹل کرانے کا پیغام؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی سمجھ لیں۔'' اس نے کہا۔ ''تھرڈ پارٹی نے کہا ہے کہ اگر میں یہ کیس واپس لے لوں تو وہ مجھے تیس سے چالیس ہزار تک دینے کو تیار ہے۔''

''پھر آپ نے تھرڈ پارٹی کو کیا جواب دیا ہے؟''

''میں نے کہا ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔''

''یہ آپ نے بڑا مناسب جواب دیا ہے۔'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''آصف بڑی مکاری سے کام لے رہا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آچکا ہے۔ اگر فیصلہ عدالت سے ہوتا ہے تو اسے ترانوے ہزار کے علاوہ عدالتی ہرجہ وخرچہ بھی ادا کرنا پڑے گا اور وہ تیس چالیس ہزار میں جان چھڑانے کی سوچ رہا ہے۔ وہ تھرڈ، فورتھ یا ففتھ پارٹی کے ذریعے کوئی بھی پیغام بھجوائے، آپ نے اس کی باتوں میں نہیں آنا۔ یہ کیس وہ مکمل طور پر ہار چکا ہے۔ آئندہ پیشی پر ہمارے حق میں فیصلہ ہوجائے گا۔''

''ان شاء اللہ......!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کردیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ملزموں والے کٹہرے میں آصف کھڑا تھا۔ آج وہ خاصا نروس دکھائی دے رہا تھا۔ پچھلی پیشی پر میں نے اپنے سوالات کے کاسٹک سوڈے سے اس کے مزاج کی خوب دھلائی کی تھی۔ استری کرنا باقی رہ گیا تھا۔ میں جرح کی تپتی ہوئی استری لے کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی پریسنگ شروع کردی۔

''تم نے میری مؤکلہ کو اپنے کاروباری نقصان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''میں نے جویریہ سے یہ بات اس خیال سے چھپائی تھی کہ اسے دکھ ہوگا۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''ویری گڈ...... گویا تمہیں انسانی جذبات کا اتنا زیادہ خیال ہے۔'' میں نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ سرمایہ کاری تم نے کس مہینے میں کی تھی؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''جولائی میں۔''

''جولائی اکیاسی میں؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''یعنی تمہاری شادی کے ایک ماہ بعد؟''

''جی......'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''یہ وہی بیس ہزار روپے تھے نا جو میری مؤکلہ نے شادی کے چند روز بعد تمہیں دیے تھے اور تم نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈپازٹ کرادیے تھے؟''

''جی...... بالکل وہی تھے۔''

میں نے اپنی فائل کے اندر سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں نے پہلے مدعا علیہ کی جون اکیاسی کی بینک اسٹیٹ منٹ آپ کی خدمت میں پیش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدعا علیہ نے بیس ہزار روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے۔ اب میں جولائی اکیاسی یا اپریل بیاسی تک کے بینک اسٹیٹ منٹ آپ کی نذر کررہا ہوں جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ مذکورہ بیس ہزار روپے جون اکیاسی سے اپریل

بیاسی تک مدعا علیہ کے اکاؤنٹ میں موجود رہے تھے مگر اپریل کی فلاح تاریخ کو یہ رقم بہ ذریعہ چیک نمبر...... نکلوائی گئی جبکہ مدعا علیہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے مذکورہ رقم جولائی اکیاسی میں ڈرا کر کے کسی کاروبار میں لگائی تھی اور وہ کاروبار بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مدعا علیہ کے بیس ہزار بھی ڈوب گئے تھے۔

گویا مدعا علیہ نے ایک بار پھر معزز عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔'' پھر میں نے روئے سخن آصف کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟''

''ہوسکتا ہے...... یہ بینک اسٹیٹ منٹ ہی...... غلط ہوں۔'' اس نے فرار کی راہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ کے لیے میں مان لیتا ہوں کہ یہ بینک اسٹیٹ منٹ غلط ہیں اور تم درست ہو اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ان اسٹیٹ منٹ کے کورنگ پیج پر ذمے دار بینک آفیسر کے دستخط بھی موجود ہیں۔ خیر...... تم ہی سچے، باقی ساری دنیا جھوٹی۔'' میں نے لمحہ بھر کے لیے رک کر حاضرینِ عدالت کی طرف دیکھا پھر دوبارہ آصف کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اب تم معزز عدالت کو یہ بتاؤ کہ اپریل بیاسی مورخہ ...... کو تم نے نیو کراچی میں جو پلاٹ خریدا تھا، اس کی ڈاؤن پیمنٹ مبلغ بیس ہزار روپے تم نے کہاں سے کی تھی؟ اس پیمنٹ کی رسید پر جو تاریخ درج ہے، وہ چیک ڈرا کرنے کے دو دن بعد کی ہے۔ اگر بینک اسٹیٹ منٹ غلط ہیں تو پھر تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ بیس ہزار روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے تھے۔ اب یہ نہیں کہہ دینا کہ تم نے نیو کراچی میں کوئی پلاٹ نہیں خریدا۔'' میں نے اپنی فائل کو تھپتھپاتے ہوئے اضافہ کیا۔ اس ثبوت کے حوالے سے میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ آفتاب شگفتہ کی ''محنت'' کاغذی صورت میں واقعتاً میری فائل میں موجود تھی۔ اگر آصف کوئی تین پانچ کرتا تو میں مذکورہ کاغذات جج کی خدمت میں پیش کردیتا۔ ''اس خریداری کا ٹھوس ثبوت ہے میرے پاس......''

''انسان کسی سے قرض ادھار بھی تو لے سکتا ہے۔'' اس نے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی۔

''ہاں...... انسان ایسا کرسکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس صورت میں انسان کو اس شخص کا نام اچھی طرح یاد ہوتا ہے جس سے اس نے ادھار اٹھایا ہو۔ تم معزز عدالت کو یہ بتانے کے پابند ہو کہ وہ بیس ہزار روپے تم نے کس سے قرض لیے تھے......؟''

''میں اس شخص کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' جج نے برہمی سے کہا۔ ''کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے...... تم اس شخص کا نام بتاؤ۔''

''سر...... اس وقت...... مجھے وہ نام...... یاد نہیں آرہا۔ ...... وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔'' وکیل صاحب تو...... خوامخواہ بال کی کھال نکال...... رہے ہیں......''

''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ ضرورت پڑنے پر تو میں خوامخواہ کھال کے بال بھی نکال سکتا ہوں۔'' میں نے سفاکی سے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دلائل کا سلسلہ شروع کردیا۔

''جناب عالی! مدعا علیہ دروغ گو درجۂ اول ہے۔ اس کے متعدد جھوٹ معزز عدالت کے ریکارڈ پر آچکے ہیں لہٰذا کسی بھی صورت اس کی کسی بھی بات کو لائقِ اعتبار نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ دروغ گو ہونے کے ساتھ ہی یہ دھوکے باز بھی ہے۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر وکیلِ صفائی اور مدعا علیہ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہوگیا اور اپنے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اس میں دھوکا نہیں کرنا چاہیے۔ دھوکا ازدواجی زندگی کی خوشگواری کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے دھوکے اور جھوٹ کو قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے...... اور مدعا علیہ نے قدم قدم پر اپنی بیوی کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری مؤکلہ کو اس بات کا دکھ نہیں کہ شوہر اس کا تیس ہزار کا زیور بیچ کر کھا گیا یا وہ اس کے دیے ہوئے نقد بیس ہزار گھول کر پی گیا...... میری مؤکلہ کو اصل غم اس بات کا ہے کہ اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال کر ایک مالدار بوڑھی عورت سے شادی کرلی جس کا نام روبی ہے اور جو ایک سانولی، موٹے نقوش کی مالک پینتالیس سالہ خاتون ہے۔ پستہ قامت اور وزن صرف سو کلو گرام۔ یہ شادی حال ہی میں ماہ جنوری میں انجام پائی ہے۔ روبی صاحبہ کے ساتھ ایک ہی خوبی جڑی ہوئی ہے کہ وہ ایک کروڑ پتی صنعت کار کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتی وارث ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ مدعا علیہ نے اپنی پہلی شادی کو چھپا کر خود کو کنوارا ظاہر کرکے روبی سے شادی کی ہے جبکہ......''

میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا پھر مسلم عائلی قوانین کی کتاب کھولتے ہوئے کہا۔'' جناب عالی! عائلی

قوانین کی دفعہ مذکور میں لکھا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی پہلے سے کی ہوئی شادی کی موجودگی میں ماسوائے ثالثی کونسل کی پیشگی تحریری اجازت کے، دوسری شادی نہیں کرے گا۔ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کی رضامندی ضروری ہے......'' پھر میں نے جج کی توجہ اس دفعہ کی جانب مبذول کرائی جس میں مذکورہ عائلی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے مرد کے لیے سزا کا ذکر تھا۔

''جنابِ عالی! عائلی قوانین کی کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جو بھی شخص ثالثی کونسل کی تحریری اجازت کے بغیر دوسری شادی کرے گا، وہ نمبر ایک...... حقِ مہر کی رقم فوری طور پر پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کو ادا کرے گا۔ چاہے حقِ مہر موجل ہو یا معجّل۔ اگر یہ رقم شوہر خود ادا نہیں کرے گا تو اس صورت میں یہ رقم قانوناً بہ طور مال گزاری وصول کی جائے گی۔ نمبر دو...... پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کی شکایت پر، سزا یابی کی صورت میں ملزم شوہر کو قیدِ محض ہوسکتی ہے جس کی مدت ایک سال تک ہوسکتی ہے یا جرمانہ ہوگا جو پانچ ہزار تک ہوسکتا ہے یا ملزم بہ یک وقت دونوں سزاؤں کا مستوجب بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر رک کر وکیلِ صفائی اور مدعا علیہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔

دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ گویا ان کے تعزیے ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ میں نے دوبارہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری مؤکلہ کو حقِ مہر کے پچیس ہزار، نقدلی ہوئی رقم بیس ہزار، زیورات کی فروخت سے حاصل ہونے والے تیس ہزار اور کم از کم ایک سال کا نان ونفقہ اٹھارہ ہزار، بہ حساب پندرہ سو روپے ماہوار...... کل ملا کر ترانوے ہزار روپے فی الفور دلوائے جائیں تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوسکیں...... دیٹس آل یور آنر۔''

جج نے غصیلی نظر سے آصف کو دیکھا اور حکم دیا۔ ''تم عرصہ سات یوم کے اندر اپنی منکوحہ اول کے تمام واجبات مبلغ ترانوے ہزار روپے ادا کردو ورنہ تمہارے خلاف سخت نوعیت کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور تم عدالت کے کمرے سے سیدھے جیل جاؤ گے۔''

اس کے بعد جج نے ایک ہفتے کی تاریخ دے دی۔

☆☆☆

اگلے روز جویریہ میرے آفس میں بیٹھی تھی۔ اس روز حسنِ اتفاق سے آفتاب شگفتہ اس کے ہمراہ نہیں آیا تھا۔

جویریہ کو میں نے پہلی مرتبہ اتنا خوش دیکھا تھا۔ میں نے اس کی مسرت کو دوآتشہ کرتے ہوئے کہا۔

''آئندہ پیشی پر تمام واجبات تو آپ کو مل جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''میں سمجھی نہیں......'' وہ پلکیں جھپکا کر بولی۔

''مطلب یہ کہ واجبات کی وصولی کے بعد آپ کو آصف کی منکوحہ کی حیثیت سے زندگی گزارنا ہے یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''بیگ صاحب! اگر مجھے اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتی تو پھر یہ سارا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ جانتے ہیں، مجھے دولت کا لالچ نہیں ہے۔ جب تک آصف کا مکروہ چہرہ مجھ پر آشکار نہیں ہوا تھا، میں ہر ظلم زیادتی سہنے کے باوجود بھی واپس اپنی سسرال جانے کی بات کررہی تھی مگر اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آصف نے مجھے مسترد کرکے اس موٹی بھینس سے شادی کی ہے تو اس کے ساتھ ہی خوش رہے۔ آپ اگلی پیشی پر خلع کا کیس دائر کردیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے۔''

اسی لمحے میری سیکریٹری نے انٹرکام پر بتایا۔ ''سر! کوئی روبی صمد صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جویریہ کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''آپ کی سوتن روبی تشریف لائی ہیں۔''

''وہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔

روبی کی آمد پر مجھے بھی قدرے حیرت ہوئی تھی لیکن میں نے اپنے اندرونی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جویریہ کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا لینے آئی ہے۔ اسے اندر آنے دیں، اسی سے پوچھتے ہیں۔''

''میں چلتی ہوں۔'' جویریہ اپنا پرس سنبھالتے ہوئے بولی۔

''بیٹھی رہیں!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آج تک آپ نے روبی کو اور روبی نے آپ کو نہیں دیکھا لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے سامنے ہی اس سے بات کروں گا۔''

اگلے ہی لمحے روبی میرے چیمبر میں داخل ہوئی پھر وہ جویریہ کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی اور معذرت خواہانہ انداز

میں بولی۔ ''وکیل صاحب! آپ بزی ہیں۔ شاید میں غلط وقت پر آ گئی ہوں۔''

''اب آ ہی گئی ہیں تو تشریف رکھیں۔'' میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ ''یہ میری ایک کولیگ ہیں۔ ان کی موجودی میں بات ہو سکتی ہے۔ آپ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' پھر میں نے جویریہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ میری عزیزہ بھی ہیں اس لیے آپ اطمینان رکھیں۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وکیل صاحب! آپ نے عدالتی کارروائی کے دوران میں میرا تعارف کراتے ہوئے جج کے سامنے میری شخصیت اور خال وخد کا جو شاندار نقشہ کھینچا تھا، اس کے بعد تو مجھے ہرگز آپ کے آفس کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ آپ نے میری عزت افزائی کرتے ہوئے کسی دروغ گوئی یا مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا اس لیے میں آپ سے ذرا بھی خفا نہیں ہوں چنانچہ اپنے کام کے لیے میں سیدھی آپ ہی کے پاس آئی ہوں۔ آپ ایک قابل اور سچے وکیل ہیں۔''

اس دوران میں روبی نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر جویریہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جس سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی کہ روبی، جویریہ کی صورت آشنا نہیں تھی۔ میں نے روبی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو آپ کے شوہر کے کیس میں وکیلِ استغاثہ ہوں یعنی...... آپ لوگوں کا مخالف وکیل!''

''آپ جس لالچی شخص کی وجہ سے اس کیس میں وکیلِ مخالف ہیں، میں نے اس بدذات کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''اب آپ اسے میری زندگی سے دفع کرنے کے لیے کوئی خطرناک دفعہ لگا کر میری جانب سے خلع کا کیس دائر کر دیں۔ میں اسی مقصد سے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

میں نے اور جویریہ نے یک بہ یک بے یقینی سے روبی کی طرف دیکھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس ہنگامی انقلابی کارروائی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟''

''ڈیڈی کو جب صورتِ حال کا علم ہوا تو ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگی۔ ''میں اس عمر میں ڈیڈی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ آصف نے اپنی پہلی بیوی کو سنگین دھوکا دیا ہے اور مجھ سے استوار ہونے والے رشتے کی عمارت بھی ایک جھوٹ پر ہی رکھی ہے۔ جو شخص ازدواجی زندگی کا آغاز ہی دروغ گوئی سے کرے، آنے والے مستقبل میں اس سے بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی لہٰذا میں نے اور ڈیڈی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آصف جیسے کم ظرف اور لالچی شخص سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ میں ڈیڈی کی رضامندی ہی سے خلع کا کیس فائل کرانے آپ کے پاس آئی ہوں لیکن آپ فکر نہ کریں، میں آپ کی مؤکلہ کا نقصان نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیسا نقصان؟'' میں نے سوالیہ نظر سے روبی کی طرف دیکھا۔ ''میں تو پہلے ہی جویریہ کی طرف سے خلع کا کیس دائر کرنے کا بندوبست کر چکا ہوں۔ وہ بھی آصف کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' وہ اپنے بیش قیمت پیور لیدر بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اس کمینے کی یہی سزا ہے کہ در در کی ٹھوکریں کھاتا رہے اور کوئی اسے منہ نہ لگائے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے سانس ہموار کی پھر اپنے بیگ کو کھول کر اس کے اندر سے ایک چیک بک برآمد کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا اشارہ آپ کی مؤکلہ کے مالی نقصان کی جانب تھا۔ آصف جیسا چیپٹر شخص آپ کی مؤکلہ کے واجبات ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتا لہٰذا آپ اسے کچھ عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھانے دیں۔ اس کی بہنوں کو اگر ضرورت ہوگی تو اس کی رہائی کے لیے چارہ جوئی کرتی رہیں گی۔'' پھر وہ ایک کیش کا چیک میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ چیک آپ اپنی مؤکلہ کو دے دیجیے گا۔ میں نے قانونی ہرجہ خرچہ بھی شامل کر کے پورے ایک لاکھ کا چیک بنا دیا ہے تاکہ اس نیک دل خاتون کا کوئی نقصان نہ ہو۔''

میں ہکا بکا اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ڈیوٹی روبی کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کہا جاتا ہے، دنیا سے ابھی انسانیت ختم نہیں ہوئی۔ جی ہاں، یہ انسانیت روبی جیسے عالی ظرف انسانوں ہی کے دم قدم سے قائم ودائم ہے۔ مجھے ندامت کا احساس بھی ہوا کہ میں نے دورانِ جرح میں اس عظیم عورت کے لیے نازیبا الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ میں نے روبی کے ہاتھ سے چیک لینے کے بجائے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ یہ چیک بہ دستِ خود میری مؤکلہ کو دیں گی تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

''میں آپ کی مؤکلہ کو کہاں ڈھونڈتی پھروں گی وکیل صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ ہی رکھ لیں۔''

''ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' میں نے

معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ ذرا نظر گھما کر تو دیکھیں......“

روبی نے بے ساختہ گردن گھما کر دیکھا تو جویریہ سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مِس جویریہ......!“

روبی الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی جویریہ کو تکنے لگی پھر مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ”مگر آپ نے تو کہا تھا کہ ...... یہ آپ کی کوئی کولیگ ہیں...... آپ نے ان کے لیے ”عزیزہ“ کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔“

”میں اپنے ہر کلائنٹ کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔“ میں نے روبی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج سے آپ بھی میری عزیزہ ہی ہیں کیونکہ میں نے آپ کا کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور وہ بھی...... ایک لاکھ کے ایڈوانس فیس چیک کے ساتھ۔“ آخری جملہ میں نے مذاق کے انداز میں ادا کیا تھا۔

”یہ چیک میری چھوٹی بہن جویریہ کے لیے ہے۔“ روبی نے کہا۔ ”آپ کی فیس میں الگ سے دوں گی۔“

اپنے لیے روبی کی زبان سے ”چھوٹی بہن“ کے الفاظ سن کر جویریہ آب دیدہ ہوگئی۔ روبی نے اٹھ کر جویریہ کو گلے سے لگالیا۔ ان کے ملن کا یہ منظر بڑا جذباتی اور روح پرور تھا۔ میں دلچسپی سے انہیں دیکھتا چلا گیا۔

شرعاً دو سگی بہنیں بہ یک وقت کسی ایک مرد کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں۔ جویریہ اور روبی سگی بہنیں نہیں تھیں لیکن زبان سے قائم ہونے والے اس رشتے نے انہیں سگی بہنوں سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب کردیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت آصف کی منکوحہ رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ لہٰذا میں نے ایک ماہ کے اندر ان دونوں کو عدالتی کارروائی کے نتیجے میں ایک لالچی اور دھوکے باز شخص کے بندھن سے آزاد کرادیا۔

بہ ظاہر یہ کیس یہیں پر ختم ہوجاتا ہے لیکن لگ بھگ چار ماہ کے بعد پتا چلا کہ اس کیس کا ڈراپ سین ابھی باقی تھا۔ ایک روز میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ادھیڑ عمر کا ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے حسب عادت پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور کہا۔

”جی فرمائیں! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”سائیں! آپ نے ہماری جتنی خدمت کردی، ہم اس کا احسان زندگی بھر نہیں چکا سکتے۔ ہم آپ کو مزید کوئی زحمت نہیں دے سکتے۔ بس، آپ ہماری ایک خواہش پوری کردیں۔“

اس شخص کے جواب نے مجھے گہری سوچ میں مبتلا کردیا اور باوجود کوشش کے بھی مجھے یاد نہ آسکا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ بالآخر میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ بتائیں، میں آپ کی کون سی خواہش پوری کروں؟“

”آئندہ جمعے کو میری شادی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! آپ کو ہماری خوشی کی خاطر اس شادی میں شرکت کرنا ہوگی۔ آپ نے پہچانا اس لیے نہیں کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ میرا نام مظہر جوکھیو ہے میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔“

”مظہر جوکھیو......!“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی یادداشت پر زور دینے کی کوشش کی مگر میں مظہر جوکھیو کو اپنے حافظے میں کہیں تلاش نہ کر پایا۔

وہ ایک شادی کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! اس کارڈ میں آپ دلہن کے نام پر غور کریں تو سب یاد آجائے گا۔“

میں نے کارڈ کھول کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے مظہر جوکھیو کی شادی جویریہ سے ہو رہی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر مظہر جوکھیو کی طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا...... تو یہ بات ہے!“

مظہر جوکھیو کی زبانی مجھے جو تفصیل معلوم ہوئی اس کے مطابق، یہ بندہ جویریہ کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا اور آفتاب شگفتہ اسی کا کرائے دار تھا۔ آفتاب اسی کے ایما پر جویریہ والے کیس میں سرگرمی دکھا رہا تھا۔ مظہر جوکھیو کو جویریہ کے حالات کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے بہنوئی شکیل احمد کا کیا ارادہ ہے۔ مظہر جوکھیو نے جویریہ کو اس دلدل سے نکال کر اپنانے کا فیصلہ کیا اور آفتاب کے ذریعے کوشش شروع کردی۔ جویریہ، آفتاب پر بھروسا کرتی تھی اور جب اسے آصف کی شادی کا پتا چلا تو اس نے اپنے حالات کی روشنی میں مظہر جوکھیو کے حق میں فیصلہ سنادیا۔ جویریہ نے دانستہ مجھ سے یہ بات چھپائی تھی اور مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ یہ اس کا انتہائی ذاتی معاملہ تھا۔

”سائیں! میں آپ کی شادی میں شرکت کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ اس کی کتھا توجہ سے سننے کے بعد میں نے کہا۔ ”اللہ آپ کی اس نیکی کو قبول فرمائے......!“

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

اور میں کافی دیر تک جویریہ کے اصلی اور سچے امیدوار کے بارے میں سوچتا رہا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

سیلاب سے بری طرح متاثر ہوئے گاؤں کے سارے ہی مٹی کے گھروندے بہہ گئے تھے۔ وزیراعلیٰ کی اپیل پر ملک کی ایک مخیر شخصیت نے متاثرین کے لیے نیا ماڈل ویلیج تعمیر کروایا۔ پختہ مکانات کے علاوہ پرائمری اسکول اور ڈسپنسری کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ چند دکانیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ بریفنگ دینے والے صاحب نے معزز مہمانوں کو بتایا کہ ایک دکان نائی کے لیے مختص کی گئی ہے۔ وزیراعظم نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا۔ ''نائی نہیں 'حجام' کہو۔''

بازارحسن

محمد الیاس

یہ ایک ایسے بازار کی منظرکشی تھی جہاں دن ویرانوں کی زد میں تھے اور راتیں ہنگاموں کی قید میں گزرا کرتی تھیں مگر یہ فلسفہ اسے بہت دیر بعد سمجھ آیا کہ اس بازارِ حسن میں حسن کے سودے اپنے اوقاتِ مقررہ پر طے ہوا کرتے تھے اور... ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس کے باوجود جب اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ در آئی لیکن چلن کی خیر ہوگئی۔ کیونکہ کسی کی دعا اور نگراں آنکھوں نے اسے پستی میں گرنے سے بچالیا تھا۔

کم عمری کی سنسنی خیز محبتوں کے شکار دوستوں کا احوال

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میرے بچپن کے دوست حاجی مزمل احمد کی پسندیدہ سیاسی جماعت چونکہ برسرِ اقتدار تھی۔ ہم دونوں دوست اکٹھے بیٹھے ٹی وی پر کارروائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوست کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "یار حاجی! تمہارے محبوب لیڈر نے آج ذات پات کی لعنت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ایسا فارمولا وضع کیا ہے کہ پیشے کے حوالے سے اب ہمارا کوئی ہم وطن بے توقیر نہیں ہوگا۔ نائی کو صرف حجام بول دینے سے اس کی قدر و منزلت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔"

حاجی حسبِ معمول مجھ سے الجھ پڑا اور بولا۔ "تم میری پارٹی کی مخالفت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میرا قائد کتنی ہی اچھی بات کیوں نہ کرے، تم نے ہر صورت میں تنقید کرنی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کے بندے! خاکروب کو سوئیپر کہہ لینے سے ذہن نہیں بدلتے۔ معاشرے کی سوچ بدلنا اور ذہنی تربیت کرنا ضروری ہے۔ نئی نسل کو شروع سے ہی نصاب میں پڑھایا جائے کہ ہر پیشہ قابلِ تکریم ہے۔ اگر نائی نہ ہوتا تو تیرے قائد سمیت ہم سب مرد جنگلی بھوت بنے ہوتے۔ ہمارے چہروں پر صرف آنکھیں دکھائی دیتیں۔ بولتے ہوئے جھاڑی کا ہر حصہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ کھانے کے وقت تیرا لیڈر، تم اور میں ایک ہاتھ سے جھاڑی ہٹاتے اور دوسرے ہاتھ سے منہ میں نوالے ٹھونستے۔ یعنی نائی نے ہمیں کم از کم ظاہراً بندہ بنا ڈالا ہے۔ خواہ اندر سے ویسے ہی کیوں نہ ہوں، جیسے موجودہ دور کے بیشتر سیاسی قائدین ہیں۔"

میرے دوست کا پارہ چڑھنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "اسی طرح اگر خاکروب نہ ہوتے تو ذرا تصور کرو کہ ہر طرف بدصورتی پھیلی ہوتی۔ گویا یہ پیشے زندگی کو خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں عزت دینی چاہیے......"

"اب تم سوشلزم کا پرچار شروع کر دو۔" حاجی نے ٹوک دیا لیکن میں بولتا گیا۔

"یاد کرو، وہ طالب...علمی کا زمانہ۔ ہمارے استاد عاصی صاحب، جو ہر روز رگڑ رگڑ کر کلین شیو کرتے اور بڑی نفاست سے پینٹ شرٹ پہنتے تھے۔ ہم سڑک سے پار چکلے کے دوسری طرف کھلے میدان میں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ہماری زبان سے "چکلا" کا لفظ سن کر عاصی صاحب نے پیار سے سمجھایا تھا۔ نہ بچو! چکلا برا لفظ ہے۔ ایسا نہیں بولتے۔ اول تو تم لوگوں کو ادھر جانا ہی نہیں چاہیے۔ لیکن کھیل کود کے لیے کھلی جگہ اسی طرف ہے۔ اس آبادی کا ذکر کرنا ضروری ہو جائے تو "بازارِ حسن" کہہ لیا کرو اور تمام لڑکے اس کے اندر سے گزرنے کے بجائے اوپر سے چکر کاٹ کر جایا کریں۔"

میں نے حیران ہوکر عاصی صاحب سے کہا تھا۔ "ماسٹر صاحب! وہاں نہ تو ڈھنگ کا بازار ہے اور نہ حسن۔ پہلے پہل مجھے چکلا کہتے ہوئے الجھن ہوتی تھی۔ کیونکہ چکلا بیلن سے گھروں میں روٹی پکائی جاتی ہے اور اب بازارِ حسن!" انہوں نے مجھے ہلکی سی چپت لگا کر کہا تھا۔

"گدھا نہ ہوتو......"

بچپن میں ہم ہر وہ کھیل کھیلتے جس پر پیسے خرچ ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ پٹھو گرم ہمارا پسندیدہ کھیل ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے ٹھیکریاں ہم خود گھس گھس کر گول کیا کرتے اور گیند کسی لاڈلے لڑکے کی ماں بنا دیا کرتی۔ کپڑے کی کترنوں کو خوب بھینچ کر کسی موٹے مضبوط گف کپڑے کی تھیلی میں، یوں کس کے سی دیا جاتا کہ اس کا سائز اور شکل کرکٹ کی بال کی طرح ہو جاتی۔ اس گھریلو ساختہ گیند کا دیسی نام کھینو تھا۔ اس کی جاذبیت دیرپا نہ ہوتی۔ صد احتیاط کے باوجود کھینو بازارِ حسن کی گندی نالی میں جا گرتی۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی اسے نالی سے نکالتا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پٹھو گرم کرنے والے کو پوری توانائی اور ممکنہ مہارت سے نشانہ بنا ڈالتا۔ کھینو کی ضرب پڑنے پر پچھک کی آواز کے ساتھ گندے پانی کے چھینٹے بھی اڑتے مگر اس وقت چونکہ ہار جیت کا معرکہ پڑا ہوتا لہٰذا کسی کو پروا نہ ہوتی کہ لباس ہی نہیں، بدن بھی ناپاک ہوگیا ہے۔ ستم بالائے ستم کہ بھیگے ہوئے کھینو کی چوٹ بھی بڑے زور کی لگتی۔

میرے والد صاحب محلے میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے پیش امام تھے۔ ڈیڑھ اینٹ کی اس اعتبار سے کہ پگڈنڈی نما تنگ گلی کے اختتام پر نکاسیِ آب کے قدرتی نالے کے کنارے پر بنی ہوئی تھی۔ نالا اب قدرتی کے بجائے سیوریج کے نظام کا اسی طرح حصہ بن چکا تھا، جس طرح کی پاک سرزمین پر حکومتیں قائم ہو رہی تھیں۔ چھوٹی سی مسجد جذبۂ ایمانی کی حرارت کے زیرِ اثر سرکاری زمین پر بنائی گئی تھی۔ اس میں ابا جی حضور کا عملی کردار کم تھا۔ چونکہ مسجد، ملحقہ گلیوں کے رہائشی .... بزرگوں کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ ہماری ماہانہ آمدنی بھی مسجد کی تنگیِ داماں کے حساب سے ہی تنگ تھی۔

مزمل کے والد صاحب، غلہ منڈی اور تانگا اسٹینڈ کے درمیانی تجارتی علاقے کے ایک احاطے میں گھوڑوں کو نعل لگایا کرتے تھے۔ ہم دونوں ہی دوستوں کے والد سخت مزاج تھے۔ میرے ابا جی صرف اس وجہ سے سرزنش کیا کرتے کہ میں کھیل کود میں مصروف رہ کر کوئی نہ کوئی نماز قضا کر دیتا تھا۔

مزمل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کے ابا جی کا حلقۂ احباب چونکہ کوچوانوں پر مشتمل تھا اور کام کی نوعیت ایسی تھی کہ دن بھر میں زیادہ وقت بھٹی دہکتی رہتی، جس میں لوہا تپانا اور مارنا کوٹنا، معمول کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ جس روز چاچا اجمل کی لڑائی کسی سے نہ ہوتی، وہ بیٹے کی پٹائی کر کے اپنا کوٹا پورا کر لیتا۔

قومی کھیل ہاکی اور کرکٹ کی مقبولیت بھی کم نہ تھی۔ جن دنوں ان کھیلوں میں سے کسی کا بھی بین الاقوامی سطح پر میچ ہو رہا ہوتا، ہم اس کے جنون میں مبتلا ہو جاتے۔ اس کے لیے ہمیں ایک اور طرز کی گیند تیار کرنا پڑتی۔ مزمل اپنے ابا کی ورکشاپ سے، تانگے کے پہیے پر چڑھائی جانے والی ربڑ کا ٹکڑا لے آتا۔ ہماری ٹولی کا ایک لڑکا فرحت قدرے نرم مزاج کا تھا۔

فرحت کے والد صاحب، ایک کھوکھا نما دکان میں چمڑے کی چپل بنایا کرتے تھے۔ تانگے کے پہیے والے ربڑ کا ٹکڑا ہم ان کے پاس لے جاتے اور وہ بڑی خوش دلی سے تیز دھار آلات کے ذریعے اسے کاٹ چھیل کر گول کر دیتے۔ اسی گول ربڑ پر کسی لڑکے کے گھر میں تھگلیاں لپیٹ کر آزمودہ طریقۂ کار کے مطابق کھیو بنا لیا جاتا۔ کرکٹ کھیلنے کے لیے کسی لڑکے کے پاس بلا نہ تھا۔ مزمل کے گھر میں کپڑے دھونے والا بھاری ڈنڈا، بلے کی طرح آگے سے چپٹا تھا اور پکڑنے کے لیے موٹھ بنی ہوئی تھی۔ کرکٹ کھیلنے کے لیے اس سے بہتر کوئی شے ہمیں دستیاب نہ تھی۔ جسے مزمل اکثر نظر بچا کر لے آتا لیکن کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی والدہ محترمہ نے اپنے مجازی خدا کے کپڑے دھونے ہوتے تھے۔ غالباً انہوں نے کپڑوں کو کوٹ پیٹ کر دل میں دبا ہوا غیظ و غضب نکالنا ہوتا تھا، لہٰذا ڈنڈا غائب پا کر گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ چاچا اجمل کو خبر ہونے پر ایک اور طرح کی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

گویا مزمل کو اللہ میاں نے گھوڑے سے زیادہ قوتِ برداشت دے رکھی تھی کہ مغلظات کے ساتھ ساتھ جسمانی سزا بھی برداشت کر لیا کرتا۔

ڈنڈے سے محروم رہ جانے کی صورت میں ہم تختی سے بھی کرکٹ کھیل لیا کرتے لیکن اس جنون کے نتیجے میں ایسے سانحات بھی رونما ہوئے کہ کسی لڑکے کی تختی لمبائی کے رخ درمیان میں سے دو یا تین ٹکڑے ہو گئی۔ متاثرہ لڑکا چشمِ تصور سے اپنے گھر کے اندرونی ماحول کا جائزہ لیتا اور پھر آبدیدہ ہو کر ساتھی لڑکوں سے مشورہ کرنے لگتا کہ مقامی اسٹیشن سے کراچی کی ریل گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے اور مزید یہ کہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑے جانے والے کم عمر لڑکے کے ساتھ ریلوے والے کیا سلوک کرتے ہیں۔ ایسے میں کوئی بہادر لڑکا، جس کو اپنے والدین پر قدرے اعتماد ہوتا اور مالی حالت بھی زیادہ دگرگوں نہ ہوتی، وہ اپنی ذاتی تختی دے کر ممکنہ سانحے کا سدباب کر دیتا۔ یوں ایک ساتھی کے بچھڑ جانے کا خدشہ ٹل جاتا۔

ماسٹر عاصی صاحب نے جس مختصر سی بستی کو بازارِ حسن کا نام دینے کی ہدایت کی تھی، ہم شرفاء کے محلے کی شمالی بغل سے گزرنے والی شہر کی اہم سڑک کے پار آباد تھی۔ شرفاء اس لیے کہ ہمارے سبھی بزرگ بشمول چاچا اجمل پورے وثوق اور اعتماد سے خود کو شریف کہا کرتے تھے۔ خصوصاً امراء کے رہائشی علاقوں اور بازارِ حسن کو ایک برابر گردانتے۔ بازارِ حسن میں چند درجن گھر ہی تھے۔ اس بستی کو درمیان میں سے ایک خاصی کھلی گلی، شرقاً غرباً اور دوسری شمالاً جنوباً گزر کر چار بڑے حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ کم و بیش سارے ہی مکانات معیار کے اعتبار سے تیسرے درجے کے تھے۔ ان سب کے گلی یا گلیارے میں کھلنے والے کمرے نسبتاً بہتر انداز میں سجے ہوئے نظر آتے۔ ان کی دیواروں پر تیز گلابی یا فیروزی رنگ ڈال کر قلعی کی ہوتی۔ پردوں کے علاوہ معمولی فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان بھی نظر آ جاتا۔

ماسٹر صاحب کی ہدایت کے برخلاف ہم شمالاً جنوباً گزرنے والے بازار سے آیا جایا کرتے، چونکہ اس میں دکانیں تھیں اور نسبتاً رونق بھی ہوا کرتی۔ کئی ماسی نما خواتین سے ہم نے علیک سلیک سے ذرا اوپر درجے کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اپنا کھیل کا سامان انہی میں سے کسی کے پاس چھوڑ کر آ جاتے، جو ڈنڈوں اور کھیو پر مشتمل ہوتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ گھر سے اسکول کے لیے آئے لیکن نیت پھر گئی تو بستے کسی ماسی کے پاس امانتاً چھوڑ دیے اور آوارہ گردی پر نکل گئے۔ عین چھٹی کے قریب پلٹ آتے، بستے اٹھاتے اور گھر میں بوجھل قدموں سے یوں داخل ہوتے، گویا پڑھ پڑھ کر مت ماری گئی ہو۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی میں ساتھیوں کو کھیلتا چھوڑ کر مسجد کی طرف سرپٹ دوڑ پڑتا۔ بھلے لباس پر کہیں کھیو کی پچھک کا ٹھپا ہی کیوں نہ لگا ہوتا، میں والد صاحب کی مار کے خوف سے نماز پڑھ لیتا تھا۔

شروع میں یہ سوچ کر میرا دماغ پھر جایا کرتا کہ بازارِ حسن میں سودا کیسے بیچا جاتا ہے۔ ذہن میں چاچا شوکت سے موازنہ کرنے لگتا، جس نے دکان میں کتابیں اور اسٹیشنری کا سامان ڈال رکھا تھا۔ اسی طرح جناب کریانہ اسٹور و جنرل مرچنٹ والے بشیر حسین کی طرف دھیان چلا جاتا کہ دکان انواع و اقسام کے سودے سے بھری پڑی ہے۔ جبکہ دن کی روشنی میں بازارِ حسن کی رونقیں ماند پڑی ہوتیں۔ تھکی ہاری بیزار

بوڑھی اور ادھیڑ عمر عورتیں ہی دکھائی دیتیں۔ رفتہ رفتہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور جان گئے کہ اس بازار میں تیزی رات کے اوقات میں آتی ہے اور کس طرح کالین دین ہوتا ہے۔ ماسی نما آزردہ صورت خواتین دو روپے پر بھی صبر شکر کر لیتی ہیں لیکن معیار پر سمجھوتا نہ کرنے والوں کو کم از کم پانچ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ پہلی پہلی بار انکشاف ہونے پر کہ اس بازار میں سودا کیسے بکتا ہے، ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فوری خیال آیا کہ قہر الٰہی سے کہیں زمین پھٹ نہ جائے اور ہم اس میں دھنس جائیں، لہٰذا بھاگ چلیں۔

خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے لیے میں اور مزمل عشا کے بعد گھر والوں کو جل دے کر نکل آئے تو بازار چمکتا ہوا دکھ لیا۔ دروازوں کے پردے ہٹا کر کرسی بچھائے، نسبتاً کم عمر لڑکیاں اور جوان عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک نے اچھا لباس پہن کر خوب بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ ہمیں پولیس پارٹی نے دیکھ لیا اور بید لہراتے ہوئے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ اس رات میں تا دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ بازار میں جو بھی کاروبار ہو رہا ہے، وہ بہرحال ٹھیک نہیں۔ چورا ہے سے آگے بازار کے آخری بائیں ہاتھ تین مکان چھوڑ کر جس گھر میں، ہم بوقتِ ضرورت اپنا سامان یا بستے رکھا کرتے تھے، اس کے دروازے میں بیٹھی سجی سنوری بھوری آنکھوں والی گوری گلابی قدرے موٹی مگر دراز قد کم عمر لڑکی کو دیکھ کر بلا خوف و تردید کہا جا سکتا تھا کہ ماسٹر عاصی صاحب نے اسے بجا طور پر بازارِ حسن کہا ہے۔ وہ مجھے روشن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

ہم سمجھ گئے کہ دن کو اس لڑکی کی ماں سے بات چیت ہوا کرتی ہے جسے ہم موٹی ماسی کہتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح گوری اونچی مگر موٹی کچھ زیادہ ہی تھی۔ گو کہ اردو روانی سے نہیں بولتی لیکن مطلب کی ہر بات بہ آسانی کر لیتی تھی۔

یوں بھی اس بازار میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتوں سے ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ سب سے زیادہ خوش اخلاق اور ہمارے ساتھ محبت سے پیش آنے والی وہی موٹی عورت تھی جو میرے ساتھی لڑکوں کی طرح مجھے مولوی کہہ کر پکارتی۔

موٹی ماسی کے ساتھ ہماری دوستی گہری ہوتی گئی۔ خصوصاً میں اور مزمل اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق چھوٹے موٹے تحفے بھی لانے لگے، جس کی خاطر ہمیں چوری چکاری کا آغاز اپنے گھر سے ہی کرنا پڑا۔ اس اثنا میں وہ کھلی زمین کسی نے خرید لی جہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ چاروں طرف خاردار تار لگا کر اس میں ہمارا داخلہ ناممکن بنا دیا گیا لہٰذا ہماری ٹیم ٹوٹ گئی۔ ہر آنے والے دن کو میں اور مزمل پڑھائی میں مزید نالائق ہوتے چلے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم دونوں کو احساس ہونے لگا کہ ہم جوان ہو چکے ہیں یا پھر انیس بیس کا فرق ہی رہ گیا ہے۔ چونکہ ہم گھوم پھر کے موٹی ماسی کی بیٹی کے حسن اور سراپا پر گفتگو کرنے لگ جاتے۔ میری طرح مزمل کو بھی وہ لڑکی چند ایک بار خواب میں نظر آئی تھی۔

ہم نے آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ اس نے باپ کی ورکشاپ میں بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ کئی روز سے ایک نیا نویلا شاندار تانگا کھڑا تھا جس کا مالک گھوڑا خریدنے کے لیے کسی دور دراز مقام پر گیا ہوا تھا۔ مزمل نے باپ کی غیر موجودگی میں تانگے کے خاک دانوں پر نصب پیتل کی لالٹینیں، گھنٹی اور چند آرائشی پترے اتار لیے۔ میں نے گھر میں پڑی تانبے کی گاگر چرا لی جو عرصہ دراز سے کبھی استعمال نہ ہوئی تھی۔ پیتل گلی سے ہمیں کل ترپن روپے کی خطیر رقم وصول ہوئی، جس کی حفاظت کے پیشِ نظر آدھے آدھے بغلی جیبوں میں دونوں نے ڈال لیے اور جیبیں شلوار کے نیفے میں پھنسا لیں۔

انجانے جوش اور سنسنی سے میرا جسم تھرانے لگ گیا۔ مزمل کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ اس کے بدن کا سارا خون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ ہم نے پچھلی ملاقات میں موٹی ماسی سے جب گول مول بات کی تو وہ کھل کر ہنس پڑی۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں بھر کر پہلوؤں سے لگا لیا۔ یوں لگا جیسے ہم فوم کے پہاڑ میں دفن ہو رہے ہیں۔ کہنے لگی۔ ”جوان ہو گئے ہو تو شرماؤ مت۔ ہماری بیٹی رخشی جیسی لڑکی کوئی نہیں۔ یہاں وہ تماش بین لوگ کیا بولتے ہیں...... سب ٹکے والی بیٹھی ہیں مگر رخشی کم سے کم پچیس روپے میں...... اپنی خوشی سے کوئی زیادہ بھی دے دیتا ہے۔ روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ زیادہ کا لالچ نہیں ہے۔ ہمارے پاس دل والا اور پیسے والا آتا ہے۔“

اسکول سے چھٹی ہونے میں ایک گھنٹا باقی تھا کہ ہم موٹی ماسی کے پاس پہنچ گئے۔ پچاس روپے دیتے ہوئے کہا، ہم رات کو گھر سے باہر نہیں رہ سکتے اس لیے دن دن میں ہی مہربانی کر دیں۔ وہ ایک پلیٹ میں ہمارے لیے برفی لے آئی اور بولی۔ ”یہ اپنے بڑے ہونے کی مٹھائی کھاؤ۔ ویسے تو تم کو مٹھائی لے کے آنا چاہیے تھی۔ خیر ہے کوئی بات نہیں۔ جب تم بہت چھوٹے تھے، تب سے میری اور تمہاری دوستی ہے۔ اس لیے تم کو کھلا کر خوشی ہو گی۔ رخشی ابھی سو رہی ہے۔ اس کو بے آرام نہیں کر سکتی۔ صبح ناشتا کرنے کے بعد سوئی تھی۔ تم کل دن کو جس وقت مرضی ہو آ جانا۔“

ہم دونوں دل میں انوکھی تمنائیں لیے واپس آ گئے۔

میں جوں ہی بستہ اٹھائے تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوا، اباجی نے رسّا میری کمر کے گرد ڈال کر مجھے برآمدے کے ستون کے ساتھ کس کے باندھ دیا اور سونٹی سے پنڈلیوں اور رانوں پر پے در پے وار کرنے لگے۔ امی اور میرے بہن بھائی کمرے میں چلے گئے۔ میری چیخ و پکار سن کر انہوں نے دروازہ بھیڑ لیا۔ گلی کے لوگ گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ بار بار دستک دی اور گھنٹی بجائی مگر اباجی اپنے مشن پر کاربند رہے۔ جلد ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

اسکول سے ہمارے کرتوتوں کا ریکارڈ کھل گیا۔ میرے اور مزمل سمیت چار اور لڑکوں کے نام بھی خارج ہو چکے تھے۔ اباجی نے ٹخنے اور گھٹنے بچا کر ٹانگوں کے ایک ایک انچ پر پورے ایمانی جذبے سے چھڑی کے وار کیے تھے۔ اب وہاں مزید گنجائش نہ رہی تھی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر دن بھر میں آتے جاتے حیلے بہانے ایک آدھ جھانپڑ رسید کر جاتے۔ میں ریڑھی پر بھیک مانگنے والے اپاہجوں کی طرح رات دن چارپائی پر کتابیں کھولے بیٹھا رہتا۔ گھریلو ٹوٹکوں سے علاج معالجہ جاری رہا جس کے نتیجے میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اللہ کا کرم ہی ہوا کہ اباجی اور چاچا اجمل ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ تو والدین کی نشانی، تانبے کی گاگر کو اپنی جگہ سے غائب پا کر اباجی فوراً اسکول جا پہنچے تھے، جہاں سے معلوم ہوا کہ بیٹا اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔

دوسری جانب مزمل، میرے برعکس خوش قسمت رہا۔ چاچا اجمل کو شک بھی نہ گزرا کہ یہ بیٹے کی کارستانی ہو سکتی ہے۔ اس نے باور کر لیا کہ کسی بازاری اچکے نے احاطے کی دیوار پھاند کر تانگے کی قیمتی چیزیں اتاری ہیں اور جب مالک نے واپسی پر تانگے کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ڈالا ہوا کپڑا ہٹایا تو سامان چوری ہونے کا پتا چلا۔

مزمل نے دوسری بڑی اور اہم خوش قسمتی بقلمِ خود اپنے کھاتے میں یوں لکھ لی کہ گھر والے جوں ہی سوئے، وہ چپکے سے نکل گیا۔ موٹی ماسی کے ہاں سحری تک رہا۔ بقول اس کے، جان جوکھوں میں ڈال کر حاصل کی گئی اپنے حصے کی رقم کا بہترین نعم البدل حسن و خوبی سے وصول کیا اور واپس آ کر شریف لڑکوں کی طرح اپنے بستر پر سو گیا۔ میری عارضی معذوری کو عذر بنا کر اس نے اگلے روز کوشش کر دیکھی کہ میرے ادا کردہ پیشگی معاوضے سے بھی استفادہ کر لے لیکن موٹی ماسی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مولوی کی امانت ہمارے پاس پڑی ہے، وہ جب بھی آیا، اس سے فائدہ

اٹھانے کا حق صرف اسے ہی ہے۔

مجھے دُہرے تہرے صدمے نے آ لیا تھا۔ دادا دادی کی نشانی، منقش گاگر جو قیمتی انٹیک کا درجہ رکھتی تھی، اسکریپ کے بھاؤ بیچ دی اور پھر اصل مقصد حاصل کرنے سے بھی محروم رہا۔ کالے چور کی طرح مار کھائی جبکہ مزمل ولولہ انگیز داستان سنا کر مجھے حسد اور حسرت و یاس کی آگ میں جھلسا رہا تھا۔

اس نے صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیا اور بتا دیا کہ وہ یارِ مار ثابت ہوا ہے۔ اس نے منت خوشامد کر کے مجھے راضی کر لیا۔ کہنے لگا۔ "زخشی بھی تجھے مولوی کہتی ہے۔ جب ہم سارے لڑکے پچھلے پہر کھیلنے جایا کرتے تھے، اس وقت وہ جاگ رہی ہوتی تھی۔ خود ہی بتانے لگ گئی کہ مولوی تم سب میں اچھا لڑکا ہے۔ مغرب سے پہلے ہی نماز کے لیے بھاگ پڑتا تھا۔ اپنا ہاکی کھیلنے والا ڈنڈا اماں کے حوالے کر کے سلام کرتا اور دوڑ پڑتا۔ میرا دل چاہتا ہے سب چھوڑ چھاڑ کر نماز پڑھوں لیکن یہ مشکل اس وقت آسان ہوگی جب کوئی مولوی جیسا بندہ مجھے بیوی بنا لے گا......"

ماسٹر عاصی صاحب نے ہم پر وہ احسان کیا جو آج تک یاد ہے اور آئندہ بھی کبھی نہ بھولیں گے۔ ہم سے نیک چال چلن اور بورڈ کے امتحان تک خوب دل لگا کر محنت کرنے کا وعدہ لیا۔ اپنی ذاتی ضمانت پر ہیڈ ماسٹر صاحب سے معافی دلا دی۔ مجھے اباجی کی مار راس آ گئی تھی۔ ایسی کایا پلٹی کہ خود بھی سمجھ نہ پایا اور دن رات پڑھنا شروع کر دیا۔ مزمل کو اس کے والد صاحب نے ٹیوشن لگوا دی۔ پڑھائی میں پناہ ملنے کے باوجود کسی لمحے دھیان بھٹک کر موٹی ماسی کی طرف چلا جاتا لیکن وہاں سے واجبات کی وصولی کے طریقۂ کار کا خیال آتے ہی اباجی حضور کی تقریر کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے کہ روزِ محشر کو بدکار عورت اور مرد کا کیا حشر ہوگا۔ نازک اعضا پر سانپ بچھوؤں کے کاٹنے کا منظر انہوں نے یوں بیان کیا گویا آنکھوں دیکھا ہو۔ دل دہلا دینے والے اس منظر نامے کے باوجود وہ گدرائے ہوئے بھرے بھرے بدن والی گوری گلابی لڑکی یاد آ جاتی جو مجھے بھوری روشن آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ دل میں امنگ بیدار ہوتی کہ ایک بار وصولی کر آؤں اور اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگ لوں۔ آئندہ کے لیے توبہ کر لوں۔ اس پر والد صاحب کی ایک اور تقریر یاد آ جاتی جس میں انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ اللہ سے معافی مانگ لینے کا سوچا سمجھا ارادہ کر کے گناہ کا مرتکب ہونے والا بدبخت انسان سیدھا جہنم میں جاتا ہے۔

عجیب ذہنی خلفشار دامن گیر ہوا رہا۔ مزمل کے بارے میں سوچتے ہوئے دل حسرت و یاس اور حسد کے جذبات سے بھر جاتا کہ ظالم انسان اگر جہنم میں ڈال بھی دیا گیا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک خوبصورت گناہ کا اندراج ہوا ہوگا۔ جبکہ انسان خطا کا پتلا ہے، لہٰذا بعید از قیاس نہیں کہ میں کسی انتہائی بھونڈے بے ہودہ اور بے لذت گناہ کی پاداش میں دھر لیا جاؤں۔

انہی دنوں حکومتی اقدامات کا غلغلہ بلند ہوا کہ ہر شہر میں قائم تمام کے تمام بازارِ حسن بند کر دینے کے سخت احکامات جاری ہوئے ہیں۔ اخبارات کی سرخیوں میں انہیں فحاشی کے اڈے قرار دیا جا رہا تھا جس کے ردِعمل میں شعبۂ صحافت کے خلاف میرے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ عاصی صاحب نے بھی اس حکومتی اقدام پر اپنی ہی طرز کا تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت برا ہوا۔ مگر اس سے اور کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ بازارِ حسن سے وابستہ افراد جو مخصوص مقامات تک محدود تھے، اب عام آبادیوں میں بکھر کر ٹھکانا کر لیں گے۔ مغربی بازو کے حاکم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے عاصی صاحب نے کہا۔ "اگرچہ یہ شخص صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے لیکن اپنی فطرت میں سخت گیر، پرلے درجے کا منتقم مزاج اور ظالم ہے۔ معاشرے کو اس کی لاحاصل مہم جوئی کا بہت نقصان پہنچے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹوپیاں سی کر اور کتابت کر کے دال روٹی کمانے والے شہنشاہِ ہند نے اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے بعض بیکار کی اصلاحات نافذ کی تھیں۔"

بازارِ حسن اجڑ گیا اور جس کے رم سے یہ نام زیبا تھا، جانے کہاں گئی۔ بورڈ کے امتحانات سر پر آن پہنچے۔ میری تیاری تسلی بخش ہو گئی لیکن واجبات کی عدم وصولی کا قلق نہ گیا۔ یہی سننے میں آیا کہ اس بازار کی عورتیں، مختلف محلوں اور جدید آبادیوں میں اٹھ آئی ہیں اور بعض دوسرے شہروں کو کوچ کر گئیں۔ ہر کسی کے اپنے چاہنے والے تھے جن کی معاونت سے نہ صرف سر چھپانے کو چھت مل گئی بلکہ آزمودہ کار حیات بھی جاری و ساری رہا اور صالح حاکم کی منشا کے برخلاف انسانی معاشرے کا قدیم ترین پیشہ نا پید نہ ہو سکا۔

میٹرک اور ایف اے مزمل اور میں نے ایک ساتھ پاس کیا۔ میں نے ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر کرنے تک مارکس اور لینن کے نظریات اور تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا۔ پوری طرح قائل ہو گیا کہ زوال پذیر ملکی معیشت کا سدھار، داس کیپٹل کی روشنی میں ممکن العمل ہے۔ اس عرصے میں مجھے صوبائی محکمۂ تعلیم میں بطور لیکچرر ملازمت مل گئی۔ فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مطالعہ جاری رکھا۔ ملک میں حقیقی عوامی

انقلاب لانے کے لیے مذہبی، مسلکی، لسانی اور نسلی گروہوں میں بٹے ہوئے عوام کو قریب لانا ضروری سمجھتا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ اس کے گماشتے، محروم طبقات کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی غرض سے ہر طرح کے تعصب کو بروئے کار لاتے ہیں۔ لسانی اکائیوں کو باہم متحد کرنے کے لیے ان کی مادری زبان کو سمجھنا اور اس کی تکریم کرنا بڑا اہم نکتہ ہے۔ میں نے سب سے زیادہ محنت اسی شعبے میں کی اور بڑے شوق سے مختلف علاقائی زبانیں سیکھتا رہا۔ اباجی نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگانے کے باوجود قطع تعلق نہ کیا اور فرمایا کہ دین اسلام، غیر مسلم کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات استوار کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن اس مقصد کے لیے بڑی واضح حدود و قیود مقرر کی گئی ہیں۔

مزمل نے ایف اے پاس کر لینے پر ہی اکتفا کیا۔ تانگا انڈسٹری تیزی سے سکڑ رہی تھی اور اس سے وابستہ شعبوں میں روزی کمانا مشکل ہوتا گیا۔ تاہم چاچا اجمل نے ایک معرکہ مار لیا۔ اس نے تقسیم ہند سے پہلے جس احاطے میں ٹھیا جمایا تھا، اس کے ہندو مالک کی ہجرت کے بعد ہندوستان سے آئے مسلمان مہاجر الاٹی کو شروع میں بیس روپے ماہوار کرایہ دیتا رہا اور کسی بھی قیمت پر قبضہ نہ چھوڑا۔ آگے چل کر کرایہ دینا بھی بند کر دیا۔ کئی حکومتیں آئیں اور گئیں۔ لڑتے لڑتے صرف الاٹی کی چونچ اور دم گم ہوئی اور پھر وہ خود بھی یوں گم ہوا کہ عدم کو سدھار گیا۔ چاچے کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ جس کسی نے بھی دعویٰ جمانے کی کوشش کی، چاچا لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا اور سب سے مؤثر ہتھیار کے طور پر گھوڑوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دینے والی گالیاں بکنے لگتا۔

تانگا اسٹینڈ از خود ہی سمٹ گیا اور غلہ منڈی پھیلتی چلی گئی۔ چاچا بوڑھا اور کمزور ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ مزمل نے سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے زیادہ ظالمانہ شکل، منڈی کی آزادی یا آزادانہ تجارت سے بھرپور استفادہ کیا، جس میں تاجر اور اجارہ دار کو اپنی شرحِ منافع مقرر کرنے کی کھلی چھٹی ہوتی ہے اور حکومتِ وقت کو موج میلا اڑانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہوتا۔ غذائی اجناس کی خرید و فروخت اور ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ کاروبار دن دونا، رات چوگنا ہوتا گیا۔ شادی بھی جلد ہی کر لی اور بچے بھی ہو گئے لیکن جو لت موٹی ماسی کے ہاں لگی تھی، وہ نہ گئی۔ میری سرکاری نوکری لگنے تک وہ اچھا خاصا مالدار تاجر بن چکا تھا۔ دولت ریلے کی صورت میں آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بری لت سے توبہ کر لی اور نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ البتہ رمضان کے روزے کی ہمت یکجا نہ کر پاتا اور

پہلا پہلا

1۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا پہلا شخص نیوزی لینڈ کا ایڈمنڈ ہلیری ہے جو اپنے نیپالی گائڈ شرپا تنزنگ کے ساتھ 29 مئی 1953ء کو چوٹی پر پہنچا۔

2۔ خلا میں سب سے پہلا آدمی روس کا یوری گاگرن 12 اپریل 1961ء کو خلائی جہاز، ووشک 1 کے ذریعے پہنچا۔

3۔ قطب شمالی میں بیٹھنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا رلبرٹ ایڈون پیری ہے جو 16 اپریل 1909ء کو وہاں پہنچا تھا۔

4۔ قطب شمالی پر جانے والا سب سے پہلا شخص ناروے کا آمندسن ہے جو 16 دسمبر 1911ء کو وہاں پہنچا۔

5۔ چاند پر قدم رکھنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا نیل آرمسٹرانگ ہے جو 31 جولائی 1969ء کو امریکی جہاز اپالو 11 کے ذریعے وہاں پہنچا۔

6۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا پہلا پاکستانی نذیر صابر ہے۔

7۔ خلا میں جانے والا سب سے پہلا مسلمان آدمی سعودی عرب کا شہزادہ سلطان سلمان السعود ہے۔ جو جون 1985ء میں امریکی خلائی شٹل ڈسکوری میں سوار ہو کر خلا میں پہنچا، دورانِ سفر شہزادہ سلطان نے پورے قرآن مجید کی تلاوت بھی کی۔

8۔ خلا میں سب سے پہلی خاتون روس کی ویلنٹینا ولاڈی میرو فنا ٹریشکوفا 12 تا 19 جون 1963ء کو ووشک 6 نامی خلائی جہاز کے ذریعے پہنچی۔

ڈوگزر عالمی معلومات سے اقتباس

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

اس سعادت سے محروم رہنے پر نہ صرف ندامت محسوس کرتا بلکہ جھنجلاہٹ میں ماتھا پیٹ لیتا۔ تاہم مذہب کے معاملے میں اس قدر جذباتی اور حساس ہو گیا کہ مجھ سے ایک روز بول دیا۔ ”مولوی! تیرے ساتھ یاری آخری دم تک نبھاؤں گا لیکن کبھی بھول کر بھی مجھے کمیونزم کا سبق نہ پڑھانا اور نہ ہی میری مذہبی وابستگی کو ڈسکس کرنا۔“

رمضان المبارک کی سترہ تاریخ کو ہم دونوں نے ایک ساتھ لمبا سفر کیا۔ سحری میں شاہراہ پر ایک اچھے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ مزمل کو سگریٹ نوشی کی عادت نویں دسویں جماعت میں ہی پڑ گئی تھی۔ اکثر اپنے والد کے سگریٹ بھی چرا لایا کرتا تھا۔ ہوٹل پر کھانے اور چائے کے بعد اس نے اوپر تلے دو سگریٹ پھونک ڈالے۔ تیسرا سلگانے پر پاس بیٹھے شخص نے اسے ٹوک دیا کہ اذان ہو رہی ہے، اب سحری کا وقت باقی نہیں رہا۔ مزمل نے باپ سے قیمتی کمرشل جائداد پانے کے علاوہ تلخ مزاجی بھی وراثت میں حاصل کی تھی۔ بھنا کر بولا۔ ”سفر میں روزے کی رعایت ہے۔ تم کون ہوتے ہو ٹوکنے والے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”رعایت ان روزوں کے لیے تھی جب پیدل سفر کرنا ہوتا تھا یا گھوڑوں اور اونٹوں پر۔ اس... ایئرکنڈیشنڈ لگژری کوچ میں روزہ رکھنے سے کیا مشکل پیش آسکتی ہے؟“ اعتراض اٹھانے والے کی حمایت میں دو تین اور لوگ بھی بول پڑے۔

مزمل سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ پیشتر اس کے کہ میدان میں کود پڑتا اور گھوسم گھونسا شروع ہو جاتا، ہوٹل سے ملحقہ مسجد میں صفیں سیدھی ہونے لگ گئیں۔ مزمل نے جھٹ سگریٹ کا سرا ایش ٹرے میں کچل ڈالا۔ عجلت میں کلی کی اور دوڑ کر پچھلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

آخر کار میں نے اپنی ہم خیال کامریڈ ساتھی سے شادی کر لی۔ بیوی کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہو تو زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔ ہم قریبی دوست اپنے اسٹڈی سرکل میں مستقبل کے حقیقی عوامی انقلاب کے خدوخال اجاگر کرتے رہے۔ حقیقی انقلاب کیا برپا ہوتا، ستم بالائے ستم کہ ملک میں قائم نیم انقلابی حکومت کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ مصائب و آلام کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ بہت سے ہم خیال دوست نہ صرف ملازمتوں سے برخاست ہوئے بلکہ جیلوں میں ڈال دیے گئے اور اذیت ناک تفتیشی مراحل سے گزرتے رہے۔ میری بیوی چند ماہ کی بچی کے ہمراہ پابندِ سلاسل ہوئی۔ بااثر خاندان کی بیٹی تھی۔ بھائیوں کی بھاگ دوڑ رنگ لائی۔ حکومتی تفتیشی ادارے کو معافی نامہ لکھ دیا۔ مجھ سے خلع لیا۔ غالباً سچے دل سے تائب ہوئی تھی۔ باقاعدہ حجاب میں باہر نکلتی۔ تیسرے سال اپنے ہم پلہ و ہم کفو سے نکاح کر کے امریکا چلی گئی۔ زندگی برباد ہونے اور بیوی بیٹی کی دائمی جدائی کے غم و اندوہ میں غرق ہونے کے باوجود جب میں چشمِ تصور سے دونوں کو دور دیس سکھ آرام میں شب و روز بتاتے دیکھتا تو دل کو قرار آنے لگتا اور دل سے تسلیم کرتا کہ اس نے ظلم اور جبر کے نظام سے سمجھوتا کر کے اچھا کیا۔ کروڑوں عوام کا ہم کچھ نہ سنوار پائے۔ کم از کم میری بیٹی اور بیوی کا مستقبل تو محفوظ ہوا۔

ہم جو سب وطن دشمن قرار پائے تھے، ملک کی نظریاتی اساس کو نقصان پہنچانے کے جرم میں سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو خزاں رسیدہ پتوں کے مانند بکھر گئے۔ وطنِ عزیز میں ایک اور طرح کا بالکل نیا خوش حال طبقہ وجود میں آ چکا تھا جس میں میرے اباجی حضور بھی شامل تھے۔ گو کہ انہوں نے میری مالی مدد کر دی لیکن مجھ سے فاصلہ رکھنے میں ہی عافیت جانی۔ مزمل نے کاروبار میں ہوش ربا ترقی کر لی تھی۔ میری توقع، جسے میں اس کے سامنے بے تکلفی میں اپنے خدشات کہا کرتا تھا، کے عین مطابق حج کرنے کے بعد ڈاڑھی رکھ لی تھی، جو صاف طور پر فتح مندی، سرخروئی اور بالادستی کی علامت نظر آتی۔ نسبتاً بہتر رہائشی علاقے میں بہت بڑا گھر بنا لیا تھا۔ دو گاڑیاں اور نوکر چاکر۔ میری بہت خاطر تواضع کی لیکن نہ جانے کیوں اس کو رہ رہ کر ہر اس سیاسی شخصیت کا تذکرہ چھیڑنے کا جوش آ جاتا جو نظریاتی اعتبار سے ذہنی طور پر میرے قریب تھی۔ مخالفین کو برا بھلا کہتے ہوئے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتا۔ میں زخمی دل لیے اٹھ آیا۔ اچھی طرح جان لیا کہ دیرینہ دوست اور میری دنیا الگ الگ ہے۔ بچپن کے دوستوں میں سے صرف فرحت نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے دلی خلوص کے ساتھ آؤ بھگت کی۔ عرصے بعد ہونے والی ملاقات میں صرف اتنا مختلف پایا کہ میرے بجائے خود اس نے بھرپور جپھی ڈال کر بڑی گرم جوشی سے میرے دونوں گالوں پر بوسے ثبت کیے۔

وقت کتنا ہی برا ہو، انسان پر اس کا یہی احسان ہے کہ بالآخر گزر جاتا ہے۔ حکومت بدلی اور ابتلا کا دور اختتام پذیر ہوا۔ نہ صرف سرکاری ملازمت پر بحالی ہوئی بلکہ سابقہ واجبات یک مشت وصول ہو گئے۔ نئی ہاؤسنگ اسکیم میں درمیانے سائز کا پلاٹ لے کر سنگل اسٹوری سادہ اور مختصر گھر تعمیر کروا لیا۔ جہاں بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ بالکل محل نما۔ یہاں گھومتے ہوئے گمان گزرتا کہ خاصے خوشحال ملک کا شہری ہوں۔ لیکن اس رہائشی علاقے کے قلعہ نما گیٹ سے باہر نکلتے ہی معاشرے کی اصل تصویر نظر آ جاتی۔ کچے پکے ٹوٹے

چھوٹے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے مسکن، جن کے مابین نقل وحرکت کی غرض سے چھوڑے گئے تنگ راستوں پر بہتا ہوا سیاہ کالا کیچڑ نما کثیف پانی، جابجا غلاظت، مکھیاں مچھر، بیمار و نزار کتے بلیاں اور فضا میں رچا ہوا ایسا تعفن کہ سانس لیتے ہوئے جی متلانے لگتا۔ ایسے ماحول میں کلبلاتی ہوئی نسلِ انسانی کو دیکھ کر خیال آتا کہ ایک ہی ملک کے اندر کئی طرح کے ممالک سمائے ہوئے ہیں، جن کے مابین اتنا تضاد ہے جو کسی بڑے تصادم کا سبب بن سکتا ہے۔

میں نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں پانچ چھ فٹ کی جگہ چھوڑی تھی۔ اسی طرح میرے عقبی دیوار والے دو منزلہ مکان کی غالباً اتنی ہی جگہ ہوا کے لیے چھوڑی گئی تھی اور اس گھر میں آئے دن میاں بیوی کے درمیان معرکہ آرائی جاری رہتی جسے میں اکثر سن لیا کرتا تھا۔ وہ خاصی بلند آواز میں لڑتے تھے، عورت تو گوشت کا پہاڑ دکھائی دیتی تھی۔ اس دن بھی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”او ظالم انسان! تو نے میری پریوں جیسی بیٹیاں بیچ دیں اپنی عیاشی کی خاطر۔“

”میں نے ان کی بڈھوں سے شریعت کے مطابق شادی کرا کے انہیں گناہ سے بچالیا ہے۔ ورنہ جیسے تیری ماں نے تیری کمائی کھائی تھی اسی طرح انہیں بھی دھندا کرنا پڑتا۔“

اکثر ان لوگوں کے درمیان اسی قسم کے مکالمات ادا کیے جاتے اور کبھی کبھی وہ اوپر سے مجھے کام کرتا دیکھ کر مسکراتی اور چھیڑتی۔

”اتنی کنجوسی نہ کرو کوئی ماسی رکھ لو۔“ میں مسکرا کر نظر انداز کر دیتا۔

☆☆☆

حاجی مزمل نے غذائی اجناس کی ذخیرہ اندوزی کا دھندا ترک کر دیا اور انتہائی قیمتی کمرشل جگہ پر پلازا کھڑا کرا کے ماہانہ ساڑھے تین لاکھ روپے کرائے کی مد میں وصول کرنے لگا اور اچھے علاقے میں ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ آتے ہی مسجد کمیٹی کا فعال ممبر بن گیا۔ عندیہ دیا کہ اس شرفاء کے رہائشی علاقے سے فحاشی کے اڈے بند کروانے ہیں۔ اپنے ہم مزاج تینوں جوان بیٹوں اور چند جوشیلے ساتھیوں کے ہمراہ فلپائنی خواتین کے مساج سینٹر گیا اور پھر چینی پر۔ دونوں کو دھمکی دی کہ جلد سے جلد یہ ”چکلے“ بند کیے جائیں۔ اصلاح معاشرہ کے جذبے سے سرشار ٹیم باری باری سب کے پاس گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ یہ نیک کارنامہ سرانجام دے کر بروقت مسجد پہنچ جاتے اور مغرب کی نماز ادا کرتے، سب انسپکٹر کی معیت میں ایک

موبائل میں سوار پولیس پارٹی نے راستے میں ہی اچک لیا اور شریف شہریوں کو دھمکانے اور نقصِ امن کے الزام میں تھانے لے گئے۔ تاہم پرچہ درج کر کے حوالات میں بند کرنے کے بجائے آئندہ محتاط رہنے کا تحریری حلف نامہ لے کر رات گیارہ بجے خلاصی کر دی۔ حاجی توبہ توبہ کر اٹھا کہ ملک میں اس کی اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت کی حکومت ہونے کے باوجود پوش علاقوں میں بھی نام بدل کر بازارِ حسن کھل گئے ہیں۔ اسلام سے دوری کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

میرے اور حاجی کے والدین کب کے آسودۂ خاک ہو چکے تھے۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ میری پینشن اتنی تھی کہ بخوبی گزارہ ہو جاتا۔ بلکہ خاصی رقم بچ رہتی لیکن گھر کے سارے کام خود کرتا۔

حاجی کسی کسی روز گھر سے کوئی خاص پکوان لے کر آ جاتا اور اپنے ڈرائیور کو واپس بھیج دیتا۔ ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔ بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ جاتیں۔ مرے ہوئے اور بچھڑے ہوئے دور گئے بہت سے لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اس کا خیال تھا کہ ملک میں قائم حکومتوں کی عمدہ حکمتِ عملی سے نظام بدلا اور وہ ذلت آمیز غربت سے نجات حاصل کر پائے۔ میں اس کو باور کراتا۔ ذرا گیٹ سے باہر دائیں بائیں جھانک کر دیکھو۔ کروڑوں لوگوں کا معیارِ زندگی دن بدن پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹا رہتا۔

سردیوں کی مری مری دھوپ میرے گھر کی چھت کے اس کنارے تک ہی باقی رہ گئی تھی، جہاں نیچے چھوٹا سا صحن تھا۔ میں ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار کا ادارتی صفحہ دیکھ رہا تھا۔ لوہے کی گول سیڑھی میں بھونچال آنے سے سمجھ گیا کہ ڈبل ڈیکر آن کھڑی ہوئی ہے۔ قصداً اس طرف نگاہ نہ ڈالی۔ معاً میرے کانوں میں آواز پڑی۔ ”مولوی! چالیس پچاس سال سے تمہاری مقروض ہوں...... کیا خیال ہے، وصولی نہیں کرو گے؟“ یک دم میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ان کی چمک اب بھی ماند نہ پڑی تھی۔ بے اختیار بول دیا۔

”ہت تیرے کی...... رخشی! میری آنکھوں میں تیری وہی تصویر تھی نوجوانی والی۔ اپنا تلخ و شیریں ماضی کریدتے ہوئے کچھ ہی دیر پہلے، خیال تیری طرف خوامخواہ پلٹ گیا تھا۔ ظالم عورت! تم نے میری اکلوتی لچی لفنگی یاد کا ستیاناس کر دیا۔“

محفلِ شعروسخن

❊ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لاسکے

❊ محمد شفیق حسین..... نیو کراچی
خوشیاں تو روٹھ گئیں ہم سے
کاش غموں کو بھی نظر لگ جائے

❊ اوشا راٹھی ...... مٹھی سندھ
زندگی میں کبھی کبھی ایسا اصول بھی اپنانا چاہیے
کہ جنگ اگر خود سے ہو تو...... ہار جانا چاہیے

❊ زرین آفریدی..... حیدر آباد سندھ
ہم کو آتا نہیں زخموں کی نمائش کرنا
خود ہی روتے ہیں، تڑپتے ہیں بہل جاتے ہیں

❊ وزیر محمد خان ...... بٹل ہزارہ
تم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیب تو دریا نہیں رہا
کہتے تھے ایک پل نہ جئیں گے تیرے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وعدہ نہیں رہا

❊ لبنیٰ وکیل..... کوئٹہ
رسم الفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے
ہر طرف آگ ہے دامن کو بچائیں کیسے
بوجھ ہوتا جو غموں کا تو اٹھا بھی لیتے
زندگی بوجھ بنی ہو تو اٹھائیں کیسے

❊ زوہیب احمد ملک..... کراچی
آبلے کیسے بھی ہوں ضبط کے پھائے رکھنا
اپنے اشکوں کو زمانے سے چھپائے رکھنا
آج سوچا ہے جی بھر کے تمہیں دیکھیں گے
پھول چہرے کو ہتھیلی پہ ٹکائے رکھنا

❊ ناہید یوسف..... اسلام آباد
روز کھالیتے ہیں ہنستے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی نگاہوں میں مروت ہے ابھی

❊ مہتاب احمد..... حیدر آباد
سپردِ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

❊ نوشتہ گلزار..... بھکر
صدیاں تیری سمت کے جو لے گیا قتیل
اب تیرے پاس لوٹ کے وہ پل نہ آئے گا

❊ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی
شفق، دھنک، ماہتاب بجلی، تارے، پھول
اس دامن میں کیا کچھ ہے، دامن ہاتھ میں آئے تو

❊ ملک مظہر بلال......تلہ گنگ
جس سے لڑتا ہوں اب اس کو منالیتا ہوں
خوب بدلی ہے تیرے بعد یہ عادت میں نے
❊ حمزہ آریان......تلہ گنگ
میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں یہی سزا تھی میری
❊ باسط ولید الرحمٰن......تلہ گنگ
میں کیا کہوں کہ مجھے صبر کیوں نہیں آتا
میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے
❊ تحریم صدیقی....کراچی
ہو نہ سکا کبھی ہمیں اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا لوحِ خیال پر رہا
❊ صبا سحر......کراچی
کچھ اس کمال سے اترے تھے ہم سمندر میں
پھر اس کے بعد ہوئی ختم رسم غرقابی
❊ شاہد علی......فیصل آباد
بس ایک پل تری قربت کا زندگی جیسا
پھر اس کے بعد وہی میں ہوں اور زمانہ وہی
❊ عظیم احمد......جھنگ سٹی
موت کا دبدبہ ہے اپنی جگہ
زندگی کا ہے اپنا کروفر
❊ اطہر حسین......کراچی
ذات سے انحراف کون کرے
اپنے دل میں شگاف کون کرے
رائگاں کردیا گیا ہے مجھے
ہاں مگر اعتراف کون کرے
❊ منیر شگفتہ......وہاڑی
اس کے لبوں کی گفتگو کرتے رہے سبو سبو
یعنی سخن ہوئے تمام یعنی کلام ہوچکا
❊ انعم کمال......حیدر آباد
جانے ہم ایک تھے کہ بے حد تھے
بٹ گئے ہیں تمام رشتوں میں
❊ طاہر مجاہد......پھالیہ
بس ایک بار مری نیند چھوگیا کوئی
پھر اس کے بعد ہر اک خواب دلنشیں آیا

❊ آذین رضوان......کراچی
اس نے پوچھا بھی مگر حال چھپائے گئے ہم
اپنے ہی آپ میں اک حشر اٹھائے گئے ہم
زندگی دیکھ کہ احسان ترے کتنے ہیں
دل کے ہر داغ کو آئینہ بنائے گئے ہم
❊ نادیہ ریاض......نوابشاہ
یہ الگ بات کہ حالات وہی ہیں اب بھی
تیرے آنے سے مگر کچھ تو سہارا ہوا ہے
❊ ریاض انصاری......لاہور
دستِ شفقت اٹھالیا تم نے
ہم ہیں اور دشتِ بے اماں بابا
❊ سائرہ نواب......پشاور
تتلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمحے
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں انہیں ہم
❊ عاصم خان......کراچی
چلنا سکھایا اس نے مجھے ہاتھ تھام کر
تھی کیا خبر کہ اس کا سہارا تھا آخری
❊ شافیہ خان شافی......کلفٹن، کراچی
کوئی خیال نہیں کیسی بے خیالی ہے
کہ اب تو آنکھ کسی خواب تک سے خالی ہے
جو ہوسکے تو اسے بخش دے بنا مانگے
انا پرست ہے جو دل تیرا سوالی ہے
❊ محمد زریان سلطان......اردو بازار کراچی
بچھڑتے وقت اس کا حکم تھا یہ
پلٹ کر اب کبھی دیکھا نہ جائے
گنوائے دوست پہلے، طے کیا پھر
خلوص و پیار کو پرکھا نہ جائے
❊ حنظلہ شاہد......سکھر
ریت کی دیوار تھی، کیا تھی انا؟ میں جھک گئی
آج پھر ایک شخص نے سر کا میرے سودا کیا
❊ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ
میں چاہوں جرم محبت ہے معاف ہوجائے
تمہارا دل میری جانب سے صاف ہوجائے
مجھے خبر ہے یہ دل اس کے حق میں بولے گا
بہ ظاہر جتنا بھی اس کے خلاف ہوجائے

❁ نعیم احمد...... بہاولپور
روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں

❁ کامران شاہد..... میر پور خاص
کبھی خوشی سے ہار کسی نے مانی ہے!
آخر دنیا کیوں ہم کو تسلیم کرے

❁ صبا حمید..... ٹنڈو الہیار
نہیں تھی حسنِ نظر کی بھی کچھ اسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

❁ وسیم اختر ...... ملتان
کہیں سے صبح کی پہلی کرن ملے، تو چلے
کھڑا ہے وقت سرِ رہگوار آخرِ شب!
کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد، وہی انتظار آخرِ شب!

❁ ردا جاوید..... ہل ہزارہ
لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

❁ عمیر رضا..... چکوال
اپنا مطلب کھو دیتی ہے دل میں رکھی بات
رونا ہے تو کھل کے رو اور جلنا ہے تو، جل

❁ ناصر خان..... کوئٹہ
بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

❁ امجد پرویز ...... سرگودھا
دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ جھمیلے میں رہیں گے

❁ محمود نصیر..... میر پور خاص
حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

❁ دلاور خان...... مانسہرہ
افلاک کا سایہ ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے

❁ سنبل...... گلگت
لیتی ہے جلتی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور!

❁ ارم کامران...... سکھر
خدا گواہ، وہ آسودگی نہیں پائی
تمہارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

❁ بینش صدیقی ...... حیدر آباد
ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں، فرصت رہتی ہے

❁ ساگر تلوکر...... میانوالی
نہیں وہ خواہش نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے

❁ احسن جمال...... اسلام آباد
دل کو حصارِ رنج و الم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

❁ رانا کلیم...... کراچی
خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

❁ یمنیٰ جاوید...... کراچی
شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اس کا چہرہ تھا گھنی شب میں ستارے جیسا

❁ ثنا صادق...... کراچی
روزِ ازل سے ہیں وہی گنتی کے چند رنگ
بنتے ہیں جن سے اَن گنت منظر، نئے نئے

❁ فیاض خان...... اوکاڑہ
بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں

کوپن برائے شمارہ اکتوبر 2017
محفلِ شعر و سخن
نام : ________________
پتا : ________________

دہشت زدہ

شاہ زین رضوان

وہ جو زندگی سے دور دکھائی دیتا تھا لیکن احساسات کے انتہائی قریب تھا... اور اس کے کان گویا اس کی آہٹ پر لگے رہتے تھے۔ کیونکہ ... وہ انتہائی پُراسرار دشمن محسوس ہوتا تھا۔ اس کی عجیب و غریب حرکات لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہی تھیں لیکن یہ فسوں کاری بھی بالآخر ایک دن ختم ہو ہی گئی۔

انتہائی چالاکی وزیرکی سے کیس حل کرنے والے ایک سراغ رساں کی کاوش

ولی کوستا دوپہر کے وقت ساؤتھ بیچ پر واقع کلارک کے پب میں داخل ہوا۔ وہ یہاں ایلس آرڈین سے ملنے آیا تھا جو امیگریشن اٹارنی کے طور پر کام کرتی تھی۔ وہ دونوں مہینے میں ایک بار دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے۔ کلارک کے برگر جنوبی فلوریڈا میں بہترین سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے لنچ کے لیے اس جگہ کو ترجیح دی۔ ولی نے ایک کونے کی میز کا انتخاب کیا اور وہاں بیٹھ کر ٹی وی پر نظریں جمادیں۔ دو منٹ بعد ہی ایلس بھی آ گئی۔ اس کے سنہری

بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور سرخ بلاؤز کے ساتھ نیلے رنگ کا بزنس سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں کئی سالوں سے ہر مہینے ایک ساتھ لنچ کر رہے تھے۔ ایلس بہت سے معاملات میں ولی سے کام لیتی تھی۔ اس لیے ان کی اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران وہ ذاتی اور گھریلو معاملات پر بھی گفتگو کرتے۔ ولی کی خواہش تھی کہ وہ اور زیادہ ذاتی باتیں کریں لیکن ایلس پیشہ ورانہ معاملات میں کسی قسم کی ملاوٹ پسند نہیں کرتی تھی۔

عام دنوں کے برعکس اس کے خوب صورت چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا بیگ فرش پر رکھا اور ولی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''کس بارے میں؟''

''مجھے کلاڈیا جین نے فون کیا تھا۔ وہ کافی خوفزدہ ہے۔''

ولی اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہیٹی میں پیدا ہوئی لیکن بعد میں اس نے امریکی شہریت اختیار کر لی اور ایلس نے ہی اس کے بچوں کو امریکا لانے میں مدد کی تھی۔ درحقیقت یہ ولی ہی تھا جس نے ہیٹی کا سفر کیا اور اس کے دونوں بچوں کو لے کر قونصلیٹ گیا تاکہ ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے ان بچوں کا خون لیا جا سکے۔ اس کے بعد ہی انہیں امریکا آنے کی اجازت ملی لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔

''کلاڈیا کا مسئلہ کیا ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

ایلس آگے کی طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولی۔ ''جب کلاڈیا صرف پانچ برس کی تھی تو اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔''

ولی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! اس نے یہ بات مجھے کبھی نہیں بتائی۔''

''یہ ایسی بات نہیں جو وہ کسی کو بتاتی لیکن اس کے باپ کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ کسی نے رات کی تاریکی میں سڑک کے کنارے اس کے گلے پر چھری پھیر دی اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی لاش اگلی صبح ملی۔''

ولی جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ معلوم ہو سکا کہ کس نے اسے قتل کیا تھا؟''

ایلس اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں رہا کہ یہ قتل کس نے کیا۔ وہ ٹونٹون میکاوٹ تھا۔''

''کیا واقعی؟'' ولی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے خفیہ یونٹ میں کام کرنے کے دوران ولی نے میکاوٹس کے بارے میں سنا تھا۔ یہ سادہ کپڑوں میں سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والا قاتلوں کا گروہ تھا جسے صدارتی محل سے احکامات ملتے تھے۔ ان لوگوں نے کئی عشروں تک ہیٹی میں دہشت کا بازار گرم رکھا جس میں لوٹ مار، جنسی زیادتی اور قتل جیسے واقعات شامل تھے۔ ان کا اصل کام لوگوں میں دہشت پھیلانا اور اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ وہ حکمرانوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کریں۔ حکومت انہیں بندوقوں، چاقو اور خنجروں سے مسلح کرتی تھی لیکن وہ پولیس یا فوج کی طرح باوردی نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ سادہ لباس پہنتے۔ ان کے سر پر پانامہ ہیٹ اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ ہوتا۔

اس کے علاوہ ان میں برائی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ''ووڈو'' پر عمل کرنے والوں میں سے تھا جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ خوفناک ہو گئے تھے۔ وہ کسی شیطان کے مانند تھے۔ ایک لمحہ وہ اپنے خداؤں کے حضور مرغی کی قربانی کرتے اور دوسرے ہی لمحے وہ نصف شب کے قریب کسی انسان کا گلا کاٹ دیتے۔ بعض اوقات مقتولین کا تعلق حکومت کے سیاسی مخالفین سے ہوتا لیکن کبھی کبھی وہ کسی ترتیب کے بغیر بھی لوگوں کو قتل کر کے ان کی لاش درختوں پر لٹکا دیتے یا سڑک کے درمیان میں چھوڑ دیتے۔ ان کا مقصد صرف دہشت پھیلانا اور لوگوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ اگر انہوں نے حکومت کی مخالفت کے بارے میں سوچا تو ان کا بھی یہی انجام ہوگا۔

ولی نے لیمن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''جب اس کے باپ کا قتل ہوا تو کلاڈیا بہت چھوٹی تھی' غالباً اس واقعے کو تیس برس یا اس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔''

''درست لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ کلاڈیا اور خاندان کے دیگر افراد جانتے ہیں کہ اس کے باپ کو کس نے قتل کیا۔ اس کا نام مارسل میٹی تھا۔ وہ ایک طرح کا جعلی ووڈو پجاری تھا اور جہاں وہ رہتا تھا وہاں اس کی شہرت مکروہات کے رسیا کی تھی۔ دو دن پہلے کلاڈیا نے اپنی دکان سے نکلتے ہوئے اسے دیکھا اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ اس نے بھی کلاڈیا کو دیکھ لیا۔''

ولی نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیٹی میں پرانی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ کچھ میکاوٹ مقتولین کے رشتے داروں کے انتقام سے بچنے

کے لیے میامی کا رخ کر رہے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح تھی تو ولی نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ یہاں خاموشی سے رہ رہے تھے۔ اس لیے ولی یا پولیس کے پاس ان کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

لیکن بعد میں قانون بدل گیا۔ اب امریکا آنے والے ہر شخص کو امیگریشن پر حلف اٹھانا پڑتا کہ وہ کبھی بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں ملوث نہیں رہا۔ اس بارے میں جھوٹ بولنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ تمام سابقہ میکاؤٹ کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب سمجھا جاتا تھا اور انہیں امریکا میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر یہ شخص مٹی پکڑا جائے اور اسے ہیٹی واپس بھیج دیا جائے تو اسے یقیناً مار دیا جائے گا کیونکہ وہاں اب بھی لوگ میکاؤٹ سے نفرت کرتے ہیں۔

ولی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''یہ ان میکاؤٹ میں سے ایک ہے جو ماضی میں قانونی طور پر یہاں آئے تھے یا یہ بعد میں کسی طرح چھپ کر آ گیا؟''

ایلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس نام کے کسی شخص کو بھی قانونی طور پر آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے امیگریشن میں ایک دوست کے ذریعے معلوم کر لیا ہے۔ وہ ضرور بعد میں آیا ہے اور یقیناً اس نے کوئی فرضی نام اختیار کیا ہوگا۔ کلاڈیا جانتی ہے کہ وہ کب اور کیسے یہاں آیا۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔''

''اور تمہارا کہنا ہے کہ اس نے بھی اسے پہچان لیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس وقت بچی تھی جب اس نے اس کے باپ کو قتل کیا؟''

''ایسا نہیں ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا لیکن کلاڈیا کا کہنا ہے کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ وہ اسے جانتی ہے۔''

''لہٰذا اب کلاڈیا خوفزدہ ہے کہ وہ اسے خاموش رکھنے کے لیے اس کا پیچھا کرے گا؟''

ایلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف یہی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان میکاؤٹ کے بارے میں ہیٹی کی لوک کہانیوں میں کیا کہا جاتا ہے؟''

''مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔'' ولی نے جواب دیا۔

''ان کے اندر شیطان کی روح ہے۔ یہ بڑی بوری لے کر گھومتے اور بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ اب تم سمجھ گئے۔ کلاڈیا کو یہی خوف ہے کہ وہ صرف اسے ہی نہیں بلکہ اس کے بچوں کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

کھانے کے دوران ایلس نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں بہت پریشانی ہے اور صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جو میری مدد کر سکتے ہو کیونکہ تم پہلے سے ان لوگوں سے واقف ہو اور اس جگہ کو بھی اچھی طرح جانتے ہو۔''

ولی محض سر ہلا کر رہ گیا لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایلس اسے کس کام کے لیے تیار کر رہی ہے۔

''تم میرے دوست ہو اور میں تمہیں اپنا ہیرو سمجھتی ہوں۔'' ایلس نے مزید کہا۔

ولی چونکتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ کلاڈیا کے پاس پیسے نہیں ہیں اور مجھے اس کام کا معاوضہ نہیں ملے گا؟''

اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا اور اس نے کبھی ایلس کو انکار نہیں کیا تھا۔ ایلس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائیں اور بولی۔ ''ہمیں اس کا معاوضہ جنت میں ملے گا۔''

☆☆☆

وہ ساؤتھ بیچ سے روانہ ہوا اور مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا لٹل ہیٹی کے قلب میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا کیریئر میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں پٹرول مین کے طور پر شروع کیا تھا اور اس علاقے میں چند راتیں گزار چکا تھا۔ اس زمانے میں اس کے فرائض میں عموماً نقب زنی، چھوٹے موٹے معاشی جرائم اور گھریلو تنازعات کی تحقیقات شامل تھیں۔ اس علاقے میں تشدد کے واقعات بہت کم ہوتے تھے۔ ہیٹی سے ہجرت کر کے آنے والوں نے وہاں بہت تکلیفیں جھیلی تھیں اور اب وہ مزید کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

ولی گاڑی چلاتا ہوا سیکنڈ ایونیو پر آ گیا۔ جہاں کئی دکانوں کی تزئین و آرائش کر کے جدید بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں چرچ کے علاوہ میوزک اسٹور، بیکریاں، ریستوران اور گروسری کی دکانیں تھیں۔ اس پٹی کے آخری سرے پر مشرق کی جانب کلاڈیا کی دکان تھی، جس کی کھڑکی پر بند ہے، کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس لیے ولی کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

وہ مزید دو بلاک آگے جا کر بائیں جانب مڑ گیا اور اسے وہ گلابی مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی جس کے بارے میں ایلس نے بتایا کہ وہ کلاڈیا کے کزن کا مکان تھا جہاں وہ اپنے بچوں سمیت رہ رہی تھی کیونکہ وہ

اپنے گھر جانے سے خوفزدہ تھی۔

ولی نے اپنی گاڑی پورچ میں روکی۔ بارن کی آواز سن کر کلاڈیا باہر آئی۔ اس نے نیلا اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا جس پر گلاب کے پھول کڑھے ہوئے تھے اور اسی رنگ کا سرخ اسکارف اس نے سر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے ولی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہیں بیٹھ کر بات کریں گے ولی۔ میں نے بچوں کو گھر میں رکھا ہوا ہے اور ان سے یہی کہا ہے کہ ہمارے مکان میں کام ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم چند روز یہیں قیام کریں گے۔ میں ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بھی میری طرح پریشان ہو جائیں۔''

کلاڈیا ایسی عورت تھی جس نے زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا لیکن کبھی پریشان نہیں ہوئی مگر اب پہلی بار وہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔

''تم مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ؟'' ولی نے کہا۔

''وہ ایک میکاؤٹ تھا لیکن اس سے بڑھ کر ایک عفریت بھی۔ اس نے صرف میرے باپ کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ ان برسوں میں کئی لوگوں کو جان سے مار ڈالا۔ سبھی میکاؤٹ چاہتے تھے کہ لوگ ان سے خوفزدہ رہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو دہشت زدہ کر کے ان سے پیسے بٹورتے یا غیر عورتوں سے ہم بستری کرتے لیکن ان میں کچھ ایسے تھے جو لوگوں کو مار کر خوشی محسوس کرتے اور مارسل میٹی بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ چشمہ لگائے رہتا۔ اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کسے دیکھ رہا ہے پھر جب وہ کسی ایک شخص کو گھورتا اور اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دوڑنے لگتی تو وہ آدمی سوچنے لگتا کہ اب اسی کی باری ہے۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے اسے دو دن پہلے دیکھا تھا؟''

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تقریباً شام ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا جب میں سوڈا خریدنے کے لیے اپنی دکان سے باہر آئی۔ ایک آدمی اسی اسٹور سے نکل رہا تھا۔ میں تقریباً اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھی جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ اس کا چہرہ پہلے ہی پتلا تھا۔ اب اور بھی زیادہ سکڑ گیا ہے۔ میں اپنی جگہ پر رک گئی اور مجھے لگا جیسے میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس نے میری طرف دیکھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟''

''پہلے تو اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ میں وہاں سے مڑی اور اپنے اسٹور کی طرف واپس جانے لگی جیسے کچھ بھول آئی ہوں۔ میں نے اندر سے دروازہ مقفل کیا۔ کھڑکی پر بند ہے، کی تختی لگائی اور پچھلے دروازے سے نکل کر گھر کی طرف جانا شروع کر دیا لیکن جب کونے پر پہنچی تو وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا جیسے میٹی لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مسکرایا کرتا تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی تھا۔''

''کیا اس نے تمہارا تعاقب نہیں کیا؟''

''نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں جلدی جلدی گھر آئی۔ بچوں سے کہا کہ وہ اپنا سامان باندھیں اور پھر ہم یہاں آ گئے۔''

''اس کے بعد تم نے اسے دیکھا؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔ عجیب وغریب واقعات پیش آ رہے ہیں۔''

''کس قسم کے واقعات؟''

''گزشتہ روز میں نے معمول کے مطابق دکان کھولی۔ ایسٹر ویک کی وجہ سے مصروفیت زیادہ ہے لہٰذا میں دکان بند کرنے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتی لیکن میں..... پورا دن میٹی سے ہوشیار رہی۔ میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن جب اندھیرا ہونے کے بعد میں گھر واپس آ رہی تھی تو مجھے لگا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا لیکن ایک منٹ بعد میں نے دوبارہ وہی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ کوئی تاریکی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ میں نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بجائے میں نے ایک آواز سنی جیسے کوئی کھڑ کھڑاہٹ ہو رہی ہو۔''

''جیسے کسی بچے کا جھنجنا؟''

''ہاں۔ ایسی ہی آواز تھی لیکن ہیٹی میں ووڈو کے ماننے والے اسے رسم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہاں یہ رواج ہے کہ جھنجھنے کو سانپ کی کمر کی ہڈیوں سے بھر دیا جاتا ہے۔''

ولی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''سانپ کی ہڈیاں۔ یہ تو

بہت ہی پراسرار چیز ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے تمہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔''

کلاڈیا نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں ووڈو پر اعتقاد نہیں رکھتی لیکن اس آواز نے مجھے ڈرا دیا۔ میں اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کون تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی بچہ مذاق کر رہا ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا... اس نے مزید میرا تعاقب نہیں کیا یا کم از کم میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے گھر آ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن صبح جب میں دکان پر پہنچی تو میں نے اپنے دروازے پر یہ چیز پڑی ہوئی دیکھی۔''

اس نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک سرخ رومال نکالا۔ اس میں ایک مجسمہ لپٹا ہوا تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے سیاہ ہیٹ اور لمبا فراک نما کوٹ پہن رکھا تھا۔

''ووڈو کے ماننے والے اسے موت کی علامت سمجھتے ہیں۔'' کلاڈیا نے کہا۔ ''اس کا نام بیرون سمیڈی ہے اور لوگ اس کی مورت کو کالے جادو کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''

ولی نے اسے ایک دفعہ اور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت گندی شکل ہے۔''

کلاڈیا نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ''بالکل اسی کی طرح جو اسے چھوڑ کر گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھایا اور واپس سڑک پر آ گئی۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اسے کونے پر کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ ہیٹی ہی تھا اور مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا پھر وہ مڑا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔''

''وہ یقیناً یہاں غیر قانونی طریقے سے آیا ہوگا۔'' ولی نے کہا۔ ''کیونکہ اب یہاں میکاوٹ کا داخلہ ممنوع ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ فرضی نام سے آیا ہوگا۔ کیا تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''دو سال پہلے ہیٹی میں زلزلہ آیا تھا اور شدید زخمیوں کو علاج کے لیے میامی لایا گیا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔''

''سننے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ جو زخمی نہیں ہوئے، وہ بھی اپنے سر اور جسم پر خون آلود پٹیاں لپیٹ کر علاج کی غرض سے یہاں آ گئے۔ انہیں اسپتال لایا گیا جہاں سے وہ غائب ہو گئے۔ سب لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ وہ میکاوٹ تھے۔''

ولی نے اس سے پہلے یہ بات نہیں سنی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہیٹی سے لوگوں کو سمندر کے راستے اسمگل کیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ پکڑے گئے اور انہیں واپس بھیج دیا گیا اور باقی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور مقامی آبادی میں گھل مل گئے۔ غالباً ہیٹی بھی اسی طرح آیا ہوگا۔

''تم نے پولیس میں اس واقعے کی رپورٹ درج کیوں نہیں کروائی؟'' ولی نے پوچھا۔

کلاڈیا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہاں کی پولیس ایسی کئی کہانیاں سن چکی ہے... جن میں لوگ دوسروں پر نقصان پہنچانے کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کے دروازے پر کٹی ہوئی مرغی پڑی ہو تو وہ پولیس میں رپورٹ درج کروا دیتے ہیں کہ ان کے دشمن کالا جادو کر رہے ہیں۔ اگر پولیس کو بتایا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' ولی نے کہا۔ ''میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کی کیا شناخت ہے۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اس کے اندر شیطان چھپا ہوا ہے۔ تم اسے دیکھتے ہی پہچان لو گے۔''

اسی وقت سامنے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو بچے برآمد ہوئے۔ لڑکی کی عمر تقریباً بارہ سال اور لڑکے کی دس سال تھی۔ وہ دونوں بہت پیارے بچے تھے اور ان میں کلاڈیا کی بہت زیادہ شباہت آ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں گھر میں رہنے کے لیے کہا تھا۔'' کلاڈیا ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''انکل کو ہیلو کہو اور واپس جاؤ۔ ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔''

ان کے جانے کے بعد کلاڈیا نے کہا۔ ''میں اپنے بچوں کو اس کے شر سے بچانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو ولی۔''

''مجھ سے جو ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔'' ولی نے کہا۔ حالانکہ اس وقت اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔

وہ سیکنڈ اسٹریٹ پر واپس آیا اور اپنی کار سڑک کے کنارے کلاڈیا کے اسٹور کے سامنے کھڑی کر دی۔ اس کے ایک شوکیس میں خواتین کے ملبوسات اور پینٹنگز جبکہ دوسرے شوکیس میں پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے کنواری مریم سمیت مذہبی پیشواؤں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں سے آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک بوڑھی عورت گنے کا رس بیچ رہی تھی۔ پیٹرولنگ کے زمانے میں ولی اکثر وہاں رک کر گنے کا رس پیتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے دل میں پھر یہ خواہش جاگی۔ ولی نے اس سے تازہ جوس کا ایک

کپ خریدا اور کار میں بیٹھ کر پینے لگا۔

سڑک کے دونوں جانب راہ گیر آ جا رہے تھے۔ ولی کی نظر ایک درمیانے قد کے دبلے پتلے شخص پر گئی۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی اور اس نے سلیٹی رنگ کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ولی نے پہلے تو اس پر کوئی توجہ نہیں دی پھر ایک منٹ بعد اس نے دیکھا کہ وہی آدمی دوسری جانب سے واپس آیا۔ کلاڈیا کی دکان پر رکا اور اس نے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کئی لمحے گزر گئے پھر وہ شخص مڑا۔ اس نے ولی پر نگاہ ڈالی۔ اپنا ہیٹ اوپر اٹھایا اور ہنسنے لگا۔ ولی لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ وہ شخص دیکھنے میں کوئی پاگل لگ رہا تھا۔ اس کی شکل اور دیکھنے کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جو کلاڈیا نے بیان کیا۔ ولی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ میٹی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا لیکن اس وقت تک وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ولی اس کی تلاش میں تیز تیز چلتا ہوا بغلی گلی میں داخل ہوا لیکن وہ وہاں بھی نظر نہیں آیا۔ ولی نے دکانوں کے عقب میں گلیاں بھی دیکھ ڈالیں۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسے تلاش کرتا رہا لیکن میٹی کسی بدروح کے مانند غائب ہو چکا تھا۔

ولی واپس اپنی کار میں آیا۔ اس کی نظر ڈیش بورڈ پر گئی جہاں ویسا ہی سیاہ مجسمہ رکھا ہوا تھا جو کلاڈیا کو اپنی دکان کے باہر سے ملا تھا۔ ولی نے اسے اٹھایا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ میٹی نے بڑی ہوشیاری سے وہ مجسمہ وہاں رکھا تھا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ولی خوفزدہ نہیں تھا بلکہ وہ کلاڈیا اور اس کے بچوں کے لیے فکر مند تھا۔ ممکن ہے کہ میٹی نے اس کی کار وہاں دیکھ کر سوچا ہو کہ وہ کلاڈیا کی دکان کی حفاظت کر رہا ہے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اسے کسی طرح کلاڈیا کے موجودہ ٹھکانے کا علم ہو گیا ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہ بات آسانی سے معلوم کی جا سکتی تھی۔

اس نے کلاڈیا کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم بچوں سمیت کسی ایسی جگہ چلی جاؤ جو لٹل ہیٹی سے باہر ہو۔''

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیوں؟''

ولی اسے تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو جاتی۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''یہ محض احتیاطی تدبیر ہے۔ تم کسی ایسے جاننے والے کے پاس چلی جاؤ جو اس علاقے میں نہ رہتا ہو۔ اس طرح ہم دونوں بچوں کے بارے میں پریشان نہیں ہوں گے۔''

''میرا ایک کزن نارتھ میامی میں رہتا ہے۔ ہم وہاں جا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ابھی اپنا سامان پیک کرو اور وہاں چلی جاؤ۔''

ولی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایلس کے دفتر آ گیا۔ وہ اس وقت کسی کلائنٹ سے مصروفِ گفتگو تھی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے ولی سے کہا۔ ''اب بتاؤ مسٹر شرلاک ہومز۔ تم کہاں تک پہنچے؟''

ولی نے اسے کلاڈیا سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتا دی۔ پھر اس کی میز پر وہ مجسمہ رکھ دیا جو اسے ڈیش بورڈ سے ملا تھا۔

ایلس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ''مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔''

''میرا بھی یہی کہنا ہے۔'' ولی بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ جب میں کلاڈیا سے ملنے گیا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ مارسل میٹی نے ہی اس کے باپ کو قتل کیا ہوگا۔ اس نے اسے تیس سال پہلے دیکھا تھا اور شاید یہی بات اس کے تصور میں تھی۔ میٹی اس کے دماغ میں بس کر رہ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ شخص وہ نہ ہو۔ شاید یہ کوئی دیوانہ ہے جو اسے پسند کرنے لگا ہے اور بے وقوفوں جیسی حرکتیں کر رہا ہے۔''

ایلس نے وہ مجسمہ اٹھا لیا اور اس پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کلاڈیا کوئی اسکول گرل نہیں جو آسانی سے خوفزدہ ہو جائے۔ وہ ایک معتدل مزاج کی بردبار عورت ہے۔ اگر وہ کہتی ہے کہ اس نے اس آدمی کو پہچان لیا ہے تو ہمیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کیوں کر رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو قانون سے بھاگا ہوا ہو، اس کا یہ رویہ ناقابلِ فہم ہے۔''

ولی نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی۔ ''میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس کبھی دوسروں کو خوفزدہ یا دہشت زدہ کرنے کی طاقت تھی، وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا کیا اثر باقی رہ گیا ہے۔ کلاڈیا نے میٹی کو دیکھا اور خوفزدہ ہو گئی۔ میٹی یہی چاہتا ہے اور مجھ پر بھی یہی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں ہے۔''

ایلس نے اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے وہ کسی خیال کو جھٹکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ''پاگل۔''

''شاید وہ پاگل ہی ہو۔ ان برسوں میں اس کے دماغ پر شیطان سوار رہا ہے۔ وہ یقیناً پاگل نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے وہ غیر معمولی خطرناک ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم

اسے کلاڈیا کے قریب آنے اور اسے نقصان پہنچنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر ہم کیا کریں؟''

''اگر ہمارے پاس اس کی کوئی تصویر ہوتی تو اسے پورے علاقے میں پھیلا دیتے اور میں اس کے دوبارہ نظر آنے کا انتظار نہیں کرسکتا لیکن شاید ہم اس کے پاگل پن کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرسکیں۔ ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق اسے باہر نکالنا ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کلاڈیا کی دکان یا کسی اور جگہ یہ سوچ کر آئے کہ وہ وہاں موجود ہوگی اور میں اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔''

ایلس سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کلاڈیا کو چارے کے طور پر استعمال کر رہے ہو؟ کیا یہ کچھ خطرناک نہیں ہے؟''

ولی نے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ یہ فول پروف تو نہیں لیکن اگر ہم نے اسے ورغلا لیا تو میں اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردوں گا پھر ہم یہ ثابت کرسکیں گے کہ وہ میٹی ہی ہے اور اسے مجرم ہونے کی بنا پر جیل بھیج دیا جائے گا۔''

''لیکن تم اسے کیسے ورغلاؤ گے؟''

''فی الوقت میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ میرے یہاں آنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تمہیں لوگوں کو ورغلانا آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس معاملے میں تم سے کچھ مدد لوں۔''

ایلس اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ''یقین کرو کہ میں نے کبھی کسی میکاوٹ کو نہیں ورغلایا۔''

اس نے ایک بار پھر اپنی کرسی کو اس طرح گھمانا شروع کردیا جیسے مسئلے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ کافی دیر تک وہ دونوں خاموش رہے پھر اچانک ایلس نے کہا۔ ''میں سمجھ گئی کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم الفریڈ ویڈال سے ملنے جائیں گے۔''

ولی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''یہ کون ہے؟''

''الفریڈ ایک ریڈیو اسٹیشن چلاتا ہے۔ یہ اسی علاقے میں واقع ہے اور سب لوگ اسے باقاعدگی سے سنتے ہیں۔ وہاں سے ہیٹین میوزک کے علاوہ ہیٹی کی تازہ ترین خبریں بھی نشر ہوتی ہیں۔ ہم اپنے شکار کو ورغلانے کے لیے الفریڈ کی مدد حاصل کریں گے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا؟''

اس سے پہلے ہی ایلس اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئی تھی۔ اس نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کئی سال پہلے اس کی دادی کو یہاں لانے میں مدد دی تھی جب اس کے لیے مشکلات پیدا کی جارہی تھیں، وہ ضرور ہمارا کام کرے گا۔''

ریڈیو سیریول کے اسٹوڈیوز سیکنڈ ایونیو سے آدھے بلاک کے فاصلے پر تھے جو کہ لٹل ہیٹی کا رہائشی علاقہ تھا۔ اس کے ایک مکان میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس کے پیچھے صحن میں بلاک کی چار دیواری بنا کر ایک کمرا کھڑا کیا اور اس پر ایلومینیم کی نالی دار چھت ڈال دی جس پر ایک پندرہ فٹ اونچا انٹینا نصب تھا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور چھت پر تین بلب روشن تھے۔ اس کے علاوہ دو کمپیوٹر اسکرین، کنٹرول پینل اور دو عدد مائیکروفون بھی وہاں نصب تھے۔ کمرے کو ساؤنڈ پروف بنانے کے لیے چھت کی اندرونی سطح پر کارڈ بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ کنٹرول بورڈ کے پیچھے الفریڈ بیٹھا ہوا تھا جو بیک وقت ڈی جے، نیوز کاسٹر، رپورٹر، ٹیکنیشن اور ریڈیو اسٹیشن کے

شناخت

ایک صاحب ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ویٹر کو بریانی کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹا گزر گیا، ویٹر واپس نہ آیا۔ وہ صاحب جھنجلائے بیٹھے تھے۔ وقت گزرتا رہا اور وہ تلملاتے رہے۔ انہوں نے منیجر کو بلا کر کہا۔ میں نے ویٹر کو بریانی لانے کا کہا تھا۔ اتنی دیر گزر گئی محترم واپس نہیں آئے۔ منیجر نے یہ سن کر چند لمحے رک کر سوچا۔ سر! کیا اس کی ڈاڑھی تھی؟ وہ صاحب منیجر کی جرح سے جھنجلا کر بولے۔ پہلے تو نہیں تھی، اب ضرور نکل آئی ہوگی۔

ضروری

کہتے ہیں جو لڑکی سے ملنے سے پہلے اپنے بال درست کرنے لگے وہ جوان اور جو نہ کرے سمجھ لیں وہ بوڑھا ہوگیا۔

حالانکہ جوانی میں بندہ بال درست تو کرتا ہے مگر ملنے کے بعد۔ جہاں تک بڑھاپے کا تعلق ہے، اس میں بال درست کرنے کے لیے لڑکی کا ہونا اتنا ضروری نہیں، جتنا بالوں کا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان ۔ بٹل ہزارہ

مالک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے ایلس کو دیکھا اور بولا۔

"آج تم کیسے ادھر کا راستہ بھول پڑیں؟"

ایلس نے ولی کا تعارف کروایا اور بولی۔ "ہمیں ایک سنجیدہ معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

الفریڈ اپنے بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ "ضرور، مجھ سے جو ہوسکا وہ کروں گا۔"

"تم کلاڈیا جین کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔ وہ ہمارے اسٹیشن پر اشتہار دیتی رہتی ہے۔"

ایلس نے اسے کلاڈیا کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ پوری بات سننے کے بعد الفریڈ نے کہا۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے ریڈیو پر اس کی دکان کے بارے میں کچھ اعلانات کرو۔ اتوار کو ایسٹر ہے اور کلاڈیا نے ڈھیروں تحائف اور مذہبی اشیا بیچنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ تم یہ اعلان کردو کہ کلاڈیا کی دکان ہفتے کی شب رات دس بجے تک کھلی رہے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ خریداری کرسکیں۔"

الفریڈ بولا۔ "گویا تم اس آدمی کو پھانسنے کی کوشش کررہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ یہ اعلان سننے کے بعد کلاڈیا کے گھر جانے کا انتظار اور اس کے ساتھ کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔"

ولی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کے ماضی کے بارے میں جانتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کلاڈیا کو خوفزدہ کرنا چاہتا ہے اور شاید اسے نقصان بھی پہنچائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ اعلان نہ سنے اور اگر سن لے تب بھی کچھ نہ کرے۔ ممکن ہے کہ اسے اندازہ ہوجائے کہ اس کے لیے جال بچھایا جارہا ہے لیکن ہم اسے سامنے آنے پر اکسا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسے قابو کرنا مشکل نہ ہوگا۔"

الفریڈ نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ وہ یہ اعلان سن لے۔ میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ کلاڈیا کی دکان آج سارا دن اور کل رات تک کھلی رہے گی۔ میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ شاید اس طرح ہم اسے پکڑسکیں۔"

دفتر واپس جاتے ہوئے ایلس اور ولی نے اس کے ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی تیار کیا۔ گوکہ ولی کو احساس تھا کہ اس طرح کے اضافی منصوبوں یا اسکیموں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ان کا واسطہ ایک پاگل انسان سے ہے۔

اسے ورغلا کر گھیرنا ایک اچھا آئیڈیا تھا لیکن اس بارے میں یہ سوچنا کہ اس کے بعد وہ کیا کرے گا، بالکل بے سود تھا کیونکہ پاگل لوگ کسی بھی منصوبے میں فٹ نہیں ہوتے لیکن ایلس اور ولی اس انداز میں نہیں سوچ رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک جال تیار کرلیا۔

ایلس اس بات پر رضامند ہوگئی کہ فون کرکے کلاڈیا کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے۔ اس منصوبے میں ایک خاتون سیکیورٹی اہلکار کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام ولی کو کرنا تھا۔ اس نے گھر آکر موریل نیویل کا نمبر ملایا۔ وہ میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرچکی تھی اور اس نے ریٹائر ہونے سے پہلے شہر کے چند حساس مقامات پر فرائض انجام دیے تھے۔ ان دنوں وہ... وقتاً فوقتاً سیکیورٹی کے حوالے سے ولی کی مدد کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کام کے لیے ایک مضبوط اور مناسب شخصیت تھی۔ اس کا فون سنتے ہی وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

"کیا ہورہا ہے ولی؟ کیا تمہارے پاس میرے لیے کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔ اگر تم کرنا چاہو۔ یہ کام تھوڑا خطرناک ہے۔"

وہ چہچہاتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے جانتے ہو ولی۔ میں خطرناک کام ہی کرتی ہوں۔"

ولی نے اسے کلاڈیا کے مسئلے کے بارے میں بتایا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ بولی۔ "تم پریشان مت ہو ولی۔ میں تیار ہوں۔"

ولی نے تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ "تم کل رات ٹھیک ساڑھے نو بجے اس کی دکان پر پہنچ جانا اور اپنا پرانا سروس ریوالور بھی لیتی آنا۔ شاید اس کی ضرورت پڑجائے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔"

اگلے روز صبح کلاڈیا اپنے کزن کے ساتھ دکان پر آئی جو سارا دن اس کے ساتھ کام کرتا تھا، یہ بھی اس منصوبے کا حصہ تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا نوجوان گرینول تھا جسے بیک وقت سیلز کلرک اور باڈی گارڈ کے فرائض انجام دینا تھے۔ ولی کا خیال تھا کہ مٹی اندھیرا پھیلنے سے پہلے نہیں آئے گا اور اگر وہ دن کی روشنی میں آ گیا تو اس سے نمٹنے کے لیے گرینول ہی کافی ہوگا۔

آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب وہ لٹل ہیٹی کے علاقے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی کار کلاڈیا کی دکان سے دو بلاک کے فاصلے پر ایک سائڈ اسٹریٹ میں کھڑی کی۔ وہ

پیدل چلتا ہوا سیکنڈ اسٹریٹ تک آیا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ دکان میں کئی گاہک موجود تھے جو اضافی وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خریداری کر رہے تھے۔ ولی نے کچھ دیر رک کر انتظار کیا پھر دو عمارتوں کے درمیان واقع ایک تنگ گلی میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ کلاڈیا کی دکان پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے گرینول نے اپنی شفٹ ختم کی اور کلاڈیا کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ بھی پہلے سے طے شدہ تھا گو کہ گرینول اس سے متفق نہیں تھا لیکن ولی نے اسے قائل کر لیا کیونکہ میٹی کو باہر نکالنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ اس نے گرینول سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی کزن کا پورا خیال رکھے گا۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ دکان کی نگرانی کرتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے موریل بول رہی تھی۔

''میں یہاں آ گئی ہوں ولی۔'' اس نے اپنی کار دکان کے عقب میں کھڑی کی تھی۔

''وہاں قرب و جوار میں کوئی اور تو نہیں؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اندر چلی جاؤ۔''

دو منٹ بعد کلاڈیا اسٹور کے عقبی حصے میں واقع اسٹاک روم میں چلی گئی پھر چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی لیکن وہ کلاڈیا نہیں بلکہ موریل تھی۔ اس نے بھی سیاہ لباس اور سر پر سرخ رومال لپیٹا ہوا تھا جبکہ کلاڈیا پیچھے سے نکل کر گھر چلی گئی۔ اس طرح منصوبے کا یہ حصہ مکمل ہو گیا۔

اگلے آدھے گھنٹے تک موریل دکان کی مالک کی طرح حرکتیں کرتی رہی۔ کبھی سامان کو ترتیب سے رکھتی۔ کبھی جھاڑ پونچھ کرتی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتی رہی تاکہ وقت پر دکان بند کر دے، اس دوران کوئی بھی دکان میں داخل نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں سے گزرا۔

دس بجے کے قریب اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا۔ دکان کی روشنیاں بجھائیں۔ باہر نکل کر تالا لگایا اور کلاڈیا کے مکان کی جانب چل دی۔ وہ خالی سڑک پر بڑے سکون سے چلی جا رہی تھی۔ ولی نے دیکھا کہ اس کا رخ شمال کی جانب تھا اور کوئی بھی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس گلی سے باہر نکل آیا اور ایک بلاک کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔

منصوبے کے مطابق موریل نے سیکنڈ اسٹریٹ پر دو بلاک کا فاصلہ طے کیا اور پھر کمرشل ایریا کو چھوڑ کر بائیں جانب مڑ گئی۔ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی جس پر ایک خستہ حال چرچ، کچھ پرانی دکانیں اور ایک خالی میدان تھا جہاں دن میں عارضی بازار لگتا تھا۔ ولی پوری طرح چوکس تھا کہ میٹی کسی وقت بھی تاریکی سے برآمد ہو سکتا ہے۔ موریل آگے بڑھتی رہی لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔

ایک بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد موریل نے سڑک پار کی۔ لمحہ بھر کے لیے ولی کی جانب دیکھا اور ایک بغلی سڑک پر غائب ہو گئی جو مغرب کی جانب جا رہی تھی۔ ولی نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ وہ زیادہ دیر تک اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ یہ سڑک بہت زیادہ تنگ اور تاریک تھی۔ مکانات درختوں سے گھرے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ ان میں کوئی نہیں رہتا۔ یہاں کوئی بھی چھپ کر موریل پر حملہ آور ہو سکتا تھا لیکن وہ وہاں سے گزرتی چلی گئی اور کسی نے مداخلت نہیں کی، تب ولی نے سوچنا شروع کر دیا کہ میٹی کو پھانسنے کی کوشش محض وقت کا زیاں ثابت ہو گی شاید۔

موریل اگلے کونے پر پہنچ کر شمال کی جانب مڑ گئی۔ وہ بھی اسی سڑک پر پہنچ گیا اور دوبارہ اس کے تعاقب میں جانے ہی والا تھا جب اس نے اپنے عقب میں ایک آواز سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ موریل نے یہ آواز نہیں سنی اس لیے وہ چلتی چلی گئی۔ ولی نے اسے جانے دیا اور اپنی رفتار آہستہ کر کے محتاط انداز میں جنوب کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ آواز دوبارہ آئی جیسے بہت سی ہڈیاں ہل رہی ہوں۔ اس بار یہ آواز تاریک مکانوں کے عقب سے آئی تھی۔ ولی سمجھ گیا کہ اب اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ میٹی نے کلاڈیا کو چھوڑ کر اپنی توجہ اس پر مرکوز کر دی تھی۔ اس نے اپنی گن نکالی اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ ایک گلی کے سرے پر کھڑا ہوا تھا جو مکانوں کے عقبی صحن کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اندھیرے میں ایک شخص کھڑا ہوا نظر آیا جسے ولی نہیں پہچان سکا لیکن دوسرے ہی لمحے وہی آواز دوبارہ آئی۔ جیسے ہی ولی اس کی جانب بڑھا، اس شخص نے گلی کی جانب دوڑ لگا دی۔ ولی نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ میٹی نے سڑک پار کی اور آگے کی جانب بڑھتا چلا گیا پھر آدھے بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بائیں جانب مڑا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ولی دوڑتا ہوا اس جگہ تک آیا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ایک لوہے کا گیٹ تھا جو ایک خستہ حال لکڑی کے مکان کے صحن میں کھل رہا تھا۔ وہ سارے مکان تاریکی میں ڈوبے

ہوئے تھے۔ یہ اندرون شہر کا تباہ حال علاقہ تھا اور ان میں رہائش متروک ہو چکی تھی۔ اس مکان کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے وہی آواز آرہی تھی۔

ولی تھوڑا سا ہچکچایا۔ یہ مکان اس کے لیے ایک جال تھا جس میں اسے داخل ہونے کی ترغیب دی جارہی تھی لیکن وہ اس کے علاوہ کیا کرسکتا تھا۔ اس کے پاس پولیس کو فون کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میٹی نے کلاڈیا کو دیکھ کر مسکرانے، اسے ڈرانے اور اس کے دروازے پر مجسمہ چھوڑنے کے سوا کیا کیا تھا، اس لیے ولی کو خود ہی کچھ کرنا تھا۔

وہ گیٹ سے گزر کر اندر داخل ہوا اور دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا دوسرے دروازے تک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گن پکڑ رکھی تھی۔ پورے گھر میں تاریکی اور ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر سوئچ تلاش کیا لیکن روشنی نہیں ہوئی۔ اس گھر میں بجلی نہیں تھی۔ وہ آواز اب بھی آرہی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کوئی گنگنا رہا تھا۔

اس نے بہ آواز بلند پکارا۔ ''میٹی!''

اسے سانپ کی ہڈیوں کی آواز اور کسی کی بڑبڑاہٹ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیا۔ وہ ہال کی طرف بڑھا۔ اس کے بالکل سامنے کارڈ بورڈ کی چھت کا ایک ٹکڑا گر کر لٹکا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا راستہ رک گیا۔ وہ اس رکاوٹ کے پاس سے گزرتا ہوا دوسری ڈیوڑھی تک پہنچا اور جیب سے موبائل نکال کر اس کی ٹارچ روشن کردی۔ اس نے روشنی کا رخ دائیں جانب ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کیا، جہاں ایک میلا سا گدا پڑا ہوا تھا اور اس پر ویسی ہی چادر بھی بچھی ہوئی تھی۔ گدے کی چاروں طرف بجھی ہوئی موم بتیوں کا موم پڑا ہوا تھا۔ گویا یہ جگہ میٹی کا ٹھکانا تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ دوسرے کمرے سے اسے موم بتی کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ وہ لیونگ روم تھا، جس کی کھڑکیاں ٹوٹ چکی تھیں اور بوسیدہ فرنیچر ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس کمرے کی چھت بھی خستہ حالت میں تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کمرے کے آخری سرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہاں اس نے میٹی کو دیکھا۔ وہ ایک قربان گاہ کے سامنے کھڑا ہوا تھا جو لکڑی کی ایک چوکور میز پر بنی ہوئی تھی۔ وہاں ایک چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ ارد گرد مرجھائے ہوئے پھول، شراب کی خالی بوتلیں، گلے سڑے پھل اور دو کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میٹی نے بھی ووڈو عقیدے کے مطابق موت کے فرشتے کا روپ دھار رکھا تھا۔ اس مجسمے کی طرح اس نے بھی سیاہ ہیٹ اور لمبا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے جھنجھنا بجایا اور دائیں ہاتھ سے پکڑا ہوا چاقو اپنی گردن تک لے گیا۔

''چاقو پھینک دو۔'' ولی نے اپنے اندرونی خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا اور گن کا رخ میٹی کی جانب کرلیا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اس نے ولی کی جانب بڑھنا شروع کردیا۔ ولی کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی عنقریب قربان گاہ کی بھینٹ چڑھنے والا ہے اور میٹی اس کا بھی سر کاٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ میٹی پر گولی چلادے لیکن اس سے پہلے ہی وہ کچھ ہوگیا جس کی اسے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔

ولی نے اس کا نشانہ لیا ہی تھا کہ اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔ ''رک جاؤ۔'' پھر موریل دوڑتی ہوئی اس کے پاس سے گزری اور اس نے میٹی کے گھٹنے پر زوردار لات رسید کی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ موریل نے جیب سے ریشمی ڈوری نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھ دیے پھر اس کا چاقو رومال میں لپیٹ کر ولی کو دیتے ہوئے بولی۔ ''پولیس کو فون کرو۔''

ولی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔''

''ہاں لیکن جب یہ شخص میرے تعاقب میں نہیں آیا تو میں سمجھ گئی کہ اس نے اپنا ہدف تبدیل کرلیا ہے اور اب یہ تمہارے لیے جال بچھا رہا ہے چنانچہ جب تم اس پراسرار آواز کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھے تو میں بھی فاصلہ رکھ کر تمہارا تعاقب کرنے لگی۔ میرا خیال درست نکلا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتی تو تم دونوں میں سے ایک کی موت یقینی تھی۔''

ولی نے یہ سوچ کر سکون کا سانس لیا کہ اس کے ہاتھوں ایک خون ہونے سے رہ گیا۔ میٹی کے چاقو پر اس کی انگلیوں کے نشانات اور پراسرار قربان گاہ اسے حملہ آور ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتے، اس کے علاوہ اس پر امریکا میں ناجائز طور پر داخلے، غیر قانونی قیام اور کلاڈیا کو ہراساں کرنے کے الزامات بھی تھے۔ اگر کوئی الزام ثابت نہ ہوسکا تب بھی اسے ملک بدر کردیا جائے گا اور اس طرح کلاڈیا ہمیشہ کے لیے اس کے خوف سے آزاد ہوجائے گی۔

شہ مات

زویا اعجاز

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عقل و شعور اور دانائی انسان میں نہیں بلکہ مقدر میں محفوظ کردی ہے۔ کبھی نشیب تو تقدیر کی نارسائی کا نوحہ اور کبھی فراز تو مقدر کی مہربانی۔ وہ جو خود کو لفظوں کا جادوگر سمجھتا تھا جانے کیسے اس کی نفرت کے طلسم کدہ میں قید ہوگیا اور نفرت و حسد کے جذبات کی آگ میں اس نے نہ صرف اپنے مستقبل کو جلا ڈالا بلکہ اپنے شاندار ماضی کو بھی راکھ کرلیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب انسان خود کو عقلِ کُل سمجھ بیٹھے تو اکثر تیز طوفان اس کی کشتی کو بھنور میں ڈال کر تماشا دیکھتے ہیں۔

ایک ایسے بازی گر کا قصہ جس کی کتابِ زیست میں

شکست کہیں نہیں لکھا تھا

میں ایک کامیاب لکھاری ہوں۔

الفاظ میرے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔

میری انگلیوں کی جنبش سے ہر روز صفحۂ قرطاس پر ان لفظوں کی تتلیاں رقص کرتی ہیں اور پھر اس رقص کی تال میل قارئین کے دلوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کر دیتی ہے اور بالآخر میرے ''فین'' بن جاتے ہیں۔

قاری اور لکھاری کا یہ رشتہ بھی بہت انوکھا ہوتا ہے۔ الفاظ کی ڈور سے بندھا ایک بے عنوان قلبی تعلق استوار ہو جاتا

ہے جو وقت کی ناؤ کے ساتھ بہتا ہوا کبھی بے حد کامیاب رہتا ہے اور کبھی محض ایک کسک بن کر رہ جاتا ہے۔ آج جانے کیوں اپنی کہانی لکھنے کے لیے بھی دل مچل اٹھا۔ خوشی خوشی کاغذ قلم تھاما تو کچھ ہی لمحوں میں اندازہ ہوگیا کہ خود احتسابی کے عمل سے گزرنا کس قدر کٹھن ہوتا ہے۔

میرا نام رانا راحیل ہے ...... اور میں ایک لکھاری ہوں۔ لکھنا میرا جنون ہے لیکن پیشے کے اعتبار سے میں ایک ''بینکار'' ہوں۔ ممکن ہے بینکاری اور تخلیقی سفر کا یہ ملاپ آپ کے لیے بہت انوکھا ہو لیکن جب آپ میرے الفاظ کی انگلی تھامے میری دنیا کی سیر کریں گے تو یہ چھوٹی موٹی الجھنیں دور ہوتی جائیں گی۔ بحیثیت لکھاری یہ بات مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ زندگی میں ہر کہانی کی داغ بیل بچپن میں ہی پڑ جاتی ہے اور پھر مستقبل میں پیش آنے والا ہر واقعہ اسی کی کڑی ثابت ہوتا ہے۔ میرا بچپن بھی بہت دلچسپ تھا۔ گروہ کے سبھی لڑکے شرارتوں میں اپنی مثال آپ تھے اس لیے ہم ''تخریب کار'' کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔

شاہدرہ کی پُرپیچ گلیوں میں بنٹے کھیلنا، چھت پر دوستوں کے ساتھ مل کر پتنگیں اُڑانے کے بعد بھی اگر وقت بچ جاتا تو ہم سبھی لڑکے دریائے راوی کی لہروں کے ساتھ نت نئے مشغلے تخلیق کر لیتے تھے۔

ان دنوں اس علاقے میں دس سال قبل پڑوسی ملک کی افواج کے ایک ناکام حملے کی بازگشت، راوی کا پُل توڑنے کی کوشش کے احوال نے لوک ورثے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس دریا کی حیثیت بھی ہم سب کے لیے کسی بھی چیلنج سے کم نہ تھی۔

ہاں! تو میں بتا رہا تھا کہ میرا بچپن دو حصوں میں تقسیم تھا۔

☆☆☆

''راحیل! کدھر غائب تھے صبح سے؟'' گھر میں داخل ہوتے ہی میری سماعت میں بڑے بھائی کی آواز آئی۔

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ راوی کے کنارے کھیل رہا تھا۔'' میں نے معصومیت سے جواب دیا۔

''میرے کمرے میں چند سوٹ پڑے ہیں ...... وہ دھوبی کو دے آنا ...... کلف لگا کے اچھی طرح استری کرنی ہے۔'' انہوں نے حسبِ سابق میرے لیے کام کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی۔

''جی بہتر ...... میں ابھی دے آتا ہوں۔'' میں نے تابع داری سے سر جھکا کر کہا تو انہوں نے اپنے بٹوے سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔

صحن کے کونے میں موجود ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر میں نے ہاتھ منہ دھوئے ہی تھے کہ ایک اور آواز سماعت میں پڑی۔

''راحیل! لائبریری سے میری کتابیں لے آئے کیا؟''

یہ میرے دوسرے بھائی تھے جو مطالعے کے بہت شوقین تھے۔ علاقے میں موجود واحد لائبریرین سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی اس لیے مجھے رابطے کا ذریعہ بنا کر اکثر کتابیں منگوا لیا کرتے ...... وہ ذاتی آمدورفت سے اجتناب ہی کرتے تھے کیونکہ کتابوں سے سر اٹھانا انہیں پسند ہی نہ تھا۔

''آپ کی الماری میں رکھ دی تھیں۔'' میں نے وہیں سے تان لگائی۔

''میں نے دیکھی ہی نہیں ...... آئندہ جب بھی کتابیں لاؤ تو میری میز پر رکھا کرو۔'' انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ہونہہ! ان سے فرصت ملتی تو الماری دیکھی ہوتی نا ...... خوامخواہ رعب جمانا آتا ہے بس مجھ پہ ...... ہڈحرام کہیں کے ......'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''جی بہتر! آئندہ خیال رکھوں گا۔'' میں نے ایک بار پھر مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

صدیق بھائی بہت خوش ہوئے اور مجھے فوری انعام سے نواز دیا۔

شام کو دوستوں میں شیخی مارنے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے دونوں جانب سے ملی یہ ''رقوم'' نعمت تھیں۔ میری اس تابع داری کی اصل وجہ بھی یہی تھی ...... ورنہ منہ میں زبان تو ہم بھی رکھتے تھے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور اسی ناتے بڑے بھائیوں کے فرمائشی پروگرام پورے کرنے کی ذمے داری میرے ناتواں کندھوں پر ہی تھی۔ میرے دونوں بھائی ذہانت اور سنجیدگی میں بے مثال تھے۔

بڑے بھائی حمید یونیورسٹی میں جرنلزم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہیں کلف دار شلوار قمیص پہننے کا بہت شوق تھا۔ دھوبی کی دکان پر چکر لگانے میں میں اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا لیکن انہیں اپنی بلبلاہٹ جتانے کی غلطی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

صدیق بھائی کو لٹریچر پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ یوں تو ہمارے گھر میں سگریٹ، پان کے نشے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن جانے کیوں ابا جان نے کبھی بھی صدیق بھائی کو کتب بینی کے نشے سے روکنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی اخباری تراشہ یا کتاب بائیں ہاتھ میں ضرور تھامے رہتے۔

اب رہ گیا میں ...... رانا راحیل ...... مجھے کتابوں کا شوق تھا

نہ ہی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کوئی دلچسپی تھی۔ میں آزاد فضاؤں کا پنچھی تھا اور آزاد ہی رہنا چاہتا تھا۔ اسکول کے بجائے میرا دل دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں لگتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بمشکل 33 فیصد نمبر لے کر اگلی جماعت میں منتقل ہوتا رہا۔

دونوں بھائیوں کے احکام بجالانے سے میرے خوب وارے نیارے رہتے تھے۔ ابا جی، امی جی سے اینٹھے گئے پیسوں کے علاوہ بھائیوں کی دی گئی انعامی رقم جیب میں ڈالے جب میں اپنے دوستوں کے پاس جاتا تو احساسِ تفاخر سے گردن میں تناؤ اور سر بلند ہوا کرتا۔

''ارے راحیل! اتنے پیسے کیسے مل جاتے ہیں تمہیں؟ ایک ہمارے والدین ہیں کہ بمشکل چار آنے یا آٹھ آنے دے کر بھی حساب طلب کرتے ہیں۔'' میرے بچپن کا دوست خاور اکثر حسرت ناک انداز میں کہتا تو میرے دل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے۔

''مجھ سے تو کبھی کوئی حساب طلب نہیں کیا گھر والوں نے...... وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔'' میں اطمینان سے کہتا۔

''بہت خوش قسمت ہو تم۔'' دوسرا دوست رشید بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

''بالکل! خوش قسمت تو میں واقعی بہت ہوں۔''

اس کے بعد ہم سب دوست مل کر ریڑھی والے سے مسالا لگا بھٹا، کٹی ہوئی مسالے دار مولی، چھوٹی سی ڈبیا میں بند کھٹا ناٹری نما چورن اور برف والے رنگ برنگے گولے خرید کر خوب مزے سے کھاتے۔

مجھے اس چھوٹی سی عمر میں ہی فتوحات اور تسخیر کی لت لگ گئی تھی اور صدیق بھائی کے بے ضرر شوق کو الٹے سیدھے القاب دیتے ہوئے میں یہ جان ہی نہ پایا کہ رانا راحیل بھی ایک مہلک ترین نشے کا شکار ہو چکا ہے۔

خود پسندی اور جذبۂ تسخیر کا نشہ...... خواہ اس کے لیے کتنے ہی جھوٹ کیوں نہ بولنے پڑتے۔

☆☆☆

جھوٹ بولنے کی یہ عادت کب اور کس طرح میرے اندر پروان چڑھی، میں آج بھی اس حقیقت سے لاعلم ہوں جتنا بچپن کے اس دور میں تھا۔ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے کے بعد شام سے قبل ہی گھر لوٹ آتا تھا، بصورتِ دیگر ابا جی پٹائی کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔

''سارا دن گلیاں ناپنے کے سوا اسے کوئی فرصت ہی نہیں...... میٹرک میں آچکا ہے لیکن سنجیدگی اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔'' وہ امی جان کے درپے ہو جاتے۔

''بچہ ہی تو ہے ابھی...... سنبھل جائے گا۔''

''میں سمجھاؤں گا اسے ابا جی! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟'' حمید بھائی اس صورتِ حال میں نجات دہندہ ثابت ہوا کرتے تھے۔

''سمجھا ہی لو تو بہتر ہے ورنہ میں کسی بھی سخت اقدام سے گریز نہیں کروں گا۔''

ابا جی کے ارادے بہت خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروانے کا منصوبہ ترتیب دیے بیٹھے تھے لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نیا گھرانا آباد ہو گیا۔ قدوسی صاحب ایک ریٹائرڈ فوجی تھے جو اکہتر کی جنگ میں زخمی ہونے کے بعد اپنے فرائض سے سبکدوش کر دیے گئے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک ہی بیٹا تھا اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ وہ میرا ہم عمر تھا۔

اظہر پڑھائی لکھائی میں جناتی خوبیوں کا مالک تھا۔ اسکول کے کام کاج سے فراغت پاتے ہی وہ ہمارے ساتھ کھیل کود میں شامل ہو جاتا۔ اب ''تخریب کار گروہ'' ٹھہرا سدا کا نکما...... انہیں اظہر کی یہ خوبیاں بہت بھانے لگیں اور نتیجتاً میری ذات پسِ پشت چلی گئی۔ گھر میں بھی آئے روز اسی کا ذکر ہونے لگا۔

''قدوسی صاحب کا لڑکا بہت فرمانبردار ہے بھئی! پڑھائی میں بھی ہوشیار ہے۔'' ابا جی اس سے کافی متاثر تھے۔

''ہمارا راحیل بھی کسی سے کم نہیں ہے جی! وہ بھی اپنے بھائیوں یا ہمارے سامنے نظر نہیں اٹھاتا۔'' امی جی کی ممتا تڑپ اٹھتی۔

''مجھے اس کی تابع داری پر کوئی شک نہیں...... میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب پڑھائی میں بھی سنجیدہ ہو جائے۔''

''اظہر کی قابلیت نے مجھے بھی بہت متاثر کیا ہے...... اس روز نیاز کے چاول دینے گھر آیا تو میرے ہاتھ میں شیکسپیئر کا ڈراما ''ہیملٹ'' دیکھ کر کہنے لگا کہ وہ اسے پچھلے سال ہی پڑھ چکا ہے۔'' صدیق بھائی نے بتایا۔

''بہت خوب! اس عمر میں مطالعے کا ایسا شوق؟'' حمید بھائی نے ہونٹ سکوڑے۔

''جی ہاں! میں نے اپنی کتابوں کی ذمے داری اسے سونپ دی ہے۔ اس کے ذوق اور کتب کے لیے احترام نے میرا دل موہ لیا۔''

یہ صورتِ حال بہت تشویش ناک تھی۔ میری برسوں کی

محنت خاک میں ملتی دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس کا حل بھی تلاش کرلیا اور غیر محسوس طریقے سے اظہر سے دوستی بڑھالی۔ شام کے اوقات میں جب سبھی لڑکے کھیلنے کے لیے اکٹھے ہوتے تو میں اس سے قبل ہی اپنی کوئی نہ کوئی کتاب تھامے اس کے پاس چلا جاتا اور الجھن بھرے انداز میں کہتا۔

''یار اظہر! مجھے ریاضی کی اس مشق کی اسکول میں سمجھ نہیں آئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں، جب ہم ہیں تو کیا غم ہے...... میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر جواب دیتا اور میرا مسئلہ حل کردیتا۔

اس کی صحبت میں رہتے ہوئے ایک جانب میری نصابی کمزوریاں دھیرے دھیرے دور ہوئیں تو دوسری جانب گھر والے بھی مجھ سے راضی رہنے لگے لیکن میں اب بھی اظہر کے باعث ہونے والی اپنی سبکی نہیں بھولا تھا۔ میری بہت سی خفیہ صلاحیتوں میں ایک خوبی ''منتقم مزاجی'' بھی تھی۔ میں کسی کو بھی اپنی ذات پر حاوی ہوتے دیکھ سکتا تھا نہ ہی اپنی سبکی برداشت کرسکتا تھا۔

اظہر قدوسی سے بھی اس تاوان کی وصولی کے لیے میں نے ''ٹائمنگ'' سیٹ کرلی تھی۔

☆☆☆

پڑھائی میں سنجیدگی اختیار کرنے کے بعد میرا نتیجہ تینتیس فیصد سے بڑھ کر ساٹھ فیصد کا ہندسہ عبور کرگیا۔

اس بہتری کے بعد گھر اور اسکول میں مجھے خوب پذیرائی ملنے لگی۔ میری تو گویا دلی مراد برآئی تھی۔ پذیرائی روزِ اول ہی سے میری کمزوری تھی۔

اسی دوران میٹرک کے بورڈ امتحانات کا وقت آن پہنچا۔ اظہر نے تیاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہمارے اہلِ خانہ میں بھی اچھے تعلقات قائم ہوچکے تھے۔ اظہر تو ہمارے گھر میں آزادانہ کہیں بھی آجاتا لیکن میں ان کے بیرونی ڈرائنگ روم تک محدود تھا۔ اکثر ہم وہیں کمبائن اسٹڈی بھی کرلیا کرتے۔ امتحانات سے ایک روز قبل قدوسی صاحب کو اپنی کپڑوں کی دکان کے لیے مال خریدنے کی غرض سے دوسرے شہر میں جانا پڑا۔ اسی رات میں نے اظہر کی ''رول نمبر سلپ'' ڈرائنگ روم میں پڑی کتاب سے نکال کر اپنی جیب میں رکھی اور رستے میں اسے پرزے پرزے کرکے گٹر میں پھینک دیا۔

اگلے روز اظہر پرچہ دینے کے لیے نااہل ہوچکا تھا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

حمید بھائی نے اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے بورڈ آفس سے اس کی متبادل سلپ جاری کروا دی لیکن اس دوران دو پرچے ہوچکے تھے۔ اب اظہر قدوسی کا نتیجہ جو بھی آتا...... دو پرچوں میں ''کمپارٹ'' کا داغ اس کے رزلٹ کارڈ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوچکا تھا۔

میرا وجود ہلکا پھلکا ہوگیا۔ نہایت اطمینان اور لگن سے پرچے دیے اور اپنی منصوبہ بندی کے اگلے حصے پر عمل شروع کردیا۔ تین ماہ کی فراغت میں صدیق بھائی کی ذاتی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو ان کتب نے مجھے اپنا اسیر کرلیا۔ جوں جوں مطالعے میں اضافہ ہوا میری سوچ، فکر اور ذہنی افق میں بے شمار تغیرات رونما ہونے لگے۔ تخریب کار گروہ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد میں اپنے مستقبل کے لیے بے حد سنجیدہ ہوچکا تھا۔

کالج کی زندگی کا آغاز ہوا تو تسخیر کا ایک اور جہاں میرا منتظر تھا۔ یہاں ایک نہیں کئی ایک اظہر قدوسی تھے جنہیں مات دینے کے لیے میں نے ذہانت اور پڑھائی کے ہتھیار تیز کرلیے اور کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ کتابوں سے دوستی نے مجھے یونیورسٹی میں ادبی میگزین کا رکن بنادیا۔

میگزین کے لیے لکھی گئی پہلی ہی کہانی مقبول ہوگئی۔ اساتذہ اور ادبی سوسائٹی کی مدح سرائی سے ملنے والی خوشی انمول تھی۔ اسی پل میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ''مصنف'' بن کر تخلیقی میدان میں اپنا نام منواؤں گا تاہم میرے اہلِ خانہ اس فیصلے پر قطعی خوش نہ تھے۔ وہ مجھے اب بھی گھر کے سب سے چھوٹے بچے ہی کی طرح سمجھتے اور برتاؤ کرتے تھے۔ اس لیے ایک نیا محاذ کھول لیا گیا۔

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں راحیل! لیکن تمہارا فیصلہ سراسر جذباتی ہے۔'' صدیق بھائی نے مجھے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

''جذباتی کیسے ہوگیا بھائی...... کم از کم آپ تو میری مدد کیجیے...... کتاب دوستی میں نے آپ ہی سے تو سیکھی ہے۔''

''میری دعا ہے کہ تمہاری یہ دوستی ہمیشہ یونہی قائم رہے لیکن اسے بطور پیشہ اپنانے کے حق میں، میں بالکل نہیں ہوں کیونکہ قلمکار ہمیشہ پس ماندگی کا شکار رہا ہے۔''

''میں اپنی محنت اور زورِ بازو سے یہ ٹرینڈ بدل دوں گا۔'' میرے جوش بھرے لہجے پر وہ مسکرانے لگے۔

''خواب دیکھنا اچھی بات ہے راحیل...... لیکن خوابوں میں رہنا حماقت ہے۔ چند سال بعد جب تم اپنے ہم جماعت لڑکوں کو باوقار سرکاری نوکری، تعیشات سے بھرپور زندگی سے

محظوظ ہوتے دیکھو گے تو اس وقت اپنے اس فیصلے کی بابت شدید بے چینی کا شکار ہو جاؤ گے۔'' انہوں نے مستقبل کا ایک ہولناک نقشہ کھینچا۔

''میں تمہارے اس شوق کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بننا چاہتا...... بلکہ مجھے تو قلم سے تمہارا ناتا جڑنے پر بہت خوشی ہے...... لیکن میرے بھائی! میں یہ بھی تو نہیں چاہتا کہ تم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ۔''

صدیق بھائی میرا کندھا تھپتھپاتے چلے گئے۔ اب گیند میرے کورٹ میں تھی...... اور میں کبھی بھی گھاٹے کا سودا کرنے کا عادی نہ تھا۔ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک اہم فیصلہ کیا اور اپنی متعین کردہ منزل کے حصول کے لیے کمر کس لی۔

☆☆☆

پہلے مرحلے میں رانا راحیل کی زندگی سے غیر سنجیدگی اور لاابالی پن کا خاتمہ میں نے بہت اہتمام سے کر ڈالا۔

میرا رجحان اعداد و شمار اور معاشیات کی جانب تھا لہٰذا میں نے بینکاری کا شعبہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ میگزین میں میری تحریریں اور آرٹیکل بھی شائع ہوتے رہے۔ پذیرائی اور توصیف میری رگوں میں خون گرما دیتی اور میں ایک نئے جذبے سے محنت کا آغاز کر دیتا۔

سالہا سال کی لگن بالآخر رنگ لائی اور میں ایک سرکاری بینک سے وابستہ ہو گیا۔ والدین اور بھائیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حمید بھائی ملک کے معروف ترین اخبار میں صحافی بننے کے بعد شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے جبکہ صدیق بھائی ''کالج'' میں لیکچرار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی شادی تین ماہ بعد طے تھی۔

نوکری ملتے ہی والدین کے دل میں میری شادی کے ارمان مچلنے لگے۔ ویسے سچی بات بتاؤں تو میں خاصا رومان پسند، حسن پرست اور صنف نازک کی قدر کرنے والا شخص تھا۔ یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم کئی ایک لڑکیوں سے دوستی بھی قائم رہی تاہم زندگی کے اس اہم ترین موڑ پر میں شادی کی بابت کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا بلکہ اب تو طویل انتظار کے بعد وہ لمحات میسر آئے تھے جب پذیرائی، مدح سرائی اور تعریف کے ان مسحور کن الفاظ کو دائمی روپ دیا جا سکے۔

میں نے باضابطہ ''لکھاری'' بننے کے لیے کمر کس لی۔

یونیورسٹی میگزین میں ملی شہرت سے مجھے یقین تھا کہ میری تحریریں ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی لیکن یہ گمان پانی پر لکھی تحریر ثابت ہوا اور پہلے ہی مرحلے پر مجھے دن میں تارے نظر آ گئے۔ شہر کے مشہور جریدے نے کئی ماہ تک میری ایک کاوش اپنے پاس رکھنے کے بعد نہایت بے دردی سے مسترد کر دی اور دوٹوک انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آپ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن فی الوقت اپنا مطالعہ وسیع کیجیے۔''

میری انا اور وقار پر بہت کاری ضرب لگی لیکن میں ان مشکلات کو خاطر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ نوکری کے اوقات کے بعد صدیق بھائی کے ذاتی ذخیرے میں موجود مشہور ادباء کی کتابوں کا مطالعہ ازسرِنو شروع کیا تو لٹریچر کی وسعت اور پھیلاؤ دیکھ کر حقیقی معنوں میں دنگ رہ گیا۔ شہر بھر میں موجود کتب خانوں کی خاک چھاننے میں ماہ و سال کا حساب ہی بھول چکا تھا۔

صدیق بھائی کے مشورے ان دنوں میرے لیے بہت صائب ہوتے۔ وہ میری ہمت بندھاتے ہوئے اکثر ایک ہی بات دہراتے تھے۔

''لگن اور محنت کسی بھی ناممکن امر کو ممکنات میں بدل دیتی ہے...... اور کسی بھی پہاڑ پر چڑھنے کے لیے طویل چھلانگ نہیں لگائی جاتی۔''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

''تمہاری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تم مشکلات کے سامنے ڈٹ جاتے ہو لیکن جانتے ہو تمہاری سب سے بڑی خامی کیا ہے؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور مختصر وقت میں بڑی کامیابی کے حصول کی خواہش تمہاری کمزوری ہے اور اگر تم نے اس کمزوری پر قابو نہ پایا تو اس میدان میں کامیابی نہیں سمیٹ سکو گے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''صبر اور سکون سے اس سفر کا دوبارہ آغاز کرو...... اور ایک بات ذہن نشین کر لو کہ کامیابی کی بلندی پر ایک ہی جست میں رسائی ممکن نہیں ہوتی...... اس سفر کے آغاز میں تمہارے قدم چھوٹے لیکن مضبوط ہونے چاہئیں...... پھر دیکھنا کامیابی تمہارے قدم خود بخود چومے گی۔''

میں نے یہ بات ذہن نشین کر لی اور شہر کے ایک نسبتاً کم معروف جریدے میں اپنی تحریر بھیج دی۔ چھ ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر ''رانا راحیل'' کا نام ایک رسالے میں جگمگاتا دیکھ کر میرے محسوسات ناقابلِ بیان تھے۔

میں نے اپنی راہ میں حائل رکاوٹوں کو مات دے دی

تھی۔ رانا راحیل کے راستے میں جو بھی رکاوٹ آتی ہمیشہ اپنے وجود پر شرمسار رہتی۔

☆☆☆

اس کے بعد یہ سفر کبھی تھم نہ سکا۔

میرے دل و دماغ پر ایک جنون سا حاوی تھا۔ بینک سے گھر آتے ہی کاغذ قلم تھام لیتا اور اپنے اردگرد پھیلے معاشرتی ناسوروں زخمی روح کے حامل کرداروں اور بوسیدہ سوچ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا۔

دھیرے دھیرے مجھے کامیابی ملتی چلی گئی گویا رانا راحیل کا قلم نکھرتا جا رہا ہے۔

ہر ماہ کم و بیش قارئین کے تبصرے مجھے ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کر دیتے اور میں شعوری کوشش کے تحت اپنی اگلی تحریر میں مزید بہتری پیدا کرنے کے لیے جت جاتا اور مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کامیابی کی دیوی مجھ پر مہربان ہو چکی تھی۔

یہ سفر شاید یونہی عالمِ مدہوشی میں جاری رہتا لیکن میرے اہلِ خانہ اب شدید تحفظات میں مبتلا ہونے لگے تھے۔ ایک روز امی جان شام کے وقت میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔

''راحیل پتر! کبھی دو گھڑی بوڑھے ماں باپ کے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔''

''آپ حکم کیجیے امی جی! میں ساری دنیا ترک کر کے آپ کے قدموں میں زندگی بسر کرنے کے لیے راضی ہوں۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔

''حمید اور صدیق کے الگ گھروں میں منتقل ہونے کے بعد گھر میں سناٹے اتر آئے ہیں۔ میں اب جلد از جلد تیری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ تیری عمر کے سبھی لڑکے دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ان لڑکوں نے آپ کے بیٹے جیسی شہرت اور کامیابی بھی تو نہیں پائی نا۔'' میں نے شرارت سے کہا تو امی جان بھی مسکرانے لگیں۔

''قدوسی صاحب کا بیٹا بھی ڈاکٹر بن کر امریکا سے کورس کر آیا...... اور اب تو اس کے یہاں بھی بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔'' امی نے اظہر کا ذکر کیا تو میں بدمزہ ہو گیا۔

''وہ اکثر تیرے متعلق پوچھتا رہتا ہے لیکن تجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

''کسی روز مل آؤں گا اس سے۔'' میں نے ٹالا۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی! لیکن اب میں شادی میں کسی قسم کی کوئی تاخیر نہیں کروں گی۔ اس لفافے میں چند لڑکیوں کی تصویریں موجود ہیں، مجھے کل تک اپنی پسند بتا دینا۔'' وہ حتمی لہجے میں کہتی ہوئی چلی گئیں۔

میری آنکھوں میں یک لخت کئی سہانے خواب اتر آئے۔ بے پناہ مصروفیت میں مشغول رہنے کے باوجود زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سب تصاویر کا بغور جائزہ لیا اور ایک پری پیکر کو سندِ قبولیت عطا کر دی۔

دو ماہ کے بعد میری زندگی میں ایک سہانی تبدیلی در آئی اور میں عقدِ نکاح میں بندھ گیا۔

شادی کے بعد ذاتی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب پیشہ ورانہ زندگی میں یکدم غیر متوقع موڑ آ گیا۔ ایک میگزین نے مجھے سلسلہ وار ناول لکھنے کی پیشکش کی جسے ٹھکرانا میرے لیے سراسر کفرانِ نعمت تھا۔

میں نے بے تحاشا محنت کی اور جب چھ ماہ بعد میری تحریر میگزین کی زینت بنی تو سرور و کیف سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ قارئین کے بھیجے گئے خطوط کا انتظار اور پھر ان کی رائے پڑھ کر نشہ دو آتشہ ہو جاتا۔

اس کے بعد میں نے کبھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا گیا لیکن میرے جنون اور شوق میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آئی۔ بینک کی سخت ترین نوکری، تخلیق کے کڑے اور کربناک مراحل، خاندانی ذمے داریاں نبھاتے نبھاتے مجھے علم ہی نہ ہوا کہ عمر کی نقدی کم ہوتی جا رہی تھی۔

وفادار، خدمت گزار اور اطاعت شعار بیوی نے میرا گھر جنت بنا دیا تھا۔ دو بچوں کی آمد کے بعد زندگی میں کوئی کمی نہ رہی تھی۔ میرے حلقۂ احباب میں رانا راحیل کی کامیابیاں اور لگن ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ دوست احباب، ساتھی کارکن اور رشتے دار میری محنت کی تعریف کرتے نہ تھکتے...... اور...... تعریف میری بہت بڑی کمزوری تھی۔ مجھے اپنی اس کمزوری سے بھی بہت محبت تھی۔

☆☆☆

تخلیق کے اس سفر کا راہی بنے دس سال کا عرصہ بیت گیا۔

اس تسخیر کے بعد میں اپنی ساکھ اور مقام پر کسی بھی سمجھوتے کا قائل نہ رہا۔ میری محنت، وقت اور لگن انتہائی بیش قیمت تھے اور مجھے اس عمل کا بھرپور معاوضہ درکار تھا۔ ماضی میں صدیق بھائی سے کی گئی بات آج بھی میرے دل و دماغ پر نقش تھی کہ میں استحصال کے اس ٹرینڈ کو تبدیل کر دوں گا...... اور بالآخر میں اس مقام تک آن پہنچا تھا کہ غیر معروف

جرائد کو اب میں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اگر کسی ادارے کے ساتھ مالی امور طے نہ پاتے تو میں استحصال کے خلاف ڈٹ جایا کرتا۔ مجھے اپنے ہنر اور صلاحیت پر کامل بھروسا تھا اس لیے انتظامیہ کے دباؤ میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وقت مجھ پر مکمل مہربان تھا۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو سونا بن جاتی۔ اس عرصے میں میرے مقابل کوئی بھی دوسرا مصنف ٹھہر ہی نہ پایا۔

میرا گھر ارضی جنت تھا۔ میری نوکری شاندار تھی۔ تخلیق کے سفر میں کامیابیاں میرے قدم چومتی تھیں۔ رانا راحیل جیسا خوش نصیب کہیں کوئی بھی تو نہ تھا۔

لیکن پھر زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے سب کچھ تلپٹ کردیا۔

☆☆☆

اس روز میں بینک میں اپنے معمول کے کام سرانجام دینے میں مگن تھا جب چپڑاسی نے کسی ملاقاتی کی آمد کا عندیہ دیا۔ میرا مثبت اشارہ پاتے ہی کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر باوقار شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''خاکسار کو ظفر الحق کہتے ہیں راحیل صاحب! کیسے کیسے احوال ہیں؟'' اس کا تعارف سن کر میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے جناب! آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے طلب کرلیا ہوتا۔'' میں نے پُرجوش معانقہ کرتے ہوئے کہا۔

ظفر الحق ایک ملک گیر شہرت یافتہ پبلی کیشنز کا مالک تھا۔ اس ادارے کے جاری کردہ شمارے بین الاقوامی سطح پر بھی خاصے مقبول تھے۔ ظفر کے بارے میں شنید یہی تھا کہ وہ رائٹرز کو بہت لاڈ پیار سے رکھتا ہے۔ اس کی میرے پاس آمد کا مطلب بھی مجھے بخوبی سمجھ آرہا تھا۔

''پیاسا ہی کنوئیں کے پاس چل کر آتا ہے جناب! ہم آپ کو اپنے ادارے میں مدعو کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ فوری طور پر مطلب کی بات پر آگئے۔

ظفر کے ادارے کی ساکھ انتہائی مضبوط تھی۔ ان کے رائٹرز کی ایک مکمل ٹیم تھی جو سالہا سال سے اس ادارے سے منسلک تھے اور اب اگر وہ مجھے اپنے ساتھ نتھی کرنا چاہتے تھے تو بلاشبہ یہ میرے سفر کی معراج تھی۔

میں نے اپنی شمولیت کی ہامی بھر لی۔ ادارہ ''داستان ہزار رنگ'' ملک کے ہر طبقے میں مقبول تھا۔ یہاں اپنا مقام پیدا کرنا ہرگز آسان نہ تھا اور آسانیاں مجھے پسند بھی تو نہ تھیں۔

قصہ مختصر...... آنے والے چند سالوں میں اپنی محنت اور لگن کی بدولت میں نے ''داستان ہزار رنگ'' میں بالآخر اپنا مقام پیدا کر ہی لیا لیکن سچ بتاؤں...... اس کامیابی میں بھی ایک تشنگی بہرحال برقرار تھی۔ یہاں ہزار ہا جتن کے باوجود ان قارئین سے وہ پذیرائی نہیں مل رہی تھی جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا لیکن بہرحال میں محنت کے ٹریک پر اب بھی اسی جوش وجذبے سے رواں تھا۔

تین سال تک افسانے اور ناولٹ لکھنے کے بعد میں نے سلسلہ وار ناول لکھنے کا آغاز کیا تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ مجھے ایسی اہانت آمیز صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے۔

☆☆☆

میرے ذہن پر ایک دھند سی طاری تھی۔

غصے اور طیش سے اپنے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میں نے زور سے میز پر پٹخا اور روم فریج سے یخ بستہ پانی کی بوتل منہ سے لگا لی۔ ٹھنڈے پانی سے اعصاب قابو میں آئے تو میں تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر ڈھے گیا۔

گزشتہ دو سال سے میرا ناول ریٹنگ میں بہت اچھا تھا لیکن پچھلے کچھ ماہ میں بینک اور گھریلو مصروفیات میں لکھی گئی قسط دوبارہ پڑھنے میں آڑے آجاتیں۔ چند اتفاقی غلطیوں کی وجہ سے ہر ماہ خطوط میں تنقیدی تبصرے میرا خون کھولا دیتے۔

''راحیل صاحب کا ناول اب بور کرنے لگا ہے...... اتفاقات کی بھرمار نے کہانی کا حسن ماند کردیا ہے۔''

''سلگتی چھاؤں تو اب واقعی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا ہے......''

''کہانی کی طوالت اب بور کرنے لگی ہے...... میں نے تو اس ناول کا مطالعہ ہی ترک کردیا ہے۔''

اس وقت بھی میں انہی فقروں کی بازگشت میں گھرا بیٹھا تھا جب میرا موبائل گنگنانے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بادلِ ناخواستہ فون آن کرکے کان سے لگایا تو حسبِ توقع ظفر کی سپاٹ آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''رانا صاحب! اپنی تحریر اب جلد از جلد سمیٹنے کی کوشش کیجیے۔ ہمیں بہت سے شکایتی خطوط موصول ہورہے ہیں۔ آپ کا ناول اپنا چارم کھو رہا ہے۔''

''بہتر ہے...... اگلی تحریر کس سے لکھوائی جائے گی؟'' میں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''جمشید صحرائی سے...... ان سے بہترین کوئی آپشن موجود نہیں۔'' ظفر نے اطمینان سے کہا اور فون بند کردیا۔

میرے ہاتھ میں موجود سگریٹ کی طرح دل بھی بری طرح سلگ رہا تھا۔ بے شمار کوششوں کے باوجود مجھے وہ

پذیرائی کبھی نصیب نہ ہوئی جو جمشید کے حصے میں آتی تھی۔ جمشید صحرائی دارالحکومت کا ایک مصنف تھا۔ وہ سادہ الفاظ اور سلیس پیرائے میں اس قدر خوبصورتی سے کہانی کے تانے بانے بنتا کہ رہائی ممکن ہی نہ ہو پاتی تھی۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا اور جذبات کا بادشاہ۔ منظر نگاری میں اسے کمال حاصل تھا۔

اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اس کی تحریروں کے یہ گن کیونکر جانتا تھا؟ تو سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی ادارے سے منسلک ہونے کے بعد میں ان کی ٹیم میں شامل مصنفین کو باقاعدگی سے پڑھتا تھا تاکہ مقابل کی خوبیوں اور خامیوں پر مکمل نظر رکھ سکوں اور جمشید صحرائی کی تحریر خامیوں سے مبرا ہوتی تھی۔ ایک خلقت اس کی دیوانی تھی۔

چاروناچار میں نے بجھے دل سے اپنا ناول سمیٹنے کا آغاز کردیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میرے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ گئی اور جمشید ایک بہت بڑی پھانس بن گیا۔ اس کے ناول کی مقبولیت کا تصور جس قدر یقینی تھا، اسی قدر ہولناک بھی۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

جمشید کا ناول پانچ سال سے زائد عرصہ شائع ہوتا رہا اور ہر ماہ تعریفی خطوط میرے لیے مزید صبر آزما ثابت ہوتے۔ میں فی الوقت مختصر کہانیوں اور ناولٹ تک ہی محدود تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ اگلے ناول کے لیے ادارہ لازماً میری خدمات حاصل کرے گا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد..... اگلے دو سال کے لیے ایک بار پھر جمشید صحرائی کا قسط وار ناول میگزین کی زینت بنا۔

مایوسی کے عالم میں میں نے اپنا مسودہ ایک ہفت روزہ میگزین کو ارسال کردیا جسے خاطر خواہ پذیرائی بھی نصیب ہوئی لیکن ''داستان ہزار رنگ'' کی ریڈرشپ کسی دوسرے ادارے کے پاس نہیں تھی۔ وہاں ہر گزرتا مہینا جمشید کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کررہا تھا اور ایک بات تو اب طے تھی کہ اس کی موجودگی میں میری کامیابی بہت دشوار ہو چلی تھی۔ اس کا تیسرا ناول بھی سابقہ مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ گیا۔

اب ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ مجھے دیگر کہانیوں میں پذیرائی نہیں ملتی تھی۔ رانا راحیل کا نام بھی ایک مستند مجھے ہوئے اور سینئر رائٹرز کی صف میں شمار ہونے لگا تھا لیکن مجھے اس دیوانگی کی طلب تھی جو قارئین جمشید صحرائی کے لیے محسوس کرتے تھے۔ اس کا ہر کردار اور مکالمے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلیتے تو میرا دل جھلسنے لگتا تھا۔

میری زندگی میں کئی دہائیوں بعد ایک اور ''اظہر قدوسی'' شامل ہوگیا تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آتی کہ کیا کروں؟ لیکن پھر ایک ایسی غیر متوقع راہ دریافت ہوئی کہ میں خود بھی دنگ رہ گیا۔

تقدیر نے مجھے ایک نئی دنیا سے متعارف کروادیا۔

اس روز میرے دفتر میں اپنے اکاؤنٹ کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک شخص کی آمد ہوئی۔ چھریری جسامت، درمیانی عمر اور قدوقامت کا یہ شخص ہاتھ میں کچھ کاغذات اور ایک رسالہ تھامے ہوئے تھا۔

''مطالعے کے کافی شوقین معلوم ہوتے ہیں آپ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے رسالے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں...... یہ میرا پسندیدہ ترین ماہنامہ ہے۔ آپ بھی پڑھیے گا بھی...... باقاعدہ قاری بن جائیں گے۔''

''قاری...... اجی محترم! میں اس ادارے کا باقاعدہ مصنف ہوں۔''

''مائی گڈنس...... اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ وہی رانا راحیل ہیں جن کا ناول اسی جریدے میں شائع ہوا کرتا تھا؟'' وہ شدید حیرت میں مبتلا تھا۔

''جی ہاں! آپ کا قیاس بالکل درست ہے۔'' میں محظوظ ہونے لگا۔

''اوہ...... آپ میری خوشی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں آپ کی سب تحریریں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔'' وہ... پرجوش ہوگیا۔

''نوازش ہے آپ کی۔''

''ارے نہیں سر جی! آپ کو علم ہی نہیں کہ میں آپ کی تحریروں سے کس قدر متاثر ہوں۔'' اس کی بات پر میں محض مسکرا کر رہ گیا۔

''آپ نے دوبارہ کوئی ناول کیوں نہیں لکھا؟''

''ارے بھئی! میری مصروفیت آپ کے سامنے ہی تو ہے...... نائن ٹو فائیو بینک جاب ہے۔ اس کے تقاضے نبھانا بھی آسان کام تو نہیں ہے پھر گھریلو ذمے داریاں ہیں...... لکھنا لکھانا تو محض میرا شوق ہے اس لیے کبھی کبھار قلم اٹھالیتا ہوں۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا۔

''گریٹ! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی سر! اگر آپ برا نہ منائیں تو اپنے فیس بک اکاؤنٹ یا آفیشل پیج پر ایڈ کرلیجیے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''مگر میرے پاس وقت ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش...... کی ہے۔''

''آپ اجازت دیجیے سر جی! میں آپ کا اکاؤنٹ بنا کر سب معاملات سمجھادوں گا۔''

''اگر مناسب سمجھیں تو آج شام غریب خانے پر تشریف لے آئیے گا۔ یہاں ڈیوٹی کے اوقات میں ایسا ممکن نہیں۔'' میں نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

''سر کے بل آؤں گا...... میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہوگی بھلا؟''

اسی شام دلاور احمد نے میرے کمپیوٹر پر فیس بک اکاؤنٹ بنانے کے بعد تمام باریکیاں سمجھا دیں اور میں اس عجوبہ روزگار دنیا کی سیر میں مگن ہوگیا۔ اگلے روز اس نے مجھے ایک ادبی بیٹھک میں پہنچا دیا جہاں ہر عمر و طبقے کے مرد و خواتین موجود تھے۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں میرے ہی ایک ناولٹ پر بحث جاری تھی۔ قارئین کے یہ براہِ راست تاثرات میرے لیے بہت سنسنی خیز تھے۔ میں اسکرین پر نظریں جمائے بے حد اشتیاق سے اس سرگرمی کا جائزہ لینے لگا۔

توصیفی کمنٹس پڑھتے ہوئے مجھے اپنے جسم و جان میں شیرینی گھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن یکدم ایک کمنٹ کڑوے بادام کی طرح حلق تک کڑواہٹ پیدا کر گیا۔ آصفہ خان نامی لڑکی نے نہایت دھڑلے اور بے باکی سے میری تحریر کے بخیے ادھیڑتے ہوئے لکھا تھا۔

''رانا راحیل صاحب ایک مستند رائٹر ہیں...... لہٰذا ان کے قلم کی پختگی میں تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ تاہم گزشتہ کچھ عرصے سے ان کی کہانیوں میں واقعاتی جھول سامنے آنے لگے ہیں جو کسی بھی صورت ایک سینئر رائٹر کے شایانِ شان نہیں اور یہی چیز ان کی تحریر کا حسن گہنانے لگی ہے۔''

یہ صاف گو رائے پڑھ کر میرا لہو سنسنا گیا لیکن نظریں اب بھی اسکرین پر ٹکی تھیں۔

''مس آصفہ! بہتر ہوتا آپ ان واقعاتی جھول کی کوئی نشاندہی بھی کر دیتیں۔'' شاہ زیب نامی لڑکے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو میری حسیات مزید متوجہ ہوگئیں۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ اور پر بیسیوں لوگ کہانی پڑھنے کے بعد ہی سر دھن رہے ہیں۔ تاہم وہ بھی اس بات سے واقف ضرور ہوں گے کہ مذکورہ کہانی کے آغاز میں ہیرو کو یتیم ہونے کے ساتھ لاوارث بتایا گیا تھا اور واضح الفاظ میں یہ کہا گیا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی رشتے دار موجود نہیں...... لیکن چند صفحات کے بعد ہی لکھا گیا کہ اس کی پرورش ماموں اور ممانی نے کی...... اگر اس بات کو سچ تسلیم کیا جائے تو اول الذکر بیان غلط ہے...... اور اگر اول الذکر کو درست تسلیم کیا جائے تو یہ بتائیے کہ ماموں اور ممانی یکا یک کون سی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ ہو گئے تھے۔''

توصیف و تنقید کا یہ ملاپ میرے لیے یکسر انوکھا تھا۔

اسی شام مجھے دلاور احمد کی کال موصول ہوئی۔

''کہیے جناب! کیا محسوسات ہیں آپ کے؟''

''نہایت شاندار...... آپ کی اس نوازش کا بے حد شکریہ......'' میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''اب شرمندہ تو نہ کیجیے سر جی! ویسے اگر آپ اجازت دیں تو گروپ میں آپ کی موجودگی اور ویلکم کی پوسٹ لگا دوں؟''

''آپ کی محبت ہے برادر! ورنہ بندے کی کیا اوقات؟''

''ایسا نہ کہیں سر جی! آپ کی قدر و قیمت کوئی ہم سے پوچھے۔'' اس کا مٹھاس بھرا لہجہ میرا دل گدگدانے لگتا۔

اگلے روز بینک سے واپسی کے بعد میں نے اپنا اکاؤنٹ کھولا تو حسبِ وعدہ دلاور میرے لیے ایک خصوصی پوسٹ لگا چکا تھا۔ لوگوں کے محبت بھرے کمنٹس پڑھ کر خوشی کی انتہا نہ تھی۔ چند گھنٹوں میں میرا ان باکس پیغامات اور فرینڈ ریکوئسٹ قبول کرنے کی التجاؤں سے لبریز ہوگیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے میں ذہنی طور پر مکمل تیار تھا۔ قارئین کی یہ محبتیں میرے لیے بہت انمول تھیں اور میں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لیے ایک بھرپور اننگز کھیلنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہر انفرادی پیغام کا جواب بہت محبت اور توجہ سے دینے کا آغاز کر دیا۔

''رانا صاحب! ہم آپ کی قابلیت کے مداح تو پہلے سے ہی تھے لیکن اب آپ کے اخلاق نے تو دل ہی موہ لیا ہے۔''

''اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں برادر! شہرت اور کامیابیاں تو فانی ہیں...... انسانیت سے زیادہ اہم میرے لیے کچھ بھی نہیں۔'' میں انکساری سے جواب دیتا۔

سوشل میڈیا میری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی لے آیا تھا۔

☆☆☆

یہ صد رنگی دنیا تھی۔ ہر طبقے اور طرزِ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد بہ آسانی باہم گفتگو کرتے، اپنے نقطۂ نظر بیان کرتے اور چین کی بنسی بجاتے۔

زندگی کے کسی بھی موڑ پر میں زاہدِ خشک نہیں رہا تھا۔ یونیورسٹی میں ادبی میگزین سے وابستگی کے باعث میری ذات صنفِ نازک کی دلچسپی کا مرکز بنی رہتی تھی تو پیشہ ورانہ زندگی میں بھی تا حال کئی ایک خواتین برضا و رغبت میل جول قائم رکھے ہوئے تھیں۔ اب اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں

کہ میں دل پھینک قسم کا انسان تھا۔ میرے دل و دماغ اور نظریات اس ضمن میں یکسو تھے۔ ایک کامیاب لکھاری ہونے کی حیثیت سے مجھے کہانیوں مختلف کرداروں کی نفسیات اور سوچ کی گہرائی جاننے کے لیے ایسے تعلقات کے لیے استثنا حاصل تھا۔

خواتین کے ساتھ بیتا وقت نرم و گرم گفتگو صفحۂ قرطاس پر لفظوں کے رقص کا تال میل بن جاتی۔ فطری طور پر ہی میں بہت حسن پرست تھا لیکن احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ریستوران کے خوابناک ماحول کی سرگوشیاں عوامی تفریحی مقامات میں دھیمے قہقہوں کی گونج نگاہوں کا تصادم میرے قلم میں برقی رو دوڑا دیتا۔

سماجی روابط کے پلیٹ فارم پر تو یہ آنکھ مچولی اور بھی دلنشین تھی۔ میری تحریروں سے متاثر خواتین گفتگو و روابط بڑھانے کے لیے بے تاب دکھائی دیتیں۔ روزِ اول ہی سے میں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا عادی تھا مگر اس دشت کی سیاحی میں کبھی بھی ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

ادبی بیٹھک کے ممبران کی رائے زنی اس قدر طاقتور تھی کہ کئی ایک مصنفین نے متواتر تنقید سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے قلم سے جزوی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مستقبل قریب میں ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بچاؤ کے لیے میں نے ان ممبران سے ذاتی روابط قائم کرنے کا آغاز کر دیا۔ میرے عندیے پر دلاور اکثر و بیشتر ادبی بیٹھک میں میری تحریروں کی بابت بحث چھیڑ دیتا۔

''رانا راحیل کی تحریروں کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ بھی میری طرح ان کی سلسلہ وار کہانی کے منتظر ہیں؟''

اس پوسٹ پر بے شمار لوگوں نے متوقع ردِعمل کا اظہار کیا لیکن اس شیرینی کے درمیان آصفہ خان کڑوے باداموں سی تلخی لیے ایک بار پھر آن دھمکی۔

''رانا راحیل بلاشبہ ایک اچھے رائٹر ہیں...... ان کی تحریروں میں محنت بھی نظر آتی ہے لیکن میری ذاتی رائے میں گداز اور گہرائی کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کی آمد نہیں ہوتی بلکہ شعوری کوشش کے تحت تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ رہا دوسرا سوال...... تو اس بارے میں صرف یہی کہوں گی کہ ان کا کوئی سلسلہ وار ناول پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔''

اس لڑکی کی رائے پڑھ کر مجھے شدید غصہ آیا۔ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے کسی مقدس راز سے واقف ہو گئی ہے۔ بیس سال سے زائد عرصے پر مشتمل اس سفر میں کسی نے میرا فن اس طرح بیان نہیں کیا تھا۔ آصفہ خان کا نام روزِ اول ہی سے میرے دل میں ایک پھانس بن کر چبھ رہا تھا۔ کسی بھی مصنف پر اس کی رائے اس قدر بے لاگ ہوتی تھی کہ ساتھی ممبران مذاقاً برملا کہنے پر مجبور ہو جاتے۔

''مس آصفہ! ایک دن آپ کسی نہ کسی رائٹر کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گی۔''

''سبھی کو پتا ہونا چاہیے کہ ڈرتی ورتی میں کسی سے نہیں ہوں...... خوشامد اور بے جا تعریفیں میری لغت میں ادبی خیانت کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔'' وہ اپنا مخصوص تکیہ کلام دہرا دیتی۔

اس روز میں یونہی بے مقصد اس کی پروفائل کھول کر دیکھتا رہا۔ وہ دارالحکومت کی رہائشی تھی۔ پروفائل میں خاصی سخت پرائیویسی تھی اور کسی بھی نوعیت کی گھریلو تصاویر یا ذاتی معلومات کا اندراج نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پراسراریت انفرادیت اور خاموشی نے میرے دل میں بھی تجسس پیدا کر دیا اور میں نے دوسطری پیغام روانہ کر دیا۔

''آپ کی صاف گوئی بے ساختہ رائے اور نڈر رویّہ قابلِ تعریف ہے...... ذہین قارئین کسی بھی مصنف کا اثاثہ ہوتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' چند لمحوں بعد ایک مختصر جواب موصول ہوا۔

''کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ جیسی باذوق خاتون نے کبھی میری قسط وار کہانی نہیں پڑھی۔''

''بس کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔''

''بائی داوے...... آپ کن مصنف کو پڑھنا پسند کرتی ہیں؟''

''جمشید صحرائی۔''

''غالباً آپ کا مطالعہ وسیع نہیں ...... ورنہ آپ لازماً کسی نامور ادیب کا نام لیتیں...... ویسے میں نے کم عمری میں ہی عصمت چغتائی منٹو مفتی شہاب بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کو ازبر کر لیا تھا۔''

''ہر شخص اپنی ذاتی پسند ناپسند میں آزاد ہے۔''

''جمشید صحرائی کی کہانیاں تو ایک ہی پیٹرن پر چلتی ہیں...... کافی یکسانیت ہے ان کی تحریروں میں......'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''لگتا ہے آپ انہیں کافی سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔''

اس کا جواب پڑھ کر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

''ارے نہیں مادام! میرے فینز ہی بس اکثر گلہ کرتے ہیں ورنہ مجھے اتنی فرصت کہاں؟''

''جمشید صاحب کے الفاظ ساحر ہیں اور کردار

لازوال...... ان کی تحریر کا گداز بے خود کر دیتا ہے...... محبت ان کے ہر لفظ میں سانس لیتی ہے...... معاشرتی برائیاں اپنے وجود پر سسکتی دکھائی دیتی ہیں...... ان کا قلم فسوں طاری کر دیتا ہے۔'' آصفہ کے الفاظ و انداز نے مجھے دنگ کر دیا اور جمشید سے از سرِنو شدید جلن محسوس ہونے لگی۔ اسی پل دل میں بے ساختہ ایک خواہش ابھری کہ کاش ایسی محبت و دیوانگی میرا نصیب بھی قرار پا جائے۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے وقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ میں روزانہ بیسیوں افراد سے سوشل میڈیا کے علاوہ فون کال پر گفتگو کرتا تھا لیکن کسی کے اندازِ بیان نے اس طرح متاثر نہیں کیا۔ آصفہ کی بات چیت سے اس کی کم گوئی، ذہنی مضبوطی اور اعلیٰ تعلیم مکمل طور پر جھلکتی تھی اور سچ بتاؤں تو پہلی ہی گفتگو میں اس کا رکھ رکھاؤ مجھے کافی متاثر کر گیا تھا۔

میں کسی بھی قیمت پر اسے اپنی ''ٹیم'' کا رکن بنانے کا خواہشمند تھا۔

☆☆☆

میری خوش قسمتی ان دنوں عروج پر تھی۔

شمارے میں تین سال سے جاری ایک جغادری مصنف کا سلسلہ وار ناول ادبی بیٹھک میں بے رحم تنقید کی زد میں تھا۔ لہٰذا قبل از وقت اپنی تحریر کے تانے بانے سمیٹنے پر مجبور ہو گیا۔

پہلی اننگز میں کامیاب اسٹروکس کھیلنے کے نتیجے میں ''قارئین'' کے اصرار پر مجھے سلسلہ وار ناول لکھنے کے لیے ایک بار پھر مدعو کیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد سوشل میڈیا، ادبی بیٹھک اور یہاں موجود قارئین کی خوشنودی ناقابلِ گزیر ہو چکی تھی۔ پچانوے فیصد افراد تو پہلے ہی میرے گرویدہ تھے۔ باقی ماندہ میں آصفہ اور اس کے چند قریبی احباب شامل تھے۔ اس لیے میں نے اپنا اگلا ''ٹارگٹ'' آصفہ خان کو منتخب کر لیا۔ اس لڑکی کے الفاظ اور گروپ میں مضبوط پوزیشن میرے لیے بہت سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔

میں اپنے ذہن میں شطرنج کی بساط بچھائے ایک نئی بازی کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اگلے کئی روز میں آصفہ کی جانب سے کسی پیغام کا منتظر رہا لیکن اس کی خاموشی و بے نیازی جوں کی توں برقرار تھی۔ ایک ہفتے بعد بالآخر میں نے خود ہی پہل کی اور میسیج میں دریافت کیا۔

''کہاں غائب ہیں محترمہ... گروپ میں بھی کم ہی نظر آ رہی ہیں؟''

شام ڈھلے اس نے اپنے مخصوص لٹھ مار انداز میں جواب دیا۔

''ایگزامز میں مصروف ہوں۔''

''نیک تمنائیں قبول کیجیے...... کون سے ایگزامز ہیں بائی داوے؟''

''شکریہ...... بی ایڈ فرسٹ سمسٹر۔''

''فراغت ملتے ہی میسیج کیجیے گا...... ہم مزاج لوگوں سے بات چیت بہت لطف دیتی ہے۔'' میں نے اپنا پہلا داؤ کھیلنے کا آغاز کر دیا تھا۔

''معذرت قبول کیجیے...... میں اشد ضرورت کے علاوہ ازخود میسیج یا رابطہ نہیں کرتی...... سوشل میڈیا استعمال کرنے کے کچھ اصول و ضوابط ہیں جن پر میں سختی سے کاربند ہوں۔'' اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

آصفہ نے پہلی ہی گیند اٹھا کر باؤنڈری سے باہر پھینک دی تھی۔ میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے گہرا کش لیا اور محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے لکھا۔

''امتحانات میں کامیابی کے لیے ایک بار پھر نیک خواہشات قبول فرمائیے...... ویسے اگر مناسب سمجھیں تو کیا میں جان سکتا ہوں آپ کی تعلیم کیا ہے؟''

''انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے...... اس کے علاوہ پنجابی اور اردو ادب بھی پڑھا ہے۔''

''کمال است...... میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک ذہین قاری ہیں۔''

''بہت شکریہ...... اور معذرت کہ مجھے کچھ مصروفیت ہے...... اللہ حافظ۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر لاگ آؤٹ ہو گئی۔

آصفہ کا یہ رویہ میرے ذہن میں شدید ہلچل مچا چکا تھا لیکن شطرنج کی اس بساط پر ابھی مزید مہرے باقی تھے۔

کچھ روز بعد دلاور اپنی کمپنی کے چیک کیش کروانے کے لیے بینک آیا تو میں نے اسے لنچ میں شریک کر لیا۔ باتوں باتوں میں گروپ اراکین کا تذکرہ بھی چھڑ گیا۔

''اچھے اور قدردان لوگ ہیں سب۔ محبت سے پیش آتے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے کہا۔

''دریں چہ شک...... کن افراد کو شرفِ گفتگو بخشا ہے آپ نے سر جی؟''

''بھائی! میرا در تو ہر ایک کے لیے وا ہے...... سبھی قارئین میرے لیے بہت محترم اور محبوب ہیں۔''

''آصفہ خان سے کبھی بات چیت ہوئی آپ

کی؟'' دلاور نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل...... ایک بار نہیں ہماری تو روز ہی چیٹنگ ہوتی ہے۔'' میں نے طرح دی۔
''کمال ہے...... اس کے بارے میں تو سنا ہے کہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی...... اکثر ممبران اس کے خشک اور سخت رویّے سے نالاں ہیں۔''
''ہاں! میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ اس کے کمنٹس بہت سخت ہوتے ہیں...... لیکن خیر! مجھے تو خود ہی میسیج وغیرہ بھیجتی ہے اور بہت خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے۔''
''ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ...... ویسے سر جی! اکثریت اسی بات پر متفق ہے کہ یہ کوئی لڑکی نہیں ہے...... بلکہ اس آئی ڈی کے پس پردہ کوئی لڑکا ہے...... ورنہ آپ ہی بتایئے خواتین کا رویّہ اس قدر پراسرار کب ہوتا ہے۔ وہ تو خود نمائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتیں۔'' دلاور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔
''کوئی بات نہیں...... بلی جلد ہی تھیلے سے باہر نکل آئے گی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''ہم تو خود جانے کب سے اس گھڑی کے منتظر ہیں۔''
دلاور کے انکشافات اور اس پہ مستزاد آصفہ کا رویّہ میرے لیے ایک چیلنج بننے لگے۔ میں گویا ایک بار پھر اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔ راوی کی لہروں کی موج وسرکشی مجھے مجسم نظر آنے لگی تھی۔ جذبۂ تسخیر ایک بار پھر مکمل شدت سے عود آیا اور میں بے اختیار اس سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جاتا۔
''آپ کی پروفائل میں ذاتی مواد کافی کم نظر آتا ہے...... اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے اس شام آصفہ کی پروفائل کھنگالنے کے بعد استفسار کیا۔
''آپ اپنی مصروفیات ترک کر کے میری پروفائل کی چھان بین کرتے رہتے ہیں...... اس کی کوئی خاص وجہ؟''
''یہی برجستہ گفتگو مجھے بہت محظوظ کرتی ہے اور آپ کے ان باکس میں لے آتی ہے۔''
''یہ میرے سوال کا جواب ہرگز نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔
''اوہو! میں نے تو یونہی برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا تھا۔''
''آئی سی...... اب برسبیلِ تذکرہ یہ بھی بتا دیجیے کہ کتنے ممبران آپ سے یہ کہہ چکے ہیں کہ آصفہ خان درحقیقت لڑکا ہے...... اور اب یہ مت کہیے گا کہ کسی نے نہیں کہا ایسا......'' اس کے دوٹوک انداز پر میں گڑبڑا گیا۔
''کچھ تو لوگ کہیں گے...... لوگوں کا کام ہے کہنا...... اس لیے یہ ذکر چھوڑیے...... لیکن سچ بتاؤں میں اب ان کے رویّے سے اوبنے لگا ہوں...... وہ وقت بے وقت بات چیت اور فون کالز کے خواہاں رہتے ہیں...... میرے کام کا بہت حرج ہوتا ہے۔''
''اس میں کیا مشکل ہے؟ انہیں واضح طور پر بتا دیجیے کہ آپ کے کام میں مخل نہ ہوں...... وہ سمجھدار اور باشعور ہیں...... اس لیے خود ہی سنبھل جائیں گے۔''
''لیکن اگر وہ ناراض ہو گئے تو مجھے دکھ ہوگا۔ میں کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن اس مسئلے کا حل بھی چاہتا ہوں۔ آپ ہی راہنمائی کیجیے پلیز!'' میں اپنے اسٹروکس مکمل توجہ سے کھیل رہا تھا۔
''کن افراد سے بیزار ہیں آپ بائی داوے؟''
''کوئی ایک ہو تو بتاؤں...... بخدا مجھے ان کی محبت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ملاقات کے تقاضے اور طویل فون کالز وقت کا زیاں کرتے ہیں۔''
''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... اگر آپ انہیں دوٹوک جواب دینے کی ہمت نہیں رکھتے تو قوتِ برداشت میں اضافہ کر لیجیے...... افاقہ ہوگا۔'' اس نے مسکراہٹ کی اسمائلی بھیجتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک التجا بھی کروں گی کہ دوسرے ممبران کے رویّے کی شکایت مجھ سے مت کیا کیجیے...... کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی غیر موجودگی میں اس کی بابت مجھ سے گفتگو کر سکتا ہے تو کہیں نہ کہیں میری ذات بھی موضوعِ گفتگو ہو سکتی ہے۔''
میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اس اننگز میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے بے پناہ صبر و تحمل کی ضرورت تھی اور رانا راحیل نے ہمیشہ ہر بازی میں مستقل مزاجی ہی سے فتح حاصل کی تھی اس لیے ایک فوری گیم پلان مرتب کر لیا۔
میرے وسیع مطالعے اور تجربے کے مطابق صنفِ مخالف کو تین اقدام میں اپنے دام میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں میرا پہلا داؤ ''اعتماد'' کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے مکمل حکمتِ عملی کے تحت ''توجہ اور اپنائیت'' کا کارڈ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

تین ماہ کا عرصہ بیت گیا۔
آصفہ خان سے چیٹنگ اب قدرے طویل ہو گئی تھی۔ اس کے رویّے میں بھی قدرے نرمی اور خوش اخلاقی جھلکنے لگی تھی۔ کتب بینی اس کا جنون تھا اس لیے کتابوں کے علاوہ کسی موضوع پر بہت کم گفتگو ہوتی۔
''آپ لکھنے لکھانے کی طرف توجہ دیجیے...... میں ہر

طرح سے راہنمائی کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں اسے ترغیب دیتے ہوئے کہتا۔

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا...... لیکن جلد ہی کوشش ضرور کروں گی۔''

''کبھی ذاتی تحریر کردہ اقتباس دکھایئے گا۔ میں آپ کے الفاظ و خیالات کی گہرائی ماپ کر یقیناً کسی بہتر مشورے سے نوازوں گا۔''

کچھ روز بعد اس نے ایک مختصر ذاتی کاوش روانہ کی۔ الفاظ کا چناؤ' جذبات کی شدت اور سوچ کی گہرائی اس کے قلم کی پختگی کا منہ بولتا ثبوت تھی تاہم میں اسے کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے سابقہ تنقید کے واجبات کی ادائیگی کا آغاز کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''اچھی تحریر ہے...... لیکن ابھی آپ کا مطالعہ بہت کمزور ہے۔ اپنے پسندیدہ مصنفین کے دائرے سے رہائی حاصل کرنے کے بعد ہی خیالات و احساسات میں وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔''

''میں نے پہلے ہی عرض کی تھی کہ ابھی قلم اٹھانے کا وقت نہیں آیا لیکن آپ ہی بضد تھے کہ اقتباس روانہ کروں۔'' مایوسی اور افسردگی کی جھلک نے میرا دل خوشی سے معمور کر دیا۔

''گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں...... آپ اپنی تحاریر مجھے دکھا دیا کیجیے...... میں بسروچشم اصلاح کے لیے تیار ہوں۔''

''یہ باتیں قبل از وقت ہیں...... وقت آنے پر حالات کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکے گا۔'' ایک مسکراتی ہوئی اسمائلی کے ساتھ جواب پڑھ کر میرے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

اس کے رویّے کی یہ مبہم تبدیلی میرے دل میں خوش فہمیوں کی افزائش کرنے لگی تھی۔ صنفِ نازک کی جانب سے اک ذرا سی نرمی ازل ہی سے ابنِ آدم کے جذبات میں ہلچل مچا دیا کرتی ہے تو میں بھلا کیونکر محفوظ رہ پاتا؟ اس لیے ایک روز احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''آپ نے اپنی ذاتی زندگی کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا...... کیا آپ مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں؟''

''مجھے ذاتیات پر گفتگو پسند نہیں...... کیا میں نے کبھی آپ سے ذاتی سوال جواب کیے؟''

''دوستوں میں اتنی پردہ داری بھی تو اچھی نہیں ہوتی...... خیر میں خود ہی بتائے دیتا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں بہت تنہا ہوں۔ کامیابی کی لگن اور جنون نے گھر بسانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا ہوں۔ بینک سے واپسی کے بعد کاغذ قلم کے ساتھ وقت بیت جاتا ہے۔ حلقۂ احباب بھی بہت محدود ہے۔'' میں نے اطمینان سے نئی کہانی گھڑی۔ ''اب تو دل چاہتا ہے کہ کسی ہم خیال اور باذوق خاتون سے عقد کر کے زندگی کی تکمیل کر لی جائے۔''

''دوستی ہم پلہ افراد میں ہوتی ہے محترم! آپ کی اور میری کوئی برابری نہیں۔'' وہ میری اصل بات نظرانداز کر گئی۔

''بہت افسوس ہوا جان کر...... اگر ہمارے مابین دوستی کا رشتہ نہیں تو پھر آپ ہی اس رشتے کو کوئی نام دے دیں۔''

''عزت و احترام...... آپ قلمکار ہیں...... اور میں قاری...... آپ کے پاس قلم کی مقدس امانت موجود ہے اور قلم کی قسم تو قرآن پاک میں بھی اٹھائی گئی ہے۔ صرف اسی تکریم کے تحت میں آپ سے بات کر لیتی ہوں...... ورنہ بے مقصد چیٹنگ مجھے پسند نہیں ہے۔''

''مجھے دلی طور پر بہت دکھ ہوا کیونکہ میں حقیقتاً آپ کو ایک دوست سے بڑھ کر حیثیت دینے لگا ہوں...... اور یقین جانیے کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ اتنے خوبصورت خیالات کی حامل خاتون سے بالمشافہ ملاقات کی جائے یا کم از کم فون پر ہی گفتگو کر لی جائے۔''

''میں محض یہی کہوں گی...... کہ عزت بنانا تو بے حد آسان ہے لیکن اسے قائم رکھنا انسان کے ذاتی اختیار میں ہوتا ہے اور میری نظر میں جب کسی کی عزت نہ رہے تو مذکورہ فرد ''بلاک لسٹ'' میں منتقل ہو جاتا ہے۔'' اس کے الفاظ میں پوشیدہ تنبیہہ میں بخوبی سمجھ گیا تھا۔

آصفہ کا رویّہ مجھے بے طرح الجھانے لگا۔ میں رانا راحیل تھا۔ سوشل میڈیا کا با اخلاق اور مقبول لکھاری...... لیکن وہ اپنے خول سے باہر آنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ یہ الجھاؤ میری جھنجلاہٹ میں اضافہ کرنے لگا۔

ان دنوں میں اپنے نئے ناول کی اقساط مکمل کرنے میں مگن تھا۔ انٹرنیٹ کنیکشن بھی فنی خرابی کا شکار تھا۔ ادارے میں چھ اقساط روانہ کرنے کے بعد میں نے ایک ہفتے بعد اپنا اکاؤنٹ کھولا تو ادبی گروپ میں ایک دھماکے دار خبر میری منتظر تھی۔ مقامی میگزین میں آصفہ خان کے تحریر کردہ مضمون کی اطلاعی پوسٹ دیکھ کر میں بے حد حیران ہوا۔

''قلمی سفر کا آغاز بہت مبارک ہو ڈیئر! لیکن آپ نے کبھی اس بارے میں بتایا کیوں نہیں؟'' میں نے اسے پیغام بھیجا۔

''بہت شکریہ...... بتانے یا نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے جی؟''

''ارے بھئی! میں آپ کی مدد کر دیتا ...... میرے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ میں کسی بھی بہترین ادارے میں آپ کو بریک دلوا سکتا ہوں۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی...... میں کسی بھی سہارے کے بغیر اپنی اہلیت کے بل بوتے پر یہ سفر جاری رکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کا جواب پڑھ کر مجھے طیش آ گیا۔

سوشل میڈیا پر لوگ اپنی تحریروں کی اصلاح کے لیے میری منت سماجت کرتے رہتے تھے لیکن اسے جانے کس بات کا زعم تھا؟

''میں آپ کی خودداری کی قدر کرتا ہوں...... لیکن ایک بار میری پیشکش پر غور کیجیے گا۔ میں ایک سالانہ میگزین تک آپ کو رسائی دلوانا چاہتا ہوں۔ بہت نامور ادیب اس کے لیے لکھنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔''

''میں بھی آپ کے خلوص کی قدر کرتی ہوں...... لیکن اپنی قوتِ پرواز کے مطابق ہی اڑان بھرنا چاہتی ہوں۔ فی الوقت میری اتنی بساط نہیں کہ نامور ادباء کے مقابل اپنی تحریریں بھیجوں...... اور آج اگر آپ میری مدد کریں گے تو مستقبل میں مجھ سے بھی یقینی طور پر کچھ نہ کچھ طلب کریں گے۔ اس لیے یہ سلسلہ یہیں روک دینا چاہیے۔'' اس سادہ اور قدرتی منطق پر میں خاموش رہ گیا اور ایک توقف سے لکھا۔

''کیا آپ کو علم ہے کہ ادارہ ایک نیا سلسلہ وار ناول کا آغاز کر رہا ہے؟ بوجھیے تو سہی کہ وہ ناول کس مصنف کا ہوگا؟''

''رانا راحیل...... ایم آئی رائٹ؟''

''جی ہاں...... بالکل......'' میں پُرجوش ہوا۔ ''کل میں نے کچھ اقساط ایک ساتھ جمع کروائیں اور جانتی ہیں کہ مدیرِ اعلیٰ نے بعد ازاں مجھے خصوصی طور پر دفتر میں طلب کیا۔ اپنی کرسی سے اٹھ کر بغلگیر ہوئے اور میری پیشانی پر بوسہ دے کر کہنے لگے...... راحیل! یہ ناول میگزین میں ایک نئی جان پھونک دے گا۔''

''مبارکباد قبول کیجیے...... چلیں اسی بہانے میں بھی آپ کی کوئی سلسلہ وار تحریر پڑھ لوں گی۔''

''میں تو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اپنا ایڈریس دیجیے۔ میں ''اپنے ناول'' کتابی شکل میں آپ کو گفٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس پیشکش کا شکریہ لیکن میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''کیا تحائف کا لین دین کسی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے؟ لیکن خیر...... میں آپ کے مثبت جواب کا منتظر تو رہوں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں اپنی سابقہ پیشکش کا عندیہ ایک بار پھر دہرایا۔ سوشل میڈیا پر اپنی گھریلو زندگی کی پوشیدگی سے میں ہمیشہ ہی بھرپور فائدہ اٹھاتا آیا تھا۔

''میں آج کل جمشید صاحب کا شاہکار ناول پڑھ رہی ہوں اور ابھی مزید کسی چیز کی تمنا نہیں۔''

''آپ کو علم ہی نہیں کہ اکثر لوگ کہتے تھے کہ جمشید صحرائی کے ناول میں بھی میرے کرداروں ہی کی جھلک تھی۔'' میں تنک گیا۔

اس سے قبل کہ وہ ایک بار پھر جمشید نامہ شروع کرتی، میں نے فوری طور پر کہا۔ ''آپ میرے ناول پر ہر ماہ اپنا تبصرہ لکھیے گا...... میں اس کہانی کو یادگار بنانا چاہتا ہوں اس لیے آپ سے وقتاً فوقتاً کردار و واقعات بھی ڈسکس کرتا رہوں گا۔ آپ ایک ذہین اور باشعور قاری ہیں اور میں اس ہنر سے فیض یاب ہونے کا خواہشمند ہوں۔''

''آپ کی نوازش ہے ورنہ میری کیا بساط...... تبصرہ تو میں ضرور کروں گی...... اور بالکل میرٹ پر کروں گی۔'' اس کے جواب نے مجھے زیرِلب مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ میں اسے اپنے رویے اور اعتماد تلے مکمل طور پر زیرِبار کرنے کا آغاز کر چکا تھا۔

آصفہ کے علاوہ بھی میری بات چیت کئی قارئین سے چل رہی تھی اور بینکار ہونے کے ناتے سرمایہ کاری کی اہمیت مجھ سے زیادہ بھلا کون جانتا تھا۔ ان سبھی افراد سے مستقبل قریب میں اس سرمایہ کاری کی بھرپور قیمت میری منتظر تھی۔ شطرنج کی بساط پر مہرے اپنی جگہ سجائے میں ایک بھرپور بازی کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

میری اس کاوش کا نتیجہ نہایت شاندار ثابت ہوا۔ تین ماہ بعد ''بنجارا'' کی پہلی قسط حقیقتاً دھماکا خیز ثابت ہوئی۔ ایک ہفتے بعد آصفہ کا تبصرہ پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

''رانا راحیل کے نئے ناول کی پہلی قسط نے بہت متاثر کیا...... کہانی کی اٹھان بہت شاندار ہے۔ امید ہے مستقبل میں یہ اپنا رنگ ضرور جمائے گی اور راحیل صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔''

''بہت خوب آصفہ جی! اگر آپ تعریف کر رہی ہیں تو واقعی یہ تحریر خاصے کی چیز ہوگی۔ اس لیے پہلی فرصت میں اسی کا مطالعہ کریں گے۔'' گروپ ممبران کا ملا جلا ردِعمل میرے تن بدن میں بجلیاں دوڑانے لگا۔

''وہ مارا......'' میں نے بے ساختہ نعرہ لگایا اور اسے میسیج

بھیجتے ہوئے لکھا۔ ''آپ کی پسندیدگی جان کر خوشی ہوئی۔''
''گڈ ورک...... کیپ اٹ اپ...... لیکن میرا تبصرہ میرٹ پر ہی ہوا کرے گا...... مائنڈ اٹ۔'' اس نے مسکراتی ہوئی اسمائلی بھیجی۔
''اس ناول کے کردار کیسے لگے آپ کو؟'' میں مزید تعریفی الفاظ سننے کے لیے بے تاب تھا۔
''بہت اچھے کردار ہیں...... لیکن ہیرو ضرورت سے زیادہ خوداعتماد اور پُرجوش ہے...... اس کا ایکشن غیر منطقی محسوس ہوتا ہے...... اس نکتے پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔''
''میں خیال رکھوں گا...... شکریہ...... آئندہ بھی یونہی اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔''
''اب آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔'' آصفہ کا جواب پڑھ کر میرے لبوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی۔
اگلے ماہ اس نے لکھا۔
''کہانی بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یکے بعد دیگرے ریاستی ستونوں کی کرپشن کا بیان بہت سنسنی خیز محسوس ہوتا ہے۔ پولیس، میڈیا اور مافیا کا یہ ملاپ بہت شاندار ہے۔''
میرے دل و دماغ نے توثیق کردی کہ آصفہ خان اب میرے دام میں آچکی ہے۔ میں اس کامیابی پر خوشی سے نہال تھا۔

☆☆☆

میری خوشی و سرشاری کا یہ دورانیہ بہت مختصر ثابت ہوا۔
دو ماہ بعد سرحدی علاقے کے ایک نوجوان ذوالفقار نے کہانی میں چند غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے گروپ میں خصوصی پوسٹ لکھی تو آصفہ خان کی پسندیدگی اور کمنٹ دیکھ کر میرا دماغ کھول اٹھا۔
''ایک بنجارا جو ہر قسم کے تکنیکی امور سے ناواقف ہے، تربیت یافتہ افراد سے بھڑ کر کامیابی حاصل کرتا ہے...... یہ نکتہ ناقابلِ ہضم لگتا ہے۔ کہانی میں چند ایک واقعاتی جھول بھی سامنے آنے لگے ہیں۔''
اس قسط پر ہونے والی تنقید نے مجھے بے قابو کردیا اور میں بھناتا ہوا آصفہ کے ان باکس میں جا پہنچا۔
''آپ نے ذوالفقار کی ہرزہ سرائی کو پسندیدگی کی سند کیوں عطا کی؟ آپ اس قدر غیر سنجیدہ تو کبھی نہ تھیں۔''
''اپنا لہجہ درست فرمایئے محترم...... اور اس نے کچھ غلط تو نہیں لکھا۔''
''آپ کی رائے پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں آپ کو اپنا نمائندۂ خاص بنانا چاہتا تھا تاکہ میری بہترین ترجمانی ہوسکے لیکن آپ نے ہی تنقید کا آغاز کردیا...... اپنا کمنٹ مٹا دیجیے اور میرا دفاع کیجیے۔''
''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں اپنی رائے بالکل میرٹ پر دوں گی اور معذرت کے ساتھ...... میرے الفاظ برائے فروخت نہیں ہیں کہ میں ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتی ہوئی ادبی خیانت کروں۔''
''اگر جمشید صحرائی کے ناول میں کوئی جھول ہوتا تو تب بھی یونہی کرتیں آپ؟'' میں نے سلگتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل یہی کرتی...... لیکن وہ ان خامیوں سے مبرا ہیں اور مثبت تنقید کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔''
''بس کر دیجیے آصفہ! صحرائی ایک بوڑھا آدمی ہے...... اس سے آپ کو کیا ملے گا؟'' میں نے غصے میں لکھا۔
''انتہائی بے ہودہ سوچ ہے یہ...... مجھے ان کی ذات سے کیا لینا دینا...... میں ان کے قلم کی مرید ہوں۔''
''ارے چھوڑو بھی...... کسی کی کہانی کو پسند کرنے کا مطلب مصنف کی اپنی ذات سے وابستگی ہی ہوتا ہے۔ میں ننھا بچہ نہیں ہوں جو سمجھ نہ سکوں۔''
''ایک قلمکار کی اس سوچ پر میں افسوس ہی کرسکتی ہوں...... اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو پھر یہ بھی جان لیجیے کہ آپ ذاتی پسندیدگی کے میرٹ پر بھی پورا نہیں اترتے۔'' اس نے اطمینان سے چوٹ کی۔
''میری ٹیم میں شامل ہو جاؤ آصفہ! بہت فائدے میں رہو گی۔'' میں نے اپنا آخری کارڈ ''ترغیب'' ظاہر کرتے ہوئے لکھا۔
''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔''
''میں تمہیں کسی بھی ادارے میں ٹاپ رائٹر بنا سکتا ہوں۔ ورنہ اس میدان میں لوگ برسوں دھکے کھاتے ہیں۔''
''مجھے دھکے کھانا منظور ہے...... لیکن میں آپ کا یہ مطالبہ پورا نہیں کرسکتی۔ میں ادبی خیانت ہرگز نہیں کروں گی۔''
''اچھی طرح سوچ سمجھ لو...... مجھے امید ہے تم گھاٹے کا سودا نہیں کرو گی۔ اگر قیمت زیادہ درکار ہو تو بھی بتا دینا...... ورنہ ایک یقینی تباہی تمہاری منتظر ہوگی۔''
''میں آپ کے میسجز بلاک کررہی ہوں...... آپ جو کرنا چاہتے ہیں، بخوشی کیجیے۔ آصفہ خان بھی ڈرے گی نہ جھکے گی۔ کرائے کے سپاہی اور بھی بہت مل جائیں گے...... گڈ لک۔''
اس کے بعد آصفہ نے میرے میسج کا رستہ ہی بلاک کر دیا۔ اس اہانت اور سابقہ ''سیٹ اپ'' کی ناکامی پر میں اپنا ضبط کھو چکا تھا اور اب کسی بھی قیمت پر اس لڑکی کو سبق سکھانا

چاہتا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت میں نے کچھ دن کے لیے ادبی بیٹھک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دوست دلاور اور سبحان میری غیر حاضری پر ذاتی طور پر رابطہ کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔

''سر جی! کوئی غلطی یا کوتاہی ہو گئی کیا ہم سے؟ ایسی بے رخی آپ پہ نہیں جچتی۔'' حسب توقع تیسرے ہی روز سبحان نے مجھے فون کیا۔

''بے رخی کیسی یارِ من! چند روز سے میں دلی طور پر بہت دکھی ہوں۔''

''الٰہی خیر! کیا ہوا میرے مرشد سائیں کو؟'' اس کی تشویش زدہ آواز ابھری۔

''سبحان میاں! بنجارا کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟''

''ایک انتہائی شاندار اور بین الاقوامی سازشیں بے نقاب کرتی ہوئی زبردست تحریر ہے......لیکن آپ کی دلی کیفیت کا تعلق بنجارا سے کیونکر پیدا ہو گیا؟''

''کیا آپ نے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ آصفہ خان اس کہانی پر ابتدائی داد کے ڈونگرے برسانے کے بعد یکدم مخالف بیانات کیوں داغنے لگی ہے؟'' میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''واللہ! میں کئی دن سے یہی بات کہنا چاہ رہا تھا......اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے آخر؟''

''وہ بے انتہا مکار، منافق اور موقع پرست لڑکی ہے یارِ من! اس نے میری زندگی اسقدر آزار بنا دی ہے کہ میں نے سماجی روابط سے تائب ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ارے سر! یہ ظلم نہ کیجیے گا۔'' سبحان بوکھلا گیا۔

''بس بھائی میرا دل ہی ٹوٹ گیا ہے......سچائی کا فی زمانہ یہی انجام ہوتا ہے۔ آصفہ خان بضد تھی کہ میں اس کے نام سے داستان ہزار رنگ میں کہانیاں لکھا کروں......لیکن جب میں نے انکار کیا تو میرے ناول پر تنقید کی دھمکیاں دینے لگی۔ ایک ادیب بہت حساس ہوتا ہے۔ ایسے معاملات سے اس کی سوچیں لہولہان ہو جاتی ہیں۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں سر جی! آپ ایک جانب رہیے۔ یہ محاذ ہم سنبھال لیں گے اور آصفہ کو یہاں ٹکنے ہی نہ دیں گے۔'' اس نے جوش سے کہا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔'' میں نے سر جھٹکتے ہوئے خود کلامی کی۔

☆☆☆

کچھ وقت گزرا تو ادبی بیٹھک میں کہانی میلے کا آغاز کر دیا گیا۔ نوآموز مصنفین اس سلسلے میں اپنی مختصر تحریریں پوسٹ کر کے سینئرز سے رائے طلب کرتے تھے۔ مجھے بھی اس مقابلے کا جج بنا دیا گیا۔ شنید یہی تھی کہ آصفہ بھی اس میں حصہ لے رہی ہے۔ میری دلی مراد بر آئی۔ مقابلے کے شرکاء مجھ سے ذاتی رابطہ کرنے کے بعد مثبت رائے کے لیے منت سماجت کرنے لگے اور میں نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا سے...... رد و کد کے بعد ان کی بات تسلیم کر کے زیر بار کر لیا۔

مجھے یقین تھا کہ آصفہ بھی مجھے اپنی تحریر پر رائے دینے کے لیے ضرور مدعو کرے گی لیکن اس نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی رابطہ نہ کیا۔ احساسِ توہین اور غصے سے میں نے بھی اس کی کہانی نظر انداز کر دی۔ مجھے گمان تھا کہ اس کہانی کی ریٹنگ بری طرح تنزلی کا شکار ہو گی لیکن صورتِ حال میں اس قدر ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوئیں کہ میں خود بھی بوکھلا کر رہ گیا۔

جمشید صحرائی نے اس تحریر پر مثبت اور حوصلہ افزا رائے دے کر سبھی کو انگشت بدنداں کر دیا۔ میرا تن بدن جھلسنے لگا۔ اسی پل مجھے دلاور کی کال موصول ہوئی۔

''سر جی! یہ آصفہ کی کہانی تو ایک ہی کمنٹ سے سپر ہٹ ہو جائے گی۔''

''جمشید اسے ذاتی فیور دے رہا ہے دلاور......میں تمہیں ایک غیر جانبدار رائے لکھ کر دیتا ہوں۔ تم اپنی جانب سے اسے پوسٹ کرو۔'' میں نے مٹھیاں بھینچیں۔

''ارے نہیں سر جی! جمشید صاحب اسے جانتے ہی نہیں......لیکن بہر حال میں کمنٹ کیے دیتا ہوں۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔''

اگلے دس منٹ بعد دلاور نے میرے الفاظ وہاں پہنچاتے ہوئے لکھا۔

''آصفہ خان کی تحریر اس مقابلے کی کمزور ترین کہانی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ خواتین کے شماروں سے بہت متاثر ہیں۔ کہانی کا پلاٹ گھسا پٹا اور آؤٹ ڈیٹڈ ہے لیکن ایک مصنف اپنے ٹریٹمنٹ اور اندازِ بیان سے اسے پُرکشش بنا سکتا ہے جو آصفہ نہ کر سکیں۔ تحریر میں جا بجا املاء کی اغلاط ہیں لیکن خیر یہ تو مصنفہ کی کم علمی یا لاعلمی کہہ سکتے ہیں۔ آصفہ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر وہ مزید کوشش کریں تو قدرے بہتر لکھ لیں گی۔ تاہم یہ ایک بیانیہ تحریر ہے جس میں کہانی کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہانی میلے کی کمزور ترین تحریر ہے......تحریر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ سرے سے کہانی ہی نہیں ہے۔''

چند لمحوں بعد میں نے ہاجرہ کو فون کیا اور حال احوال دریافت کرتے ہی استفسار کیا۔
''آپ کی کہانی پر جمشید صاحب نے کوئی رائے دی تھی کیا؟''
''نہیں سر جی! مجھے بہت دکھ ہے اس بات کا۔'' وہ کافی آزردہ تھی۔
''احتجاج آپ کا حق ہے ڈیئر ...... آپ سب ساتھیوں سے مشاورت کیجیے اور اس غیر مساوی سلوک کے خلاف ایونٹ کا بائیکاٹ کر دیں۔ میں ہر موڑ پر آپ کے ساتھ ہوں۔''
اور پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا...... کہانی میلا متنازعہ حیثیت اختیار کر گیا۔
میرے ذہن و قلب اب پُر سکون ہو چکے تھے۔ آصفہ سے ملی اذیت میں سود سمیت لوٹا چکا تھا۔ ''بنجارا'' پر اس کے تنقیدی تبصروں کے جواب میں میرے جانثار ساتھی اس کے خوب لتّے لیتے۔ میں وقتاً فوقتاً انہیں آصفہ سے منسوب جھوٹے قصے سنا کر اپنی مظلومیت ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوتی۔ اسے شکست سے دوچار کرنے کی تمنا شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور پھر ایک ایسا دھاکا ہوا جو مجھ سمیت ہزاروں اراکین کے وہم و گمان کی سرحدوں سے بھی بعید تھا۔

☆☆☆

چھ ماہ بعد بینک اوقات میں دلاور اور سبحان کی مشترکہ فون کالز موصول ہوئیں۔
''سر جی! آصفہ خان کی وہی کہانی داستان ہزار رنگ میں شائع ہوگئی ہے۔''
''واٹ ربش! ایسا کیسے ممکن ہے؟ ارے مجھ جیسے رائٹر کو وہاں دس سال بعد موقع ملا تھا۔ وہ کل کی بچی وہاں کیسے پہنچ گئی۔ اس نے کسی اور سے لکھوائی ہوگی یہ کہانی یا جمشید کی سفارش لی ہوگی۔'' میں بے قابو ہو گیا۔
''آپ ذرا گروپ میں ایک پوسٹ پڑھ لیجیے۔'' دلاور نے سپاٹ انداز میں کہا تو میں نے فوراً موبائل فون پر ہی اپنا اکاؤنٹ کھول لیا۔
ادبی بیٹھک میں آصفہ نے سب ممبران کی مبارکباد اور توصیف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔
''آپ سب کی محبتوں کا بہت شکریہ...... یہ کہانی نہیں...... میری بقا کی جنگ تھی۔ جمشید صاحب نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اسے طوالت دی جانی چاہیے۔ ان کا یہ کمنٹ ایک ''معزز ہستی'' سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس ہستی نے اپنے ایک ''سپاہی'' کے کندھے پر بندوق رکھتے ہوئے اس کہانی پر ''کمزور ترین تحریر'' کا فتویٰ لگا دیا۔ جمشید صحرائی کی رائے پر ایسی ہرزہ سرائی پر خاموشی اور بے عملی ان سے میری محبت کی توہین تھی۔ ایک طرف جمشید صاحب سے محبت تھی تو دوسری جانب کسی کی نفرت...... قرض تو مجھے چکانا ہی تھا۔ آج اس کہانی کی اشاعت سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اب میرے ذمے کوئی قرض نہیں۔''
اسی لمحے مجھے ان باکس میں ایک میسج موصول ہوا۔ آصفہ خان کا نام دیکھ کر میں حیران ہونا بھی بھول گیا۔
''زہے نصیب! آج ہمارے میسج کیسے اَن بلاک کر دیے؟'' میں نے طنز کیا۔ ''شاید اپنی ناکارہ کہانی پر تعریفی تبصرہ لکھوانا ہوگا۔''
''ہرگز نہیں...... یہ جوڑ توڑ آپ کا خاصہ ہیں لہٰذا آپ ہی کو مبارک...... میں تو شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ آپ کی ''محبت اور اعلیٰ ظرفی'' نے میرے ارادے مہمیز کیے۔ آئندہ بھی یونہی کرتے رہیے گا، میرے سفر میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی...... اور ہاں، ایک آخری بات یہ کہوں گی کہ کسی کو مات دینے کی خواہش میں ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق ہمیں ''شہ مات'' بھی دے سکتا ہے۔ آپ اپنی مہم جاری رکھیے...... میں اپنی محنت، خلوصِ نیت سے جاری رکھوں گی...... پھر یہ وقت خود ہی گواہی دے گا کہ شہ مات کس کا نصیب ٹھہری؟''
آصفہ کے ان الفاظ نے میری ذات کے پرخچے اڑا دیے اور اس روز سے ہمارے مابین ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

آتشِ انتقام نے میرے دل و دماغ بے طرح جھلسا رکھے تھے۔ آصفہ خان کا تصور میرے رگ و پے میں چنگاریاں پیدا کر دیتا۔ سبحان، ہاجرہ اور شہباز میری دلی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے کسی جانثار دوست کی طرح میری ہمت بندھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔
''سر جی! کم ظرف لوگوں کے لیے پریشانی میں مبتلا ہونا لاحاصل ہے۔'' سبحان اکثر ملاقات کے لیے آتا اور مجھے بے حد محبت سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا۔
''بس برادر! میری حساس طبیعت نے اس واقعے کا بہت اثر لیا ہے۔ آصفہ کے نام سے داستان ہزار رنگ میں کہانیاں لکھنے سے انکار کی پاداش میں آج میرا ناول بے

طرح تنقید کی زد میں ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں سر جی! ہم اسے اس حرکت کا مزہ ضرور چکھائیں گے۔'' سبحان کی جنگجو طبیعت مچل اٹھی۔

''لیکن کیسے؟''

'' اگر ہم آصفہ خان کے مقابلے میں اپنی ٹیم سے ایک رائٹر میدان میں لے آئیں تو اس کا سفر آغاز میں ہی بے موت مر جائے گا۔''

''نیک خیال ہے۔'' میں نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

''ہاجرہ بھی لکھنے لکھانے کا شغف رکھتی ہے...... اگر آپ اس کی راہنمائی کریں تو وہ آصفہ کو چاروں شانے چت کردے گی۔ علاوہ ازیں ہم سبھی احباب اس کے خلاف ادارے میں شکایتی اور تنقیدی مواد بھیجتے رہیں گے۔ ادبی بیٹھک میں اس کی کسی بھی تحریر کا ذکرِ خیر نہیں ہوگا۔ آپ دیکھیے گا وہ بہت جلد اپنی کہانیوں کے فلاپ ہونے پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے معافی طلب کرے گی۔'' سبحان کی حکمتِ عملی پر میں اَش اَش کر اٹھا۔

''مجھے منظور ہے...... میں کسی بھی قیمت پر اپنی اہانت کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں ہاجرہ کو کہانیاں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''بہت خوب! یہ ہوئی نا بات...... بس اب آپ اطمینان سے اس متکبر اور بد دماغ انسان کا زوال دیکھتے رہیے۔''

بہت عرصے بعد میں نے کھل کر سانس لی۔ آصفہ کی تلخ گفتگو اور اپنی ناکامی کسی پھانس کی طرح میرے دل میں گڑ چکی تھی تاہم سبحان اور ہاجرہ کی اس حکمتِ عملی نے مزاج میں قدرے بشاشت پیدا کردی۔

چند روز بعد ہاجرہ نے اپنی کہانیوں کے کئی مسودات کا پلندا مجھے ارسال کردیا۔ ان مسودات پر نظر ڈالتے ہی میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے اندازِ بیاں، جملوں کی بناوٹ اور دیگر لوازمات میں بے پناہ غلطیاں تھیں لیکن اب اوکھلی میں سر دیا تھا تو موسلوں سے کیا ڈرنا؟ میں نے ان تخلیقات کی زیبائش کے لیے کمر کس لی۔ درجن بھر سے زائد کہانیاں ازسرِنو لکھتے ہوئے میں ''بنجارا'' کی کئی اقساط پر نظرِ ثانی بھی فراموش کردیتا۔

اسی آنکھ مچولی میں چھ ماہ سے زائد عرصہ بیت گیا۔ میں اپنی ٹیم کی کارکردگی سے مکمل مطمئن تھا۔ میری تحریر پر معترض افراد ان کے جارحانہ انداز سے بے حد خائف رہتے۔ میں نے اپنی گمشدہ میراث ''پذیرائی'' ایک بار پھر حاصل کرلی۔ زندگی میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہوگیا تھا

لیکن سچ بتاؤں تو میری توجہ اب اپنی تحاریر سے زیادہ آصفہ کے خلاف مہم جوئی پر مرکوز ہو چکی تھی۔ شہباز نے میری ہدایات کے مطابق سوشل میڈیا پر موجود دیگر مصنفین سے روابط بڑھاتے ہوئے انہیں بھی ''سچائی'' سے آگاہ کرنے کا آغاز کردیا تو سبحان نے ماضی قریب میں آصفہ کے سرد رویے سے ''متاثرہ افراد'' پر مشتمل ایک ٹیم کی تشکیل شروع کرکے اس کے گرد گھیرا انتہائی تنگ کردیا۔

ہم سب کا مقصد محض ایک متکبر اور بد اخلاق لکھاری کی ''رسوائی اور راہِ راست'' پر واپسی تھا۔ اتحاد کی قوت سے تو چڑیاں بھی طاقتور جال اڑانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں' ہمارے مقابل تو ایک ایسی صنف موجود تھی جس کی کمزوری مسلمہ ہے۔

میں شدت سے اس کی شہ مات کا منتظر تھا۔

☆☆☆

چند دن سے بینک کی مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہوگیا تھا کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہ ملتی۔ پیشہ ورانہ مسائل کے علاوہ آصفہ کا سفرِ مسلسل بھی باعثِ آزار بن چکا تھا۔ میری ٹیم کے اراکین کی سب تدابیر کے باوجود وہ ''داستان ہزار رنگ'' میں باقاعدہ لکھاری بن گئی تھی۔ ہر ماہ ادبی بیٹھک میں اس پر ریکارڈ تنقید کی جاتی لیکن اس تنقید کے کوڑے کھا کر اس کی اگلی تحریر اسقدر نکھر کر سامنے آتی کہ میں دم بخود رہ جاتا۔ مختصر دورانیے میں ہی اس کی تحاریر نے قارئین کے دلوں میں گھر کرلیا۔ جمشید صحرائی کے بعد ایک اور ''رقیب'' میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔

نفرت' عداوت اور بغض کا یہ سفر دھیرے دھیرے میرے اعصاب میں انتشار پیدا کرنے لگا۔ تھکاوٹ' ذہنی تناؤ اور بے آرامی دیگر امور پر بھی بے طرح اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اس روز بھی میں لنچ کے اوقات میں ہی تھکن سے چُور ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ موبائل فون پر داستان ہزار رنگ کے رابطہ افسر کا پیغام دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''رانا صاحب! آج شام کچھ وقت نکال کر دفتر میں ملاقات کا شرف بخشیے...... کچھ ضروری امور پر بات چیت کرنی ہے۔''

میں نے الجھے ذہن سے ملاقات کی توثیق کردی اور طے شدہ وقت کے مطابق دفتر روانہ ہوگیا۔ چیف ایڈیٹر نے خوش اخلاقی سے استقبال کرتے ہوئے حال احوال

دریافت کیا لیکن جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں واضح تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔

''رانا صاحب! آپ کی ہمارے ادارے سے وابستگی اور خلوص انتہائی قابلِ تعریف ہے لیکن عزیزم! اگر آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں تو ایک وقفہ لے لیجیے..... ہمیں چنداں اعتراض نہ ہوگا۔''

''کیسا وقفہ جناب؟ میں سمجھ نہیں پایا۔''

''دیکھیے عزیزم! عروج و زوال تو زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں۔ آپ کی فروعی مصروفیات اب براہِ راست تخلیقی عمل پر اثر انداز ہونے لگی ہیں..... اس لیے آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ ''بنجارا'' کو جلد از جلد سمیٹنے کی کوشش کیجیے اور کچھ عرصہ اپنے قلم کو آرام دیجیے۔''

''یہ سراسر ناانصافی ہے..... میرا ناول ریٹنگ میں ٹاپ پر ہے۔ ہر ماہ آپ کے شمارے میں تعریفی خطوط کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ تحریر سمیٹنا چہ معنی دارد.....'' میں بھڑک اٹھا۔

''حضور! ذرا دھیرج رکھیے..... آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ناول ریٹنگ میں ٹاپ پر ہے؟'' وہ طنزیہ گویا ہوئے۔

''سوشل میڈیا پر ''بنجارا'' کی مقبولیت ریکارڈ ساز ہے۔ ہر ماہ آپ ڈھیروں تعریفی خطوط شائع کرتے ہیں۔''

''رانا صاحب! ہم اپنا ادارہ ''ہارڈ کاپی'' کی صورت میں چلاتے ہیں..... داستان ہزار رنگ، ڈیجیٹل ادارہ نہیں ہے کہ ہم سوشل میڈیا کی دنیا سے روابط قائم رکھیں..... اور رہی بات تعریفی خطوط کی' تو آج یہ بھی جان لیجیے کہ ہمیں وہ خطوط بھی سنسر کر کے شائع کرنے پڑتے ہیں۔ اصل فیڈ بیک اور عوامی رائے پر بھی نظر کرم کر لیجیے۔'' ایڈیٹر نے اپنے سامنے فائل میں موجود کچھ پرنٹ آؤٹس اور خطوط مجھے تھما دیے۔

میں نے بے تابی سے ان کاغذات پر نظر دوڑائی۔ الفاظ کسی خنجر کے مانند دل میں گڑے جا رہے تھے۔

''رانا راحیل کا یہ ناول جغرافیہ کا مضمون بن چکا ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو میں اس ناول کا مطالعہ ترک کر دوں گا۔''

''راحیل صاحب کا ہیرو انسانی خوبیوں کا مالک ہی نہیں..... وہ خلائی مخلوق کے مانند لگتا ہے۔''

''بنجارا کا آغاز بہت شاندار تھا لیکن اب تو یہ تحریر اتفاقات اور بے سروپا ایکشن پر مبنی تامل فلم کا تاثر دینے لگی ہے۔''

''ایک بہترین آغاز کے بعد مصنف اپنی تحریر سے انصاف کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ محض خانہ پری کے لیے لکھ رہے ہیں۔''

ان لفظوں کی تپش مجھے بے حال کر رہی تھی۔

''نیا ناول کس سے لکھوایا جائے گا..... جمشید صحرائی تو پہلے ہی سے مصروف ہیں۔'' میں نے ایک نئی تحریر کے آغاز کا عندیہ دینے کے لیے تمہید باندھی۔

''بورڈ میٹنگ میں چند ایک نام شارٹ لسٹ کرنے کے بعد حتمی فیصلہ آصفہ بانو کے حق میں دیا گیا ہے۔''

''وہ ایک ناتجربہ کار لڑکی ہے..... اسے اتنا بڑا پروجیکٹ سونپ کر اپنے ادارے کی ساکھ داؤ پر لگا رہے ہیں آپ؟'' میرا ذہن کھول اٹھا۔

''محترم! یہ آپ کا اور میرا دردِ سر نہیں ہے..... ایڈیٹوریل بورڈ نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔''

میرے وجود میں آتش فشاں دہکنے لگا لیکن اس کیفیت سے بے خبر ایڈیٹر نے اپنی روایتی مسکراہٹ اور خوش اخلاقی سے معانقہ کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

ایڈیٹر کے دفتر سے گھر واپسی کا سفر بے حد کٹھن تھا۔ زہریلے تبصرے اور تند الفاظ کی بازگشت اعصاب کو مکمل جامد کر گئی۔ رائٹنگ ٹیبل پر کاغذات کا ڈھیر میری نظرِ کرم کا منتظر تھا لیکن دست بستہ حاضر رہنے والے الفاظ بھی روٹھ کر جانے کہاں جا چھپے تھے۔

مسودات کی سیاہی' چائے کا خالی کپ' سگریٹ کے بیسیوں ادھ بجھے ٹکڑے' میز کے کناروں پر گرتی راکھ' کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی مدھم سرسراہٹ اور قدِ آدم کھڑکی سے منعکس شفق کی گہری سرخی میں ایک ہی ہیولا بار بار اپنی جھلک دکھلاتا اور کھلکھلاتی سرگوشی میں چند الفاظ دہرا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

''ایک آخری بات یہ کہوں گی کہ کسی کو مات دینے کی خواہش میں ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق ہمیں ''شہ مات بھی دے سکتا ہے۔'' کمرے میں موجود ہر شے سے انہی الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''نہیں! ہرگز نہیں..... رانا راحیل کبھی بھی شکست تسلیم نہیں کرے گا..... آخری مات آصفہ ہی کو ہوگی۔ میری رسائی اور تجربہ اسے کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا..... کبھی بھی نہیں۔'' میں نے عزمِ نو سے سوچا اور ایک نئی سپاہ کی تیاری کے لیے کمر کس لی۔

زہریلی بازگشت اب مدھم ہونے لگی تھی۔

قسط نمبر: 6

وقت

محسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔وقت رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا...... ''میرے بچے! انتظار کرو۔وقت آنے پر تمہیں سب بتادوں گا۔'' یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے اینگلٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔''ونی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے درِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مار اماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی...... ''مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔'' اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو اسٹیٹلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کر دیا۔آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔پھر سرخ ہنڈائے کار... میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاڈو اور لیما ایبل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے۔جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں

رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایئرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک سیاہ ٹویوٹا کرولا اس کے سر پر آن پہنچی۔ علی ہر نوعیت کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ حالات کی ستم ظریفی تھی یا شومئی قسمت کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ ان حالات میں انکل سلطان بے طرح مجھے یاد آئے۔ میں نے ان کی زبان سے ایک محاورہ سنا تھا...... سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی سچویشن تھی۔

میرے دائیں ہاتھ کی چوپ نے مجرمانہ ذہن رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور کی گدی کی ایسی ''مزاج پرسی'' کی تھی کہ وہ اپنی گردن کو ایک جانب ڈھلکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ''براجمان'' تھا۔ سیاہ ٹویوٹا کرولا سے برآمد ہونے والے اس کے دونوں ساتھیوں نے تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کے بعد ہی انہوں نے میری سمت پیش قدمی کی تھی۔

ٹیکسی سے باہر نکلتے وقت میں نے اپنا سفری بیگ بھی اٹھا لیا تھا جو اس وقت میرے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ میرا قیمتی لیپ ٹاپ اور پاسپورٹ بھی اسی بیگ میں تھا۔ ہنگامی صورتِ حال میں میرا ذہن بھی اپنی رفتار کو بڑھا دیا کرتا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے دس ویں حصے میں سیاہ ٹویوٹا کرولا سے برآمد ہونے والے نوجوان کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔

ان میں سے ایک دراز قامت اور دوسرا درمیانے قد کا مالک تھا۔ دراز قامت نوجوان نے جینز پر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور وہ خاصا خوش شکل انسان تھا۔ اس کے حلیے میں ہیروز والا لک تھا۔ اس نے کلائی میں اوپل والا بریسلٹ پہن رکھا تھا اور اس کی انڈیکس فنگر (انگشت شہادت) میں مجھے یلو سیفائر کی ایک انگوٹھی بھی نظر آئی۔ درمیانے قد کے مالک شخص نے سفید کاٹن کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ میں یہی توقع کر رہا تھا کہ وہ فوراً مجھ پر پل پڑیں گے اور مجھ سے سفری بیگ کو چھیننے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد میرے سیل فون، والٹ وغیرہ کی باری آنا تھی لیکن ان کا ردِعمل میری توقع کے برعکس تھا۔

دراز قامت ہیرو ٹائپ نوجوان نے بڑے معتدل انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''بھائی! تم کون ہو اور ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟''

''میں ایک مسافر ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹیکسی والا مجھے ہوٹل پہنچانے کے بجائے کسی ویران جگہ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت میں تھوڑا ''ہاتھ چلایا'' اور یہ بے ہوش ہو گیا۔'' بات کے اختتام پر میں نے بڑی بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

اس دوران میں شلوار سوٹ والا نوجوان اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر اس نے کسی کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ اور جس جگہ وہ کھڑا تھا اس کا پتا سمجھاتے ہوئے ایک موبائل گاڑی طلب کی۔

''تم نے تھوڑا نہیں، کافی زیادہ ہاتھ چلا دیا ہے۔'' دراز قامت نوجوان نے میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر وہ اپنے ساتھی کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔

''ارباب! ذرا چیک تو کر...... کہیں یہ کمینہ ٹہل تو نہیں گیا!''

اس کا اشارہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف تھا۔ شلوار سوٹ پوش ارباب، سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے ٹیکسی کی جانب بڑھ گیا۔

''رات کے آخری پہر تو بیرونِ ملک ہی کی فلائٹس یہاں پہنچتی ہیں۔'' دراز قامت نوجوان نے کہا۔ ''خصوصاً یورپ اور امریکا سے آنے والی۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

''میں امریکا سے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھی نہیں تھے ورنہ وہ اس طرح میرا انٹرویو کرنے کے بجائے لوٹ مار کو ترجیح دیتے اور اپنا کام کر کے رفو چکر ہو جاتے۔ اس خیال نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ بہرحال وہ دونوں میرے دشمن نہیں تھے۔

''کمینہ زندہ اور صحیح سلامت ہے۔'' ارباب نے اعلان کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''دو چار تھپڑ پڑیں گے تو آنکھیں کھول دے گا۔'' پھر وہ میری جانب اشارہ کرتے

ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

''عظیم! یہ مسافر خوش قسمت ہے جو لٹنے سے بچ گیا ورنہ زرینہ پھوپی کی طرح آج اس کا بھی کام ہوجانا تھا۔''

ان کی باہمی گفتگو سے مجھے ان دونوں کے نام معلوم ہوگئے تھے۔ دراز قامت عظیم نے کہا۔

''ابے! یہ خوش قسمت اس لیے ہے کہ امریکا سے آیا ہے اور تمہاری پھوپی زرینہ آئی تھیں جرمنی سے۔ نازی اور اتحادی میں کچھ تو فرق ہوتا ہے نا...... آئی لو امریکا۔''

عظیم کے آخری جملے سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ امریکا کا حمایتی تھا۔

ارباب نے کہا۔ ''عظیم! اگر تجھے امریکا سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمیشہ کے لیے وہاں چلا جا۔ ایک ماہ گزار کر واپس کیوں آگیا ہے؟''

ارباب کے لہجے میں بیزاری سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے امریکا بالکل پسند نہیں تھا شاید۔

''چلا جاؤں گا۔'' عظیم نے بڑے فخر سے کہا۔ ''اپنا تو پانچ سال کا ملٹی پل ویزا لگا ہوا ہے۔ ابھی میں نو مرتبہ اور بھی امریکا جاسکتا ہوں اور جب میں مناسب سمجھوں گا تو وہاں سیٹل بھی ہوجاؤں گا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''بھائی! لٹنے سے بچنے کے لیے مبارک ہو۔ اپنا نام تو بتادو۔''

''علی...... اسد علی۔'' میں نے جواب دیا۔

عظیم نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''علی میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ ارباب میرا کزن ہے۔ یہ میری پھوپی کا بیٹا ہے اور...... یہ پولیس والا ہے۔''

میں نے عظیم اور ارباب سے باری باری مصافحہ کیا۔ وہ دونوں کزن تھے اسی لیے آپس میں کافی بے تکلف تھے اور ''تو تڑاق'' سے بات کرتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ارباب نے جو کسی کو فون کیا تھا تو یقیناً اس نے پولیس کی موبائل گاڑی کو وہاں بلایا ہوگا۔ مالک کا شکر کہ میں نہ صرف لٹنے سے بچ گیا تھا بلکہ اس وقت محفوظ افراد کے بیچ تھا لیکن ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی تھی کہ یہ بات ارباب اور عظیم کو کیسے پتا چلی کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے لوٹنے کی غرض سے اس طرف لایا تھا جو وہ سیاہ ٹویوٹا کرولا میں وہاں پہنچ گئے۔

جب یہی سوال میں نے ان سے کیا تو ارباب نے بتایا۔

''اس ٹیکسی ڈرائیور کو ہم کافی دنوں سے تلاش کررہے تھے۔ یہ کئی مسافروں کو اسی طرح لوٹ چکا ہے۔ چند روز پہلے اس نے جرمنی سے آنے والی میری پھوپی زرینہ کو بھی لوٹ لیا تھا۔ پھوپی کے پاس زیور اور نقدی کے علاوہ بہت سا قیمتی سامان بھی تھا۔ سب کچھ چلا گیا۔ پھوپی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نامراد کی ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ ہم جبھی سے اس کی تلاش میں تھے لیکن یہ ذلیل انسان بہت شاطر ہے۔ پھوپی کو لوٹنے کے بعد اس نے کئی روز تک اپنی ٹیکسی روڈ پر نہیں نکالی ورنہ یہ کہیں نہ کہیں ضرور پولیس کی گرفت میں آجاتا۔ اینی ہاؤ...... اس وقت میں ڈیوٹی پر بھی نہیں ہوں اس لیے تمہیں سول ڈریس میں نظر آرہا ہوں۔ میں عظیم کے ساتھ کہیں جارہا تھا کہ اس ٹیکسی پر میری نگاہ پڑی اور میں نے اس کا تعاقب کیا، پھر ہم یہاں پہنچ گئے۔''

''میری مدد کرنے کا بہت شکریہ۔'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' ارباب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں پولیس ڈیپارٹ میں انسپکٹر ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض بنتا تھا۔''

''اور جہاں تک ''مدد کرنے'' کی بات ہے تو اس کی تمہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔'' عظیم نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے تم یہ کام بہ خوبی کرچکے تھے۔'' پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''تمہارے تھوڑا سا ہاتھ چلانے سے جو وہ انٹا غفیل ہوا ہے تو اب تک واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ تمہارے ہاتھوں میں ضرور کوئی گن چھپا ہوا ہے...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''مسٹر عظیم! میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہ اپنی حفاظت کی خاطر کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اس ٹیکسی کا تعاقب کررہے ہیں تو میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اطمینان سے بیٹھا رہتا اور جہاں تک میرے ہاتھوں میں کسی گن کے چھپے ہونے کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دکھانے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

''مجھے تو ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا......!''

''بہت گہرے ہو......!'' عظیم نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، پولیس کی پٹرولنگ موبائل وہاں پہنچ گئی۔ ہم سب پولیس کی گاڑی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تین باوردی پولیس والے موبائل میں سے نکلے اور انہوں نے ارباب کو سیلیوٹ کیا۔ ارباب نے ٹیکسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے ہوش میں لاؤ اور ڈالو موبائل میں۔ تھانے چل کر اس کا آپریشن کرتے ہیں۔"

ایک پولیس والا موبائل کی طرف بڑھا اور باقی دونوں ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مصروف ہوگئے۔ یہ "مصروفیت" بے دریغ طمانچوں پر مبنی تھی۔ اسی دوران میں تیسرا پولیس والا موبائل میں سے پانی کی ایک بوتل اٹھا لایا۔ پھر اس پانی کی مدد سے ٹیکسی ڈرائیور کے گالوں پر طمانچوں کے ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے بھی مارے جانے لگے۔ اگلے ہی لمحے ٹیکسی ڈرائیور نے آنکھیں کھول دیں۔

اس نے اپنے گرد پولیس والوں کو دیکھا تو سہم گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "میں کہاں ہوں......؟"

"تم اس وقت اپنے باپ کی سسرال میں یعنی اپنی ننھیال میں ہو۔" ارباب نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اب یہ نہیں پوچھنا......میں کون ہوں؟...... کیونکہ ہمیں پتا ہے، تم بڑے چال باز ٹیکسی ڈرائیور ہو۔ رات گئے مسافروں کو ویران سڑکوں کی طرف لے جا کر لوٹتے ہو۔" لمحاتی توقف کر کے ارباب نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"مم...... مقصود......" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

اسی وقت اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ اور بھی خوفزدہ ہوگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس صورتِ حال میں اسے اپنی بچت کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

عظیم نے اس کے قریب آکر خوں خوار لہجے میں کہا۔

"بیٹا جی! اب تم شہید ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بہت عیش کر لیے تم نے۔" میں نے مزید گرہ لگائی۔

"شہید تو تمہیں ہونا ہی پڑے گا اور وہ بھی تھانے جا کر۔"

"عظیم! تم اسد علی کو اس کی منزل تک پہنچا دو۔" ارباب نے کہا۔ "میں اس خبیث کو تھانے لے جا رہا ہوں۔"

پھوپی زرینہ نے اتنے دن سے طعنے مار مار کر میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ کہتی ہیں...... ارباب پتر! تیرا پولیس والا ہونے کا کیا فائدہ۔ میں تو تمہارے شہر میں آ کر لٹ گئی......"

وقت

علامت

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کرکٹ انگریزوں کے لیے مشغلہ نہیں، مشن ہے۔ لیکن اگر آپ نے کبھی کرکٹ کی ٹیموں کو مئی جون کی بھری دوپہر میں ناعاقبت اندیشانہ جرأت کے ساتھ موسم کو چیلنج کرتے دیکھا ہے تو ہماری طرح آپ بھی اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تعزیری مشقت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر کوئی سر پھرا منہ مانگی اجرت دے کر بھی اپنے مزدوروں سے ایسے موسمی حالات میں یوں کام کرائے تو پہلے ہی دن اس کا چالان ہو جائے۔ مگر کرکٹ میں چونکہ عام طور سے معاوضہ لینے کا دستور نہیں، اس لیے چالان کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں جس طرح ہلکا پھلکا کھیل ترقی کر کے کام میں تبدیل ہو گیا وہ اس کے موجدین کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ غالب نے شاید ایسی ہی کسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

اور اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل کے معاملے میں ہمارا رویہ بالغوں جیسا نہیں، بالکل بچوں کا سا ہے......اس لحاظ سے کہ صرف بچے ہی کھیل میں اتنی سنجیدگی برتتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بچہ سیانا ہوتا ہے، کھیل کے ضمن میں اس کا رویہ غیر سنجیدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ذہنی بلوغت کی علامت ہے۔

کرکٹ کے رسیا ہم جیسے ناآشنائے فن کو لاجواب کرنے کے لیے اکثر کہتے ہیں:

"میاں! تم کرکٹ کی باریکیوں کو کیا جانو؟ کرکٹ اب کھیل نہیں رہا، سائنس بن گیا ہے سائنس!"

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب

"چراغ تلے" سے اقتباس

ذہانت

☆رات کو نیند نہیں آتی، دن کو چین نہیں آتا۔ دل سے پوچھا کیا یہی پیار ہے۔ دل نے کہا نہیں پاگل گرمی کی وجہ سے سب کا یہی حال ہے۔

☆☆☆

☆امتحان میں سوال آیا کہ چیلنج کسے کہتے ہیں؟ ایک لڑکے نے پورا پیپر خالی چھوڑ دیا اور آخری صفحے پر لکھا...... اپنے باپ کی اولاد ہے تو پاس کر کے دکھا۔

مرسلہ: ام حرم شفیق۔ نیو کراچی

ذرا دیر کو رک کر اس نے گہری سانس لی پھر ٹیکسی ڈرائیور کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے کڑوے لہجے میں بولا۔

''میں نے سورج طلوع ہونے سے پہلے اس لٹیرے کے اندر سے پھوپی زرینہ کا سارا سامان اور سارا مال نکلوانا ہے......''

''او کے ارباب! تم اپنے محکمہ جاتی کاموں کو زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔'' عظیم نے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ بھائی، ہم چلتے ہیں۔''

میں نے ارباب سے الوداعی مصافحہ کیا اور سیاہ ٹویوٹا کرولا میں پسنجر سیٹ پر آبیٹھا۔ عظیم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور مجھ سے پوچھا۔

''کدھر جائیں گے؟''

''ہوٹل پی سی۔'' میں نے جواب دیا۔

''امریکا سے آئے ہو اور ہوٹل جارہے ہو؟'' عظیم نے گاڑی کو واپس ائرپورٹ کی سمت موڑتے ہوئے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے نا بھائی؟''

''بالکل خیریت ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مقصود تو مجھے مخالف سمت میں لے جارہا تھا۔ اگر میں اس کے ہاتھوں لٹ جاتا تو پھر شاید خیریت نہ رہتی......''

میں عظیم کی کرید کو سمجھ رہا تھا لیکن ظاہر ہے، میں کسی اجنبی کے ساتھ فری نہیں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ یہ ثابت ہوچکا تھا کہ وہ میرا دشمن نہیں، مجھے اس کی ذات سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ اس کی ٹٹول کے نتیجے میں، اسے میں جو جواب دے رہا تھا ان سے اس کی تسلی نہیں ہورہی تھی۔

''ہوٹل میں ٹھہرنے کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ ادھر کراچی میں تمہارا کوئی اپنا نہیں ہے!'' عظیم نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے تک ایسا ہی تھا۔'' میں نے گاڑی کے باہر کے مناظر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا کوئی اپنا ہے۔ یہاں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عظیم نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مسٹر عظیم! مشکل وقت میں جو انسان آپ کی مدد کرے وہ آپ کا اپنا ہی تو ہوتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ نیک اور خیرخواہانہ کام آپ نے کیا ہے......'' لحاتی توقف کر کے میں نے دوبارہ گاڑی سے باہر دیکھنا شروع کردیا اور حیرت بھرے لہجے میں اضافہ کیا۔

''ارے...... اب لگ رہا ہے کہ میں ہوٹل پی سی کی طرف جارہا ہوں۔ وہ بدبخت ٹیکسی ڈرائیور تو مجھے کہیں اور ہی لے جارہا تھا۔''

''میں نے کوئی نیک کام کیا ہے یا نہیں، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر میں اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ تم اپنے معاملات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔ اینی ہاؤ، میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کیا کراچی میں تمہارا کوئی رشتے دار یا دوست نہیں ہے جو تم ائرپورٹ سے سیدھا پی سی جارہے ہو۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے مسٹر عظیم۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں زندگی میں آج پہلی مرتبہ پاکستان آیا ہوں۔ یہاں پر میں کسی کو جانتا ہوں اور نہ ہی کوئی مجھے جانتا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم یا تو ٹورسٹ ہو اور یا پھر کسی خاص مشن پر یہاں آئے ہو؟'' عظیم نے شک زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

عظیم ایک ذہین شخص تھا۔ اس کی دونوں باتیں درست تھیں یعنی میں ٹورسٹ بھی تھا اور ایک خاص مشن لے کر بھی کراچی آیا تھا لیکن میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''عظیم! تمہارا پہلا اندازہ درست ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں۔ تین دن تک کراچی میں قیام کروں گا پھر شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جاؤں گا۔ دیٹس آل۔''

وہ چند لمحات تک بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

''اسٹوڈنٹ ہو؟''

''یس۔''

''کیا پڑھ رہے ہو؟''

''سائیکالوجی......'' میں نے بتایا۔ ''گریجویشن کرلیا۔ آج کل سمر وکیشنز ہیں۔ میں سیر سپاٹے پر نکل آیا۔''

''سائیکالوجی ......'' اس نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔ ''میلو کی یا فیمیلو کی؟''

''ہیومن سائیکالوجی!'' میں نے جواب دیا۔ ''اور یہ دونوں ہیومن میں ہی شمار ہوتے ہیں۔''

''شاید......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''شاید کا کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔ ''کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں انسان ہی ہیں لیکن میرے خیال میں دونوں کی نفسیات میں کافی فرق ہوتا ہے۔''

''دونوں بنیادی طور پر تو ہیومن (انسانی) نفسیات ہی کے حامل ہوتے ہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن جینڈر کے فرق کی وجہ سے تھوڑا الگ ضرور ہیں۔''

''تھوڑا کیا، مجھے تو بالکل ہی الگ لگتا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ ایک دوسرے کے برعکس ہیں اسی لیے وہ کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کون؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''مہر النسا......'' اس نے بوجھل لہجے میں بتایا۔

''اوہ......'' میں نے کہا۔ ''کیا مہر النسا تمہاری محبوبہ ہے؟''

''کبھی وہ میری محبوبہ تھی۔'' وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھی کا کیا مطلب ہوا عظیم؟''

''اب وہ میری بیوی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ شادی شدہ ہو؟'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''صرف شادی شدہ ہی نہیں بلکہ چار بچوں کا باپ بھی ہوں۔ میرا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔''

''ویری گڈ۔'' میں اتنا ہی کہہ سکا۔

''میں نے لو میرج کی تھی۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''مجھے مہر النسا سے شدید نوعیت کا عشق ہو گیا تھا لیکن دونوں طرف کا سماج ہمارے ملن کے حق میں نہیں تھا چنانچہ ہم نے کورٹ میرج کرلی لہٰذا دونوں جانب کے ظالم سماج کو ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنا پڑے لیکن شادی کے بعد مہر النسا کا مجھ سے رویّہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ میں اب بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں لیکن اسے میری کوئی پروا نہیں۔ ہر روز گھر میں ایک نیا پھڈا کھڑا ہوتا ہے۔''

''اس میں مہر النسا کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''کیا تم مہر النسا کو جانتے ہو؟''

''ہاں جانتا ہوں۔'' میں نے عظیم سے تفریح لینے کی غرض سے کہا۔

''تم تو پہلی مرتبہ پاکستان آئے ہو۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے کراچی میں تو تم دونوں کی ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... تو اس کا مطلب ہے، وہ نیویارک یا یوسٹن میں تم سے ملی ہوگی......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر سوال کیا۔

''تم امریکا میں کہاں رہتے ہو؟ میرا مطلب ہے،

تمہارا تعلق امریکا کی کس ریاست سے ہے؟''
''ٹیکساس۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔
''ہیوسٹن بھی تو ٹیکساس ہی میں ہے......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔
''بالکل ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی ہیوسٹن ہی سے کراچی آیا ہوں لیکن میری رہائش ہیوسٹن میں نہیں۔ میں ٹیکساس کے علاقے لیک جیکسن میں رہتا ہوں۔ تم نے نیویارک اور ہیوسٹن کا ذکر کیوں کیا۔ کیا مہرالنسا وہاں رہتی ہے؟''
''وہ وہاں رہتی نہیں بلکہ وزٹ ویزا پر آج کل ادھر گئی ہوئی ہے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''میں نے فروری میں وزٹ ویزا لینے کے لیے پوری فیملی کو ٹرائی کیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے، مہرالنسا اور چاروں بچوں کو پانچ سال کا ملٹی پل ویزا مل گیا۔ پہلے میں امریکا گیا اور لگ بھگ ایک ماہ وہاں گزارنے کے بعد واپس آ گیا۔ میرے اس وزٹ کا مقصد اپنے بزنس کے لیے امریکا کی مارکیٹس کو چیک کرنا تھا۔ چند روز میں نیویارک میں رکا۔ شیرٹن ہوٹل میں میرا قیام تھا جو خاصا مہنگا پڑ رہا تھا لہٰذا میں اپنے ایک فیملی فرینڈ کے پاس کیلی فورنیا چلا گیا۔ وہ شخص ایل اے (لاس اینجلس) میں رہتا ہے۔ اس مختصر سے ٹور میں تو امریکا میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں واپس آ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ ٹرائی کروں گا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''آج کل مہرالنسا دو بیٹیوں کے ساتھ امریکا گئی ہوئی ہے۔ اس کی والدہ یعنی میری ساس صاحبہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ یہاں سے بہت سے ڈریس اپنے ساتھ لے کر گئی ہیں۔ ان ڈریس کو وہاں کی ایگزی بشنز میں سیل کریں گی اور ساتھ ہی سیر و تفریح بھی چلتی رہے گی۔ یہ لوگ پہلے بروکلین نیویارک میں چند روز ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب ہیوسٹن گئے ہیں۔ ہیوسٹن میں میری ساس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ زیادہ وقت یہ لوگ ہیوسٹن ہی میں گزاریں گے۔ وہاں بھی ڈریسز کی ایگزی بشنز کرنا ہیں۔ گیارہ جولائی کو آغا خان کمیونٹی کا کوئی بڑا دن آنے والا ہے۔ ٹیکساس، خصوصاً ہیوسٹن میں اس کمیونٹی کے کافی لوگ آباد ہیں لہٰذا بڑے دن کی تیاری کے لیے خوب شاپنگ کریں گے۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہرالنسا ڈریسز فروخت کرے گی اور اچھی خاصی رقم کما کر واپس آئے گی...... اسی لیے میں نے تم سے پوچھا کہ مہرالنسا سے تمہاری ملاقات کہاں پر ہوئی اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

اس نے مجھے جتنی تفصیل کے ساتھ اپنی فیملی کے حالات و واقعات کے بارے میں بتایا تھا، اس سے اس کی سادگی اور نیک نیتی جھلکتی تھی۔ میں اگر چاہتا تو ان معلومات کی روشنی میں عظیم کے ساتھ کوئی بھی گیم کھیل سکتا تھا۔ اگر میں اسے بتاتا کہ میں نیویارک یا ہیوسٹن میں مہرالنسا سے ملاقات کر چکا ہوں تو وہ بھی میرے اس جھوٹ کو پکڑ نہیں سکتا تھا لیکن میرے ضمیر کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ شفاف دل کے مالک عظیم کے ساتھ ایسی چیٹنگ کروں۔ جب وہ میرے ساتھ مخلص تھا تو پھر میں اسے دھوکا کیسے دے سکتا تھا۔
''عظیم!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مہرالنسا سے نیویارک میں ملا ہوں اور نہ ہی ہماری ملاقات ہیوسٹن میں ہوئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ملاقات کبھی بھی، کہیں بھی نہیں ہوئی۔''
''پھر تم نے کیوں کہا کہ تم مہرالنسا کو جانتے ہو؟'' وہ خفگی آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''اور یہ کہ تم اسے بے قصور سمجھتے ہو؟''
''یہ بات میں نے ہیومن سائیکالوجی کی بنیاد پر کہی تھی۔''
''ہیومن سائیکالوجی۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
''ہیومن سائیکالوجی کا سیدھا سیدھا مطلب ہے، انسانی نفسیات۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ علم بتاتا ہے کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو پھر اس سے محبوبہ والی اندھی اور طوفانی محبت کی توقع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اب آپ اس کے شوہر بن چکے ہوتے ہیں اور پھر جب وہ بچوں کو جنم دیتی ہے تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اب وہ کسی کی ماں بھی ہے۔ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس کی ذات دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اولاد پیدا کرنے کے بعد اس کی ذات تین حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ گویا اسے ان تینوں حصوں کے لیے ٹائم نکالنا ہوتا ہے۔ اس کا محبوب اور اس کا شوہر کسی اور کی اولاد ہوتا ہے جبکہ بچے اس کی اپنی اولاد ہوتے ہیں لہٰذا فطری اور نفسیاتی طور پر اس کی سب سے زیادہ توجہ اپنی اولاد پر مرکوز رہتی ہے۔ اس مصروفیت سے وہ تھوڑی بہت فرصت اپنے شوہر کی دیکھ ریکھ کے لیے نکال لیتی ہے اور محبوب...... کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا چنانچہ کسی بیوی اور بچوں کی ماں سے سب سے زیادہ شکایت بے

چارے محبوب ہی کو ہوتی ہے جیسا کہ تمہیں ہے......''

''او بھائی نفسیات داں!'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔''اگر میں تمہاری تقریر سن رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مہرالنسا کی حمایت میں مجھے ہی قصوروار ٹھہرادو۔''

''میں نے نہ تو مہرالنسا کی حمایت کی ہے اور نہ ہی تمہاری مخالفت۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔''میں نے تو ایک اصولی بات کی ہے۔''

''لو بھائی، ہم پی سی پہنچ گئے۔''عظیم نے سیاہ کرولا کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اصولی بات سے میں نہ تو اتفاق کروں گا اور نہ ہی اختلاف......بس، تم مجھے یہ بتادو کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟''

''صبر اور برداشت۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''بے شک! مالک صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''ملاّ والی لولی پاپ سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ گاڑی کو ایک طرف روکتے ہوئے بولا۔''تم ماہر نفسیات ہو تو مجھے اس مسئلے کا کوئی سائنٹیفک حل بتاؤ۔''

''میاں بیوی کا رشتہ ایسا بندھن ہے کہ جس کے بیچ اپلائی کی جانے والی ہر سائنس زیرو ہوجاتی ہے۔'' میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔''اگر اس اپلیکیشن کو بار بار ٹرائی کیا جائے تو سسٹم ہینگ ہوجاتا ہے۔''

''لیکن میرے پاس ہے ایک حل اس مسئلے کا۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

''کون سا حل؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''تم ریسپشن پر پہنچو اور چیک ان کا پراسس مکمل کرو۔''عظیم نے بہ دستور معنی خیز انداز میں کہا۔''میں گاڑی کو پارک کرکے آرہا ہوں پھر اس ٹاپک پر بات کریں گے۔''

''اوکے......'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس کی گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

اگلے دس منٹ میں چیک ان کا پراسس مکمل ہوگیا۔ پی سی میں میری تین دن کے قیام کی بکنگ تھی۔ اس دوران میں عظیم اپنی گاڑی کو پارکنگ میں لگا کر واپس آگیا تھا۔ ہم دونوں لابی میں بیٹھ گئے۔ عظیم نے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہوجائے گی لیکن تم ایک طویل سفر کرکے یہاں پہنچے ہو لہٰذا تمہیں ڈٹ کر ایک بھرپور نیند لینا چاہیے۔ میں تمہیں زیادہ دیر لابی میں نہیں روکوں گا۔ بس تم ناشتا کرو پھر اوپر اپنے کمرے میں جاکر آرام سے سوجانا۔''

''ناشتے کی کوئی خاص طلب محسوس نہیں ہورہی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''ادھر دبئی میں کافی کچھ کھالیا تھا۔''

''یار! تمہارے بہانے میں بھی کچھ کھالوں گا۔''عظیم نے دوستانہ انداز میں کہا۔''اور تھوڑی گپ شپ بھی ہوجائے گی۔ ابھی تو میں نے تمہیں اس مسئلے کا حل بھی بتانا ہے۔''

''او، یس!'' میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔''اوکے، ہم ہلکا پھلکا ناشتا کرسکتے ہیں۔''

''تھینکس برو! کیا منگواؤں؟''عظیم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔''ایزیوژل۔ سب چلے گا۔''

عظیم نے ویٹر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔''باس! دو کپ چینو، کلب سینڈوچ اور کوئی اچھا سا کیک کھلادو۔''

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو عظیم نے اپنی جینز کی ہپ پاکٹ میں سے والٹ نکالا اور اس والٹ کے اندر سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''برو! یہ رکھ لو۔ آپ تین دن کے لیے کراچی کے مہمان ہو۔ اگر کوئی بھی پرابلم ہو تو آپ مجھے کال کروگے۔ اوکے......!''

میں نے اس کے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ لے کر اس پر نگاہ ڈالی۔ وہاں ''عظیم احمد کپور'' کا نام درج تھا۔ عہدے والی لائن میں ڈائریکٹر لکھا تھا اور کمپنی کا نام ''اے کے ٹریڈرز'' تھا۔ نیچے نیوچالی کے علاقے کا ایڈریس تھا۔ میں نے مذکورہ کارڈ کا بہ غور جائزہ لیا پھر عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عظیم! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی بات برو؟''

''عظیم احمد اور کپور کا ملاپ......'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔''میں سمجھ نہیں پارہا کہ ایک مسلمان شخص کے ساتھ کسی ہندو فیملی کا سرنیم کیوں لگا ہوا ہے؟''

''اکثر لوگوں کو اس بات پر حیرت بلکہ الجھن ہوتی ہے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔''بات دراصل یہ ہے کہ میرے آباؤاجداد کا تعلق ماضی میں ہندوؤں سے رہا ہے اور اگر تین چار نسلیں پیچھے چلے جائیں تو ہم لوگ ہندو ہی تھے پھر جب ہندوستان میں دعوتِ اسلام کا آغاز ہوا تو بہت سے سکھوں اور ہندوؤں نے مذہب اسلام اختیار کرلیا۔ اسی زمانے میں میرے آباؤاجداد نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا اور ہم مسلمان ہوگئے تھے۔ میرے پردادا کی

ضد تھی کہ ہم اپنا فیملی سر نیم نہیں ہٹائیں گے لہٰذا ہم سب کے ناموں کے ساتھ ''کپور'' لگا ہوا ہے۔''

''انٹرسٹنگ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کی یہ کمپنی ''اے کے ٹریڈرز'' کس قسم کی ٹریڈنگ کرتی ہے؟''

''ہم لوگ ملائیشیا، یو اے ای اور دوسرے ملکوں سے ایڈیبل آئل امپورٹ کرتے ہیں۔'' عظیم نے بتایا۔ ''ایک زمانہ تھا ایڈیبل آئل (کھانے کا تیل) کی امپورٹ میں ہمارا طوطی بولتا تھا لیکن آج کل بزنس کافی ٹھنڈا جا رہا ہے پھر بھی اللہ کا شکر ہے۔ اس پروردگار نے اپنے کرم سے بہت عزت سے نواز رکھا ہے۔''

''آج کل پوری دنیا میں بزنس کا حال کم وبیش ایک جیسا ہی ہے۔'' میں نے اظہارِ حقیقت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر بزنس مین اپنے اپنے سُر میں ایک ہی رونا رو رہا ہے۔ اینی ہاؤ...... اے کے ٹریڈرز سے مراد ''عظیم کپور ٹریڈرز'' ہی ہے نا؟''

''اسے ''عظیم کپور'' سمجھیں یا ''علی کپور'' کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں بھائی مل کر بزنس کو سنبھالتے ہیں اور پاپا ہماری راہ نمائی کرتے ہیں۔ میرے پاپا حفیظ احمد کپور کا نام بزنس کی دنیا میں بہت معروف ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم سے مل کر واقعی مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''میں تمہیں اپنے پاپا اور چھوٹے بھائی علی سے بھی ملواؤں گا۔'' عظیم نے کہا۔ ''تم اچھی طرح ریسٹ کرلو۔ میں شام میں تم سے کانٹیکٹ کروں گا۔ اگر تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے تو مجھے دے دو۔''

''میرے پاس تو امریکا والا نمبر ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس پر کال کرو گے تو تمہیں رومنگ لگے گی اور کال بہت مہنگی ہو جائے گی۔''

''اس مسئلے کا تو بہت ہی آسان سا حل ہے۔'' وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ''میں جب امریکا میں تھا تو میں نے وہاں کا سم کارڈ بھی لیا تھا۔ بس، اس میں کریڈٹ ڈالنا ہوگا۔''

''میرے پاس اس مسئلے کا اور بھی آسان حل موجود ہے۔'' اب کی بار میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

وہ دلچسپ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کیا ہے؟''

''تم واٹس ایپ یوز کرتے ہو؟''

''ہاں...... یوز کرتا ہوں۔''

''بس تو پھر ہم واٹس ایپ پر کانٹیکٹ کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں واٹس ایپ کے نمبرز ایکسچینج کر لیتے ہیں۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' عظیم نے ستائشی نظر سے میری طرف دیکھا۔

اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو نہ صرف اپنا واٹس ایپ کا نمبر دیا بلکہ ایک دوجے کو اپنے پاس ایڈ بھی کرلیا۔ میں نے کہا۔

''عظیم! ابھی تک تم نے اس مسئلے کا حل نہیں بتایا جس کا تعلق بیوی اور محبوبہ سے ہے!''

''برو! اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔'' وہ آنکھ دبا کر بولا۔ ''محبوبہ اور بیوی دو الگ کردار ہونا چاہیے۔ ایک گھر والی، ایک باہر والی۔ گھر میں بھی سکون، باہر بھی شانتی۔''

''زبردست!'' میں نے کہا۔ ''اس میں اگر تیسرا کردار آفس والی کا بھی شامل کرلیں تو ایک مثلث بن جائے گی۔''

''پھر مجھے گنجا ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔'' عظیم نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''مہرالنسا کو پہلے ہی مجھ پر شک ہے کہ میرا کسی سے کوئی چکر وکر چل رہا ہے اور...... پاپا اس کے شک کو مضبوط کرتے رہتے ہیں۔''

''عظیم! ایک بات ذہن میں فیڈ کرلو کہ شک صرف مرد کو ہوتا ہے، عورت کو ہمیشہ یقین ہوتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اینی ہاؤ...... اب تمہاری مہرالنسا سے کب بات ہوگی؟''

''کیوں...... خیریت؟'' وہ بدلے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''گھبراؤ نہیں، میں تمہاری کوئی شکایت نہیں کرنے والا۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہاری جب بھی اپنی وائف سے بات ہو تو اسے یہ ٹپ دینا کہ بوسٹن میں اسماعیلی کمیونٹی کا جو سب سے بڑا جماعت خانہ ہے اس کے نزدیک ہی ساؤتھ ولکریسٹ ڈرائیو پر ''سوائے'' ریسٹورنٹ اینڈ شاپنگ مال ہے۔ گیارہ جولائی والے آغا خان کمیونٹی کے امامت ڈے کے حوالے سے سوائے میں چوڑیوں، مہندی اور ملبوسات کے مختلف اسٹالز لگتے ہیں۔ کوئی بھی شخص جماعت خانے کے مکھیا سے اسٹال لگانے کی اجازت حاصل کرسکتا ہے۔ اس اجازت نامے کو دیکھ کر سوائے والے اسٹال کے لیے ایک بڑی ٹیبل مہیا کر دیتے ہیں۔ اگر مہرالنسا اس آپشن کو یوز کرے تو اس کی خوب کمائی ہوسکتی ہے۔''

''زبردست آئیڈیا ہے یار۔'' وہ پُرجوش انداز میں

بولا۔ ''میں آج ہی مہرالنسا کو بتاتا ہوں۔''
تھوڑی دیر کے بعد عظیم ہوٹل سے رخصت ہوگیا۔
میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے انکل سلطان سے رابطہ کیا۔ کراچی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد میں نے اپنی رسٹ واچ اور سیل فون میں پاکستان کا معیاری وقت سیٹ کرلیا تھا۔ اس وقت میرے پاس ستائیس جون کی صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ بے سٹی، ٹیکساس میں اس وقت چھبیس جون کی رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ تیسری گھنٹی پر انکل نے میری کال ریسیو کرلی۔
''ہیلو انکل! آپ کیسے ہیں۔ آپ سوتو نہیں گئے تھے؟''
''تمہاری طرف سے خیریت کی خبر سنے بغیر میں کیسے سوسکتا ہوں میرے بچے!'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''میں پچھلے پانچ گھنٹے سے تمہارے فون کا انتظار کررہا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق، پانچ گھنٹے پہلے تمہیں کراچی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھ سے رابطہ کرنے میں اتنی تاخیر کیوں ہوگئی......سب ٹھیک تو ہے نا؟''
''سب ٹھیک ہے انکل!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں مقررہ وقت پر کراچی پہنچ گیا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں جاکر آپ کو کال کروں گا لیکن راستے میں ایک چھوٹا سا اپ سیٹ ہوگیا تھا اس لیے......''
''کیسا اپ سیٹ میرے بچے؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔
جواب میں، میں نے انہیں خود کو پیش آمدہ واقعے کی تفصیل سنادی۔ انہوں نے پوری توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔
''خدا کا شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔ میں سمجھتا ہوں، اللہ نے تمہاری خصوصی مدد کی ہے۔''
''جو مالک کی مرضی۔'' میں نے مختصراً کہا۔
''تم نے عظیم نامی جس نوجوان کا ذکر کیا ہے، وہ تمہیں کیسا لگا ہے؟'' انکل نے پوچھا۔
''مجھے تو وہ معقول اور سمجھ دار انسان لگا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے سینے میں ایک مخلص اور ہمدرد دل ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔
''انکل! آپ نے عظیم کے بارے میں کیوں سوال کیا؟''
''تم نے مجھے اس کی زندگی کے حوالے سے جو کچھ بھی بتایا ہے، اس سے میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ دل کا صاف انسان ہے۔'' انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کے لیے اجنبی تھے لیکن اس نے تمہارے ساتھ اپنے گھریلو حالات بھی ڈسکس کیے۔ تمہیں ہوٹل تک بہ حفاظت پہنچایا اور ضد کرکے ناشتا بھی کرایا۔''
''جی انکل! میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ عظیم اچھی نیت کا مالک ایک پُرخلوص شخص ہے۔'' میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں، مجھے عظیم کے ساتھ دوستی کرلینا چاہیے۔ ماں کی تلاش میں وہ میرے بہت کام آسکتا ہے۔ وہ کافی اثر رسوخ والا بندہ ہے۔''
''تمہاری بیان کردہ تفصیل کے مطابق، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ قدرت نے کسی خاص مقصد سے تمہیں عظیم سے ملوایا ہے۔'' انکل نے کہا۔ ''تم اس کے ساتھ دوستی بڑھاؤ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا میرے بچے۔''
''کون سی بات انکل؟'' میں نے پوچھا۔
''تم نے بتایا ہے کہ عظیم کا کزن ارباب پولیس والا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تمہیں پولیس اور قانونی بکھیڑوں سے دور ہی رہنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''
''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں انکل۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھوں گا اور مالک کے کرم سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔''
''ان شاء اللہ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ ''میں تمہیں بار بار فون کرکے ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ تمہیں جیسے ہی فرصت ملے، اپنی خیر خیریت کی خبر دیتے رہنا اور سلمٰی صاحبہ کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی پیش رفت ہو، اس سے مجھے آگاہ کرتے رہنا۔''
''یہ تو میرا فرض ہے انکل۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو اپنے معاملات سے باخبر رکھوں گا۔''
''اوکے میرے بچے۔'' وہ شفقت بھرے انداز میں بولے۔ ''میں اب سونے جارہا ہوں۔ تم بھی کچھ دیر آرام کرلو۔''
''مجھے بھی نیند آرہی ہے کیونکہ ابھی تک میرا دماغ سونے جاگنے کے اوقات کے لحاظ سے امریکا کے ٹائم کے ساتھ سیٹ ہے۔'' میں نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو دن میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
''گڈ نائٹ!'' انکل نے عادتاً کہا۔ ''تم بھی

سو جاؤ۔''

میں نے بھی انکل کو ''گڈ نائٹ'' کہا اور رابطہ موقوف کر دیا۔

پاکستان کی سرزمین پر یہ میرا پہلا دن تھا۔ میں جس عظیم ہستی کی تلاش میں کراچی پہنچا تھا، وہ اس شہر میں مجھ سے کتنے فاصلے پر موجود تھی، مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں بہت جلد اس سے باخبر ہو جاؤں گا...... بہت جلد......!

☆☆☆

ایک بجے دوپہر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سونے سے پہلے سیل فون کو آف کرنے کے بعد چارجنگ پر لگا دیا تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور واش روم میں گھس گیا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں، میں فریش اپ ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے سیل فون آن کیا۔ وہاں واٹس ایپ پر عظیم کا ٹیکسٹ پڑا تھا۔ میں نے مذکورہ ٹیکسٹ کو اوپن کیا۔ لکھا تھا۔

''برو! جب تم اپنی نیند پوری کر چکو اور گھومنے پھرنے کا موڈ ہو تو بتا دینا۔ میں تمہیں پک کرلوں گا۔ آج میں بالکل فری ہوں۔ اسی بہانے تمہیں تھوڑی کمپنی دے دوں گا۔''

عظیم کا ٹیکسٹ پڑھنے کے بعد میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں دل و دماغ میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ عظیم کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا۔ ہماری ملاقات کو ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن اس مختصر سے عرصے ہی میں وہ مجھے اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ میرے لیے قابلِ بھروسا ثابت ہوگا۔ ٹیکسٹ کا رپلائی کرنے کے بجائے میں نے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے واٹس ایپ پر اسے کال کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عظیم الشان صاحب! آپ کیسے ہو؟''

''تم نے مجھے کیا کہا......؟'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔

''عظیم الشان صاحب۔'' میں نے اپنے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ''کیوں...... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی؟''

''نہیں یار......'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''پھر تم اس لفظ پر بے طرح کیوں چونک اٹھے؟''

''علی! بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری دادی نے میرا نام عظیم الشان ہی رکھا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد پاپا نے میرے نام کے ساتھ لگے شان کو ہٹا دیا اور میں صرف عظیم رہ گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس عظیم کے ساتھ احمد کا اضافہ کر دیا گیا اور اب میں عظیم احمد ہوں...... عظیم احمد کپور۔''

''اوہ...... سمجھ گیا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تم میرے منہ سے اپنا اصلی نام سن کر چونک گئے تھے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن اصلی اور نقلی نام کا چکر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے تمام ڈاکیومینٹس میں عظیم احمد کپور ہی لکھا ہوا ہے لہٰذا میں اسی نام کو اپنا اصلی نام سمجھتا ہوں۔''

''بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پیدائش کے بعد بچے کا جو نام رکھا جاتا ہے یعنی جو اس کا پہلا نام رکھا جاتا ہے، وہ کارخانۂ قدرت میں اسی نام سے رجسٹر ہو جاتا ہے۔ جدید زبان میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نام ہی اس کی ''آئی ڈی'' ہوتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بعدازاں وہ دس مرتبہ بھی اپنا نام تبدیل کرلے مگر اپنے ابتدائی نام کے اثرات سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اینی ہاؤ، اس ٹاپک پر بعد میں بھی بات کریں گے۔ یہ بتاؤ، آج تم فری کیوں ہو۔ کیا آج آفس نہیں گئے؟''

''آج آفس کی چھٹی ہے۔'' عظیم نے بتایا۔

''آج تو فرائیڈے ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا پاکستان میں فرائیڈے کی چھٹی ہوتی ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے یار۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چھٹی تو یہاں سنڈے ہی کی ہوتی ہے۔ بعض جگہ ہفتہ اور اتوار دو دن کی چھٹی ہوتی ہے لیکن آج چاند رات کی وجہ سے ہم آفس نہیں گئے۔''

''چاند رات...... میں سمجھا نہیں!'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''برو! آج رمضان کا چاند نظر آنے کی قوی امید ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس لیے لوگ اپنے اپنے روزگار سے ذرا جلدی آف کر کے گھر کی طرف دوڑ لگا دیں گے۔ ہمارا آفس بزنس سینٹر کے قلب میں واقع ہے۔ یہاں عام دنوں میں ٹریفک جیم ملتا ہے، رمضان کی آمد کے سبب تو وہ افراتفری مچے گی کہ تمام سڑکیں گاڑیوں سے بھری ملیں گی۔ ہم عموماً چھ بجے شام آفس سے نکلتے ہیں اور ساڑھے چھ یا زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے گھر پہنچ جاتے ہیں لیکن

اگر آج یہ معمول دہرایا جاتا تو گھر تک پہنچتے پہنچتے نو نہیں تو آٹھ تو بج ہی جانا تھے لہٰذا ہم نے آج آفس بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھا ہوں۔ فریش ہونے کے بعد تمہیں کال کیا ہے۔''

''گڈ!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''تم نے لنچ تو نہیں کیا نا ابھی؟''

''نہیں......'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''او کے۔ ہم لنچ ایک ساتھ کریں گے۔'' عظیم نے کہا۔ ''تم ریڈی رہو۔ میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔''

''پک کرنے ...... مطلب ہم ہوٹل سے باہر کہیں لنچ کریں گے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہاں یار! تم گھومنے پھرنے پاکستان آئے ہو۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''ہوٹل رات گزارنے کے لیے ٹھیک ہے۔ دن بھر تمہیں سیر سپاٹے کرنا چاہئیں۔ اگر تمہارا موڈ ہو تو میں آ جاتا ہوں ورنہ جو تمہاری خوشی......!''

''پاکستان میں تم میرے پہلے مخلص دوست ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری تجویز کو رد کیسے کر سکتا ہوں۔ آ جاؤ...... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''ہوٹل کے نزدیک پہنچ کر میں تمہیں کال کروں گا۔'' عظیم نے کہا۔ ''پھر تم لابی میں آ جانا۔ تم نے مجھے دوست سمجھا ہے تو تمہیں دوستی نبھا کر بھی دکھاؤں گا۔ اسی لمحے سے اپنے ذہن میں یہ بات نقش کر لو کہ یہاں پاکستان میں تم میرے مہمان ہو...... میرے مہمان دوست۔ میری اس بات کا کوئی ایسا ویسا مطلب نہیں نکال لینا۔''

''ایسا ویسا مطلب سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''علی! میں اندر باہر سے ایک جیسا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی آ جاتا ہے اس لیے اکثر لوگ میری بات کا برا مان جاتے ہیں......''

''تم فکر نہیں کرو عظیم۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں صاف گو لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ! ہماری خوب نبھے گی۔ اب بتاؤ، ایسا ویسا مطلب نکالنے سے تمہاری کیا مراد تھی؟''

''یار! سیدھی سی بات ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا کہ پاکستان میں تم میرے مہمان ہو۔ اس سے تمہارے ذہن میں کہیں یہ بات نہ آ جائے کہ میں یہ پیشکش اپنی کسی غرض کے لیے کر رہا ہوں۔''

''مثلاً کیسی غرض؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ جب میں امریکا آؤں تو تم اسی طرح میری بھی مہمان نوازی کرو۔'' اس نے کہا۔

''اوہ ...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''عظیم! اگر ہمارے بیچ دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا ہے تو پھر ہر قسم کے تکلفات کو رخصت ہو جانا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے کے مخلص اور بے غرض دوست ہیں لہٰذا ہم میں سے کوئی کسی کا نہ تو مہمان ہے اور نہ ہی میزبان۔ میں اس وقت تمہارے ملک اور تمہارے شہر میں ہوں۔ تم اپنی استعداد کے مطابق، میرے ساتھ جتنا بھی تعاون کر سکتے ہو کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جب تم میرے ملک اور میرے شہر میں ہو گے تو اس وقت میں اپنی بساط کے مطابق تمہارے ساتھ جتنا بھی تعاون کر سکوں گا، تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری دوستی ہمیشہ بے لوث رہے گی۔''

''ان شاء اللہ ......!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''تمہارا سیل فون ڈوئل سم والا ہے...... کیا تم اس میں دو سم استعمال کر رہے ہو؟''

''نہیں ......'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ میرا سیل فون ڈوئل سم ہی ہے لیکن میں ایک سم ہی استعمال کرتا ہوں۔ دوسری سم کا سلاٹ خالی پڑا ہے۔''

''او کے ...... میں آ رہا ہوں۔'' عظیم نے سرسری انداز میں کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ!'' میں نے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔

عظیم سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ اس دنیا میں چاروں طرف منافقت اور ریاکاری کا دور دورہ ہے۔ آپ کو اپنے اردگرد بے شمار چمکتے ہوئے چہرے نظر آئیں گے جن کی زبان سے شہد ٹپک رہا ہوگا، ان کے الفاظ میں دنیا بھر کی دانش بھری ہوگی۔ وہ پارسائی کے دعوے دار بھی ہوں گے اور ان کا ماضی بہ زبانِ خود انسانیت کی خدمت کے واقعات سے بھرا ہوگا لیکن ان میں سے کتنے افراد صادق اور امین ہوں گے، یہ بتانا بہت مشکل بلکہ تکلیف دہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لوگوں کی اکثریت ''قول و فعل میں تضاد'' کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔

اس قحط الرجال کی فضا میں اگر کوئی سچا اور کھرا انسان آپ کو میسر آ جائے تو اسے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھنا چاہیے اور اس کی قدر بھی کرنا چاہیے۔ عظیم بھی ایک ایسا ہی انسان تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی کال آ گئی اور اس نے بتایا کہ وہ ہوٹل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور لابی میں آ بیٹھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی انسان کے بارے میں فوری طور پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اوپر عظیم کے حوالے سے جو رائے دی ہے، وہ ایک فوری فیصلے کا نتیجہ ہی نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک عام آدمی کی رائے اور میری رائے میں بہت فرق ہے۔ میں کوئی پہنچا ہوا ماہر نفسیات تو نہیں مگر سائیکالوجی کا ایک ہونہار اسٹوڈنٹ ضرور ہوں۔ جس طرح کوئی ماہر باورچی چاول کے ایک دانے سے پوری دیگ کا احوال معلوم کر لیتا ہے، بالکل ویسے ہی میں بھی پہلی ملاقات میں انسان کی حرکات وسکنات سے اس کی سوچ کا ایکسرے کر لیتا ہوں اور اکثر اوقات میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔ ہاں، اگر کوئی بڑا منجھا ہوا اداکار ہو اور کسی خاص مقصد کے تحت وہ ایکٹنگ کر رہا ہو تو اس صورت میں بعد ازاں میرا اندازہ غلط نکل سکتا ہے۔

عظیم سے ہوٹل کی لابی میں ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے والٹ میں سے ایک سم کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے اپنے سیل فون کے خالی سلاٹ میں لگا لو۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے سم ہے یار۔'' اس نے بتایا۔ ''ڈرو نہیں۔ یہ لیگل کنکشن ہے۔ میرے نام پر رجسٹرڈ ہے یہ۔ اس سے تمہیں پاکستان میں ہر جگہ کال کرنے میں آسانی رہے گی۔ یہ پوسٹ پیڈ کنکشن ہے لہٰذا کریڈٹ لوڈ کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم بے فکری سے اسے استعمال کرو۔ جب بل آئے گا تو میں ادا کر دوں گا۔ تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔''

''ٹینشن کی بات تو ہے نا عظیم۔'' میں نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر میں تمہاری سم لے لوں گا تو پھر تم کیا کرو گے؟ تمہیں بھی تو اس کی ضرورت ہوگی نا......!''

''تو تم اس لیے پریشان ہو رہے ہو کہ یہ سم تمہیں دینے کے بعد میں کیا کروں گا۔'' وہ معتدل انداز میں بولا پھر اپنے دو سیل فون مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میں چار سمز آل ریڈی یوز کر رہا ہوں۔ دو ایک موبائل میں اور دو دوسرے موبائل میں۔ یہ پانچویں سم میرے پاس اسپیئر میں پڑی تھی۔ تم بے دھڑک اسے استعمال کر سکتے ہو۔''

عظیم کے پاس دو اینڈرائڈ سیل فون تھے۔ برانڈ کا نام اس لیے نہیں لوں گا کہ یہ ان کمپنیز کی مارکیٹنگ ہو جائے گی اور بزنس کا اصول یہ ہے کہ بغیر پیسے وصول کیے کسی کی مارکیٹنگ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے عظیم کے ہاتھ سے مذکورہ سم لے کر اپنے سیل فون میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ پانچوں کی پانچوں سمز تمہارے ہی نام پر ہیں؟''

''ہاں بھئی! یہ پانچوں سمز میرے ''سی این آئی سی' پر ہی رجسٹرڈ ہیں۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''تمہیں کسی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم میرے دوست ہو تو پھر مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ کیا پاکستان میں اتنی آسانی سے سم کارڈ مل جاتے ہیں کہ ایک آدمی کے پاس پانچ پانچ کنکشن موجود ہیں!''

''بعض لوگوں کے پاس تو اس سے بھی زیادہ سمز ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ تو کچھ عرصہ پہلے دہشت گردی کی روک تھام کے لیے پی ٹی اے نے کافی سختی کر دی ہے اور اس وقت وہی سمز کام کر رہی ہیں جو کسی نہ کسی کے سی این آئی سی پر رجسٹرڈ ہیں ورنہ اس سے قبل تو اندھی لگی ہوئی تھی۔ موبائل کی سمز پان اور سگریٹ کی دکانوں پر بھی فروخت ہو رہی تھیں۔''

''آپ لوگوں کے تو مزے ہیں عظیم بھائی۔'' میں نے کہا۔ ''امریکا میں تو ایسی آسانیاں حاصل نہیں ہیں۔ واقعی تم لوگ آزاد ملک کے آزاد باسی ہو۔''

''طنز کر رہے ہو......!''

''نہیں، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''اینی ہاؤ......'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے تمہیں جو سم دی ہے، اس کا نمبر نوٹ کر لو۔''

اس نے نمبر بتایا اور میں نے نوٹ کر لیا۔ اس نے بتایا۔

''اس وقت پاکستان میں پانچ موبائل سروس پرووائڈر کمپنیز کام کر رہی ہیں اور میرے پاس سب کا ایک ایک کنکشن ہے۔ ایک سم تمہیں دے دی ہے، باقی چار میرے پاس ہیں۔ ان میں سے کچھ پوسٹ پیڈ اور کچھ پری پیڈ ہیں۔ میں نے تمہیں جو سم دی ہے وہ پوسٹ پیڈ ہے۔ مزے کرو......''

عظیم سے ہونے والی اس تمام تر گفتگو میں میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ اس وقت جو سمز آن ہیں، وہ کسی نہ کسی کے سی این آئی سی پر رجسٹرڈ ہیں۔ ضرورت پڑنے پر حکومتی حساس ادارے بہ آسانی اس شخص کا سراغ لگا سکتے ہیں جس کے نام پر وہ سم رجسٹرڈ ہو۔ پی ٹی اے کے احکامات سے پہلے جو سمز جاری کی جا چکی تھیں کیا وہ سب کی سب بند کر دی گئی ہیں یا ان میں سے کچھ ابھی تک آن ہیں؟''

''میری معلومات کے مطابق، اس وقت صرف وہی سمز آن ہیں جن کی پی ٹی اے کے پاس مستند رجسٹریشن موجود ہے۔ پچھلے دنوں پی ٹی اے نے ایک مہم چلائی تھی جس کے تحت ہر سم ہولڈر کو اپنے سروس پروائیڈر کے پاس جا کر اپنے اوریجنل سی این آئی سی کے ساتھ اپنے نمبر کو کنفرم کرانا تھا۔ علاوہ ازیں ہر سم ہولڈر کا بائیومیٹرک بھی کیا گیا ہے لہٰذا اس وقت جو بھی سمز آن ہیں، ان کا مالک حساس اداروں کی پہنچ سے دور نہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ بہ آسانی اس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔''

''اور جو سمز بند کر دی گئی ہیں اگر ان کے مالکان کا سراغ لگانا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''اگر ان میں سے کوئی سم کبھی کسی سی این آئی سی پر رجسٹر ہوئی ہو تو اس کے مالک کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''لیکن تم اتنی دلچسپی سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تمہیں بھی کسی کی کھوج لگوانی ہے؟''

''ہاں، ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کراچی کے چند افراد کے سیل فون نمبرز ہیں لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نمبر رسپانڈ نہیں کر رہا۔ بعض نمبرز پر یہ ریکارڈنگ سنائی دیتی ہے...... ''آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔'' اگر ان سمز ہولڈرز میں سے کسی ایک کا بھی ایڈریس مجھے معلوم ہو جائے تو میرے لیے بڑی آسانی ہو جائے گی۔''

''اوہ...... یہ تو بہت معمولی سی بات ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''کئی موبائل سروس پروائیڈر کمپنیز کے کال سینٹرز میں میرے دوست کام کرتے ہیں۔ تم وہ تمام نمبرز مجھے دے دینا۔ میں پتا کروا دوں گا لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن ابھی تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ پہلے لنچ کریں گے۔ باقی باتیں اس کے بعد۔''

''او کے۔ تو لنچ کے لیے نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم اپنی گاڑی میں ہو؟''

''ہاں...... گاڑی ہوٹل سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر تم ریڈی ہو تو چلتے ہیں۔''

''آئی ایم ریڈی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن صرف دو منٹ لوں گا۔ مجھے ذرا اپنے کمرے تک جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، تم کمرے سے ہو آؤ۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔

میں لابی سے اٹھا اور لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

بروکلین (نیویارک) میں مرزا عامر بیگ نے مجھے جو چالیس فون نمبرز دیے تھے، وہ میں نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیے تھے۔ علاوہ ازیں یہ تمام نمبرز میں نے اپنے سیل فون میں بھی فیڈ کر رکھے تھے۔ میں اگر چاہتا تو سیل فون سے بھی یہ نمبرز عظیم کو سینڈ کر سکتا تھا لیکن میرے خیال میں کاغذ پر لکھی ہوئی لسٹ دینا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ راستے میں اس لسٹ کی کہیں سے زیروکس (فوٹو کاپی) کروا کے عظیم کو دے دوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے ان چالیس میں سے کسی ایک شخص کا پتا ٹھکانا تو معلوم کر ہی لے گا۔ اگر میں کسی ایک بھی ایسے شخص تک رسائی حاصل کر لیتا جس نے منی ٹرانسفر سے بیگ صاحب کو رقم بھیجی تھی تو مجھے اپنی ماں تک رسائی حاصل کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی۔ مجھے ہر قیمت پر اپنی ماں کو تلاش کرنا تھا۔ یہ میرا مشن تھا اور یہی میرا مقصدِ حیات......!

عظیم کی گاڑی ہوٹل کی بیک سائڈ پر ایک پارک کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ عظیم نے مجھے بتایا کہ مذکورہ پارک ''پولو گراؤنڈ'' کے نام سے موسوم ہے۔ کسی زمانے میں وہاں پولو کا کھیل ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک فیملی پارک ایسی تھی۔ میں نے عظیم سے پوچھا۔

''تم نے اپنی گاڑی یہاں کیوں پارک کی؟''

''پی سی میں غیر متعلقہ گاڑیوں کی پارکنگ کی اجازت نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس لیے مجھے یہاں گاڑی پارک کرنا پڑی۔ یہ چارجڈ پارکنگ ہے اور یہاں کوئی بھی اپنی گاڑی پارک کر سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک وسیع و عریض پارکنگ لاٹ ہوٹل شیرٹن کے پہلو میں بھی ہے۔ اس شہر میں کار پارکنگ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ کراچی شہر کسی وبائی مرض کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ فلک بوس عمارتوں پر عمارتیں بنتی چلی جا رہی ہیں لیکن گاڑیوں کی پارکنگ کی طرف کسی کی

توجہ نہیں۔ اکثر پیٹرول پمپس اور ہاسپٹلز نے توفٹ پاتھ کو بھی اپنے احاطے میں شامل کررکھا ہے۔ کراچی میں تمہیں جابہ جا ناجائز تجاوزات دیکھنے کو ملیں گی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، دیکھ لوں گا۔'' میں نے اس کی وہائٹ وٹز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پارکنگ کے مسائل تو دنیا کے ہر ملک میں ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور مہذب ملک ان مسائل کو بہت خوش اسلوبی سے ٹیکل کرلیتے ہیں۔''

''ہاں یار! تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں مہذب اور ترقی یافتہ بننے میں ابھی کم ازکم سو سال تو لگ ہی جائیں گے۔''

وٹز پارکنگ سے نکل کر مین روڈ پر آئی تو پی سی ہوٹل کے سامنے سڑک کی دوسری جانب مجھے ایک کنگ سائز زیرِ تعمیر عمارت دکھائی دی۔ اس عمارت کو زیرِ تعمیر کہنا مناسب نہیں تھا۔ اس کی حالت سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ کافی عرصہ پہلے اس کی تعمیر کا سلسلہ رک گیا تھا۔ اسٹرکچر کے اعتبار سے وہ ادھوری عمارت کوئی ہوٹل یا جدید شاپنگ مال نظر آتا تھا۔ میں نے عظیم سے پوچھا۔ ''اس عمارت کی تعمیر کیوں روک دی گئی ہے؟''

''کوئی پولیٹیکل ایشو ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس ''ایشو'' کے پیچھے بعض بڑی بااثر قوتوں کی رسا کشی ہے اسی لیے یہ بے چارہ بیچ میں لٹک کر رہ گیا ہے۔ میں پچھلے پچیس تیس سال سے اسے ایسے ہی لٹکا ہوا دیکھ رہا ہوں...... اپنے بچپن سے!''

''ویری سیڈ!'' میں نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ کوئی ہوٹل وغیرہ بن رہا تھا؟''

''انٹرنیشنل چین ہوٹل...... ہائٹ ریجنسی!'' عظیم نے بتایا۔

''ہائٹ ریجنسی!'' میں نے دہرایا۔ ''یہ تو ایک معروف انٹرنیشنل چین ہوٹل ہے۔''

''اب اس زیرِ تعمیر بلکہ مفقود التعمیر ہائٹ ریجنسی ہوٹل میں آوارہ کتے اور بلیاں قیام پذیر ہیں یا پھر، ہیروئنچیوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔''

''ہیروئنچی......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''یس ہیروئنچی......'' ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ''ہیروئن ایک خطرناک نشہ ہے۔ یہ پاؤڈر فارم میں ہوتا ہے۔ اسے بعض لوگ وہائٹ گولڈ بھی کہتے ہیں۔ ہیروئن کو استعمال کرنے والا نشے باز ہیروئنچی کہلاتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم نے جس پاؤڈر کا ذکر کیا ہے، امریکا میں اسے وہائٹ پائزن اور سفید موت بھی کہتے ہیں۔ مالک ہر انسان کو اس لعنتی نشے سے محفوظ رکھے۔''

''آمین......!'' عظیم نے تہِ دل سے کہا۔

''یار! مجھے ایک پیپر کی زیروکس کروانا ہے۔'' میں نے گاڑی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی شاپ نظر آئے تو بتانا۔''

''ڈونٹ وری!'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''پہلے پیٹ پوجا کرلیں پھر زیروکس کو بھی دیکھ لیں گے۔ کراچی میں ہر پچاس گز پر ایک فوٹو کاپی والا بیٹھا ہوا ہے۔ تم جتنی چاہو گے اتنی زیروکس ہوجائیں گی۔''

میں مطمئن ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد عظیم نے اپنی وٹز کو ایک عالی شان عمارت میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں تمہیں ایک ایسی جگہ لنچ کراؤں گا جہاں بیٹھ کر کھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔''

''تھینک یو۔'' میں نے کہا۔

گاڑی کو پارکنگ میں لگانے کے بعد ہم عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کوئی عالی شان کلب تھا۔ جب ہماری گاڑی اندر داخل ہوئی تھی تو میں نے مین گیٹ کے اوپری حصے پر ''سروسز میس'' کے الفاظ لکھے دیکھے تھے۔ یہ الفاظ دیکھ کر میں چونکا تو تھا لیکن میں نے عظیم سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

ہم ڈائننگ ہال میں جاکر بیٹھے تو میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہال تقریباً خالی نظر آرہا ہے۔ ہمارے علاوہ بس دو تین میزوں پر ہی لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔''

''یہاں پر لنچ کے وقت اتنا ہی رش ہوتا ہے...... نہ ہونے کے برابر۔'' عظیم نے بتایا۔ ''البتہ رات میں ڈنر کے وقت کچھ رونق ہوجاتی ہے۔ ویک اینڈ پر یہاں اچھا خاصا رش ہوتا ہے کیونکہ کھانے کے اہتمام کے علاوہ رات گئے تک تفریحی پروگرامز کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔''

''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو ''سروسز میس'' کا تو مطلب یہ ہوا کہ یہاں کسی فورس سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے کھانے پینے کا بندوبست ہوتا ہے۔'' میں نے عظیم کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کے ماحول سے بھی کچھ ایسا ہی ''ایٹمن شین'' تاثر مل رہا ہے۔''

''تم غلطی پر نہیں ہو۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم بالکل درست انداز میں سوچ رہے ہو۔''

''تو کیا تمہارا تعلق کسی فورس سے بھی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر یہ تمہارے کزن کے تعلقات کا کرشمہ ہے!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

علی الصباح یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ عظیم کا کزن ارباب محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ میری ارباب سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ ارباب ایک دبنگ پولیس آفیسر تھا اسی لیے میں نے اس کا تذکرہ کیا تھا لیکن عظیم نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی اور بولا۔

''نہیں یار! ارباب کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''پھر......؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسی وقت ویٹر مینیو لے کر آ گیا۔ عظیم نے کہا۔ ''پہلے آرڈر دے دیں پھر اس ٹاپک پر بات کرتے ہیں۔ بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟''

''کوئی دیسی ڈش منگوا لو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن زیادہ آئلی اور اسپائسی نہ ہو۔''

''دیسی ڈش تھوڑی بہت آئلی اور اسپائسی تو ہوگی یار۔'' عظیم نے مینیو پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا تو ڈیزرٹ سے کنٹرول کر لیں گے۔''

''دیٹس گڈ!'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

عظیم نے ویٹر کو آرڈر نوٹ کرواتے ہوئے کہا۔

''ایک چکن بریانی، ایک مٹن قورمہ، ایک ماش کی دال......''

''سر! نان یا چپاتی؟'' ویٹر نے پوچھا۔

''چپاتی......!'' عظیم نے جواب دیا۔

ویٹر نے استفسار کیا۔ ''میٹھے میں کیا لیں گے سر؟''

''اس وقت میٹھے میں ہے کیا کیا؟''

''سر! کسٹرڈ ہے، لب شیریں ہے اور قلفی تو ہمیشہ ہوتی ہی ہے۔'' ویٹر نے ڈیزرٹ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔

''ٹھیک ہے، آپ کھانا سرو کرو۔'' عظیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میٹھے کا بعد میں بتائیں گے۔''

''او کے سر!'' ویٹر نے تعظیم سے گردن جھکائی اور واپس چلا گیا۔

میں نے عظیم سے پوچھا۔ ''مقصود کی کوئی خیر خبر ہے؟''

''کون مقصود؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ارے وہ ٹیکسی ڈرائیور جس نے آج علی الصباح مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''اور تم لوگوں کی آمد نے اس کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا اور میں لٹنے سے بال بال بچا تھا۔''

''تم کسرِنفسی سے کام لے رہے ہو۔'' عظیم نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تم اپنی حفاظت کا بندوبست کر چکے تھے۔''

''اینی ہاؤ...... میں خود بچا یا آپ لوگوں نے مجھے بچایا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مالک نے میری حفاظت فرمائی ہے۔''

''بے شک! اللہ ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا انسپکٹر کزن ارباب اس لٹیرے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کیا مقصود سے ارباب کی جرمنی پلٹ پھوپی زرینہ کا مال و اسباب برآمد کروا لیا گیا ہے؟''

''یار! مجھے کوئی خبر نہیں۔ ارباب سے اس بارے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔'' عظیم نے بتایا۔ ''یہ بات ذہن میں بٹھا لو کہ پاکستان کی پولیس بڑی کاریگر ہے۔ جب کوئی جرائم پیشہ شخص ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو یہ اس کی ایسی خاطر داری کرتے ہیں کہ وہ اپنے دماغ اور پیٹ میں کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ اسے سب کچھ اگلنا پڑتا ہے......سب کچھ!''

''اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک بات کہوں......!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارا دوست ہوں علی!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہاری جو بھی بات مجھے ناگوار گزرے گی، میں دل میں نہیں رکھوں گا، تمہارے منہ پر صاف بول دوں گا لہٰذا تم بھی مجھ سے جو کہنا چاہتے ہو، بلاتردد کہہ ڈالو۔''

''تم نے پاکستان کی پولیس کے لیے ''کاریگر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہوں گا۔''

''کیسا اضافہ؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میری معلومات کے مطابق، پاکستان کی پولیس ''کاریگر'' نہیں بلکہ ''جادوگر'' ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ جادو کی چھڑی گھما کر اپنی کسٹڈی

میں آئے ہوئے بندے کی زبان سے ان جرائم کا بھی اقبال کروا لیتے ہیں جو اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں کیے ہوتے۔"

"ہاہاہا......" عظیم نے دھیمے سروں کا ایک قہقہہ لگایا۔ "میں تمہاری معلومات کو چیلنج نہیں کروں گا۔ یہ "صلاحیت" بہرحال ہماری پولیس کے اندر پائی جاتی ہے لیکن جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، بالکل اسی طرح تمام پولیس والے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں، میں ارباب کی مثال دوں گا۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرا کزن ہے۔ اگر وہ میرا رشتے دار نہیں بھی ہوتا تو میں اس کے بے داغ کردار کو سیلوٹ کرتا ہوں۔"

"اگرچہ تمہارے کزن سے میری نہایت ہی مختصر سی ملاقات ہوئی ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ وہ بڑا دبنگ اور اصول پرست پولیس آفیسر ہے۔"

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ویٹر نے آرڈر پلیس کر دیا پھر وہ عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"سوری سر! میں بھول گیا تھا۔ میٹھے میں لب شیریں ریڈی نہیں ہے۔ اس کی جگہ خوبانی کا میٹھا موجود ہے۔"

"او کے!" عظیم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "کھانا اینڈ ہو جائے تو قلفی اور خوبانی کا میٹھا لا دینا۔"

امریکا میں انڈین ہوٹلز میں ایسے کھانے آسانی سے مل جاتے ہیں جو انڈیا اور پاکستان میں کھائے جاتے ہیں۔ میں نے ان کھانوں میں سے بعض ڈشز کھائی ہوئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسی دیسی ڈشز میرے روزمرہ کے کھانوں میں شامل نہیں رہی تھیں۔

ماش کی دال اور مٹن قورمہ اگرچہ تھوڑے اسپائسی تھے لیکن یہ دونوں ڈشز بہت ٹیسٹی تھیں۔ بریانی لیتے وقت میں نے اپنے لیے کم مسالے والے حصے میں سے چاول نکالے تھے۔ چکن بریانی کا ذائقہ بھی لاجواب تھا۔ میں نے ہاتھ روکے بغیر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس دوران میں ہماری گپ شپ بھی چلتی رہی۔

عظیم نے بتایا۔ "کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک این جی او کے لیے بہت کام کیا تھا۔ اس آرگنائزیشن کے اعلیٰ عہدے داروں میں فورس کے ایک ریٹائرڈ کرنل بھی شامل تھے۔ کرنل خان کے ساتھ میری بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی اور ہماری اکثر ملاقاتیں اسی میس میں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں کے اسٹاف کو معلوم ہے کہ میں خان صاحب کا دوست ہوں لہٰذا یہ لوگ میرا ریگارڈ کرتے ہیں۔ اگر میں خان صاحب کے بغیر بھی یہاں آ جاؤں تو مجھے ڈائننگ میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں سویلین ہوں۔ اصولی طور پر میں اس میس کی سہولیات کو انجوائے کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ یہاں کے اسٹاف کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ گیٹ پر ہی مجھے روک کر "سوری" کہہ سکتے ہیں کہ آپ فورس کے کسی آدمی کے ساتھ نہیں ہیں لہٰذا ہم آپ کو میس کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ ان لوگوں کی مہربانی ہے کہ مجھے خان صاحب کا خاص دوست اور مہمان خیال کرتے ہوئے میرے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ بس یار! اللہ کا بڑا کرم ہے۔ دوستوں کی دعاؤں سے اللہ نے بڑی عزت دے رکھی ہے۔"

عظیم سے پہلی ملاقات کے وقت ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک یار باش آدمی ہے۔ پھر ہوٹل پہنچ کر ناشتا کرنے کے دوران میں میرے اس اندازے کو تقویت پہنچی تھی اور اب اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں جس مشن کے لیے کراچی آیا تھا اس سلسلے میں عظیم میرے لیے بہت معاون اور مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

"یار عظیم! ایک کام یاد رکھنا۔" میں نے خوبانی کے میٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

وہ قلفی کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بولا۔ "کون سا کام علی؟"

"مجھے ایک صفحے کی زیروکس کروانا ہے۔" میں نے بتایا۔

"مجھے یاد ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "یہاں سے اٹھیں گے تو پہلے فوٹو کاپی کرائیں گے، اس کے بعد کہیں اور کا رخ کریں گے۔"

"او کے۔" میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

اس نے کہا۔ "یار! میں تمہیں "اسد" کہہ کر مخاطب کروں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ میرا اصل نام اسد ہی تو ہے...... اسد علی!" میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تمہارے اس فیصلے کا کوئی خاص سبب ہے؟"

"میرے چھوٹے بھائی کا نام علی احمد کپور ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم سب اسے "علی" کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کا یہی نام ہم سب کی زبانوں پر چڑھا ہوا

ہے۔ جب تم اور علی ایک ہی جگہ پر موجود ہو گے تو پھر بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ہمارے علی پکارنے پر تم دونوں متوجہ ہو جاؤ گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں برو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''امریکا میں سب مجھے شارٹ نیم ''علی'' سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں اگر میں ''اسد'' کے نام سے پکارا جاؤں گا تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔''

کھانے کے اختتام پر جو بل آیا، اس نے مجھے حیران کردیا۔ میں نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! دو آدمیوں نے پیٹ بھر کر اتنا عمدہ کھانا کھایا ہے اور وہ بھی اتنے کم پیسوں میں۔ کیا پاکستان میں کھانا اتنا ہی سستا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں اسد!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہاں پر فورس سے متعلقہ افراد کو انتہائی کم نرخ پر بہت عمدہ کھانا مہیا کیا جاتا ہے ورنہ دوسرے اسٹار ہوٹلز میں بیٹھ کر کھاؤ گے تو لگ پتا جائے گا۔''

''فورس والوں کے تو ہر جگہ خوب مزے ہیں بھئی۔'' میں نے کہا۔ ''امریکا میں بھی انہیں زندگی کے ہر شعبے میں خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔''

''لیکن ہمارے یہاں تو نہ صرف ان کے بلکہ ان کے عزیز واقارب کے بھی بڑے مزے ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''میرا ایک دوست ہے فرخ...... اس کی کہانی سنو گے تو اش اش کر اٹھو گے۔''

''میں تمہارے دوست کی کہانی ضرور سنوں گا۔'' میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کہانی میں تمہیں گاڑی میں بیٹھ کر سناؤں گا۔'' عظیم نے کہا۔ ''اب ہم یہاں سے اٹھیں گے اور سی سائڈ کا رخ کریں گے...... اوکے!''

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

ہم ایک مرتبہ پھر عظیم کی وٹز میں آبیٹھے اور ساحلِ سمندر کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''عظیم! پی سی سے نکلنے کے بعد سے لے کر اب تک میں نے جتنا کراچی دیکھا ہے، اس سے تو کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے جبکہ پوری دنیا میں اس کی غربت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور ورلڈ بینک کے علاوہ اور بھی بہت سے بینک ہر سال اس ملک کی مالی امداد کی مد میں اسے بھاری قرضے دیتے رہتے ہیں۔ یہ کیا معما ہے؟''

''اس معمے کو حل کرنے کے لیے تمہارے لیے چند حقائق سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔'' عظیم نے میریٹ ہوٹل کے سامنے سے گاڑی گزارتے ہوئے کہا۔

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔'' میں نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ، وہ حقائق کون کون سے ہیں؟''

''اول یہ کہ کراچی ایک کاسموپولیٹن شہر ہے۔ اس کی آبادی دو کروڑ یعنی بیس ملین سے زیادہ ہے اور اسے پاکستان کا سب سے زیادہ مصروف اور تیز رفتار شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوم، تم اس وقت شہر کے جس حصے میں سفر کر رہے ہو، وہ کراچی کا سب سے زیادہ پوش اور صاف ستھرا علاقہ ہے۔ اکثر فائیو اسٹار ہوٹلز، شاپنگ مالز اور مختلف ملکوں کے سفارتخانے اسی ایریا میں واقع ہیں۔ تمہارے امریکا کی ایمبیسی پہلے اسی میریٹ ہوٹل کی بغل میں ہوا کرتی تھی۔ اب وہ شہر سے باہر مائی کولاچی کے ایریا میں چلی گئی۔ بعض ناخوشگوار دہشت گردی کے واقعات کے سبب امریکا بہادر کو اپنی ایمبیسی یہاں سے کہیں اور شفٹ کرنا پڑی ہے۔ اس زمانے میں یہ میریٹ ہوٹل بھی ہالیڈے ان ہوا کرتا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا کراچی کے اس صاف ستھرے پوش علاقے کو پورے پاکستان کا پرومو نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لاہور اور اسلام آباد میں اس سے بھی زیادہ نیٹ اور کلین علاقے موجود ہیں لیکن یہ پورے ملک کی تفسیر نہیں ہو سکتی۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہو برو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا تو واقعتاً کسی بھی ملک میں نہیں ہوتا کہ وہاں ہر علاقہ ایک جیسا پوش اور صاف ستھرا ہو۔ تم صرف نیویارک ہی کو لے لو۔ وہاں ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن اور مڈ ٹاؤن مین ہیٹن کا جو حال ہے، وہ اپ ٹاؤن مین ہیٹن میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن بزنس سینٹر ہے اور مڈ ٹاؤن مین ہیٹن کو میڈیا اور شوبز سینٹر سمجھ لو۔ مین ہیٹن کے یہ دونوں حصے پوش اور صاف ستھرے ہیں جبکہ اپ ٹاؤن کا حال اس سے کافی مختلف ہے۔ اپ ٹاؤن مین ہیٹن میں ہارلیم اور اردگرد کے سیاہ فام کے بعض ایسے علاقے بھی ہیں جو گندگی اور غلاظت کے عالمی مقابلے میں پہلا اور دوسرا انعام حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔''

''اور جہاں تک ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر

بینکوں سے قرضے لینے کا معاملہ ہے نا......'' وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''اگر تم یہ سوچ رہے ہو تو سنگین غلطی کر رہے ہو کہ وہ بلین ڈالرز یا ان کا کچھ حصہ پاکستان کے غریبوں تک بھی پہنچتا ہوگا یا ان کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتا ہوگا۔''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''تو پھر وہ ملین اور بلین ڈالرز کہاں چلے جاتے ہیں؟''

''چند مخصوص اداروں سے گزر کر چند مخصوص افراد کے پیٹ میں۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ بہت ہی اذیت ناک موضوع ہے۔ اس پر بھی کبھی بات کریں گے۔ ابھی موڈ کو خوشگوار رکھنا ضروری ہے کہ ہم سیر و تفریح پر نکلے ہوئے ہیں۔''

''اوکے...... رائٹ یو آر۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اسد! کراچی کے جس حصے کو دیکھ کر تمہیں پاکستان کے ایک غریب ملک ہونے پر شبہ ہوا ہے، ایسی زندگی اس ملک کے زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد افراد کو میسر ہے۔ باقی پچانوے فیصد میں سے پچاس فیصد بے چارے غریب غرباء ہیں اور باقی ماندہ پینتالیس فیصد افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔''

''سو سیڈ!'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''تم یہ کہہ سکتے ہو کہ پاکستان ایک امیر ملک ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن اس ملک کے عوام کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہے۔''

''ونڈر فل......'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

ہم ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے۔ عظیم نے ساحل کے متوازی ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

''یہ سی ویو کا علاقہ ہے۔ آگے ہم دو دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ ادھر بہت سے ریسٹورنٹس بنے ہوئے ہیں۔ تم اسے فوڈ اسٹریٹ بلکہ سمندر کی مناسبت سے ''فوڈ کوسٹ'' بھی کہہ سکتے ہو لیکن اس ایریا میں اصل رونق رات ہی کو ہوتی ہے۔''

''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کھانے کے ہی نہیں، کھلانے کے بھی۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''پاکستان کے ہر حصے کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور کراچی والے تو حد سے زیادہ چٹورے ہیں۔ یہ لوگ گھر سے باہر کھانے پینے کو ایک فن سمجھتے ہیں اسی لیے یہاں ریسٹورنٹس کا بزنس بہت منافع بخش ہے۔ بے شمار ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کے اسپاٹس کے علاوہ فوڈ اسٹریٹس کی بھی کمی نہیں ہے۔ جیسے حسین آباد، برنس روڈ، بوٹ بیسن اور سی ویو کی یہ فوڈ اسٹریٹ وغیرہ۔''

''جہاں تک مہمان نوازی کی بات ہے تو وہ مجھے تمہارے رویّے ہی سے اندازہ ہو گیا ہے۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔ ''امریکا میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ مہمانوں کو یوں اپنے ساتھ لیے گھومتا رہے۔''

''مجھے امریکا کی زندگی کا تجربہ ہو چکا ہے۔'' وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ماہ ایل اے (لاس اینجلس) میں گزار کر آیا ہوں۔ میں جن لوگوں کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا وہ دونوں میاں بیوی جاب والے تھے۔ صبح کے گھر سے نکلے رات گئے ہی لوٹتے تھے۔ اس ایک ماہ میں ان کے ساتھ میں ایک آدھ بار ہی کہیں گھومنے نکلا ہوں گا اور وہ بھی گروسری وغیرہ لینے ورنہ میں دن بھر گھر میں پڑا یا تو سوتا رہتا تھا یا ٹی وی دیکھتا تھا اور یا پھر شام میں کسی پارک میں جا بیٹھتا تھا جہاں نوجوان نسل کے بڑے رنگین اور سنگین نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ ہمارے کلچر کے لحاظ سے تو وہ کھلی بے حیائی ہے۔''

''ہر کلچر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے عظیم الشان صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم جسے کھلی بے حیائی کہہ رہے ہو، وہ وہاں کے ماحول کے لحاظ سے یوز ٹو ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن بات اپنی اپنی برداشت کی بھی ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''جب سے ہماری فیملی کے افراد کا امریکا کا پانچ سال کا ملٹی پل وزٹ ویزا لگا ہے، مہر النسا کی ایک ہی رٹ ہے کہ ہمیں کسی طرح بھی کوشش کر کے مستقل طور پر امریکا میں سیٹل ہو جانا چاہیے لیکن میں وہاں ینگ جنریشن کی آزادی اور بے راہ روی کا جو حال دیکھ کر آیا ہوں، اس کی روشنی میں تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ وہاں مستقل رہائش اختیار کرنا تو میری برداشت سے باہر ہے اسی لیے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے میں نے مہر النسا کو امریکا کا وزٹ کرنے بھیجا ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے وہاں کے بچوں کی آزادی کا حال دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوگی کہ ہمیں امریکا میں سیٹل ہونا چاہیے یا دور کے ڈھول سہانے......!''

''تم نے بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے عظیم۔'' میں

نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''انسان جب تک خود کسی تجربے سے نہ گزرے، دوسروں کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

ہماری گفتگو جاری رہی اور سمندر کی سیر کرتے ہوئے ہم دو دریا کے علاقے سے واپس آ گئے۔ عظیم نے ڈولمن سٹی کی پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے کہا۔

''اوپر ہائپر اسٹار میں ایک بہت اچھی کافی شاپ ہے۔ وہاں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے گھر لے کر چلوں گا۔''

''اپنے گھر کیوں؟'' میں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''تاکہ تمہیں اپنے پاپا اور چھوٹے بھائی سے ملواسکوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوتو......!''

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''نہیں یار...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

ہم ڈولمن سٹی کے ہائپر اسٹار میں واقع ''گلوریا جینز'' نامی کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ مذکورہ کافی شاپ کا ماحول بڑا رومانٹک اور خواب ناک تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہم خوب پیٹ بھر کے کھانا کھا چکے تھے لہٰذا صرف کپیچینو کافی کا آرڈر دیا گیا۔

گلوریا جینز کی کافی عمدہ بلکہ لاجواب تھی۔ میں نے کہا۔ ''عظیم! تم مجھے اپنے فرخ نامی کسی دوست کی کہانی سنانے والے تھے!''

''ہاں یار...... فرخ پیشے کے اعتبار سے تو ایک عام سا جرنلسٹ ہے لیکن اس نے قسمت خوب پائی ہے۔'' عظیم کافی کا سپ لیتے ہوئے بولا۔ ''حسنِ اتفاق کہہ لو یا اس کا نصیب کہ فرخ کی جس لڑکی سے شادی ہوئی، وہ ڈیفنس کے ایک کالج میں اسلامیات کی لیکچرر ہے۔ ڈیفنس سوسائٹی سے تعلق کی وجہ سے ان لوگوں کی رہائش بھی ڈی ایچ اے کے ایک اپارٹمنٹ میں ہے جو کہ کالج ہی کا مہیا کردہ ہے۔ پچھلے دنوں یعنی کچھ عرصہ پہلے لیکچرر صاحبہ کو دو پلاٹ بھی الاٹ ہوئے تھے۔ اب ان پلاٹس کی مالیت کروڑوں میں ہے۔ مستقبل قریب میں فرخ کا منصوبہ دونوں پلاٹس کو فروخت کر کے دبئی میں انویسٹ منٹ کا ہے۔ ڈیفنس کے باسی ہونے کے ناتے مسز فرخ کے پاس ڈیفنس کریک کلب کی ممبر شپ بھی ہے۔ اگر کوئی ڈیفنس والا نہ ہو تو اس ممبر شپ کے لیے لگ بھگ آدھا کروڑ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ڈیفنس کریک کلب میں ایلیٹ کلاس اور شہر کی کریم ہی دیکھنے کو ملے گی اور وہاں کا کھانا اپنے معیار اور ذائقے کے اعتبار سے شہر کے کسی بڑے سے بڑے ریسٹورنٹ میں بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ میں نے فرخ کا ذکر کس ذیل میں کیا تھا......؟''

''سروسز میس میں انتہائی کم بل پر جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تھا تو تم نے کہا تھا، اس سلسلے میں تمہیں میں اپنے دوست فرخ کی کہانی سناؤں گا۔''

''ہاں یاد آ گیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''فرخ اس لحاظ سے بھی خوش بخت ہے کہ اس کے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹے جڑواں اور دونوں بیٹیاں بھی جڑواں۔''

''فنٹاسٹک!'' میں نے کہا۔

''ڈیفنس کریک کلب میں بھی ممبرز کو لو پرائس پر عمدہ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''فرخ کے گھر میں رات کا کھانا نہیں بنتا۔ مسز فرخ سرِشام بچوں کو لے کر کلب پہنچ جاتی ہیں۔ بچے اپنے اپنے کھیل میں لگ جاتے ہیں اور مسز فرخ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو جاتی ہے۔ کلب کے اندر بچوں کے لیے تمام انڈور گیمز کا بندوبست ہے پھر یہ لوگ کلب میں ڈنر کرنے کے بعد ہی گھر واپس آتے ہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے کیونکہ کریک کلب میں پانچ چھ افراد کا ڈنر گھر میں پکانے کی نسبت کافی سستا پڑتا ہے اور وہ بھی فائیو اسٹار ہوٹل کے معیار کا۔''

''زبردست۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''فرخ تو واقعی بہت لکی ہے۔''

ہم کافی شاپ سے نکلے تو عظیم کے دو دوست ہائپر اسٹار میں مل گئے۔ عظیم نے ان سے شیک ہینڈ کرنے کے بعد کہا۔

''تم لوگ بھی ادھر آئے ہوئے ہو۔''

عظیم کے دونوں دوستوں سے میں نے بھی ہاتھ ملایا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام عدنان اور دوسرے کا نام عمران تھا۔ عدنان نے کہا۔

''ہم لوگ ادھر آئے ہوئے تو ہیں لیکن سمجھ نہیں آ رہا کہ واپس کیسے جائیں گے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عظیم نے پوچھا۔

''یار! ہم جس کے ساتھ آئے تھے، وہ ایک لونڈیا کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' عدنان نے بتایا۔ ''ہمیں بھی کہا تھا کہ ابھی آتا ہوں اور ہم پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے انتظار میں ادھر خوار ہو رہے ہیں۔''

"تم لوگ تھے کس کے ساتھ؟" عظیم نے استفسار کیا۔

عمران نے بتایا "سلمان کے ساتھ۔"

"اوہ......" عظیم نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"وہ تو ہے ہی خوار لڑکیوں کے پیچھے......" پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسد! میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں فرخ کی کہانی سنائی ہے نا، وہ اللہ کا بندہ ان کاموں کا بڑا ماہر ہے۔ یار دوست اسے گرو کہتے ہیں۔ لڑکی کو سیٹ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"پھر تو میں تمہارے دوست سے ضرور ایک تفصیلی ملاقات کروں گا۔" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "میں اس شعبے میں کافی نالائق واقع ہوا ہوں۔ ہوسکتا ہے، فرخ کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے کوئی فائدہ ہوجائے۔ دو چار گر تو وہ مجھے سکھا ہی دے گا۔"

"اب تم اتنے بھی ننھے بچے نہیں ہو اسد کہ تمہیں یہ کام سیکھنے کے لیے فرخ کی شاگردی اختیار کرنا پڑے۔" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم جہاں سے آئے ہو وہاں دس سال کی عمر میں ہی لڑکے اور لڑکیاں گرو کا اعزاز حاصل کرلیتے ہیں اور تم اسی آزاد ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہو۔ اینی ہاؤ...... میں تمہیں فرخ سے ضرور ملواؤں گا۔"

پھر وہ اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں گھر جارہا ہوں۔ تم میری گاڑی میں آجاؤ۔ میں فیز ٹو کی طرف سے نکل جاؤں گا اور تمہیں ڈیفنس مارکیٹ پر ڈراپ کردوں گا۔"

عدنان اور عمران نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم ہائپر اسٹار سے نکل کر عظیم کی گاڑی میں آبیٹھے۔ عدنان نے کہا۔

"عظیم! تم خیابانِ اتحاد سے نکل کر مین کورنگی روڈ پر آؤ تو ہم سب کے لیے آسانی رہے گی۔ راستے میں ڈیفنس فیز ٹو کی مارکیٹ پر ہمیں ڈراپ کرکے تم گورا قبرستان کے راستے اپنے گھر کی طرف نکل جانا۔"

"تم فکر نہیں کرو۔" عظیم نے کہا۔ "میرے ذہن میں بھی یہی روٹ ہے۔"

وہائٹ وِٹز ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کی صاف ستھری سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں عظیم کی بغل میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ عدنان اور عمران عقبی نشست پر براجمان تھے اور اتفاق سے فرخ ہمارا موضوعِ گفتگو بنا ہوا تھا۔ عظیم نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اسد! تم سائیکالوجی پڑھ رہے ہو۔ ایک بات مجھے سمجھاؤ۔"

"پوچھو برو......!"

"جو لوگ فرخ اور سلمان کی طرح گھر سے باہر، ایک سے بڑھ کر ایک "کارنامے" انجام دے رہے ہوتے ہیں، وہ گھر میں اپنی بیویوں کے سامنے بھیگی بلی کیوں بن کر رہتے ہیں؟" عظیم نے مجھ سے پوچھا۔ "سلمان کی تو ابھی خیر سے شادی نہیں ہوئی لیکن میں فرخ کی گھریلو زندگی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مسز فرخ اسے ننھے بچوں کی طرح خوب ڈانٹ کر رکھتی ہے۔"

"انسان کو کسی ایک ہی جگہ کی بادشاہی مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ گھر میں اپنی بیویوں سے دب کر رہتے ہیں، گھر سے باہر ان کے بڑے ٹھاٹ باٹ ہوتے ہیں۔ انہیں شان و شوکت حاصل رہتی ہے لیکن جو لوگ زور زبردستی سے اپنے بیوی بچوں کا جینا حرام کرکے رکھتے ہیں، انہیں ہر وقت اپنی رعب داب میں رکھ کر ان پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں، گھر سے باہر انہیں وہ اختیار اور اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ایک اہم فیکٹر بچے بھی ہیں......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب بچے پیدا ہوجاتے ہیں تو مرد کو گھر میں بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ عام طور پر بچوں کا ووٹ اپنی ماں کی طرف ہی ہوتا ہے لہٰذا بہت سارے معاملات میں شوہر کو بیوی کے سامنے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ شور شرابے اور بدمزگی سے بچنے کے لیے شوہر بیوی کی بہت سی زیادتیوں کو برداشت کرجاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے، بچوں والی بیوی بھاری ہوتی ہے۔"

"یہ بات......!" عظیم نے پرجوش انداز میں کہا۔ "اسد یار! تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"عظیم! لگتا ہے، اسد نے تمہارے ذاتی معاملات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔" عدنان نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "تمہارے ساتھ بھی تو کچھ اسی قسم کی سچویشن ہے...... ہے نا؟"

"لیکن اسد نے تو کہا ہے کہ بچوں والی بیوی بھاری ہوتی ہے۔" عمران نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ "جبکہ عظیم کی بیوی تو دبلی پتلی ہے......!"

"تم دونوں کو بہت مذاق سوجھ رہا ہے نا۔" عظیم نے اپنے بے تکلف دوستوں کی بات کا برا منائے بغیر کہا۔ "ابھی تم آزاد گھوم رہے ہو اس لیے دماغ میں بڑی مستی ہے۔ جب کسی کھونٹے سے بندھو گے تو پھر آٹے دال کا بھاؤ پتا

چل جائے گا۔ تمہاری بیویاں جوتے مار مار کر ساری مستی، پتا نہیں کہاں کہاں سے نکال دیں گی۔''

عدنان اور عمران، عظیم کے اس ردِعمل پر بلند آہنگ قہقہے لگانے لگے۔

عظیم نے مجھ سے کہا۔ ''اسد! تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔ بچوں والا باپ کئی ایک معاملات میں مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے، بچوں کی نفسیات سے اور لوگوں کے تبصروں سے۔ اس ذیل میں سب سے زیادہ بے چارہ شوہر وہ ہوتا ہے جو جوائنٹ فیملی میں رہ رہا ہو۔''

''اور ایسے مجبور ولاچار شوہر کو عظیم احمد کپور کہتے ہیں......'' عدنان نے چوٹ کی۔

عمران نے اس پر ایک ردا چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور ایسے شوہر پر اگر فلم بنائی جائے تو اس کا ٹائٹل ہوگا...... جورو کا غلام!''

میں ان تینوں کی باہمی نوک جھوک کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بے تکلف دوست تھے اور بے تکلف دوستوں میں ایسی جملے بازی چلتی رہتی ہے۔ میں ان کی گفتگو کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس ''نیک کام'' میں، میں نے بھی اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تاش کے پتوں میں ''جیک آف اسپیڈ'' یعنی حکم کا غلام تو سنا تھا لیکن ''جورو کا غلام'' پہلی مرتبہ سننے میں آیا ہے۔''

''بروٹس...... یوٹو......!'' عظیم نے شکایتی نظر سے میری طرف دیکھا۔

''نہیں عظیم......'' میں نے جلدی سے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو سمجھنے کے لیے کہا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں اسد۔'' عدنان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جورو کا غلام اور حکم کا غلام ایک ہی بات ہے۔ جورو کہتے ہیں، بیوی کو یعنی کہ وائف...... اور وائف جب حکم دیتی ہے اور شوہر اس کا حکم بجالاتا ہے تو وہ جورو کا غلام کہلاتا ہے۔''

''اب سمجھا......'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اسد کیا سمجھا اور کیا نہیں سمجھا، یہ میں بعد میں اسد سے خود پوچھ لوں گا۔'' عظیم نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تم دونوں کا کمینہ پن بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔ مہمان کا خیال کرتے ہوئے میں تم دونوں کی چھیڑخانی کو برداشت کر رہا ہوں ورنہ کب کا تمہیں گاڑی سے باہر پھینک چکا ہوتا۔''

''وہ تو تم ہمیں پھینکو گے ہی۔'' عدنان نے کہا۔ ''مگر یہاں نہیں...... فیز ٹو والی مارکیٹ کے سامنے۔''

''بڑے کمینے ہو تم لوگ۔'' عظیم کی ہنسی نکل گئی۔

''تمہارے ہی دوست ہیں عظیم۔'' عمران گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ کیا کہتے ہیں کہ...... انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے...... جیسے تم، ویسے ہم...... اللہ اللہ، خیر سلا!''

ہنسی مذاق کے اس سلسلے کو اس وقت بریک لگ گئے جب عظیم نے گاڑی کو خیابان اتحاد سے مین کورنگی روڈ پر ڈالا۔ میں پہلی مرتبہ کراچی آیا تھا۔ یہاں کے گلی کوچوں سے میری شناسائی نہیں تھی لیکن میں ان تینوں کی باہمی گفتگو سے بہت پک کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں میں...... مسلسل گاڑی کے باہر بھی دیکھ رہا تھا لہٰذا سڑکوں کے نام سے کافی واقفیت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔

گاڑی مین کورنگی روڈ پر چڑھی تو آگے پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ گاڑیوں کو روک کر چیک کر رہے تھے لیکن ہر گاڑی کو نہیں۔ جس گاڑی پر ان کا دل آجاتا، وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے سائڈ پر کر لیتے تھے۔

''ان لوگوں کو بھی پتا چل گیا ہے کہ آج رمضان کا چاند نظر آجائے گا۔'' عظیم نے کہا۔ ''اس لیے انہوں نے ایڈوانس ہی میں کمائی شروع کر دی ہے۔''

''کمائی شروع کر دی ہے۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ لوگ تو چیکنگ کر رہے ہیں۔ اس میں کمائی کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟''

''بھولے بادشاہ! تمہیں یہاں کی پولیس کے کارناموں کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔'' عدنان نے کہا۔ ''یہ جن لوگوں کو سائڈ میں کر رہے ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ ضرور نکلوائیں گے۔''

''یہ بھولا بادشاہ نہیں ہے عدنان۔'' عظیم نے عدنان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری پولیس کے بارے میں اسد کی معلومات بڑی گہری ہیں۔ اینی ہاؤ، میں تو نکل رہا ہوں یار۔''

بات ختم کرتے ہی عظیم نے گاڑی کو زگ زیگ کر کے ٹریفک کے ریوڑ میں سے آگے نکالا۔ اسی لمحے ایک بائیک والے کو پولیس والوں نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکا نہیں اور بائیک کو بھگا لے گیا۔ اس بائیک پر دو افراد سوار

تھے۔ عظیم نے بھی بائیک والے کی دیکھا دیکھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی پولیس والوں کے پاس سے گزری تو انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا مگر عظیم نے گاڑی روکی نہیں بلکہ گاڑی کی اسپیڈ کو اور بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

''اب انہوں نے ہماری گاڑی پرفائرنگ کی ہے۔'' عدنان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''گاڑی روک لو عظیم ورنہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔''

''مسئلہ کھڑا ہو یا بیٹھا رہے، مجھے پروا نہیں ہے۔'' عظیم نے گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں نکل آیا جیسے بائیک والا نکل گیا تھا۔''

''بائیک والا اس لیے نکل گیا تھا کہ وہ ڈبل سواری جا رہے تھے۔'' عدنان نے کہا۔ ''اگر وہ بائیک کو روک لیتے تو ہزار پانچ سو روپے دے کر ہی ان کی جان چھوٹتی مگر ہم تو کسی قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہو رہے تھے۔ اگر تم گاڑی روک لیتے تو اچھا تھا۔ اگر انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم مشکل میں پھنس جائیں گے۔''

''ہم مشکل میں پھنس جائیں گے نہیں بلکہ مشکل میں پھنس چکے ہیں۔'' عمران نے اپنے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کی ایک موبائل ہمارے پیچھے آ رہی ہے......''

عظیم نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ کچھ اوپر سے گزر رہی تھیں۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا پاکستان میں بائیک پر ڈبل سواری قانوناً منع ہے؟''

''یہ پاکستان کا نہیں، صرف کراچی کا مسئلہ ہے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''اگر بلی بھی کہیں پیشاب کر دیتی ہے تو موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

''ارے یار! یہ سب اینٹی ٹیرنسی دہشت گردی ایکٹ کے تحت دکھائی جاتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شہر میں کہیں کوئی دہشت گردی کا واقعہ پیش آ جاتا ہے تو فوری طور پر موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ تصور یہ ہے کہ دہشت گرد موٹر سائیکل پر سوار ہو کر مجرمانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔''

عدنان نے کہا۔ ''ایسی پابندی عائد کرنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کہیں لازمی دہشت گردی کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔ دہشت گردی کے کسی متوقع واقعے کو روکنے کے لیے بھی ایسی پابندی لگا دی جاتی ہے۔''

''کافی الجھی ہوئی صورت حال ہے۔'' میں نے کہا۔

''کچھ دن اس شہر میں رہو گے تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔'' عمران نے کہا۔

عدنان بولا۔ ''بائیک پر ڈبل سواری کی پابندی سے جرائم کی شرح میں کمی واقع ہو یا نہ ہو لیکن چیکنگ کے بہانے پولیس والوں کی چاندی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہ ہر آنے جانے والے کو روک کر اپنی جیبیں گرم کرتے رہتے ہیں۔''

''یہ تو کھلی لاقانونیت ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''قانون کے رکھوالوں کو تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سن کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ شہریوں کی زندگی کو تحفظ دینے کے بجائے پولیس الٹا انہیں لوٹنے پر کمربستہ ہے۔''

''بات تو افسوس کی ہے مگر یہی یہاں کی سچائی ہے۔'' عظیم نے سرسری انداز میں کہا۔

''عظیم! افسوس کرنے اور سچائی بیان کرنے کے اور بہت سے مواقع آئیں گے۔'' عدنان نے فکرمندی سے کہا۔ ''فی الحال پولیس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔ آگے سگنل بھی مجھے بند نظر آ رہا ہے۔ وہ ہمیں بچ کر نکلنے نہیں دیں گے۔''

''سگنل بند نظر آ رہا ہے تو کیا ہوا۔'' عظیم بے پروائی سے بولا۔ ''کیا ہماری گاڑی کے لیے کراچی میں صرف ایک یہی سڑک رہ گئی ہے۔ میں ڈیفنس موڑ سے ٹریک بدل رہا ہوں۔''

''عظیم!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے، تمہیں گاڑی روک کر حالات کا سامنا کرنا چاہیے۔ فرار اور وہ بھی مجرمانہ فرار اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''عظیم تو اب رکنے والا نہیں برو۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔ ''جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔ میں ان سے ہار نہیں مانوں گا۔ تم دیکھنا، میں انہیں کیسے ڈاج دیتا ہوں......''

بات ختم کرتے ہی اس نے وٹز کو لیفٹ سائڈ پر موڑ لیا کیونکہ اس وقت تک ہماری گاڑی سگنل پر پہنچ چکی تھی۔ سگنل چونکہ بند تھا، اسے توڑ کر آگے نہیں بڑھا جا سکتا تھا لہٰذا بچت کا یہی ایک راستہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ عظیم نے ڈیفنس موڑ سے گاڑی کو لیفٹ

ٹرن کیا تھا کیونکہ چند لمحے پہلے وہ اس ارادے کا اظہار کر چکا تھا۔

''گڈشاٹ۔'' عدنان نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''عظیم! پولیس والوں کی موبائل سگنل پر پھنس کر رہ گئی ہے۔ شاید وہ یہی سوچ رہے تھے کہ ہم مین کورنگی روڈ پر سیدھے آگے بڑھیں گے۔ اس لیے وہ دھوکا کھا گئے۔''

عظیم نے عدنان کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے مجھ سے پوچھا۔ ''اسد! کیا تمہیں کسی قسم کا ڈر محسوس ہو رہا ہے؟''

''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی ڈر محسوس نہیں ہو رہا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔''

''اگر تم کہو تو میں گاڑی روک دیتا ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''عظیم! اس مختصر سے عرصے میں تمہیں.... جتنا سمجھ پایا ہوں اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ تم رکو گے نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت نڈر ہو۔''

''اس کا مطلب ہے، تم مجھے اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔'' وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں زندگی میں رسک لینے سے کبھی ہچکچاتا نہیں ہوں۔''

''بے شک! زندگی اور موت پر مالک کو ہی اختیار حاصل ہے لیکن انسان کو جانتے بوجھتے ہوئے کوئی خوامخواہ کا رسک نہیں لینا چاہیے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اینی ہاؤ، میں بہادر لوگوں کو پسند کرتا ہوں اور تم ایک جی دار انسان ہو۔''

''تھینکس برو......'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس وقت ہم ڈیفنس لائبریری کے پاس سے گزر رہے تھے۔ عظیم کی نظر ونڈ اسکرین کے اس پار سڑک پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تو اس کے چہرے کے اچانک بدلتے ہوئے تاثرات کا سبب مجھے دکھائی دے گیا۔ سامنے سے ایک پولیس موبائل بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔

عظیم ایک لمحے کے لیے پریشان ضرور ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ وٹز کو لیفٹ سائڈ کی ایک اسٹریٹ پر موڑ لیا۔

''ارے...... یہ کیا کر رہے ہو؟'' عمران چلّایا۔

عدنان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''عظیم! تم نے گاڑی لیفٹ سائڈ پر کیوں موڑ دی؟ ہمیں گھر جانا ہے جو رائٹ سائڈ پر ہے۔''

''کیا تم ہمیں نثار شہید پارک کی سیر کرانے لے جا رہے ہو؟'' عمران نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں چونکہ پولیس موبائل کو دیکھ چکا تھا اس لیے عظیم کی حکمت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری اسٹریٹ میں گھماتے ہوئے اپنے دوستوں کے سوالات کے جواب میں کہا۔

''ابے او گدھے کے بچو! تمہیں گھر جانے اور نثار شہید پارک کی سیر کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ پہلے اپنے ان باپوں سے تو جان چھڑا لو پھر ایسا سوچنا۔''

''کن باپوں سے؟'' عدنان نے بے ساختہ پوچھا۔

''میں پولیس والوں کی بات کر رہا ہوں۔'' عظیم برہمی سے بولا۔

''عظیم! پولیس موبائل کو تو ہم ڈیفنس موڑ والے سگنل پر چھوڑ آئے ہیں۔'' عمران نے اپنے عقب میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اب تو ہم محفوظ ہیں۔''

''او محفوظ کے بچے! کیا کراچی پولیس کے پاس صرف ایک ہی موبائل ہے۔'' عظیم نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جس موبائل کو ہم نے ڈیفنس موڑ والے سگنل پر جل دیا ہے، لگتا ہے انہوں نے وائرلیس پر اپنے بھائی بندوں کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔''

''عظیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے خود ایک پولیس موبائل کو سامنے سے آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی عظیم نے گاڑی کو سائڈ اسٹریٹ میں گھمایا تھا۔''

عدنان نے منت ریز انداز میں کہا۔ ''عظیم! تمہیں ہیرو بننے کا شوق ہے تو تم اپنا یہ شوق ضرور پورا کرو لیکن ہمیں اللہ کے واسطے یہیں اتار دو۔''

''ہاں یار! تم ہمیں گاڑی سے اتار دو۔'' عمران نے عدنان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہاں سے پیدل مارچ کرتے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔''

''بزدل کہیں کے۔'' عظیم نے گاڑی کو ایک طرف روکتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ کیا خاک لڑکیاں پھنساؤ گے۔ پولیس کو دیکھ کر تو تمہاری سانس خشک ہوتی ہے۔ اگر کسی لڑکی کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو یہ کہہ کر جان چھڑاؤ گے کہ...... سر! یہ تو میری بہن ہے!''

''تم ہمیں ذلیل کر رہے ہو!'' عدنان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''میں دلیل دے رہا ہوں۔'' عظیم نے بیزاری سے کہا۔ ''اب اترو گاڑی سے۔ اگر وہ تمہارے رشتے دار پولیس والے ادھر آ گئے تو ہم سب دھر لیے جائیں گے۔''

وہ دونوں چپ چاپ وٹز سے اتر گئے۔

عظیم نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ لڑکیوں کو پھنسانے کا کیا قصہ ہے؟''

''برو! یہ امریکا نہیں پاکستان ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کسی لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے، اسے پٹانے کے لیے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ دونوں اس ٹیلنٹ سے پیدل ہیں۔ پہلے انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انہیں لڑکیاں پھنسانے کے گر بتاؤں لیکن ان کی بزدلی کو دیکھتے ہوئے میں نے انہیں چلتا کر دیا۔ آج کل یہ دونوں سلمان کی شاگردی میں ہیں اور آج سلمان انہیں ہائپر اسٹار میں چھوڑ کر کسی لڑکی کے ساتھ غائب ہو گیا۔ یہ ہے کل کہانی۔''

''یہ کل کہانی نہیں ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس کہانی میں تمہارا بھی تو کردار ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ یہ دونوں لڑکی پھنسانے کے گر سیکھنے کے لیے تم سے درخواست کیوں کرتے...... ان کے لیے تم ایک گرو کی حیثیت رکھتے ہو۔''

''ارے یار! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں خود ہی گئے گزرے ہیں اس لیے ادھر ادھر سے سہارے ڈھونڈتے رہتے ہیں ورنہ یہ کام اتنا مشکل کہاں ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو، یہ کام واقعی مشکل نہیں ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ ''کیا یہاں پولیس والے لڑکی لڑکے کو ایک ساتھ دیکھ کر پریشان کرتے ہیں؟''

''ہاں یار! یہ ایک حقیقت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بڑی عجیب وغریب حقیقت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے امریکا کی طرح یہاں نوجوان نسل کو آسانیاں اور آزادیاں حاصل نہیں ہیں۔'' عظیم نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی جہاں تک پولیس کا معاملہ ہے تو وہ اس قسم کی روک ٹوک کسی اصلاحی

ہم ہیں پاکستانی

ہم پاکستانی بہ آسانی شناخت ہو سکتے ہیں کیونکہ......

☆ ہر کھانا لہسن اور پیاز میں پکاتے ہیں۔

☆ گفٹ پیپرز کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔

☆ گیٹ پر رخصت ہونے سے پہلے آدھا گھنٹا ضرور بات کرتے ہیں۔

☆ بچا ہوا کھانا فریج میں ضرور رکھتے ہیں۔

☆ کھانا پکاتے ہوئے کبھی بھی پیمانہ ناپ کر آئل استعمال نہیں کرتے بلکہ اندازے سے ڈالے جاتے ہیں۔

☆ بغیر ڈاکٹر کی تجویز کے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔

☆ ہمیشہ کہتے ہیں گندا کپڑا دینا کوئی چیز صاف کرنی ہے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

پہلو کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ اس سے ان کا مقصد صرف اپنی جیب گرم کرنا ہوتا ہے۔''

''ویری بیڈ اینڈ ویری سیڈ۔'' میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''امریکا میں تو پولیس سے اس نوعیت کی بدعنوانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

''برو...... یہ امریکا نہیں، پاکستان ہے۔'' عظیم نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''یہاں بہت کچھ چلتا ہے بلکہ یہاں سب چلتا ہے۔''

''اس سب چلتا کو دیکھ کر تو مجھے یہی لگتا ہے کہ پاکستان کی پولیس بہت امیر ہوگی۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''قدم قدم پر تو ان کی کمائی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔''

''اس تمام تر کمائی کے باوجود بھی وہ امیر نہیں ہو پاتے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ اور ان کی فیملی کے افراد کیسے کیسے عذابوں میں مبتلا رہتے ہیں۔''

''مالِ حرام سے کبھی سچی خوشی نہیں خریدی جا سکتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ گاڑی کو ایک ایسی جگہ پر روکتے ہوئے بولا جہاں پہلے سے چند کاریں کھڑی تھیں۔

''خیریت......'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف

دیکھا۔ ''کیا یہاں رکنے کا ارادہ ہے؟''

وہ اپنی وٹز کو ان گاڑیوں کے بیچ اس طرح پارک کرنے لگا کہ دور سے وہ دکھائی نہ دے۔ میں اس کا مقصد بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ پولیس والوں کی نگاہ سے اپنی گاڑی کو چھپانا چاہتا تھا۔ یہ احتیاط مناسب بھی تھی حالانکہ کافی دیر سے ہمیں اپنے عقب میں پولیس کی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی لیکن عظیم کی یہ حکمت عملی مجھے پسند آئی کہ...... احتیاط افسوس سے بہتر ہے!

ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے تو اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''یار! تھوڑی دیر پارک میں بیٹھ کرری لیکس کریں گے پھر گھر جائیں گے۔''

''او کے۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ہم ایک لمبا راؤنڈ لگا کر نثار شہید پارک میں آ بیٹھے۔ عظیم نے کہا۔ ''اگر تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو تو میں ایک سگریٹ پی لوں۔''

''کیا تم اسموکنگ کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن پاپا کے سامنے نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے پاپا کو تمہاری اسموکنگ کی خبر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''علی انہیں میرے بارے میں پوری رپورٹنگ کرتا ہے۔ پاپا کو تو یہ بھی پتا ہے کہ میں ڈرنک بھی کرتا ہوں۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے پاپا کو یہ بات پسند نہیں ہے...... ہے نا؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایک اسموکنگ اور ڈرنک ہی کی بات نہیں اسد، پاپا کو تو میری کوئی بھی بات پسند نہیں ہے......''

آخری جملہ اس نے بڑی اداسی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک مجبور اور دکھی انسان نظر آیا تھا۔ اس کے لہجے سے اپنے پاپا کے لیے گہرا شکوہ جھلکتا تھا۔ میں نے ٹٹولنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

''عظیم! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پاپا کو تمہاری کوئی بھی بات پسند کیوں نہیں ہے؟''

''یہ بہت لمبی کہانی ہے دوست۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری یار! میں نے تم سے سگریٹ کا تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا تم اسموکنگ کرتے ہو؟''

بات کے اختتام پر اس نے مارلبورو لائٹس کا پیکٹ اور لائٹر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مارلبورو سگریٹ کے پیکٹ پر ڈالی پھر کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''نو تھینکس...... میں اسموکنگ نہیں کرتا۔''

''ڈرنک تو کرتے ہو گے؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نو ڈرنک...... نو اسموکنگ۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا یار۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''تم امریکا سے آ رہے ہو یا سعودی عرب سے؟''

''اس میں بے یقینی والی کون سی بات ہے۔'' میں نے جواباً اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کوئی اصول نہ ہوا کہ امریکا میں رہنے والا ہر شخص سگریٹ نوش اور شراب نوش ہوگا اور سعودی عرب کا ہر باشندہ ان دونوں چیزوں سے نابلد اور محروم......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ عین ممکن ہے کہ امریکا میں رہنے والے کسی شخص نے زندگی میں کبھی سگریٹ اور شراب کے جام کو اپنے ہونٹوں سے نہ لگایا ہو اور یہ بھی عین العین ممکن ہے کہ سعودی عرب میں رہنے والے بعض لوگ روزانہ پابندی کے ساتھ ڈرنک بھی کرتے ہوں اور اسموکنگ بھی......!''

''میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بس ایسے ہی امریکا اور سعودی عرب کی ایک مثال دے دی تھی۔ واقعی اسے اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ ویسے عموماً تاثر یہی ہے کہ مغرب زدہ لوگ آزاد خیال ہوتے ہیں اور مکے مدینے سے تعلق رکھنے والے نیک و پارسا۔''

''یہ تاثر بھی سراسر غلط ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''انسان کی پارسائی اور بدکاری کا تعلق دنیا کے کسی مخصوص خطے کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ یہ تو انسان کے اندرون کا معاملہ ہے۔ اندر سے اچھا انسان برائی اور بے حیائی کے گڑھ میں رہ کر بھی گناہ سے خود کو بچا سکتا ہے اور اس کی بہترین مثال کنول و کیچڑ کی ہے لیکن جو انسان اندر سے برا ہے، وہ پاکیزہ اور متبرک مقام پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ ہاں، یہ

ٹھیک ہے کہ ماحول سے انسانی سوچ پر بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ تمام تر اثرات خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ انسان اس وقت بدلتا ہے جب اس کے داخلی معاملات تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس دنیا میں مالک نے صرف دو ہی طرح کے انسان پیدا کیے ہیں۔ ایک وہ جن کا خمیر خیر سے اٹھا ہے اور دوسرے وہ جن کا خمیر شر سے اٹھا ہے۔ خیر والا ہمیشہ خیر والا ہی رہتا ہے اور شر والا سدا شر والا ہی۔ ان میں داخلی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ دیکھنے والی آنکھ کو ان میں جو بھی تبدیلی نظر آتی ہے، وہ خارجی اور عارضی ہوتی ہے۔''

''اوکے......اوکے......'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ گیا بغیر مونچھ ڈاڑھی کے مولوی صاحب۔''

''میں مولوی صاحب نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ......'' وہ بات کو بدلتے ہوئے بولا''...... کہ تم صرف ماہر نفسیات ہی نہیں بلکہ ایک فلسفی بھی ہو۔ اس وقت تمہارے اندر سقراط، بقراط اور ارسطو کی روحیں بہ یک وقت متحرک ہیں۔''

وہ اس قسم کی باتیں کررہا تھا جیسے اسے اس ٹاپک سے فرار کا راستہ چاہیے ہو۔ میں نے اسے خاصا کھلا راستہ فراہم کرتے ہوئے ایک چوٹ بھی کردی۔

''اچھا تو تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس خطے کے مولوی صاحب اندر سے سقراط، بقراط اور ارسطو ہوتے ہیں......؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، اس کا سیل فون جاگ اٹھا۔ اس نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''علی کی کال ہے۔''

پھر اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں علی......!''

دوسری جانب علی نے کیا کہا، میں نہیں جانتا تاہم عظیم کے جواب سے یہی لگا کہ علی نے پوچھا ہوگا، کہاں ہو بھائی؟

''میں اپنے دوست کے ساتھ ہوں۔'' عظیم نے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔''

عظیم نے دوسری طرف علی کو سنا پھر بولا۔ ''ارے یار! پتا ہے مجھے۔ جب سعودی عرب میں گزشتہ شام رمضان کا چاند نظر آگیا تھا اور آج وہاں پہلا روزہ ہے تو آج لازمی پاکستان میں چاند دکھائی دے جائے گا۔''

عظیم نے چند لمحے خاموش رہ کر اپنے چھوٹے بھائی کی بات سنی پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اسد کو بھی اپنے ساتھ لے کر آرہا ہوں۔''

دونوں بھائیوں کے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوا تو عظیم نے مجھ سے کہا۔

''پاپا کا فون تھا۔''

''پاپا کا فون......'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مگر تم نے تو تمام تر گفتگو علی سے کی ہے!''

''علی تو پاپا کا چمچہ ہے۔'' وہ بینچ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں، علی نے پاپا کے کہنے پر ہی مجھے فون کیا ہوگا۔''

میں نے بھی اس کی تقلید میں پارک کی بینچ چھوڑ دی اور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''یار عظیم! تم اپنے باپ اور چھوٹے بھائی کی طرف سے اتنے بدگمان کیوں ہو؟''

''یہ معاملہ آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' وہ پارک کے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''کبھی فرصت میں بیٹھیں گے تو میں تمہیں اپنی لائف اسٹوری تفصیل کے ساتھ سناؤں گا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جب سے میں نے لَومیرج کی ہے، پاپا کا رویہ میرے ساتھ بالکل بدل گیا ہے۔ وہ اس شادی کے خلاف تھے۔ ابھی تک انہوں نے مہرالنسا کو دل سے اپنی بہو تسلیم نہیں کیا جبکہ اس عرصے میں، میں نے پاپا کو ایک پوتے اور تین پوتیوں کا دادا بھی بنایا ہے۔ مہرالنسا میرے چار بچوں کی ماں ہے اسد......''

''کیا علی کی شادی نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''علی بھی شادی شدہ ہے۔''

''اس کے کتنے بچے ہیں؟''

عظیم نے جواب دیا۔ ''علی ابھی صاحبِ اولاد نہیں ہوا۔''

''اوہ......'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا علی کی بھی لَومیرج ہے؟''

''نہیں۔'' وہ زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''علی پاپا کی نظر میں بہت ہی فرمانبردار اور بی با بیٹا ہے۔ اس نے پاپا کے کہنے پر اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کی ہے اور پاپا کی نظر میں علی اور اس کی بیوی دنیا کے سب سے زیادہ قابل انسان ہیں جبکہ عظیم اور مہرالنسا دنیا کے نالائق ترین انسان......''

میں نے عظیم کے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ یہ خالصتاً ان کا فیملی میٹر تھا اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں اسے کریدنے کی کوشش کروں۔ اگر وہ اپنی زبان سے خود ہی کچھ بتادے تو یہ الگ بات ہے۔ میں جانتا تھا کہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں افراد کے بیچ اس نوعیت کے ایشوز جنم

لیتے ہی رہتے ہیں۔

ہم جس راستے سے پارک میں داخل ہوئے تھے اس کے مخالف گیٹ سے باہر نکل آئے۔ میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ عظیم نے یہ احتیاط پولیس کے ممکنہ خطرے کے پیش نظر کی تھی۔ نثار شہید پارک بہت ہی صاف ستھرا اور دل خوش کن فیملی پارک تھا۔ اس کا مقابلہ یورپ اور امریکا کے کسی بھی پارک سے کیا جاسکتا تھا۔ میں نے آج دوپہر میں پولو گراؤنڈ والے فیملی پارک پر بھی نگاہ ڈالی تھی لیکن نثار شہید پارک اس سے کافی آگے کی چیز تھا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ یہ شہر کے پوش علاقے کے دامن میں واقع تھا۔ اس پارک میں آنے والے افراد کے چہروں سے بھی اطمینان اور آسودگی جھلکتی تھی۔

عظیم نے اپنی وٹز کو جہاں پارک کیا تھا، وہ وہاں سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور چوکنا نظر سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا پھر مطمئن ہونے کے بعد اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا جو اب بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے اریب قریب کھڑی گاڑیاں رخصت ہوچکی تھیں۔

ہم گاڑی کے اندر آکر بیٹھے اور عظیم گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے، پولیس والے اس طرف نہیں آئے۔''

''میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ گاڑی کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ اب تک ہم دھر لیے گئے ہوتے۔''

عظیم نے دو تین مرتبہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش بارآور نہیں ہوئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ وہائٹ وٹز نیو برانڈ گاڑی تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کے گیس (فیول) میٹر کی طرف دیکھا اور چونک اٹھا۔ میٹر کی سوئی زیرو پر براجمان تھی۔

''عظیم!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ساری کوششیں فضول ہیں کیونکہ گاڑی کا فیول ختم ہوچکا ہے۔''

''اوہ نو......'' وہ فیول میٹر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہاری طرف آنے سے پہلے ٹینک فل کروایا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟''

''یہ ہوچکا ہے عظیم الشان صاحب۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں جانتا ہوں، یہ کیسے ہوا ہوگا۔''

''کیسے؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

''تم جب پولیس کے ناکے سے رسی تڑا کر نکلے تھے تو تمہیں یاد ہوگا، پولیس والوں نے تمہیں روکنے کے لیے فائرنگ کی تھی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب اس فائرنگ سے محفوظ رہے تھے۔''

''درست!'' میں نے اس کی تائید میں کہا۔ ''ہم مالک کے کرم سے محفوظ رہے تھے اور تمہارے وہ دونوں دوست اب تک صحیح سلامت اپنے گھر بھی پہنچ چکے ہوں گے لیکن ......'' میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرے خیال میں تمہاری وٹز محفوظ نہیں رہی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کوئی اندھی گولی اس کے فیول ٹینک کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی ہے، یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فیول ٹینک اس گولی سے معمولی سا متاثر ہوا ہوگا۔ اگر گولی عین فیول ٹینک کے اندر گھستی تو ہم چاروں کے چاروں ایک خوفناک دھماکے کے نتیجے میں گاڑی کے ساتھ ہی بھک سی اڑ گئے ہوتے اور اس وقت تک ہمارے جسم درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر فضا میں بکھر چکے ہوتے۔''

عظیم کے چہرے پر سراسیمگی نمودار ہوئی۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسد! گاڑی سے نیچے اترو......''

وہ حالات کی سنگینی کو سمجھ گیا تھا۔ میں اس کے کہنے کے مطابق وٹز سے باہر آگیا اور پوچھا۔ ''کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''میں اسٹیئرنگ کو کنٹرول کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم گاڑی کو پش دے کر اس کی جگہ سے ہٹاؤ۔''

میں اس کے مقصد کی تہ میں پہنچ گیا۔ وٹز اس زاویے سے پارک کی گئی تھی کہ اسے آگے کی طرف نہیں دھکیلا جاسکتا تھا کیونکہ اس کے فرنٹ کے ساتھ چند انچ کے فاصلے پر پارک کی دیوار تھی۔ دھکا لگا کر گاڑی کو پیچھے ہی ہٹایا جاسکتا تھا۔ میں پارک کی دیوار کی طرف آیا اور دونوں ہاتھ وٹز کے بونٹ پر رکھتے ہوئے عظیم سے پوچھا۔

''گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا ہوا ہے نا؟''

''ہاں ہاں......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بے فکر ہوکر دھکا لگاؤ۔''

میں نے دونوں پاؤں کو زمین پر جمایا اور جسم و جان کی پوری قوت سے وٹز کو پش کرنے لگا۔ اس سلسلے میں عظیم بھی کھڑکی سے پش دے کر میری مدد کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے گاڑی کو اس کی پارکنگ کی جگہ سے ہٹا کر ایک دوسرے مقام پر کھڑا کردیا۔

وٹز اپنی جگہ سے ہٹی تو میرے خیال کی تصدیق

ہوگئی۔ اس مقام پر عین گاڑی کے فیول ٹینک کے نیچے پیٹرول گرنے کا ایک دائرہ نما نشان بڑا واضح نظر آرہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ فائرنگ کے دوران میں پولیس والوں کی چلائی ہوئی کوئی گولی گاڑی کے فیول ٹینک کو گھائل کرگئی تھی۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے راستے میں ٹینک سے پیٹرول نکلتا رہا ہوگا اور ٹینک کے اندر جو پیٹرول بچا تھا وہ سارے کا سارا یہاں پر ''ڈھیر'' ہوگیا تھا...... ایک ننھے سے ''تالاب'' کی شکل میں!

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' عظیم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ''گولی گاڑی کے ٹینک میں لگی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ پولیس والوں کو اس خوفناک حقیقت کا علم نہیں ہوسکا ورنہ وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہ چھوڑتے۔''

''مالک کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور سبق چھپا ہوتا ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''ففٹی ففٹی!'' اس نے جواب دیا۔

''ففٹی ففٹی...... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں تمہاری آدھی بات سمجھ پایا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اللہ کی پوشیدہ مصلحت تو نظر آرہی ہے کہ ہمیں بچانا مقصود تھا اس لیے پولیس والوں کو ہماری کمزوری کا علم نہیں ہوسکا کہ ہماری گاڑی کا فیول ٹینک متاثر ہوچکا ہے لیکن اس سے قدرت ہمیں کیا سبق سکھانا چاہتی ہے، یہ میرے پلے نہیں پڑسکا......''

''قدرت ہمیں اور خاص طور پر تمہیں اس واقعے سے یہ سبق سکھانا چاہتی ہے کہ اس قسم کی ایفی شینسی جان لیوا ہوسکتی ہے لہٰذا اجتناب بہت ضروری ہے۔ قدرت دو طریقوں سے انسان کو سبق سکھاتی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر ون...... انسان کو نقصان پہنچا کر۔ نمبر ٹو...... انسان کو نقصان سے بچا کر۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں، مالک جنہیں نقصان سے بچا کر کوئی سبق سکھاتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، میں خوش قسمت ہوں......!'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''یقیناً!'' میں نے پورے تیقن سے کہا۔ ''اس لیے تم ہر وقت اپنے گھریلو حالات کا رونا نہیں روتے رہا کرو۔ مالک نے تمہیں جس حال میں رکھا ہوا ہے، اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ وہ تمہیں بھٹی چڑھا کر کندن بنانا چاہتا ہے، تمہیں زندگی کا کوئی انتہائی مفید سبق سکھانا چاہتا ہے۔''

عظیم چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''اسد! تم بڑے گہرے انسان ہو، کسی سمندر کی طرح...... تمہاری عمر تو اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن میں محسوس کررہا ہوں کہ تمہارے وجود میں کسی سو سالہ بڈھے کی روح سمائی ہوئی ہے......''

''ارے یار! تم سمندروں کی گہرائی کو ناپنے والا کام چھوڑ دو۔'' میں نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ''اس قسم کا کام راکیل ویلش اور میڈم ڈیلفینا ہی کو زیب دیتے ہیں۔''

''میں نے راکیل ویلش کی دو تین فلمیں دیکھی ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ ہالی ووڈ فلم انڈسٹری کی ایک حسین وجمیل اداکارہ ہے لیکن یہ میڈم ڈیلفینا کون ہے؟''

''ڈیلفینا ڈیلس کی ایک منجھی ہوئی کلاکارہ ہے۔'' میں نے عظیم سے تفریح لینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ راکیل ویلش سے بھی آگے کی چیز ہے۔''

''میں نے ڈیلفینا کا نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''بس سمجھو کہ تم نے کچھ بھی نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔ ''میرے الفاظ تمہارے ایک کان سے گھس کر دوسرے کان سے نکلے اور ہوا میں تحلیل ہوگئے۔''

''کیا یہ ڈیلفینا کوئی خطرناک عورت ہے؟''

''ایسی ویسی خطرناک۔'' میں نے کہا۔

''اس کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ......'' اس کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے راکیل ویلش کی کون کون سی فلم دیکھی ہے؟''

''ون ملین ایئرز بی سی، فیدم......'' اس نے بتایا۔

''فیدم...... اوکے!'' میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے دیکھا ہوگا کہ ''فیدم'' میں ہالی ووڈ کی ساحرہ راکیل ویلش کس طرح چھ فٹ کا اسکیل اٹھائے بحرالکاہل کی اتھاہ گہرائیوں کو ناپتے ہوئے اپنے حسن و جمال کی خیرات فلم بینوں میں بانٹتی پھرتی ہے...... دیکھا ہے نا؟''

''ہاں دیکھا ہے۔'' وہ خوابناک لہجے میں بولا۔ ''راکیل ویلش کا بدن لاجواب اور اداکاری باکمال ہے۔''

''یہ جو ڈیلفینا ہے نا......'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ راکیل ویلش سے کہیں زیادہ حسین و سنگین ہے۔ یہ کسی بھی معقول انسان کو پریسٹن ہالو والے بنگلے میں بہتر گھنٹے کے لیے ٹھہرا کر اپنے ناز و ادا سے اس کی مت ماردیتی ہے۔ یہ پاؤں کے نیچے

سے اس طرح زمین کھینچتی ہے کہ اس کے چنگل میں آیا ہوا انسان منہ کے بل تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے۔ خیر......'' میں لمحے بھر کے لیے رکا پھر تشویشناک انداز میں کہا۔

''تم ان دونوں عورتوں کو دفع کرو اور یہ بتاؤ کہ اس سچویشن سے کیسے نکلنا ہے!''

''بات کو بدل رہے ہو نا؟'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

''میں بات کو بدل نہیں رہا بلکہ نظریۂ ضرورت کے تحت موجودہ صورتِ حال کا احساس کررہا ہوں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''راکیل ویلش اور میڈم ڈیلفینا تو دنیاوی حوریں ہیں۔ ان کا گلیمر میں ذکر کہیں سکون سے بیٹھ کر کریں گے...... انسان زندہ، قصہ باقی!''

''موجودہ سچویشن سے نکلنے کے دو حل ہیں میرے پاس۔'' عظیم نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر کہا۔

''ہاں بتاؤ......'' میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''ہم بہت سی چیونگ گم چبا کر اس کا ایک گولا سا بنالیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اس گولے کو فیول ٹینک کے متاثرہ حصے پر چپکا دیں۔ پھر گاڑی میں پیٹرول ڈلوا کر گھر چلے جائیں۔''

''تمہاری وٹز برانڈ نیو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے پہیے کوئی اسپیسر وغیرہ بھی نہیں ڈلا ہوا۔ گاڑی کے نیچے اتنی گنجائش نہیں ہے۔ تم جو ترکیب بتا رہے ہو اس پر عمل کرنا ہم دونوں کے بس کی بات نہیں پھر مجھے گاڑی کے نیچے لیٹ کر کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے...... کیا تمہیں ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''اس منصوبے پر کوئی ماہر مکینک ہی عمل کرسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ خالی فیول ٹینک کے متاثرہ حصے کو تلاش کرنا بھی کارِ دارد ہے لہٰذا یہ حل تو قابلِ عمل نہیں۔'' بات ختم کرکے میں نے عظیم کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں دوسرے حل کے بارے میں استفسار کررہا ہوں۔ اس نے کہا۔

''گاڑی کی ڈکی میں ایک خالی گیلن رکھا ہوا ہے۔ ہم کسی پیٹرول پمپ سے اسے بھروا لیتے ہیں پھر تھوڑا تھوڑا پیٹرول ڈال کر گاڑی کو چلاتے ہیں۔ جیسے ہی فیول میٹر کا کانٹا اینڈ کی طرف بڑھے گا، ہم گاڑی روک کر اس میں اور پیٹرول ڈال لیں گے پھر تھوڑا سا فاصلہ طے کرلیں گے۔ اس طرح بالآخر ہم گھر پہنچ جائیں گے۔''

''یہ ترکیب قابلِ عمل مگر کفرانِ رحمت ہے۔'' میں نے کہا۔

''کفرانِ رحمت...... کیا مطلب؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''تھوڑی دیر پہلے ہم بات کررہے تھے کہ مالک بعض خوش نصیب انسانوں کو نقصان سے بچا کر کوئی سبق سکھا دیتا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس نے ہم سب کی جان بچا کر ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ جان لیوا خطرناک کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ اس سبق کو فراموش کردینا کفرانِ رحمت ہی تو ہوگا۔''

''لیکن ہم نے اس سبق کو کب فراموش کیا ہے؟''

''تم نے چھید والے فیول ٹینک میں پیٹرول ڈال کر گھر پہنچنے کا جو منصوبہ بیان کیا ہے، وہ صد فیصد رسکی اور جان لیوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''روڈ پر سفر کرتے ہوئے کوئی بھی سنگین حادثہ پیش آسکتا ہے۔''

وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر کیا کریں؟''

''ویری سمپل۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی گاڑی یا ٹیکسی پکڑ کر یہاں لاتے ہیں اور وٹز کو ٹو کرکے کسی مکینک کے پاس لے جاتے ہیں۔ پھر اس گاڑی کے فیول ٹینک کی مرمت کا معاملہ مکینک پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کمال ہے، یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا!''

''وہ اس لیے کہ تم اس وقت پریشان ہو۔'' میں نے کہا۔ ''جب انسان کا ذہن کسی الجھن کا شکار ہوتا ہے تو پھر کوئی نیا خیال آنا تو دور کی بات ہے، جو خیالات پہلے سے وہاں موجود ہوتے ہیں وہ بھی رفو چکر ہوجاتے ہیں۔''

''میں علی کو فون کرکے یہاں بلا لیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''پھر ہم وٹز کو ٹو (کھینچ کر) کرکے اپنے مکینک کے پاس طارق روڈ لے جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمارا گھر بھی قریب ہی ہے۔''

''علی کو بلاؤ گے تو پھر یہ بات تمہارے پاپا سے چھپی نہیں رہے گی کہ وٹز پر پولیس نے فائرنگ کی تھی جس کے نتیجے میں فیول ٹینک لیک ہوگیا ہے۔'' میں نے ایک خاص نکتے کی جانب توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس سے تمہارے لیے گھر میں کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا تو بلالو علی کو......''

''علی کو یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پولیس نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

''پھر......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم دیکھتے جاؤ، میں کیا کرتا ہوں۔'' وہ اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اسپیکر فون

آن کر رہا ہوں۔ تم بھی سنتے جاؤ۔''

تھوڑی ہی دیر میں اس نے علی سے رابطہ کرلیا اور کہا۔''علی! میں ایک پرابلم میں ہوں۔ کیا تم ابھی میرے پاس آسکتے ہو؟''

''کیا ہوا بھائی۔'' علی کی تشویش بھری آواز مجھے سنائی دی۔''تم اس وقت کہاں ہو اور پرابلم کیا ہے؟''

''یار ڈاکو ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''ہم نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی ہے۔ ڈاکوؤں نے ہم پر فائرنگ بھی کی ہے جس سے وٹز کا فیول ٹینک ڈیمیج ہوا ہے۔ میں اس وقت نثار شہید پارک کے قریب ہوں۔ پلے لینڈ والی سائڈ پر۔''

''میں پاپا کو فون کرتا ہوں......''

''پاپا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔'' عظیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''تم اپنی گاڑی میں آجاؤ۔ ہم وٹز کو ٹو کر کے مکینک کے پاس لے جائیں گے۔''

''اصل میں پاپا اس وقت تمہارے قریب ہی ہیں۔'' علی نے بتایا۔''میری گاڑی وہ لے کر گئے ہوئے ہیں۔''

''پاپا میرے قریب ہیں...... مطلب کہاں ہیں؟''

''وہ اس وقت شیخ صاحب کے گھر میں ہیں۔''

''اوکے ٹھیک ہے، میں خود بات کرلیتا ہوں۔'' عظیم نے یہ کہہ کر فون بند کردیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''برو! کام بن گیا۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''شیخ صاحب یہاں قریب ہی فیز ٹو ایکسٹینشن میں رہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔''شیخ صاحب کا تعلق ہائی کورٹ سے ہے۔ وہ پاپا کے دوست ہیں اور مجھ سے بھی ان کی پکی یاری ہے۔ اس موقع پر وہ ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ میں انہیں فون کررہا ہوں۔ وہ کسی کو بھیج کر ہماری گاڑی کو ٹو...... کروالیں گے۔ فیز ٹو ایکسٹینشن میں موٹر مکینکس کی پوری مارکیٹ ہے۔''

''تم اپنے پاپا کو فون کرو گے یا شیخ صاحب کو؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''شیخ صاحب کو۔'' وہ میرے سوال کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا۔''پاپا کو تو علی اب تک ساری کہانی سنا چکا ہوگا۔''

دونوں بھائیوں کے بیچ بداعتمادی کی فضا دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ میں علی سے ابھی تک ملا نہیں تھا۔ اگر عظیم اچھا تھا تو وہ بھی یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ مجھے کبھی جوائنٹ فیملی میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے رشتوں کے باہمی ایشوز کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں علی، عظیم اور ان کے پاپا کے بیچ تناؤ کی جو کیفیت دیکھ رہا تھا، ممکن ہے، یہ سب عین فطری اور نارمل ہو۔ اصل صورتِ حال اسی وقت واضح ہوسکتی تھی جب میں علی کپور اور حفیظ کپور سے مل کر عظیم کے بارے میں ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لیتا۔

میں کپور فیملی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ عظیم کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''شیخ صاحب ہیں۔''

وہ لگ بھگ ایک منٹ تک شیخ صاحب سے بات کرتا رہا۔ شیخ صاحب کو بھی اس نے ڈاکوؤں والی کہانی ہی سنائی تھی۔ بات مکمل کرنے کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''شیخ صاحب نے یہاں نثار شہید پارک کے اسٹاف میں کسی بااثر آدمی سے بات کی ہے۔ ان کا ایک بندہ ابھی یہاں آئے گا اور ہم گاڑی کی چابی اس کے حوالے کر کے سیدھے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر جائیں گے۔ وٹز جانے اور شیخ صاحب جانیں...... کیسا ہے؟''

''عمدہ ہے لیکن......!'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔''لیکن کیا؟''

''یہ عمدگی داغ دار ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''اگر آپ کے پاس بیلجیم کا سب سے اعلیٰ شیشہ ہو لیکن اس شیشے میں بال آجائے تو اس کی قدر و قیمت خاک میں مل جاتی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بیلجیم کے شیشے کا یہاں کیا کام؟'' اس کے استفسار میں الجھن تھی۔

''کام شیشے کا نہیں، بال کا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا......'' اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔

''تم نے جو کچھ کیا، وہ یقیناً عمدہ ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''لیکن تمہارے جھوٹ کی وجہ سے اس کی عمدگی گہنا گئی ہے۔ تمہیں علی کو اور شیخ صاحب کو سب سچ بتانا چاہیے تھا کہ ہماری گاڑی پر پولیس نے فائرنگ کی تھی اور اس کا سبب ہماری اپنی غلطی تھی۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''عظیم! میری ایک بات ذہن میں نقش کرلو کہ آپ

جسے اپنا کہتے ہیں اس کے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ جھوٹ رشتوں کے لیے زہر ہے۔ اسے بنیاد بنا کر جو بھی عمارت کھڑی کی جائے وہ چاہے سو منزلوں تک بلند کیوں نہ ہو جائے، سچائی کا ایک نرم جھونکا چشم زدن میں اسے زمین بوس کر دیتا ہے۔''

عظیم نے ندامت سے گردن جھکا دی۔

☆☆☆

جب ہم عظیم کے گھر پہنچے تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور اس وقت تک رمضان کے چاند کا بھی اعلان ہو چکا تھا۔ گویا کل پہلا روزہ تھا۔

عظیم کا گھر عالی شان تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ کراچی کا پوش رہائشی علاقہ تھا۔ وہاں پر زیادہ تر بزنس مین اور کاروباری افراد رہتے تھے۔ یہ رہائشی ایریا دہلی مرکنٹائل سوسائٹی کہلاتا تھا۔ ہم ٹیکسی کے ذریعے عظیم کے گھر پہنچے تھے۔ بنگلے کے گیٹ پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ وہاں لگ بھگ ایک سو مرد و زن کا ایک چھوٹا سا ہجوم لگا ہوا تھا۔ عظیم نے مجھے لے جا کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور کہا۔

''فریش ہونا ہے تو بتاؤ......؟''

''نہیں یار، میں فریش ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''او کے!'' وہ بولا۔ ''تم بیٹھو، میں فریش ہو کر آ رہا ہوں۔ ویسے وہ سامنے اٹیچڈ باتھ ہے۔'' اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی ضرورت محسوس کرو تو کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔''

''تھینک یو۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

عظیم کے جانے کے بعد میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں پر موجود ہر شے سے اہلِ خانہ کے اعلیٰ ذوق اور امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم کا سارا فرنیچر قیمتی اور عمدہ لکڑی کا تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر بڑی بڑی آئل پینٹنگز آویزاں تھیں لیکن ان میں سے کسی بھی پینٹنگ میں کسی انسان یا کسی جانور کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ وہ سب کی سب آئل پینٹنگز کیلی گرافی کا انمول شاہکار تھیں۔ ہر پینٹنگ میں قرآنی آیات کو بڑے خوب صورت انداز میں پینٹ کیا گیا تھا۔ حسین رنگوں کا امتزاج ان پینٹنگز کی خوب صورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ زیادہ تر پینٹنگز میں چاروں قل اور آیۃ الکرسی کو جدید ڈیزائن میں لکھا گیا تھا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ عظیم کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کے ساتھ شیشے کی بڑی سی چوبی الماری بھی رکھی ہوئی تھی۔ مذکورہ الماری کے اندر موٹی موٹی کتابیں بڑے سلیقے سے سجا کر رکھی ہوئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ سب ضخیم مذہبی کتابیں تھیں۔ میں صوفے سے اٹھا اور یہ سوچ کر واش روم میں گھس گیا کہ......چلو، میں بھی فریش ہو لیتا ہوں!

تھوڑی دیر کے بعد عظیم بھی وہاں آ گیا۔ اس دوران میں، میں فریش ہو کر دوبارہ صوفے پر براجمان ہو چکا تھا۔ عظیم جاتے ہوئے ڈرائنگ روم کا اے سی آن کر گیا تھا لہٰذا کمرے کا موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔

عظیم کی آمد سے قبل ایک ملازم صورت آدمی پانی کا جگ اور گلاس سینٹر ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ عظیم نے میرے لیے گلاس میں پانی نکالا اور کہا۔

''لو......حلق تر کرو۔ ابھی چائے بھی آ رہی ہے۔''

''یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے پانی کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تمہارے پاپا اور تمہارے بھائی سے ملنے یہاں آیا ہوں لیکن وہ دونوں مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔''

''اسد! تمہارے ساتھ تکلف والا کوئی معاملہ نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس چائے پانی کے علاوہ تمہیں ہمارے ساتھ ڈٹ کر ڈنر بھی کرنا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی اور جہاں تک پاپا اور علی کا تعلق ہے تو......'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پاپا شیخ صاحب کے گھر سے نکل چکے ہیں اور راستے میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے اور علی باہر والے لوگوں کے ساتھ مصروف ہے۔ وہ بھی فارغ ہو کر ادھر ہی آئے گا۔''

عظیم نے ''باہر والے لوگوں'' کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے باہر بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ میں نے عظیم سے پوچھا۔

''یار! یہ کون لوگ ہیں......؟''

''یہ مفلس، نادار اور مستحق لوگ ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ہر سال جب رمضان کا چاند نظر آتا ہے تو ہم لوگ ضرورت مند افراد میں راشن کے تھیلے تقسیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر سال کی طرح اس سال بھی اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔ ایک تھیلے کے اندر کسی بھی چار پانچ افراد کی فیملی کے لیے مہینے بھر کے استعمال کی خورونوش کی ہر شے موجود ہوتی ہے۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''غریبوں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھنا تو بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ انسان کے اس عمل سے مالک بہت خوش ہوتا ہے۔''

''بس یار! ہم تو اپنی بساط کے مطابق کوشش کرتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔''

''کائنات کے رجسٹر میں انسان کا معمولی سے معمولی عمل بھی درج ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور مالک کسی کے بھی عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ کسی کو اس کے عمل کے برابر اور کسی کو دوگنا، چوگنا، دس گنا اور ستر گنا صلہ عطا کرتا ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔''

ہماری بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ چائے آ گئی۔ وہ محض چائے نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ خاصے ریفریشمنٹ کے لوازمات بھی تھے۔ ملازم نے چائے کے برتن اور دیگر لوازمات میز پر سجائے اور ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ میں نے برتنوں سے بھری ہوئی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار عظیم! یہ چائے ہے یا ڈنر......؟''

''بس اب تم شروع ہو جاؤ بسم اللہ کر کے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''باقی تبصرے بعد میں ہوں گے۔''

اور میں شروع ہو گیا......!

عظیم نے کہا۔ ''یار! ایک بات ذہن میں رکھنا۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے علی اور شیخ صاحب کو ڈاکوؤں والی جو اسٹوری سنائی ہے اس سلسلے میں، ہمارے بیان میں تضاد نظر نہیں آنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دوست بنایا ہے تو اب تمہارے جھوٹ کو بھی نبھانا پڑے گا۔''

''یار! میں عموماً جھوٹ نہیں بولتا۔'' وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن تم میرے پاپا کو نہیں جانتے۔ وہ کسی تھانے دار سے کم نہیں ہیں۔ بال کی کھال نکالتے ہیں اور اگر کوئی میرا معاملہ ہو تو کھال کے بال بھی نکال سکتے ہیں۔ میں نے ان کے بہت سے سوالات اور لعن طعن سے بچنے کے لیے یہ کہانی فٹ کی ہے۔''

''بس تو پھر اس کہانی کو فٹ اور ہٹ ہی سمجھو۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم میری طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔''

''تھینک یو یار۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اٹس او کے۔''

ہمارے چائے ختم کرنے تک عظیم کے پاپا بھی گھر پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ڈرائنگ میں آ گئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملے پھر مصافحہ کرنے کے بعد میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

''سب خیریت ہے نا؟''

''جی انکل ...... سب امن و امان ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

حفیظ کپور درمیانے قد کا مالک ایک فربہ اندام شخص تھا۔ رنگت سانولی اور چہرے کے خال و خط سے جفاکشی جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور زمانے بھر کا تجربہ ٹپکتا تھا۔ وہ دبنگ شخصیت کا مالک ایک متاثر کن شخص تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پینسٹھ کے قریب لگایا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ حفیظ کپور اس وقت اپنی عمر کی باسٹھویں منزل پر کھڑا تھا۔

مجھ سے رسمی علیک سلیک کے بعد حفیظ کپور نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اکبر بادشاہ......!''

میں کچھ نہ سمجھا اور سوالیہ نظر سے عظیم کی طرف دیکھا۔ قبل اس کے کہ عظیم کچھ بولتا، حفیظ کپور نے اس سے پوچھ لیا۔

''اکبر کو تم نے کہیں بھیجا ہے؟''

''نہیں پاپا! ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ ادھر ہی تھا۔'' عظیم نے بتایا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں پاپا۔''

پھر پاپا کا جواب سنے بغیر عظیم ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دانستہ وہاں سے اٹھا تھا۔ وہ پاپا کے ساتھ بیٹھنے سے کنی کاٹ رہا تھا۔ باپ بیٹے کے بیچ تنی ہوئی اس نازک رشتے کی ڈور کے بارے میں مجھے عظیم کی دن بھر کی گفتگو سن کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے حفیظ کپور کے رویے میں بھی عظیم کے لیے بڑی واضح بے رخی اور بے اعتنائی محسوس کی تھی۔ کچھ بھی تھا، عظیم نے انہیں اگر براہِ راست نہیں بھی بتایا تھا لیکن علی کی زبانی یقیناً انہیں اس واقعے کی خبر ہو چکی تھی کہ ڈاکوؤں نے ہماری گاڑی پر فائرنگ کی تھی۔

اصولی طور پر انہیں سب سے پہلے عظیم سے اس واقعے کے بارے میں دریافت کرنا چاہیے تھا مگر انہوں نے تو ایسا ظاہر کیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم پر ڈاکوؤں نے فائرنگ کی تھی اور نہ ہی انہوں نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر واقعی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو پھر بھی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے معاملے سے اتنی ہی عدم دلچسپی ہوتی؟ بہرحال، مجھے حفیظ کپور کی یہ ادا پسند نہیں آئی تھی......!

تھوڑی ہی دیر میں گھریلو ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو حفیظ کپور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''اکبر! کبوتروں کو باجرا ڈال دیا تھا نا؟''

''جی صاحب! چاروں برتن بھرے ہوئے ہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔

حفیظ کپور نے پوچھا۔ ''اور پانی کی کیا پوزیشن ہے؟''

''میں نے پانی بھی فل کر دیا ہے۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''اکبر بادشاہ! تم اور کوئی کام کرو یا نہیں لیکن پرندوں کے کھانے دانے کی طرف سے تم نے کبھی غفلت نہیں برتنا۔'' حفیظ کپور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''انسانوں کی طرح ان بے چاروں کے پاس خوراک کا ذخیرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی جیب میں کوئی پیسے ہوتے ہیں کہ جب بھوک لگے تو کچھ خرید کر کھالیں۔ یہ اپنی ہر ضرورت کے لیے انسان کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''اور انسان اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے مالک سے امید لگائے رکھتا ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ مالک اس کی ضروریات کا خیال رکھے تو انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ مالک کی دوسری مخلوقات کو نظر انداز نہ کرے۔''

''سبحان اللہ......!'' حفیظ کپور نے تعریفی نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''بہت گہری بات کی ہے تم نے۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟''

''اسد علی۔'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

حفیظ نے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چائے کے برتن اٹھالو اور سعیدہ سے پوچھو کہ رات کے کھانے میں کیا بنا ہے؟''

''جی صاحب۔'' اکبر یہ کہتے ہوئے اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔

مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے حفیظ کپور نے ''اکبر بادشاہ'' کا نعرہ اپنے اسی ملازم کے لیے لگایا تھا۔ اپنے نوکروں کے ساتھ نرمی اور اپنایت کا یہ سلوک مجھے بہت اچھا لیکن ایٹ دی سیم ٹائم ...... ایک بیٹے کے ساتھ باپ کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ لگتا تھا یا تو حفیظ کپور کو اپنے بیٹے عظیم کپور سے بڑی سنگین نوعیت کی شکایات تھیں یا پھر یہ شخص دہری شخصیت کا مالک تھا۔

اکبر برتن سمیٹ کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو حفیظ کپور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! تم تو بہت سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔ عظیم سے تمہاری دوستی کیسے ہوگئی؟''

اس کے آخری جملے میں استفسار سے زیادہ طنز چھپا ہوا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''انکل! آپ نے ایسا کیوں کہا؟ کیا میں آپ کے بیٹے سے دوستی کے قابل نہیں ہوں......؟''

''نہیں...... ایسی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم مجھے کافی سنجیدہ اور بردبار لگے ہو اور عظیم...... خیر چھوڑو۔'' وہ بات کو بدلتے ہوئے بولے۔ ''امریکا میں تمہارا تعلق کس اسٹیٹ سے ہے؟''

''ٹیکساس۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ اچھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''ٹیکساس تو حجم میں لگ بھگ پورے پاکستان کے برابر ہی ہے۔ کافی بڑی اسٹیٹ ہے یہ۔''

''جی انکل! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''اور وہاں کا موسم بھی بڑی حد تک کراچی جیسا ہی ہے۔'' حفیظ کپور نے کہا پھر پوچھا۔ ''ٹیکساس میں تم کہاں ہوتے ہو؟''

''رہائش بے سٹی میں ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور کالج لیک جیکسن میں۔''

''گڈ۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر بتایا۔ ''میں نے بھی کچھ عرصہ امریکا میں گزارا ہے لیکن یہ پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے۔''

''پچیس تیس سال پہلے تو میں اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔'' میں نے کہا پھر حفیظ کپور سے پوچھا۔ ''آپ کس سلسلے میں امریکا گئے تھے اور کس اسٹیٹ میں قیام کیا تھا؟''

''بس والد صاحب سے لڑائی ہوئی اور میں منہ اٹھا کر امریکا چلا گیا۔'' وہ ہنستے ہوئے بتانے لگے۔ ''اس زمانے میں امریکا جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج کل ہو چکا ہے۔

پھر مجھے اس لیے بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میں امریکن ایمبیسی کے تمام تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ والد صاحب کا اپنا چلتا ہوا بزنس تھا لہٰذا مجھے آسانی سے وزٹ ویزا مل گیا۔ میں گیا تو وزٹ ویزا پر تھا لیکن وہاں جا کر میں سلپ ہو گیا اور پورے چار سال تک وہاں کام کرتا رہا۔ جب امریکا اور امریکی کلچر سے دل بھر گیا تو میں واپس پاکستان آ گیا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے یہ عرصہ امریکی ریاست ڈکوٹا میں گزارا تھا۔''

''نارتھ یا ساؤتھ؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے بتایا۔ ''نارتھ ڈکوٹا۔''

اسی لمحے اکبر نامی ملازم نے آ کر بتایا۔ ''صاحب! بکرے کی چانپیں ہیں، آلو گوشت کا سالن ہے، مٹن پلاؤ ہے اور سبزی کی بھجیا بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم تھوڑا سا باربی کیو بھی پکڑ لو۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''لیکن اس سے کہنا کہ چکن تکے اچھی طرح سینک کر دے اور دھاگے والے کباب بھی لے لینا۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' اکبر نے فرماں برداری سے کہا پھر پوچھا۔ ''روٹی لاؤں یا چپاتی؟''

''چپاتی اور نان دونوں چیزیں لانا ہیں۔'' حفیظ کپور نے کہا۔ ''اسد صاحب بہت دور سے آئے ہیں۔ انہیں کھانے میں کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی اچھا صاحب۔'' اکبر سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

ادھر اکبر وہاں سے رخصت ہوا، ادھر ایک موٹا تازہ نوجوان سست روی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ میں اس نوجوان کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً ایک ہی جیسی تھی اور وزن میرے محتاط اندازے کے مطابق ایک سو تیس کلوگرام سے متجاوز ہی تھا۔

وہ گول مٹول گوشت کا پہاڑ بڑی محبت سے آ کر مجھ سے گلے ملا، میرا حال احوال پوچھا اور پُرجوش مصافحہ کرنے کے بعد ایک طرف جا بیٹھا۔ اس نوجوان کے انداز و اطوار میں بڑی شائستگی پائی جاتی تھی۔ وہ عظیم کا چھوٹا بھائی علی کپور تھا۔

''علی! سب کو نمٹا دیا نا......؟'' حفیظ کپور نے اس سے پوچھا۔

''جی پاپا۔'' علی نے جواب دیا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' حفیظ کپور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ اس کی مہربانی ہے ورنہ میری اتنی اوقات نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''انکل! عظیم کہاں چلا گیا؟''

''آپ کے سامنے ہی تو اٹھ کر گیا ہے۔'' حفیظ نے جواب دیا۔ ''ادھر گھر ہی میں کہیں ہوگا۔''

''بھائی اوپر اپنے پورشن میں ہے۔'' علی نے بتایا۔

''علی! اسے فون کر کے یہاں نیچے بلاؤ۔'' حفیظ کپور نے علی سے کہا۔ ''اس کا دوست اور ہم سب کا مہمان یہاں بیٹھا ہے اور وہ اوپر اپنے کمرے میں گھسا بیٹھا ہے۔ فون پر مہرالنسا کی منت خوشامد میں لگا ہوگا۔ جب سے اس کی بیوی امریکا گئی ہے، یہ بولا یا بولا یا پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجنوں کی لیلیٰ کہیں گم ہو گئی ہو۔''

حفیظ کپور نے یہ تمام تر الفاظ بڑے نارمل انداز میں ادا کیے تھے لیکن میں نے عظیم کے لیے ان کی خفگی کو بڑا واضح محسوس کر لیا تھا۔ ان باپ بیٹے کے معاملات کو سمجھنے کے لیے دونوں کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔ یہ تو میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ دونوں کے بیچ ایک خلیج حائل ہے جسے پاٹنے میں دونوں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

''وہ آ رہا ہے۔'' علی نے اعلان کرنے والے انداز میں بتایا۔

حفیظ کپور اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم سب بھائی آپس میں گپ شپ کرو۔ میں تھوڑا آرام کروں گا۔ اب ڈنر پر ملاقات ہوگی۔''

بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ باپ کی آمد پر عظیم چپکے سے ڈرائنگ روم سے غائب ہو گیا تھا اور بیٹے کی آمد کی خبر سن کر باپ کو آرام کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے اور یہ کترانا دیدہ و دانستہ تھا۔ دونوں کے دلوں میں دوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

ان لمحات میں، میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اگر میں چند روز ان کے ساتھ رہا اور مالک نے مجھے موقع دیا تو عظیم کپور اور حفیظ کپور کے درمیان تعلق کی وہی مضبوطی اور پائیداری قائم کر دوں گا جو علی کپور اور حفیظ کپور کے بیچ میں نے دیکھی تھی۔ میں خلوصِ نیت سے ایسا سوچ رہا تھا اور مالک...... نیتوں کا حال جانتا ہے!

☆☆☆

ڈنر بڑا شاندار تھا۔ گھر کے پکے ہوئے تمام پکوان لذیذ اور مزے دار تھے۔ کھانے کے جو آئٹمز باہر سے

منگوائے گئے تھے، وہ بھی لاجواب تھے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب میں عظیم کے گھر سے رخصت ہوا اور بہ وقتِ رخصت حفیظ کپور نے مجھ سے وعدہ لیا کہ پہلا روزہ میں ان کے گھر پر ہی افطار کروں گا۔

''او کے انکل! میں ضرور آؤں گا۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔

عظیم مجھے سیاہ ٹویوٹا کرولا میں پی سی چھوڑنے آیا۔ جب اس نے مجھے ہوٹل پر ڈراپ کیا تو مجھے یاد آیا کہ میں ابھی تک چالیس فون نمبرز والی لسٹ کی زیروکس نہیں کرواسکا تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر عظیم سے کیا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''ارے یار! افراتفری میں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ تم وہ پیپر مجھے دے دو۔ میں اس کی کاپی کروا کر کل تمہیں دے دوں گا۔''

میں نے مذکورہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔

''اس پر چند لوگوں کے سیل فون نمبرز ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے بھی پتے ٹھکانے کا سراغ مل جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔'' پھر میں نے اسے تھوڑی سی تفصیل بھی بتادی۔

''اسد! تم فکر نہ کرو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔ میں تمہاری خوشی کی خاطر کسی نہ کسی کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔''

پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور واش روم میں گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں فریش اپ ہو کر بیڈ پر آ گیا پھر انکل سلطان کو فون کیا۔

ہمارے درمیان لگ بھگ ایک گھنٹا بات ہوئی۔ میں نے انکل سلطان کو اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں پوری تفصیل کے ساتھ بتایا۔ انہوں نے کہا۔

''یہ عظیم بہت کام کا آدمی ہے۔ مجھے امید ہے، اس سے دوستی تمہارے لیے مفید ثابت ہوگی۔''

''جی انکل! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پوری کپور فیملی ہی بہت اچھی ہے۔ مخلص اور سپورٹنگ......''

انکل نے مجھے بہت دعائیں دیں اور کہا۔ ''پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ......!''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھالیا۔ دوسری جانب عظیم کپور تھا۔

''ہیلو۔'' میں نے اس کی کال پک کرتے ہوئے کہا۔ ''عظیم! تم خیریت سے تو ہو نا......؟''

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''برو! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں، بتاؤ کیا خوشخبری ہے؟''

''تم نے مجھے چالیس سیل نمبرز کی جو لسٹ دی ہے، میں نے اپنے سیل فون سے ان تمام نمبرز کو ٹرائی کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''پھر......؟'' میں نے سوال کیا۔

''ان میں سے ایک نمبر ایسے شخص کا ہے جسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''انتالیس نمبرز میرے سیل فون کی میموری کے لیے انجان تھے لیکن جیسے ہی میں نے چالیس واں نمبر ٹرائی کیا، میرے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ابھر آیا۔ یعنی وہ نمبر نام کے ساتھ میرے سیل فون میں فیڈ ہے۔''

''یہ نزاکت شاہ کون ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نزاکت شاہ کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہی کہا تھا نا کہ تمہیں ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے، یہ چالیس افراد کسی نہ کسی حوالے سے مختلف اوقات میں جس سے وابستہ رہے ہیں؟''

''ہاں...... میں نے تمہیں یہی بتایا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تمہاری مطلوبہ ہستی کوئی خاتون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں......'' میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔

''کیا اس خاتون کا نام سلمیٰ ہے......؟'' عظیم نے استفسار کیا۔

بے ساختہ میرا ہاتھ کپکپایا اور سیل فون ہاتھ سے پھسل کر بیڈ کے اوپر جا گرا......!

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

آرٹسٹ

سلیم انور

فنکار اگر اپنی فنکاری سے متاثر نہ کرسکے تو زندگی کے کسی مقام پر اسے پذیرائی نہیں ملتی مگر... یہاں پذیرائی سے بے پروا وہ ایک ایسی فنکارہ ثابت ہوئی جس کے فن نے انتہائی کٹھن مراحل میں کسی دوست کے مانند اس کا ساتھ دیا۔ گویا وہ اور اس کا فن ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

مصیبت اور بے بسی کے عالم میں ایک دوراندیش آرٹسٹ کا کارنامہ

کیتھرائن اپنی بینک کی ملازمت سے زیادہ خوش نہیں تھی۔ وہ اس وقت تک اسے محض بوریت سمجھتی تھی جب تک اس کی ملاقات فرینک گڈمین سے نہیں ہوئی۔

کیتھرائن، گلف اسپرنگس، مس سی پی کے مارش لینڈ بینک میں پارٹ ٹائم کیشیئر تھی۔ اس کے کام کی وضاحتی شیٹ پر اس کی حقیقی پوزیشن کہیں بھی درج نہیں تھی۔ البتہ اس سے جزوقتی کیشیئر، سیکریٹری اور سپلائی انچارج سب ہی کام لیا جاتا تھا۔ البتہ ایک کام کی اسے اجازت نہیں تھی......

قرضوں سے متعلق درخواستوں کو پروسس کرنا۔

یہ کام برانچ منیجر ڈیوڈ بیورز کا تھا جو کہ اس معاملے میں مکمل اختیار رکھتا تھا کیونکہ اسے اور کوئی کام زیادہ نہیں آتا تھا۔

کیتھرائن کی ذمے داریاں تین حصوں پر مبنی تھیں۔ اول کسٹمرز کی شکایات اور معلومات کو ہینڈل کرنا اور ضرورت پڑنے پر کیشیئر کی حیثیت سے کام کرنا۔ دوم بینک منیجر ڈیوڈ بیورز کو صبح کے ٹائم کافی بروقت پیش کرنا اور اسے یقینی بنانا اور سوم برانچ میں ہر کسی کو آفس سپلائیز فراہم کرنا اور ان کا آرڈر دینا۔ آفس سپلائیز میں کاغذ، پیپر کلپس، کیلنڈرز سے لے کر پرنٹر کے کارٹرجز سب ہی کچھ شامل تھا۔

بینک میں اپنے روزمرہ کے کام کے دوران کبھی کبھار کیتھرائن کو اگر موقع مل جاتا تھا تو وہ ایک کام سے بے حد لطف اندوز ہوتی تھی۔ یہ کام وہ کافی کے وقفے یا لنچ بریک کے دوران کیا کرتی تھی۔ بینک کے عقبی دفاتر اور ہال ویز کی جو دیواریں کبھی ننگی ہوا کرتی تھیں، اب اس کی فطری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ تمام دیواریں تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں اسکیچز، لائن ڈرائنگز، پورٹریٹس، لینڈ اسکیپس اور ہر وہ شے شامل تھی جو تصور میں آسکتی تھی۔ یہ تصاویر پینسل، چارکول، روشنائی اور حتیٰ کہ واٹرکلرز سے بنی ہوئی تھیں۔

کیتھرائن ایک آرٹسٹ تھی...... ایک فطری مصورہ!

اور اگر اس کی تصویریں نظروں کو بھلی لگتی تھیں تو اس سے زیادہ دل آویز اس کو ان تصویروں کو تخلیق کرتے ہوئے دیکھنا ہوتا تھا۔ وہ نہایت پرسکون انداز میں پوری درستی، مہارت اور مشاقی کے ساتھ بغیر کسی مشقت کے اپنے کام میں مگن رہتی تھی۔

کسی بھی پرانی کار، بائیسکل یا ڈلیوری ٹرک کا تفصیلی خاکہ یا بینک کی کھڑکی کے باہر موجود کسی بھی شے کا اسکیچ بنانا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ یہ اسکیچ صرف چند سیکنڈ میں تیار کر لیتی تھی۔ اس کے ہاتھ کاغذ پر حرکت کررہے ہوتے تھے اور نگاہیں اس شے پر جمی رہتی تھیں۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اسے اس شے پر سے نگاہیں ہٹانا پڑتی ہوں۔ ورنہ اکثر وہ اپنا کام مکمل ہونے کے بعد ہی اس شے سے نظر ہٹاتی تھی۔

البتہ اسے ایک مسئلہ یہ تھا جس کا اکثر ذکر کیا کرتی تھی کہ وہ اپنی یادداشت کی بنیاد پر کسی چیز کی تصویر نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ جس شے کا اسکیچ بنارہی ہو وہ اس کی نظروں کے سامنے واضح طور پر موجود ہوتا کہ وہ کاغذ پر اس کا بالکل صحیح اور مکمل خاکہ تیار کرسکے۔ ''اگر کوئی شخص جاگنگ کرتا ہوا گزرے اور میں اس کا اسکیچ تیار کرنے کا فیصلہ کروں تو مجھے یہ امید کرنا ہوگی کہ وہ گر پڑے اور میرے سامنے ساکت پڑا رہے۔'' کیتھرائن نے ایک مرتبہ اپنے بینک کی ساتھیوں کو بتایا تھا۔

سچ بات یہ تھی کہ کیتھرائن اپنی مصوری کو سنجیدگی سے لیتی تھی۔ یہ اس کا مشغلہ اور اس کی شدید رغبت تھی۔ بینکنگ کا کاروبار، خاص طور پر نوٹ پیڈز کے آرڈر کرنے کا کاروبار اس کے تصور یا اس کے دل کی دھڑکنوں میں ہیجانی کیفیت لانے کا قطعی کوئی سبب نہیں تھا۔

کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی حتیٰ کہ وہ دن آن پہنچا جب فرینک گڈمین کی آمد ہوئی۔

یہ فروری کی ایک صاف ستھری سرد صبح تھی...... وہ یہ صبح کبھی نہیں بھول پائے گی جب فرینک گڈمین سڑک پار کرکے لابی کے دروازوں میں سے گزرتا ہوا اس کی زندگی میں داخل ہوا۔

لیکن افسوس...... وہ اس کا دل لوٹنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو مارش لینڈ بینک کے عمدہ اور باوفا کسٹمرز کی جمع پونجی لوٹنے کے لیے آیا تھا۔

''ہر کوئی ساکت ہوجائے!'' فرینک گڈمین نے چیختے ہوئے حکم دیا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پہلے ہی مضبوطی سے تھام لیا تھا اور پورے منظر کو اپنی زد میں لیا ہوا تھا جبکہ اس کے دیگر دو ساتھی لابی کے پار ہال میں پھیل چکے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ہتھیار نکال لیے تھے۔ ساتھ ہی کینوس کے خالی تھیلے بھی نکال کر کیشیئر خواتین کے چہروں کی جانب اچھالتے ہوئے انہیں نقدی تھیلوں میں بھرنے کا حکم دینے لگے۔ بینک میں موجود کسٹمرز کو انہوں نے فرش پر لیٹ جانے کا آرڈر دیا۔

سفید ٹائلوں سے مزین بڑے سے کمرے میں بلند آوازوں اور تنبیہی احکامات کی گونج پر بینک منیجر ڈیوڈ بیورز تیزی سے اپنے دفتر سے باہر آگیا۔ اس نے درشت انداز

میں اس ہلچل کو گھورا اور پھر جب اس نے اپنا حکم چلانے کی کوشش کی تو فرینک گڈمین کے ساتھیوں میں سے ایک نے فوراً ہی اس پر گولی چلادی۔

بالآخر جب چیخ و پکار قدرے معدوم ہوگئ تو فرینک گڈمین نے اپنا مطالبہ فوراً دہرانا شروع کردیا۔

''خالی تھیلوں کو کرنسی سے فوراً اور تیزی سے بھرنا شروع کردو اور کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے اور نہ کسی سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ جہاں تک الارم کے بٹن دبانے کی بات ہے تو......'' یہ کہتے ہوئے فرینک گڈمین کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی...... ''الارم سسٹم کی تاروں کے ساتھ ٹیلی فون اور سیکیورٹی کیمروں کے تار بھی ڈس کنیکٹ کیے جاچکے ہیں۔ اس لیے خواتین کیشیئر الارم بٹن دبانے کی زحمت میں وقت ضائع نہ کریں اور تھیلوں میں نوٹ بھرتی رہیں۔ ہاں، تمام نوٹ بڑی مالیت کے ہونے چاہئیں، یہ بات دھیان میں رہے۔''

تمام خواتین کیشیئرز اپنا کام تقریباً نمٹا چکی تھیں کہ ان میں سے ایک نے جو اپنا تھیلا سب سے پہلے بھر چکی تھی، اتفاق سے نگاہ اٹھا کر کیتھرائن کی جانب دیکھ لیا۔

اس مخصوص دن کیتھرائن سیکریٹری کی میز سنبھالے ہوئے تھی اور اس لیے اس ہلچل کے مرکز سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ وہاں سے ڈاکوؤں کے لیڈر فرینک گڈمین کا چہرہ اسے بالکل صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی عادت اور فطرت کے مطابق فرینک گڈمین کے چہرے کی تصویر ساڑھے آٹھ بائی گیارہ انچ کے اسٹیشنری کے کاغذ پر بڑی تیزی اور مہارت سے بنانے میں مگن تھی۔

وہ شاید فرینک گڈمین کی نظروں کی زد میں آنے سے بچ جاتی اگر وہ خاتون کیشیئر ضرورت سے زیادہ وقت تک اسے ٹکٹکی باندھے نہ دیکھ رہی ہوتی۔ فرینک گڈمین تو پہلے ہی چوکنے انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اور ہر ایک پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جب اس خاتون کیشیئر کی مسلسل توجہ کسی ایک جانب مرکوز پائی تو وہ الرٹ ہوگیا۔

اس نے خاتون کیشیئر کی نظروں کا تعاقب کرتے

بہادری

تین دوست اپنی بہادری کے قصے بیان کررہے تھے۔ پہلا دوست بولا۔ ''میں دس سال تک سائبیریا کے برفانی علاقے میں رہا ہوں۔''

دوسرا بولا۔ ''میں پندرہ سال تک افریقا کے گھنے جنگلوں میں شیروں اور آدم خوروں کے ساتھ رہا تھا۔''

تیسرا بولا۔ ''دوستو بہادر میں ہوں۔ مجھے دیکھو! پورے بیس سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔''

☆☆☆

مغربی فیشن کے دلدادہ ایک صاحب شدید گرمی اور حبس کے باعث گھر میں صرف انڈرویئر اور بنیان کے ساتھ ٹائی لگائے آرام کرسی پر براجمان تھے۔ ان کی اہلیہ نے پوچھا۔

''اتنے کم لباس میں ٹائی کی بخ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟''

فرمانے لگے۔ ''نیک بخت کوئی مہمان آگیا تو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

☆☆☆

ایک پروفیسر صاحب ایک فرسٹ کلاس ہوٹل میں کافی پینے تشریف لے گئے۔ کافی دیر تک وہ گہری سوچ میں مستغرق سگار پیتے رہے۔ ویٹر بھی کافی لانا بھول چکا تھا۔ ویٹر کو کافی دیر بعد کافی لانے کا خیال آیا۔ وہ بھاگم بھاگ کافی لے کر آیا اور پروفیسر صاحب سے ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ ''معاف کرنا سر جی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ یہ کافی ملائیشیا کی ہے اور لاجواب کافی ہے۔''

پروفیسر صاحب بولے۔

''ارے اتنی دور چلے گئے تھے شریف آدمی! میں بھی کہوں کافی اب تک کیوں نہ آسکی۔''

اطہر حسین، کراچی

ہوئے کیتھرائن کی جانب نگاہ گھمائی جو بینک ڈکیت کے ایک شاندار پورٹریٹ کو فنشنگ ٹچز دینے میں مگن تھی۔ اس پورٹریٹ کو "بینک ڈکیت ان ایکشن" کا عنوان دیا جاسکتا تھا۔

فرینک گڈمین نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ لابی اور ایڈمن ایریا کی درمیانی لکڑی کی بنی ہوئی ریلنگ پھلانگی اور کیتھرائن کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ریوالور کی نال کیتھرائن کی دلکش ناک پر تان لی اور پورٹریٹ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے دے دو!"

پھر اس نے اپنا دھیان اپنے عقب میں ہونے والی ایکٹی وٹی پر مرکوز کرلیا۔

کیتھرائن نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کاغذ اس کے حوالے کردیا۔

"قابلِ تحسین!" فرینک گڈمین نے پورٹریٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تفریح کی ایک لہر سی چمکنے لگی۔ "یہ دس بجے کے خبرنامے میں بہت زبردست رہتی!"

فرینک گڈمین کی ستائش کا یہ اظہار حقیقت کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے ہاتھ میں جو کاغذ تھاما ہوا تھا وہ پورٹریٹ اتنا ہی صاف اور شارپ تھا جیسے کہ کوئی بلیک اینڈ وائٹ فوٹوگراف ہوسکتا ہے!

فرینک گڈمین دیکھنے میں ایک عام سا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال اور چہرے کے نقوش معمولی اور ناقابلِ ذکر تھے۔ ان کے بارے میں بالکل صحیح صحیح تفصیل بیان کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ الفاظ قطعی ناکافی رہتے...... جبکہ دوسری جانب ایک تصویر!

فرینک گڈمین کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ یہ تصویر اس کے بنے بنائے کام کا ستیاناس کرسکتی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے وہ پورٹریٹ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اپنے ریوالور کی نال لہراتے ہوئے بولا۔ "میز سے پرے ہوجاؤ!"

پھر وہ لابی کی سمت پلٹ گیا جہاں اس کے دونوں ساتھی موجود تھے۔ جب اس نے ڈیوائیڈر عبور کیا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا تو اس نے سر کی جنبش سے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا جو بازوؤں میں رقم سے بھرے ہوئے تھیلے لٹکائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے بے تابی سے اس کے حکم کا انتظار کررہے تھے۔

انہوں نے اشارہ پاتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور لپک کر باہر سڑک پر نکل گئے۔

پھر جب فرینک گڈمین ان کے پیچھے دروازے کی جانب بڑھنے لگا تو اچانک رک کر پلٹا اور براہ راست کیتھرائن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ نیچے کیا اور اپنے کوٹ کی جیب تھپتھپانے لگا۔

"میں اس عورت کی قدر کرتا ہوں جس میں پہل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔" اس نے کیتھرائن سے مخاطب ہوکر مسکراتے ہوئے کہا۔ "عمدہ کوشش تھی!"

اور پھر وہ بھی پلٹ کر بینک سے باہر لپک گیا۔

ایک لمحے کے لیے کسی نے بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ بالآخر سینئر خواتین کیشیئرز میں سے ایک اپنے سیل فون کی جانب دوڑی جبکہ دیگر بینک منیجر کے لیے بے حس و حرکت جسم کی جانب لپکے جو بدستور فرش پر موجود تھا۔ انہیں یہی محسوس ہوا کہ وہ مرچکا ہے اور اس حقیقت کی تصدیق بعد میں آنے والے تین درجن پولیس افسران کی فوج نے بھی کردی۔

اس سے قبل بینک برانچ کا بیشتر اسٹاف یا تو اپنے ہاتھ مل رہا تھا، یا کھڑا کانپ رہا تھا یا ایک دوسرے کے شانے پر اپنا سر لٹکائے سسکیاں لے رہا تھا۔ اس دوران عملے کی ایک نوجوان لڑکی کی توجہ کیتھرائن کی جانب مبذول ہوگئی جو ایک بار پھر اپنی میز پر پہنچ چکی تھی۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی بڑے غور سے بینک اسٹیشنری کی اس شیٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو اس نے اپنی میز پر سے اٹھائی تھی۔ اس کاغذ کا جائزہ لینے کے دوران اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری ہلکی سی مسکراہٹ طاری تھی۔

"کیتھرائن!" اس نوجوان لڑکی نے پوچھا۔ "آخر کیا ہے جس کے بارے میں تم اتنی گہری سوچ میں گم ہو؟"

کیتھرائن نے نظر اٹھا کر اس نوجوان ساتھی لڑکی کی جانب دیکھا اور پُرسکون لیکن فاتحانہ لہجے میں بولی۔ "اس اسکیچ کی کاربن کاپی ہے جو وہ ڈاکو اپنے ساتھ لے گیا ہے!"

غلطی

اعتزاز سلیم

مجرم چاہے کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو... کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرجاتا ہے... وہ جو گھر کا چراغ تھی اپنے ہی گھر کو آگ لگانے والوں میں شامل ہوگئی پھر کیسے اپنا دامن جلنے سے بچاسکتی تھی۔ اس کی لاکھ پردہ داری کے باوجود تاڑنے والوں نے قیامت کی نگاہ سے معاملات کی گہرائی کو دیکھ لیا تھا۔

دولت کے لالچ میں رشتوں کو فراموش کرنے والوں کا انجام

شہر کے اس حصے میں زیادہ تر مڈل کلاس لوگ رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سرکاری نوکریاں کرنے والے، دکانیں چلانے والے اور روزی کی خاطر پورا دن محنت کرنے والے لوگ جن کے گھران کے مالی حالات کے گواہ تھے مگر اس محلے کے عین وسط میں محلے کی اکلوتی مسجد کے ساتھ ایک بہت خوبصورت کوٹھی بھی تھی۔ محلے سے گزرتے ہوئے ہر شخص کی نگاہ اس کوٹھی پر ضرور پڑتی تھی کیونکہ درمیانے درجے کے گھروں کے درمیان اس کوٹھی کی شان و شوکت اور چمک دمک

ہر فرد کو حیران کر دیتی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ کوٹھی کے دونوں سیکیورٹی گارڈ بے ہوش پڑے تھے۔ کوٹھی میں لگے سیکیورٹی کیمرے آف تھے اور کوٹھی کا مالک میاں شبیر احمد اس وقت اپنے بیڈروم میں ایک کرسی پر بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگی ہوئی تھی اور اس کے سامنے اس کی دونوں بیٹیاں ایک صوفے پر اس حالت میں بیٹھی تھیں کہ ان کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اس کی بیوی یہ دیکھ کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ منہ پر نقاب چڑھائے دو آدمی ہاتھ میں پسٹل پکڑے ان کے سر پہ کھڑے تھے۔ تیسرا آدمی جو ان کا سرغنہ تھا، اپنی عجیب سی آواز میں بول رہا تھا۔

''آخری بار پوچھ رہا ہوں' تجوری کا کوڈ کیا ہے؟ ورنہ ابھی تک تو صرف کپڑے اتارے ہیں۔'' میاں شبیر نے ہاتھ اٹھا کر اپنی شکست کا اعلان کیا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر شبیر کے منہ سے ٹیپ اتاری۔

''ہاں بول۔'' میاں شبیر نے ہکلاتے ہوئے تجوری کا کوڈ بتا دیا۔ یہ جدید ڈیزائن کی تجوری تھی جس کا لاک توڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اس شخص نے تجوری کھول دی۔ حیرت سے ان تینوں کا منہ کھل گیا۔ ان کے اندازے سے کہیں زیادہ سونا اور کروڑوں روپے کی رقم اس میں موجود تھی۔ انہوں نے ایک بیگ میں سونا اور پیسے ڈالے اور بیگ کی زپ بند کی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک سوزوکی کلٹس محلے سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

میاں شبیر کی شہر کی مین مارکیٹ میں کئی دکانیں تھیں۔ ماہانہ لاکھوں کے حساب سے کمانے والے میاں شبیر کے پاس کروڑوں کے حساب سے دولت کیوں ہے؟ اس کی وجہ چند لوگ ضرور جانتے تھے۔ میاں شبیر سود پر لوگوں کی چیزیں رکھتا۔ اس کے پاس روزانہ بڑے کاروبار کرنے والے لوگ قرضہ لینے آتے تھے۔ وہ سونا اور مکان پر رقم دیتا۔ بینکوں کی نسبت میاں شبیر بہ آسانی لوگوں کو پیسے دیتا جس کی وجہ سے اس کے پاس کافی گاہک آتے تھے۔ میاں شبیر کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں، سترہ سال کی زرینہ اور پندرہ سال کی زرمینہ...... میاں شبیر کی بیوی زنیرا میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو امیر لوگوں کی بیویوں میں ہوتی ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں بھی اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور کہیں سے بھی دو جوان بچیوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے چھوٹے لوگوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ بیگم کی تمام تر مخالفت کے باوجود میاں شبیر نے گھر اپنے آبائی علاقے میں ہی بنایا تھا۔ اس وقت ان کے گھر میں پولیس کے اہلکار گھوم رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں انسپکٹر شہزاد پولیس والوں کے روایتی سوال پوچھ رہا تھا۔ ''آپ کو کسی پہ شک ہے؟''

''آپ کی کسی سے دشمنی؟'' میاں شبیر کا کہنا تھا وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ ڈاکو.... پیسے اور سونا کس چیز میں ڈال کر لے گئے ہیں جبکہ باقی ساری تفصیلات انہوں نے جزئیات کے ساتھ بیان کر دیں مگر اس سوال کا جواب زنیرا نے اچانک دیا کہ وہ بھورے رنگ کا ایک بیگ تھا۔ زنیرا نے بس یہاں تک بتایا کہ جب انہوں نے زرینہ اور زرمینہ کو باندھ کر برہنہ کیا اس کے بعد انہیں ہوش نہیں رہا۔ گھریلو ملازمین بھی تفتیش سے گزر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد باہر آ کر انسپکٹر شہزاد گاڑی میں بیٹھ گیا اور تمام صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ میاں شبیر کا کافی اثر رسوخ تھا اس لیے اس ڈکیتی کے بعد انسپکٹر کو کئی فون موصول ہوئے۔ افسران کا پریشر بہت زیادہ تھا۔

''فاروق......!'' اس نے باہر کھڑے سپاہی کو آواز دی۔ فاروق اس کے ماتحت تمام لوگوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ قریب آنے پر اس نے فاروق کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''کیا لگتا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''سر! کوئی گھر کا بندہ ملوث ہے۔ ڈاکو پوری طرح لوکیشن سے واقف تھے اور صرف ایک تجوری ہی اوپن کروائی اور باقی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' فاروق نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''گھر میں تمام لوگوں کے موبائل نمبر اور ڈیٹا نکلواؤ...... اس کے علاوہ تمام ملازمین کی تفصیل لو۔ شام تک ساری معلومات مجھے چاہیے۔''

☆☆☆

یہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے کا منظر تھا۔ ہاتھ میں سادہ سا موبائل پکڑے وہ جلدی جلدی نمبر ملا رہی تھی۔ ''کیا ہے، کیوں میسج پہ میسج کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے بولی۔ ''مجھے بھی مرواؤ گے اور خود بھی پھنسو گے۔ اب آرام کرو، تین چار دن کال مت کرنا۔''

''بتاؤ تو سہی پولیس کی تفتیش کہاں تک پہنچی؟'' دوسری طرف سے وہی عجیب سی آواز آئی۔

''بعد میں بات ہوگی ابھی سارے باہر بیٹھے ہیں۔''

''زرینہ۔'' باہر سے آواز آئی۔

''اچھا کوئی آ رہا ہے' بائے......'' اس نے جلدی سے فون بند کیا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”سر! موبائل نمبرز سے کوئی ایسی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ صرف میاں شبیر کی بڑی بیٹی کے موبائل سے ایک نمبر پر بار بار کال کی گئی ہے اور وہ ان کی کسی دوست کا ہے۔“ فاروق نے شام کو ساری رپورٹ پیش کی۔ ”گھر کے تمام ملازم اسی علاقے کے ہیں اور کسی کے موبائل نمبر میں کوئی مشکوک کال یا میسیج نہیں۔“

”کیا کہہ سکتے ہیں پھر...... ابھی تک تو اندھیرے میں ہیں۔“ شہزاد نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں سر! مکمل اندھیرے میں نہیں، آپ ایک چیز مس کررہے ہیں۔“ فاروق مسکرایا۔

”کیا؟“ شہزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میاں شبیر کے بنگلے پر دو سیکیورٹی گارڈز ہیں، اس رات دونوں ہی بے ہوش پائے گئے مگر ان کے سر پر نہ کوئی وار کیا گیا اور نہ ہی کسی اور طرح سے زخمی یا بے ہوش کیا گیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس رات دونوں معمول کے مطابق چائے پی کر اپنی ڈیوٹی پر گئے تھے......“

”اس کا مطلب ہے چائے میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ اوہ، یہ بات تو بیچ میں ذہن سے نکل گئی۔“ شہزاد نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”چلو آؤ۔“

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پولیس اسٹیشن سے باہر آگئے۔ آدھے گھنٹے بعد میاں شبیر کا باورچی زاہد ان کے سامنے تھا۔ ”کب سے کام کررہے ہو یہاں؟“ شہزاد نے سوالوں کا آغاز کیا۔

”جی پانچ سال ہوگئے ہیں۔“ زاہد بولا۔

”اچھا اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟“

”ملک سعید کی کوٹھی پر۔“ زاہد نے ایڈریس بتادیا۔

”اچھا تو اس رات تم نے سیکیورٹی گارڈز کی چائے میں کیا ملایا تھا۔“ فاروق نے اچانک سوال کیا۔

”کک کیا سر...... میں نے کیا ملانا ہے۔ میں تو بس چائے بنا کر دے کر آگیا تھا۔“ فاروق نے چند سوال گھما پھرا کر کیے مگر زاہد اسے بے قصور لگا۔ زاہد کا کہنا تھا کہ وہ چائے پیالیوں میں ڈال کر چند منٹ کے لیے واش روم گیا تھا اور کوئی اہم بات نہیں ہوئی تھی۔ فاروق اور شہزاد باہر آگئے۔

☆☆☆

میاں شبیر کے گھر ہونے والی ڈکیتی کو ایک ہفتہ گزر گیا مگر مجرموں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ انسپکٹر شہزاد اس دن پھر سب لوگوں کے بیان دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ ایک بیان پر وہ رک گیا۔ کوئی بات بار بار اس کے ذہن میں آرہی تھی مگر اس کی وضاحت نہیں ہورہی تھی۔ دو تین بار غور سے پڑھنے پر وہ چونک اٹھا۔ ”فاروق......!“ اس نے فاروق کو آواز دی۔

”جی سر۔“

”ایک کام کرو۔“ شہزاد نے کہا اور فاروق کو سمجھانے لگا۔ دس منٹ بعد فاروق پولیس اسٹیشن سے روانہ ہوگیا۔ یہ دوسرے دن شام کی بات تھی، فاروق نے تمام تر تفصیلات اس کے سامنے رکھ دیں۔

”یہ تو کیس ہی حل ہوگیا سر جی۔“ فاروق مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں چلو آؤ ذرا میاں شبیر کے گھر کا چکر لگا لیں۔''

آدھے گھنٹے بعد وہ میاں شبیر کی فیملی کے سامنے بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا انسپکٹر صاحب کوئی خاص بات ہوئی ہے؟'' میاں شبیر نے پوچھا۔

''جی بالکل، آپ کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے آیا تھا کہ آپ کا مجرم پکڑا گیا ہے۔'' شہزاد مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا......'' سب کے منہ کھل گئے۔ ''مگر کیسے اور کب؟'' زنیرا بولی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے......امامیہ ٹاؤن کے ایک گھر سے......گلی نمبر پانچ اور مکان نمبر اٹھارہ......'' شہزاد نے جواب دیا۔

''مگر زین تو وہ گھر کب کا چھوڑ چکا ہے۔'' زنیرا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اوہ بہت تیز ہیں آپ مسز شبیر......صرف گھر کا ایڈریس بتانے سے آپ کو مجرم کا نام پتا چل گیا۔'' شہزاد طنزیہ لہجے میں بولا۔

''کک کیا مطلب......زنیرا! تم کیسے جانتی ہو اسے؟'' میاں شبیر نے سخت لہجے میں پوچھا مگر زنیرا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

''صرف بیگم صاحبہ ہی نہیں آپ بھی جانتے ہیں سر......کچھ دن پہلے دس تولے سونا دے کر جو تین لاکھ کی رقم لے گیا تھا سود پر......ساجد نام بتایا تھا نا اس نے......وہی اصل میں زین ہے۔ آپ کی بیگم کا چھوٹا بھائی جو تین سال پہلے جیل بھی جا چکا ہے۔''

☆☆☆

زنیرا کا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس خاندان سے تھا۔ بے حد حسین زنیرا ہمیشہ اونچے خواب دیکھتی تھی اور اس سے دو سال چھوٹا زین بہن کا مکمل فرمانبردار تھا۔ زنیرا اٹھارہ سال کی تھی جب باپ کے بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں باپ کی پنشن سے دونوں بہن بھائی گزارہ کرتے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد زنیرا تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئی۔ اس نے ایف اے کیا تھا۔ ایک پرائیویٹ دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی جاب کرنے والی زنیرا نے بہت جلد شکار پھانسنے شروع کر دیے۔ لوگ اس کی معصوم شکل سے آسانی سے دھوکا کھا جاتے پھر ایک دن ایم ڈی صاحب جو اس کی زلفوں کے اسیر تھے، ان کی بیگم صاحبہ نے زنیرا کو آفس سے فارغ کروا دیا۔ زین بھی بری صحبت میں رہ کر نشے اور شراب کی لت میں پڑ چکا تھا۔ زنیرا نے بہت جلد میاں شبیر کی ایک دکان پر سیلز گرل کی نوکری حاصل کر لی اور اس بار خود مالک ہی دھوکا کھا گیا۔

میاں شبیر سے شادی کے بعد زنیرا نے خود کو کافی بدل لیا۔ اس نے میاں شبیر کو بس یہی بتایا کہ وہ یتیم ہے اور ایک وومن ہاسٹل میں رہتی ہے۔ اس دوران زین جو دو تین بار کچھ ماہ کے لیے جیل کی ہوا کھا چکا تھا، ایک ڈکیتی کی واردات میں پکڑا گیا۔ کافی عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد جب واپس آیا تو زنیرا کو تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے بہن کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا کہ وہ میاں شبیر کو اس کے ماضی کے بارے میں سب بتا دے گا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے چنگل میں پھنس گئی۔ پہلے دس تولہ دے کر اپنے ہی شوہر سے سود پر رقم دلوائی پھر ڈکیتی کی واردات میں حصہ دار بن گئی۔ وہ ایک سستا موبائل اور سم لے کر بڑی بیٹی زرینہ کے کمرے میں بیٹھ کر زین سے رابطہ کرتی تھی۔

☆☆☆

زنیرا ایک سائڈ پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ ''زین گرفتار نہیں ہوا اب اس کا ایڈریس بتا دیں مسز شبیر۔'' زنیرا نے ہار مانتے ہوئے ایڈریس بتا دیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ زین کو اس کے دونوں دوستوں سمیت گرفتار کر لیا گیا اور میاں شبیر کو اس کی ساری دولت واپس مل گئی۔ میاں شبیر نے زنیرا کو کھلے دل سے معاف کر دیا۔ اس شام شہزاد اپنے آفس میں بیٹھا تھا جب فاروق اندر داخل ہوا۔

''سر! ایک سوال پوچھنا ہے۔'' وہ بولا۔

''یہی نا کہ آخر مجھے کیسے پتا چلا بیگم زنیرا گھر کی بھیدی ہے؟'' شہزاد مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی۔'' فاروق نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیگم زنیرا کا کہنا تھا جب ان کی بیٹیوں کو باندھ کر برہنہ کیا گیا تب وہ بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہیں اس وقت ہوش آیا جب مجرم بھاگ چکے تھے اور میاں شبیر کو زرینہ وغیرہ نے کھول دیا تھا......لیکن جب میں نے میاں شبیر سے پوچھا کہ مجرموں نے پیسے اور سونا کس چیز میں ڈالے ہیں تو ان کے بجائے زنیرا بیگم نے جواب دیا کہ ایک بھورے رنگ کے بیگ میں......تبھی مجھے شک ہوا اور میں نے تمہیں بیگم صاحبہ کی تفصیل جاننے پر لگایا۔ کیس حل ہو گیا۔''

''ٹھیک کہتے ہیں سر، مجرم چاہے جتنا ذہین کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔'' فاروق مسکراتے ہوئے بولا اور سیلیوٹ مار کے باہر چلا گیا۔

''میں اس بے حجابی کو پسند نہیں کرتا۔ اگر کپڑوں سمیت پانی میں اتر جاؤں تو پہننے کے لیے دوسرے کپڑے نہیں ہیں۔'' مالک بن زعر جس سے وہ بہت مانوس ہو گئے تھے، بہت کہا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر یہ تجویز رکھی گئی کہ چشمے سے پانی لے کر درختوں کے جھنڈ میں چلے جائیں اور وہاں نہا کر یہی کپڑے پہن لیں۔ جب مصر پہنچیں گے تو نئی پوشاک خرید کر پہنا دی جائے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے چشمے سے پانی بھرا اور درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے۔ ان کے پاؤں میں رسّی

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنا دی گئی... جیسے کہ حصرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

دوسرا حصہ

باندھ کر اس کا سرا محافظوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔
مالک بن زعر آپ کی اس شرم و حیا پر حیران ہو رہا تھا۔ اس کی حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی جب غسل کر کے واپس آئے اور اس نے ان کے جسم پر نئے کپڑے دیکھے۔
''تمہارے پاس کپڑے تو تھے نہیں پھر یہ نئے کپڑے کہاں سے آ گئے؟''
''یہ کپڑے آپ لوگوں نے نہیں رکھے تھے؟''
''نہیں۔''
''پھر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے نہانے کے بعد پیٹھ پھیری تو میرے کپڑے وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کی جگہ یہ نئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں سمجھا آپ لوگوں نے رکھے ہوں گے۔''
مالک بن زعر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہو سکتا۔ نہانے کے بعد حسن و جمال بھی ایسا نکھر آیا تھا کہ نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا مالک بن زعر غلام ہے اور یوسفؑ اس کے آقا۔
''اے غلام سچ بتا تیری حقیقت کیا ہے؟''
''اگر سچ سننا چاہتے ہو تو سچ یہ ہے کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کا غلام نہیں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ میں ان کا غلام ہوں، وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ میرے مالک نہیں میرے بھائی تھے۔ مجھ سے حسد کرتے تھے۔ ان کے حسد ہی نے انہیں یہ راہ سجھائی کہ وہ مجھے کنوئیں میں پھینک دیں اور میں وہیں مر کھپ جاؤں۔ یہ تو میری قسمت تھی کہ میں آپ لوگوں کے ہاتھ لگ گیا اور میری جان بچ گئی۔ آپ نے میری قیمت ادا کی ہے اس لیے اب تو میں آپ کا غلام ہی ہوں۔ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔''
مالک بن زعر ان باتوں سے متاثر ہوا۔ سمجھ گیا کہ یہ لڑکا کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی آیا کہ اسے اپنا بیٹا بنا لے لیکن لاکھوں روپے کا لالچ تھا جس نے فوراً دامن پکڑا۔ اپنے گناہ سے چھٹکارا پا لینے کے لیے یہ جواز بھی فوراً ذہن میں آیا کہ اگر یہ حقیقت کنعان ہی میں کھل جاتی تو میں اسے اس کے گھر تک پہنچا دیتا لیکن اب بہت وقت گزر گیا۔ انسانوں کی منڈی چند قدم پر ہے۔ وہاں پہنچتے ہی لوگ ٹوٹ پڑیں گے۔ ایسا حسین غلام اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ بیوپاریوں میں میری ساکھ بھی بڑھ جائے گی کہ میں کیسے اچھے غلام لاتا ہوں۔ اس کے بعد کبھی مصر آیا تو میرا مال کھڑے کھڑے بک جایا کرے گا۔
یہ قافلہ اس رات مصر کے باہر چشمے کے پاس پڑاؤ کیے رہا۔ مالک بن زعر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی رسیاں کھول دیں اور انہیں خوش رکھنے کے لیے مزے مزے کی باتیں کرتا رہا۔
رات کے کسی پہر میں قافلہ روانہ ہوا۔ ابھی دن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ مصر میں داخل ہوا۔ اللہ اکبر! کسے معلوم تھا کہ اس قافلے میں ایک نبی زادہ شامل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پڑپوتا ہے اور غلام کی حیثیت سے فروخت ہونے جا رہا ہے۔
دروازۂ شہر پر کھڑے محافظوں نے ایک ایک اونٹ کا جائزہ لے کر اندر جانے دیا۔ اس اونٹ کو دیکھ کر ٹھٹک گئے جس پر حضرت یوسفؑ، مالک بن زعر کے ساتھ بیٹھے تھے۔
''یہ لڑکا کون ہے؟''
''غلام ہے، فروخت کے لیے لایا ہوں۔''
''یہ تو کہیں سے بھی غلام نہیں لگتا۔ کسی بھدی شکل والے کا بیٹا بھی نہیں لگتا۔'' محافظ نے مالک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''غلام تو ہر طرح کے آتے ہیں۔''
''کتنی قیمت لوگے اس کی؟''
''نیلام گاہ میں آ جانا۔ ابھی تو مجھے بھی نہیں معلوم کتنی قیمت لوں گا۔''
''اگر میں اسے یہیں خرید لوں اور تمہیں نیلام گاہ تک نہ جانے دوں؟''
''فرعون کے دربار میں میری شکایت جائے گی۔ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کو روکنے کا۔''
''میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ایسا ہی کروں لیکن کیا کروں اسے میں بھی غلط سمجھتا ہوں۔ بہر حال اس دروازے سے آج

تک سیکڑوں غلام گزرے ہوں گے لیکن میں نے ایسا غلام اس سے پہلے نہیں دیکھا۔''

مصر پہنچتے ہی قافلے میں شامل تاجر اپنی اپنی اجناس لے کر ادھر اُدھر پھیل گئے۔مالک بن زغر حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر ایک سرائے میں چلا گیا۔

دروازۂ شہر سے لے کر سرائے تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن سرائے میں پہنچتے ہی مالک پر یہ عقدہ کھل گیا کہ پورے شہر میں حسنِ یوسفؑ کے چرچے پھیل چکے ہیں۔

اسے سرائے پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سرائے کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ یہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک نظر دیکھنے کے مشتاق تھے۔ مالک کے تجارتی ذہن نے کمائی کا ایک بہترین ذریعہ ڈھونڈ لیا۔ اس نے بہت معمولی سی ایک رقم مقرر کردی کہ یہ رقم ادا کرو، یوسف کو قریب سے دیکھو اور چلے جاؤ۔

یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔

یہ شہر جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو لایا گیا، مصر کا دارالسلطنت رعمیس تھا۔ جغرافیائی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب تھا۔

شہر کے ایک ایک گھر میں چرچے ہو رہے تھے کہ کنعان کی طرف سے ایک قافلہ آیا ہے۔ اس قافلے میں ایک غلام بھی ہے جو فروخت کے لیے آیا ہے۔ اس کا مالک اس کے چہرے پر نقاب ڈالے رہتا ہے کہ اس کے لاثانی حسن کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ لوگ قیمت ادا کر کے اس کے حسن کا دیدار کرتے ہیں۔ جو اس غلام کو دیکھ آئے تھے، وہ قدرت کی کرشمہ سازیوں کے گن گا رہے تھے۔

ہوتے ہوتے یہ چرچے شاہی خاندانوں تک بھی پہنچے۔ ان گھروں میں ایک گھر مصری افواج کے شاہی افسر ''قوطیفار'' کا بھی تھا۔ یہ شخص فرعونِ مصر کے بعد دوسرا مرتبہ رکھتا تھا اور عزیزِ مصر کہلاتا تھا۔

یہودی روایات کے مطابق عزیزِ مصر کی بیوی کا نام زلیخا جبکہ بعض اسلامی روایات میں راعیل بتایا گیا ہے البتہ قرآن پاک میں صرف ''عزیز کی بیوی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ زلیخا لفظ زلخ یا زلخ اور زلخا سے مشتق ہے جس کے معنی پھسلنا یا دروازے کو بند کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے بعد میں واقعے کی نسبت سے روایات میں زلیخا کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ ہم اسے لقب بھی کہہ سکتے ہیں۔

قوطیفار عزیزِ مصر ایک دن فرعون کے دربار سے اپنے محل میں آیا۔ کنیزوں اور غلاموں کے جھرمٹ سے گزرتا ہوا خواب گاہ میں پہنچا تو زلیخا کو معمول سے زیادہ خوش دیکھا۔

''تم اسی طرح خوش رہو۔ پھر بھی بات کیا ہے، کیوں اتنی خوش ہو؟''

''میں نے سنا ہے ایک کنعانی غلام آکر ٹھہرا ہے۔ اس کی خوبروئی کے چرچے عام ہو رہے ہیں۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کوئی فرشتہ ہے جو زمین پر اتر آیا ہے۔ میں نے سوچا ہے میں بھی اسے دیکھنے جاؤں۔''

''تم عزیزِ مصر کی بیوی ہو۔ ایک معمولی غلام کو دیکھنے جاؤ گی؟''

''یہ مت بھولیے کہ میں بھی ایک حکمران کی بیٹی ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ بندشیں بہت سے مواقع پر ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔''

''میں نے تم پر پابندی نہیں لگائی لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ کے سوچتے سوچتے وقت گزر جائے گا۔ اسے کوئی اور لے کر چلتا بنے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں ابھی دربار سے آرہا ہوں۔ بادشاہ نے اس غلام کے مالک کو پیغام بھجوادیا ہے کہ وہ ایک غلام سے اس طرح دولت کمانا بند کردے اور اس غلام کی باقاعدہ نیلامی کا اعلان کرے۔ شاید کل تک اسے نیلام گاہ میں پہنچا دیا جائے۔''

''یہ تو آپ نے اور بھی بُری خبر سنادی۔ اسے تو نیلام گاہ سے کوئی بھی خرید کر لے جائے گا۔ میں تو اسے دیکھنے سے بھی گئی۔ دیکھتی تو سہی کہ کوئی انسان کتنا خوبصورت ہوسکتا ہے۔''

زلیخا کی شادی کو کئی سال ہوگئے تھے۔ وہ ابھی تک اولاد سے محروم تھی۔ عزیزِ مصر نے اس کی اداسی کو دور کرنے کے لیے کئی مرتبہ چاہا تھا کہ وہ کسی کی اولاد لے کر پال لے لیکن زلیخا کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا۔ زلیخا کا اشتیاق دیکھ کر عزیزِ مصر نے ایک مرتبہ پھر یہ پیشکش کی۔

''اگر اس نوعمر غلام کو ہم خرید لیں اور اسے اپنا بیٹا بنالیں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟''

''یہ فیصلہ تو اسے دیکھنے کے بعد ہی کرسکوں گی۔ اگر وہ واقعی اتنا خوبصورت ہے جتنا کہا جارہا ہے تو مجھے آپ اپنا ہم خیال سمجھیے گا۔''

''پھر کل تک انتظار کرو۔''

''نیلامی کی کیا ضرورت ہے۔ اسے براہِ راست کیوں نہیں خرید لیتے؟''

''مصر میں بہت سے لوگ اس کی خریداری کے مشتاق ہیں۔ اگر میں نے خرید لیا تو مخالفتوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

''پھر آپ بولی دینے میں پیچھے نہ رہیے گا۔''

''سنا ہے فارعہ نام کی ایک رئیس زادی خچروں پر دولت لاد کر لائی ہے۔ سرائے کے سامنے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ نیلامی کا اعلان سنتے ہی نیلام گاہ پہنچ جائے گی۔''

''آپ کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا تمام زیور لے کر نیلام گاہ میں جائیے گا۔''

مالک بن زغر نے نیلامی کا اعلان کر دیا۔ تمام خریداروں کے لیے اذنِ عام تھا۔ جس کی بولی زیادہ ہوگی یوسفؑ اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

مصر میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی غلام کے لیے نیلامی ہو رہی تھی۔

مقررہ دن جب نیلامی کا میدان سجا تو مالک نے ایک بڑا قالین بچھا کر ایک کرسی ڈال دی جس پر یوسف علیہ السلام کو بٹھا دیا گیا۔ جو صرف اس وقت اٹھائی جاتی تھی جب نیلامی کا آغاز ہو۔

میدان میں ہجوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔ کہتے ہیں اس ہجوم میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی جو اپنے ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کا ایک لچھا لے کر آئی تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اس کے بدلے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا جاسکتا ہے۔

نیلامی کا آغاز ہونے ہی والا تھا کہ شاہی فرمان آ گیا۔ ''جب تک عزیز مصر نیلام گاہ میں نہ پہنچ جائیں، نیلامی شروع نہ کی جائے۔''

ہجوم شور مچا رہا تھا کہ نیلامی شروع کی جائے لیکن جیسے ہی یہ اعلان ہوا لوگوں کے چہروں کی رونق ماند پڑ گئی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ یوسفؑ کو نہیں خرید سکیں گے۔ بہت سے لوگ اس آرزو میں کھڑے رہے کہ یوسفؑ کے چہرے سے نقاب ہٹے اور وہ ان کا دیدار کرسکیں۔

زلیخا کا اشتیاق دیدنی تھا جبکہ عزیز مصر نہایت اطمینان سے تیار ہو رہا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

''آپ نے شاید یہ طے کر لیا ہے کہ اس غلام کو کوئی اور خرید لے۔''

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔''

''آپ کو تو جلد سے جلد نیلام گاہ میں پہنچنا چاہیے۔ کوئی آپ کے انتظار میں بیٹھا رہے گا؟''

''ہاں، انہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں شاہی فرمان بھجوا چکا ہوں۔ میرے پہنچے بغیر نیلامی کا آغاز نہیں ہوگا۔''

''اس کے باوجود آپ کو جلدی کرنی چاہیے۔ آپ کہہ رہے تھے بادشاہ بھی اس غلام کا مشتاق ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ گیا؟''

''پھر مجبوری ہوگی۔ مجھے پیچھے ہٹنا پڑے گا لیکن مجھے یقین ہے میں اسے اپنے لیے مانگوں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔''

''یہ وقت ہی کیوں آئے۔ آپ کو پہلے پہنچنا چاہیے۔''

''بس میں تیار ہو گیا۔''

فارعہ کے خچر دولت سے لدے تیار کھڑے تھے اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نقاب اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ عزیز مصر کے پہنچنے سے قبل نقاب اٹھنا محال تھا۔

منادی نے آواز لگائی۔

''کوئی ہے جو اس بڑے حسب نسب والے غلام کو خریدے اور کون ہے جو اس عقل مند غلام کو خریدے۔''

منادی کی آواز اس بات کی علامت تھی کہ عزیز مصر نیلام گاہ میں آ چکا ہے۔ مالک بن زغر نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے مالک سے کہا تم میری بولی یہ کہہ کر لگاؤ۔ ''ہے کوئی جو اس غریب الوطن مسافر کو

خریدے۔‘‘

مالک نے یہی کہہ کر آواز لگائی اور بولیاں لگنی شروع ہو گئیں۔

نقاب اٹھتے ہی رئیس زادی فارعہ کی نظر حضرت یوسف علیہ السلام پر پڑی تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ یہ خیال ہی دل سے نکل گیا کہ وہ یوسفؑ کو خریدنے آئی تھی۔ وہ تو خود ان کے ہاتھوں بک چکی تھی۔ لوگ بڑھ چڑھ کر بولیاں لگا رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ دولت سے لدے اس کے خچر اپنی مالکن کے اشارے کے منتظر کھڑے رہے۔

بولیاں لگتی رہیں اور بالآخر عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

فارعہ کو ہوش تو اس وقت آیا جب حضرت یوسف علیہ السلام کا سودا ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کو جہاں پہنچانا چاہتا تھا پہنچا دیا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ وہ فروخت ہو چکے تو بے اختیار باپ کی یاد آئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کسی پکارنے والے نے پکارا۔ اس آواز کو صرف حضرت یوسف علیہ السلام سن سکے۔

’’اے یوسفؑ! دل چھوٹا مت کر۔ تیرے خدا نے تیرے لیے بہتر انتظام کر رکھا ہے۔ یہ مخلوق جو آج تجھ کو خریدنے کے لیے جمع ہو گئی ہے اور تجھے غلام بنانا چاہتی ہے، میں عنقریب ان سب کو تیری غلامی میں دے دوں گا اور یہ سب تجھ کو جھک جھک کر سلام کریں گے۔‘‘

عزیز مصر نے بھاری قیمت دے کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا اظہار کر دیا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ صرف بیس درہم میں بکوا دیا، دوسری مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے وزن کے برابر مشک، ریشم اور چاندی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ وزن کرا کر خریدا گیا۔

عزیز مصر نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی سواری پر سوار کر کے گھر کی طرف چلا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی غلام کو نہیں کسی صاحبِ عزت کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اس کے دل میں خدا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ڈال دی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے حضرت یوسف علیہ السلام اس کی آنکھوں کا تارا اور دل کے مالک بن چکے تھے۔

اس زمانے میں مصری خود کو دنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی وصحرائی قبائل کو نہایت حقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں ان کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے۔ انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ نسلِ ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا۔ یہاں مدنیت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ شکار پر ان کے رزق کا مدار تھا۔ بکریوں کے گلّے ان کا دھن دولت تھے۔ ایسے ماحول میں یہ قدرت ہی کی معجز نمائی تھی کہ کوئی عام مصری نہیں، وزیر سلطنت عزیز مصر انہیں اکرام واحتشام کے ساتھ اس نیت سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے کہ وہ انہیں اپنا بیٹا بنائے گا۔ یوسفؑ کے پروردگار کا یہی ان سے وعدہ تھا۔

عزیز مصر گھر پہنچا تو زلیخا سر سے پاؤں تک آراستہ سراپا انتظار بنی بیٹھی تھی۔ اسے یہ خبر مل چکی تھی کہ اس کے شوہر نے وہ غلام خرید لیا ہے۔ غرور سے اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ جسے کوئی نہیں خرید سکا اسے میرے میاں نے خرید لیا لیکن جونہی عزیز مصر، حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر اس کے سامنے پہنچا اس کی تنی ہوئی گردن جھک گئی۔ اپنا سنگھار خاک دھول نظر آنے لگا۔ چاند تھا کہ زمین پر اتر آیا تھا۔ روشنی تھی جس نے جسم کا روپ دھار لیا تھا۔ اس بدوی (حضرت یوسف علیہ السلام) کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن سب کچھ تھا۔ زلیخا کے پاس سب کچھ تھا مگر کچھ نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ غرور کہ اس نے اس غلام کی قیمت ادا کی ہے۔ اس کے نفس نے اسے دھوکا دیا کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔

زلیخا کا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچا۔ اس احساس نے دل میں شور مچا دیا کہ یہ غلام بنانے کے لائق نہیں۔ میرا میاں اسے غلام بنا کر لایا ہے، غلام بنا کر رکھے گا۔ یہ ایسا نہیں ہے کہ اسے بارِ صعوبت سے آشنا کیا جائے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیز مصر کی قلبِ ماہیت پہلے ہی ہو چکی ہے۔

’’اس کو عزت سے رکھو۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنا لیں۔‘‘ یہ سننا تھا کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

ابن اسحٰق ابو عبیدہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ فراست وذہانت والے اشخاص دو موقعوں پر دو شخص گزرے ہیں۔ ایک عزیز جب اس نے بیوی کو کہا کہ اس یوسف کا رہن سہن اچھا رکھو، شاید

یہ ہمیں نفع دے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں اور وہ لڑکی جس نے اپنے باپ پیغمبر حضرت شعیب سے عرض کی' اے ابا جان اس (موسیٰ) کو کام پر رکھ لیجیے کیونکہ جن کو آپ کام پر رکھیں گے یہ ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور امانت دار ہے۔

قرآن کہتا ہے۔ ''اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا۔ اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔''

عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت و ثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمے داریاں ان کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنا دیا۔

زلیخا اس صورتِ حال سے بہت خوش تھی۔ وہ خود یہ چاہتی تھی کہ یوسف اس گھر میں غلام کی طرح نہ رہے۔

یہ گھر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ عزیز مصر ان کی دیانت داری سے بہت خوش تھا لیکن ابھی آزمائش کی ایک گھڑی اور تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی جوانی کا عالم تھا۔ حسن و خوبروئی کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا کہ جو آپ کے جسمِ اطہر میں مجسم نہ ہو گیا ہو۔ زلیخا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا مقام و مرتبہ بھول گئی۔ اس کی آنکھیں رخِ روشن کا تعاقب کرنے لگیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام فہیم و ذکی تھے۔ زلیخا کی آنکھوں کا مطلب خوب سمجھ رہے تھے۔ جب سے آپ پر جوانی آئی تھی، زلیخا کی نیت کا فتور صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ مالکن تھی۔ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ گھر چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ بس یہ کوشش کرتے رہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھنے پائے جس سے زلیخا کی حوصلہ افزائی ہو۔ کوشش کرتے تھے کہ زلیخا سے آمنا سامنا نہ ہو لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔

زلیخا کی حالتِ بد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ان پر پروانہ وار نثار ہونے لگی۔ بہانے بہانے سے انہیں اپنے پاس بلاتی۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خانوادۂ نبوت کا چشم و چراغ اور منصبِ نبوت کے لیے منتخب بھلا کیسے اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ فحاشی میں مبتلا کیسے ہو سکتا تھا۔

وہ ان پر ڈورے ڈالتی رہی۔ انہیں ورغلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ان کے پائے استقامت میں جنبش نہ آسکی۔ کئی مرتبہ انہوں نے سوچا کہ زلیخا کی شکایت عزیز مصر سے کریں لیکن اپنی حیثیت دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ عزیز مصر بھلا ان کی بات پر کیسے یقین کرے گا۔

ان کی خاموشی نے زلیخا کے حوصلے بڑھا دیے۔ دل میں چاہت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ اس کی انا کا مسئلہ بن گیا کہ ایک معمولی غلام اس کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ ضد میں آ گئی۔ حیا اور فطرتِ نسوانی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تہیہ کر لیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زبردستی سے پیش آئے گی۔

ایک روز جب عزیز مصر باہر گیا ہوا تھا، زلیخا نے کنیزوں، لونڈیوں کو دور کر دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ زلیخا کے بستر کے سرہانے جو بت رکھا ہے، اس پر زلیخا نے کپڑا ڈال دیا ہے۔ وہ اتنی بے قابو ہو گئی تھی کہ اپنی زبان سے دعوتِ گناہ دینے لگی۔ یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا۔ شاہی خاندان کی عورت اور وہ بھی محبوب نہیں بلکہ عاشق، سولہ سنگھار، بے حجاب ادائیں، دروازے بند راز کھل جائے تو مالکہ خود ذمے دار۔ اسے خوش کر کے ترقی کے اور زیادہ مواقع۔ تمام دنیاوی دولت قدموں میں آسکتی تھی۔ تمام حالات سازگار تھے لیکن اس پیکرِ عصمت نے بہکنے کے بجائے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پناہ بخدا...... میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت ''اللہ'' ہے اور وہ تمام کائنات کا مالک ہے اور کیا میں اپنے اس مربی ''عزیز مصر'' کی امانت میں خیانت کروں جس نے مجھے غلام نہ رہنے دیا مجھے عزت عطا کی۔''

''تم کس عزیز مصر کی بات کر رہے ہو۔ وہ جو بدصورت بھی ہے اور عمر میں مجھ سے بڑا بھی۔ تم جوان ہو اور خوبصورت بھی...... آجاؤ، مجھے شاد کام کرو۔ میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔''

''تم کس کی بیوی ہو۔ اگر میں ایسا کروں تو ظالم کہلاؤں گا۔ ظالموں کا انجام جہنم ہے۔''

''یہاں کوئی دیکھنے والا ہے؟ یہ دیکھو میں نے شامی دیوتا کی آنکھیں ڈھانپ دی ہیں۔''

''میں اپنے خدا کی آنکھیں نہیں ڈھانپ سکتا۔ وہ ہر جگہ ہے ہر وقت دیکھتا ہے۔''

"مجھے تمہاری ان باتوں سے سروکار نہیں۔ مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے کہ عزیز مصر آئے تو مجھے شادکام کر۔"

"اور پھسلایا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے' اس کے نفس کے معاملے میں اور دروازے بند کر دیے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ۔ یوسف نے کہا پناہ بخدا بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت بخشی۔ بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے۔ اس طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو۔ بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔" (سورۃ یوسف)

"برہان رب" سے مراد وہی نصیحت ہے جو حضرت یوسفؑ نے زلیخا کو کی تھی یا اس کی برائی کے سوال کا جواب دیا تھا یعنی میں عزیز مصر کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔

بعض مفسرین نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نظر آئے تھے جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام رک گئے۔ بعض نے کہا فرشتہ ظاہر ہوا تھا۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے بت پر پردہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو عبرت حاصل ہوئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دو چیزوں نے روکا۔ ایک اللہ کا تصور، دوسرے عزیز مصر کے احسان کی احسان شناسی۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ یہ عورت ماننے والی نہیں تو آپ دروازے کی طرف دوڑے تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائیں۔ زلیخا انہیں پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگی اور پیچھے سے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نہ رکے اور کرتے کا دامن زلیخا کے ہاتھ میں رہ گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازہ کھولا تو عزیز مصر کو باہر کھڑے دیکھا۔ دراصل عزیز مصر اسی وقت پہنچا تھا۔ دروازے پر دستک دینے والا تھا کہ دروازہ کھل گیا لیکن اس عالم میں کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی کمرے میں تھے اور زلیخا بھی۔

"یوسف اور وہ (زلیخا) آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا کرتہ (کھینچ کر) پھاڑ دیا دروازے پر دونوں نے عزیز مصر کو موجود پایا۔"

مفسرین کے مطابق زلیخا کا چچازاد بھائی بھی دروازے پر موجود تھا۔ عزیز مصر ساری صورتِ حال کو بھانپ گیا تھا کہ اندر کیا ہو رہا تھا اور دروازہ کیوں بند کیا گیا تھا۔

زلیخا کو اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا کہ اب بات کھل گئی ہے۔ الزام اسی پر آئے گا۔ اب وہ خود کو بچاتی یا یوسفؑ کو اس نے ایک پاک شخص پر تہمت دھر دی۔ آگے بڑھی اور رونی صورت بنا کر اپنے شوہر کے سامنے فریاد کناں ہوئی۔

"ایسے شخص کی سزا قید خانے کی ہوا یا دردناک عذاب کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ بُرا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ یوسف ہی ہے جس نے مجھ پر بُری نظر ڈالی۔ مجھے ناپاک کرنا ہی چاہتا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس وقت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ورنہ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کی۔ "یہ اس کا بہتان ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادہ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا کہ سامنے آپ آ گئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا تاکہ میں آپ کی سزا کا مستحق بنوں۔ اگر یہ سچی ہے تو سچی بات کیوں نہیں کہتی۔"

زلیخا کا چچازاد بھائی ان حالات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ جس وقت دروازہ کھلا یوسفؑ آگے تھے یعنی دروازہ انہوں نے کھولا۔ زلیخا پیچھے تھی اور اس کے ہاتھ میں یوسفؑ کے دامن کا کپڑا بھی تھا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کپڑا کیسا ہے؟"

"یہ یوسف کے دامن کا کپڑا ہے جو بھاگتے میں میرے ہاتھ میں آ گیا۔"

"یہ کپڑا سامنے کی طرف سے پھٹا ہے یا پیچھے کی طرف سے۔ اگر پیچھے کی طرف سے پھٹا ہے تو یوسف سچا ہے زلیخا جھوٹی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ دامن تو کہیں سے بھی پھٹ سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف نے تمہارے ساتھ زبردستی کرنا چاہی اور اس دوران دامن پھٹ گیا؟"

"بالکل یہی بات ہے۔"

اگر یہی بات ہے تو تم نے اپنا بچاؤ تو کیا ہوگا؟"

''میں نے اپنا بچاؤ کیا تھا۔ اسی لیے تو یوسف کا ارادہ پورا نہیں ہوا۔''
''اگر بچاؤ کیا تھا تو تمہارا نہ تو کپڑا کہیں سے پھٹا اور نہ کوئی خراش آئی اور نہ شاید کمرے کی کوئی چیز ادھر سے ادھر ہوئی جبکہ یوسف مرد تھا۔ تم سے زیادہ طاقتور تھا۔ تمہارے سارے کپڑے پھاڑ سکتا تھا۔''
''تم میرے بھائی ہوتے ہوئے یوسف کی طرفداری کر رہے ہو۔''
''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں طرفداری کر رہا ہوں۔''
''یہ طرفداری نہیں تو اور کیا ہے۔ جب میں کہہ رہی ہوں تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔ ان معاملوں میں عورت ہی کی بات مانی جاتی ہے۔ ظالم مرد ہی ہوتا ہے۔''
اب یہ سب دروازے سے ہٹ کر کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ تمام چیزیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں البتہ بستر کے سرہانے رکھے بت پر ایک بڑی چادر پڑی ہوئی تھی۔ زلیخا کے بھائی نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔
''اس بت پر یہ چادر کس نے ڈالی ہے۔''
''مجھے کیا خبر۔ یہ حرکت بھی اسی ظالم کی ہوگی۔ یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ دیوتا کو میری حالت کی خبر ہو۔'' اب زلیخا گھبرا گئی تھی۔
''یوسف تو مصری مذہب کا قائل ہی نہیں، اسے اس بت سے کیا لینا دینا۔'' پھر وہ شخص حضرت یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔ ''کیا یہ تم نے کیا تھا؟''
''جی نہیں۔ مجھے جب انہوں نے کمرے میں بلایا تو اس بت پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھو میں نے بت کی آنکھیں ڈھانپ دی ہیں۔ اب ہمیں کوئی دیکھنے والا نہیں۔ انہیں یاد ہوگا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اپنے اللہ کی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پھر میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں جو تم مجھ سے چاہتی ہو۔''
''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' زلیخا نے کہا۔ ''بت پر کپڑا تو میں نے اس لیے ڈال دیا تھا کہ کہیں یہ اسے نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔''
''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ کپڑا تم نے نہیں اس نے ڈالا ہے۔ تمہاری تضاد بیانی تو کچھ اور کہہ رہی ہے زلیخا۔''
''وہ میں بھول گئی تھی۔ اب ذکر نکلا تو مجھے یاد آیا۔ میں بھلا بت پر کپڑا کیوں ڈالنے لگی تھی۔''
عزیز مصر اس بحث سے تنگ آ گیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ بات زیادہ پھیلے۔ اس نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو سمجھایا۔
''یوسفؑ سچے تم ہی ہو اور اس عورت کے معاملے سے درگزر رو۔ اگر بات یہاں سے نکلی یا تم نے باہر جا کر کسی سے کہا تو میری شہرت پر دھبا لگ جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے میں اپنے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔''
''مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔ میں یہ بات کبھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ یہ میری مالکن ہیں۔ شیطان نے انہیں بہکا دیا تھا۔ انہیں خود احساس ہو جائے گا کہ یہ غلطی پر تھیں۔ میں نے تو اپنے ظالم بھائیوں کو معاف کر دیا ان کی تو مہربانیاں میرے ساتھ رہی ہیں۔ میں انہیں معاف کرتا ہوں۔''
اس کے بعد وہ زلیخا سے مخاطب ہوا۔
''جو کچھ تم سے ہو گیا اس کے لیے معافی کی خواستگار ہو اور آئندہ کے لیے توبہ کر لو۔''
قرآن پاک نے ان تمام تفصیلات کو نہایت اختصار سے بیان کر دیا ہے۔
''کہنے لگی اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ یوسف (علیہ السلام) نے کہا، اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارے میں پھسلایا تھا اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے اگر پیراہن یوسف..... سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے۔ قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھی کہا بے شک! اے عورت یہ تیرے مکروفریب سے ہے۔ بلاشبہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے یوسف تو اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ تو بلاشبہ خطاکار ہے۔''
معاملہ یہاں رفع دفع ہو گیا تھا لیکن گھر کے ملازموں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ ان کے ذریعے سے یہ بات باہر نکلی اور شاہی خاندان کی عورتوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔
''عزیز مصر کی بیوی کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ اپنے غلام پر فریفتہ ہو گئی۔ اتنے بڑے مرتبے کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ۔''
ایک دن زلیخا کے خاندان کی دو عورتیں اس سے ملنے آئیں اور کرید کرید کر حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں

معلوم کرنے لگیں۔

زلیخا کے کانوں تک باتیں پہنچ رہی تھیں کہ عورتوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں لیکن جب ان عورتوں نے براہِ راست حضرت یوسف علیہ السلام کا نام لے دیا تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔

وہ عورتیں پوچھ رہی تھیں۔ ”تمہارا غلام کیا واقعی خوبصورت ہے؟“

”کیا تمہیں نہیں معلوم۔ اس کی خوبصورتی کا چرچا تو پورے مصر میں ہوا تھا جب وہ فروخت ہو رہا تھا۔“

”کیا وہ اتنا خوبصورت ہے کہ تم اپنا مرتبہ بھول گئیں؟“

”اگر تم بھی دیکھ لو تو تمہارا ابھی وہی حال ہو جائے جو میرا ہوا۔“

”یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی کتنا بھی خوبصورت ہو، ہمیں اپنی ناموس کا خیال ہے۔“

”تم کیا سمجھتی ہو ناموس کا خیال مجھے نہیں؟“

”سننے میں تو یہی آیا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اتنا ہوا کہ میں اس کے حسن کو دیکھ کر بے خود ہو گئی۔“

”یہ سب بہانے ہیں۔ کوئی ایسا حسین نہیں ہوتا اور کوئی ایسے بے خود نہیں ہو جاتا۔“

دراصل ان عورتوں کو خود یہ شوق ہو گیا تھا کہ وہ حضرت یوسف کا دیدار کر لیں۔ ایک جذبہ شوق ان کے دلوں میں بھی جاگ چکا تھا اور اب وہ زلیخا کو آمادہ کر رہی تھیں کہ وہ حضرت یوسفؑ کو ان کے سامنے لے آئے اور بالآخر وہ اس پر کامیاب ہو گئیں۔

”اگر تم دیکھنا ہی چاہتی ہو کہ وہ کتنا خوبصورت ہے اور اسے دیکھ کر تمہارا کیا حال ہوتا ہے تو کسی روز آ جاؤ، میں اسے تمہارے سامنے لے آؤں گی۔ تم مجھے طعنے دینا چھوڑ دو گی۔“

ان عورتوں نے دوسری عورتوں کو بتایا۔ ان میں عمائدین کی بیویاں بھی شامل تھیں۔

زلیخا نے ان عورتوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہ دستر خوان پر بیٹھیں تو زلیخا نے ان عورتوں کے ہاتھوں میں ایک ایک چھری اور لیموں دے دیے کہ جب یوسف سامنے آئے تو تم اس لیموں کو کاٹنا۔

زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام حکم کی تعمیل میں باہر آئے۔ سب عورتیں جمالِ یوسفؑ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ بے اختیار پکار اٹھیں۔ یہ آدمی نہیں نور کا پتلا ہے۔ کوئی کہنے لگی فرشتہ ہے انسان نہیں۔

وہ یہ باتیں کرنے میں ایسی محو ہوئیں کہ انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ وہ لیموں پر چھری پھیر رہی ہیں یا اپنی انگلیاں تراش رہی ہیں۔ حسنِ یوسفؑ پر نظریں ایسی جمیں کہ اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں۔ یہ زلیخا کی زبردست فتح تھی۔ جتنے طعنے اسے ملے تھے سب کا جواب تھا۔ جو حالت اس کی تھی، اسی میں سب مبتلا تھیں۔

”تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ اب بتاؤ میرے یوسف کو دیکھ کر تمہارا کیا حال ہوا؟ اب بتاؤ کہ میرا اس سے عشق بے جا تھا؟“

”اور جب (اس معاملے کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اُسے رجھا لے۔ وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بد چلنی میں پڑ گئی۔ پس جب عزیز کی بیوی نے ان عورتوں کے مکر کو سنا تو ان کو بلا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی۔ پھر یوسف سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب عورتوں نے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور پکار اٹھیں یہ تو انسان نہیں ہے، ضرور ایک فرشتہ ہے، بڑے مرتبے والا فرشتہ۔ (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا یہ ہے وہ آدمی جس کے بارے میں مجھے تم طعنے دیتی تھیں۔“ (سورۃ یوسف)

جب زلیخا نے دیکھا کہ ان عورتوں کی انگلیوں سے خون جاری ہے اور وہ حسنِ یوسف میں محو ہیں۔ گویا قائل ہو چکی ہیں کہ میرا اس سے عشق بے جا نہیں تھا تو بے پروا ہو کر کہنے لگی۔

”میں نے اس کا دل قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا مگر میں یہ کہہ دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہنا نہ مانا تو میں اسے قید میں ضرور ڈالوں گی۔“

وہ دوسرے لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو دھمکا رہی تھی کہ قید کی سختیوں سے ڈر کر وہ اس کا کہنا مان لیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ان عورتوں کا تریا چرتر تھا۔ وہ انہیں اپنی جانب مائل کرنے کے لیے

یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش وحواس جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کرلیا۔ وہ انہیں بھی اتنا ہی قصوروار سمجھ رہے تھے جتنا زلیخا کو۔ انہیں تو ان عورتوں کی طرف سے بھی خطرہ ہوگیا تھا۔

وہ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے جوان کے گرد منڈلانے لگا تھا، اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہوئے۔

''خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بلا رہی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے قید میں رہنا زیادہ پسند ہے۔ اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل ہوجاؤں اور نادانوں میں بن جاؤں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ زلیخا یہ دھمکی دے چکی تھی کہ انہیں داخلِ زندان کرا کے دم لے گی۔ اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر اس دھمکی کا کیا اثر ہوا ہے۔ اس نے موقع دیکھ کر انہیں اپنے پاس بلایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے لیکن محتاط بھی ہوگئے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اس کے حضور پہنچے لیکن دروازے سے لگ کر کھڑے ہوگئے کہ کہیں زلیخا پہلے کی طرح پھر دروازہ بند نہ کرلے۔

''آؤ یوسف! مجھ سے شرما کیوں رہے ہو۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

''میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کے پاس بیٹھنے کی جسارت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ کو جو کہنا ہے کہیے۔''

''میں نے تو تمہیں کبھی غلام نہیں سمجھا۔''

''یہ آپ کی بڑائی ہے لیکن میں ہوں تو غلام۔ آپ کے شوہر نے مجھے قیمت دے کر خریدا ہے۔''

''اگر میرا کہنا مان لو تو جتنے میں خریدے گئے ہو، اس سے زیادہ کے مالک بن سکتے ہو۔ تم نے دیکھ لیا کہ جو عورتیں مجھے مطعون کرتی تھیں، وہ بھی میری ہم خیال ہوچکی ہیں۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ مجھے شاد کام کرو اور انکار کرکے میرے غضب کا نشانہ مت بنو۔ میں تو تمہیں خاصا عقل مند سمجھتی تھی۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ میری پیشکش کو ٹھکرا رہے ہو۔''

''میرا جواب اب بھی وہی ہوگا جو میں پہلے دے چکا۔''

''یعنی انکار؟'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ غصے سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ''میں کہہ چکی ہوں، میں تمہیں حوالۂ زنداں کردوں گی۔ اس گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو۔''

''جس کام کے لیے تم مجھے بلا رہی ہو اس کے مقابلے میں مجھے قید پسند ہوگی۔''

''تم نے زنداں کا نام سنا ہے، دیکھا نہیں ہے۔ جس حسن پر ناز کررہے ہو، وہ کملائے ہوئے پھول کی طرح نظر آنے لگے گا۔''

''مجھے ان دھمکیوں سے سروکار نہیں۔ میں ہرگز آپ کی بات نہیں مانوں گا۔''

''تمہیں اگر یہ زعم ہے کہ عزیز تمہاری حمایت کرے گا جیسے کہ وہ پہلے کرچکا ہے تو اس گھمنڈ میں مت رہنا۔ وہ میرے حکم سے باہر نہیں ہے۔''

''مجھے کسی سے امید نہیں۔ میرا اللہ میرے حق میں جو بہتر سمجھے گا، وہ کرے گا۔''

''میں ایک دن کا وقت تمہیں اور دیتی ہوں۔ اس کے بعد مجھے جو کرنا ہوگا، وہ کر گزروں گی۔''

''ایک دن بعد بھی میرا جواب یہی ہوگا۔''

زلیخا نے ایک کے بجائے دو دن انتظار کیا۔ اس دوران وہ اپنے شوہر کو خلافِ معمول خوش کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے یوسف علیہ السلام کو بلا بھیجا اور ان کے سامنے وہی سوال دہرایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ زلیخا نے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے جیل کا نقشہ کھینچا۔ گفتگو کے دوران اس کا طیش انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

وہ ان کی طرف سے مایوس ہوچکی تھی۔ اب اس کے مقام اور مرتبے کا تقاضا تھا کہ وہ ان کو سزا دے۔ اسے یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ شاید زنداں کی صعوبتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو جھکا دیں۔ ابھی تو تمام عیش و آرام انہیں حاصل ہے اس لیے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔

معراج کی حدیث میں آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... میں یوسف پر سے گزرا تو دیکھا ان کو نصف حسن عطا کیا گیا ہے۔ علامہ سہیلی وغیرہ اس کے معنی بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم کو جو حسن ملا تھا، اس کا نصف حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا روئے اقدس بجلی کی طرح چمکتا تھا اور جب کوئی عورت ان کے پاس آتی تو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتے اور اکثر اوقات اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر رکھتے۔ اسی وجہ سے جب حضرت یوسف علیہ السلام زلیخا کی مدعو عورتوں کے پاس سے گزرے تو عورتوں نے بھی زلیخا کو ان کی محبت میں معذور سمجھ لیا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا کیسا اثر ہوا تھا اور زلیخا نے بڑے ناز سے کہا تھا۔

''یہ ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔''

زلیخا کی انا اور خود پرستی نے اسے اکسایا کہ غلام ہوتے ہوئے جس آدمی نے اس کا حکم نہ مانا، وہ اسے سزا دلوائے۔ اس نے عزیز مصر کو بھڑکایا۔

''جس نے آپ کی بیوی کی عفت کو داغدار کرنے کی کوشش کی اسے آپ نے اتنی آسانی سے معاف کر دیا۔ اسے تو قید میں ہونا چاہیے۔ سب اسے پاک دامن سمجھ رہے ہیں اور مجھے لعن طعن کر رہے ہیں۔ رسوائی تو میری ہو رہی ہے۔ اگر اسے سزا ملے تو کم از کم لوگ یہ تو کہیں گے کہ یوسف غلطی پر تھا اس لیے موجب سزا ہوا۔''

عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت کی تمام نشانیوں کو دیکھ چکا تھا، اس کے باوجود زلیخا کی یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ یوسف کو سزا دلوا کر زلیخا کو رسوائی سے بچا سکتا ہے۔ زلیخا کی رسوائی خود اس کی رسوائی تھی۔ یوسف کو اگر ایک مدت کے لیے زنداں میں بند کر دیا جائے تو یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا اور یہ چرچے بند ہو جائیں گے۔

عزیز مصر کے لیے کیا مشکل تھا۔ کوئی مقدمہ چلائے بغیر حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان میں ڈال دیا۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے ''موضح القرآن'' میں تحریر فرمایا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دعا کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلے میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عورتوں کے مکر سے بچا لیا مگر قید ان کی قسمت میں مقدر کر دی۔

حضرت شاہ صاحب کی اس بات کو قوی کرنے کے لیے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دعا مانگا کرتا تھا۔ ''اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں''۔ نبی اکرمؐ نے سنا تو فرمایا۔ ''بلا و مصیبت کیوں مانگتا ہے۔ اس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔''

حضرت شاہ عبدالقادر کی محققانہ خدمات اپنی جگہ لیکن اس مصیبت کے موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام یہی کہہ سکتے تھے کہ میں ان عورتوں کی بے حیائی کے مقابلے میں زنداں کو پسند کرتا ہوں۔

عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسفؑ کو رام کیا جا سکے پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے بھی اپنے داؤ گھات استعمال کیے مگر پھر بھی ناکامی رہی۔ آخری درجہ اس آزمائش کا یہ تھا کہ زلیخا نے دھمکی دی، یا تو مجھے شادکام کرو ورنہ قید خانے میں ڈالا جائے گا۔ اس روشنی میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں قید کی طلب نہیں بلکہ استقامت اور عزیمت کا مظاہرہ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ یہ دھمکی میرے ارادۂ حق اور خدا رسی کو باطل نہیں کر سکتا۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھیج دیا گیا۔ ایک بے خطا کو مجرم بنا دیا گیا صرف اس لیے کہ زلیخا کا جرم چھپ جائے اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جائے کہ یوسف نے ہی زلیخا کو بہکانا چاہا تھا جس کی وجہ سے وہ قید کر دیا گیا۔

گناہوں کی جگہ سے دور چلے جانا یہ بھی عصمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قید کو مقدر بنا کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس برائی سے بچا لیا۔

یہ عجیب افتاد تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام زنداں میں تھے لیکن اپنے رب کو یاد کرتے تھے اور اس کی رضا پر خوش تھے۔ دعوت و تبلیغ کی بھی امید تھی کیونکہ وہاں اور قیدی بھی تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادے تھے۔ اسلام کی تبلیغ ان کے خون میں تھی پھر خدا نے ان کو بھی نبوت کے لیے چن لیا تھا۔

''جب وہ سنِ رشد کو پہنچا تو ہم نے اس کو فیصلے کی قوت اور علم عطا کیے۔''

صاحب قصص الانبیا نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

''اور جب وہ (یوسف) اپنی عمر کی پختگی (یعنی بلوغت) کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو نبوت اور دانائی عطا کی۔''

دین حق کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جیل میں موجود قیدی جب ان کے حسنِ ظاہری اور حسنِ سیرت سے متاثر ہوئے تو ان کے پاس پرندوں کی طرح آ کر بیٹھنے لگے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے باقاعدہ تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ ان کا پیغام وہی تھا جو حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا تھا۔

جب قیدی آپ کے پاس آ کر بیٹھتے تو آپ انہیں پیغامِ حق دیتے۔

''ہمیں لائق نہیں کہ ہم کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں۔ خدا کا ہم لوگوں پر بھی اور دوسروں پر بھی فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا بتاؤ تو سہی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا و غالب۔ جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ سن لو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ اس نے فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔''

''میں نے ان لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوب علیہ السلام کی پیروی کی ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔''

''میرے رفیقو! اللہ ایک ہے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اس کا ماننا ہی اصل ایمان ہے۔ تم بتوں کی پرستش چھوڑ دو کہ یہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے جو سخت گناہ ہے۔ اللہ ہی ہر چیز کا مالک ہے، اسی کی پرستش کرو۔ اسی سے مدد مانگو، اسی کا سہارا ڈھونڈو۔''

یہی ان کا پیغام تھا جو وہ مختلف پیرایوں میں قیدیوں کے سامنے دہرا رہے تھے۔

مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند تر ''آمن راع'' تھا یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پا چکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کا لقب ''فاراع'' اسی لیے ہوا کہ وہ ''راع'' یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ پھر یہی فاراع عربی میں جا کر فرعون ہو گیا۔

قیدیوں نے فرعون کے بارے میں بھی سوال کیا کہ جب ہمارا بادشاہ سورج دیوتا کا مظہر ہے تو پھر ہم سورج دیوتا کے ساتھ ساتھ فرعون کی پرستش کیوں نہ کریں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بے خوفی سے بادشاہ کے بارے میں بھی زبان کھولی۔

''کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کی ذات میں خود کو شریک کرے اور نہ کوئی اس کا مظہر ہو سکتا ہے۔ اللہ کی صفات ہی اس کا مظہر ہیں۔ تمہارے بادشاہوں نے اپنی شاہی کو برقرار رکھنے کے لیے الوہیت آمیز شاہی کا تصور دے دیا اور خود کو خدا کا مظہر ورنہ وہ بھی اسی طرح خدا کے بندے ہیں جس طرح میں اور تم۔ وہ سخت گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ تم لوگ اگر مجبور بھی ہو تو بھی دل سے یہ مت سمجھو کہ وہ خدا ہیں۔''

یہ باتیں نہایت تلخ تھیں لیکن وہ اس نرمی سے بیان کر رہے تھے کہ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ان کی نرم گفتاری اور علمیت کے چرچے ہونے لگے۔

آپ کی علمیت کے چرچے جب قید خانے کے داروغہ تک پہنچے تو وہ بھی آپ سے ملنے کا مشتاق ہوا اور آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھنے لگا اور چند ہی روز میں آپ کا گرویدہ ہو گیا۔

یہ سب اللہ کی طرف سے تھا جو ان کے ساتھ ہوتا جا رہا تھا۔ اللہ راہیں نکال رہا تھا۔

توریت کے الفاظ یہ ہیں۔

''قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے اسی کے حکم سے کرتے تھے اور داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے، بے فکر تھا اس لیے کہ خداوند اس کے ساتھ تھا اور جو کچھ وہ کرتا، خداوند اس میں اقبال مندی بخشتا۔''

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

حقدار

آصفہ ضیا احمد

ہر معاشرہ اپنے رسم و رواج کو پروان چڑھا کر فخر محسوس کرتا ہے... وہ بھی ہندو معاشرے میں ایسے زندان کی قیدی تھی جس سے وہ چاہنے کے باوجود نہیں نکل پارہی تھی لیکن... ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور پھر اس کی پرواز اونچے آسمانوں پر قابلِ دید تھی۔ کیونکہ مکافات کا عمل انتہائی چابک دستی سے اپنے فرائض انجام دے کر سب کو حیران کر دیتا ہے۔

رشتوں اور احساسات کے بیوپار اور جذبات کے مابین معرکہ آرائی

چندو آج بڑے اچھے موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ آج اس کی گھر والی سریتا نے اسے ایسی خوشخبری سنائی تھی کہ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس خبر کا وہ برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سارے سنسار کو چیخ چیخ کر بتائے کہ عنقریب وہ باپ بننے والا ہے۔ اس کے سُونے آنگن میں بھی بہار آنے والی ہے۔ شادی کے اتنے برسوں بعد آج اسے سریتا بہت اچھی لگی۔ ورنہ وہ اسے جلی کٹی سنانے سے باز نہیں آتا تھا۔ زبان سریتا کے پاس بھی تھی

لیکن وہ صبر وتحمل سے اس لیے کام لیتی تھی کہ شوہر کے گھر کی چار دیواری کے علاوہ اس کا اور کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ ماں باپ کا سایہ تھا نہ کوئی ماں جایا تھا۔ اس لیے آنسو پینے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ زاروقطار رونے کے بعد اپنا سارا غصہ اپنی مری ہوئی ماں پر نکالتی کیونکہ جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اس کی ماں لیلاوتی نے چندو کو گھیرا تھا۔ سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔

سریتا نے جیسے ہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، لیلاوتی اس کے بیاہ کے سپنے دیکھنے لگی لیکن باوجود کوشش کے کوئی بر ہاتھ نہیں لگ رہا تھا کیونکہ لیلاوتی کے پاس نہ دان دہیج تھا اور نہ کنیادان کے لیے پھوٹی کوڑی تھی۔ بیٹی کی منہ زور جوانی دیکھ کر اس کا کمزور دل دہلا جا رہا تھا۔ چندو اس کے محلے کے قریبی ٹیکسی اسٹینڈ پر اکثر و بیشتر اسے نظر آتا لیکن جان پہچان اس وقت ہوئی جب وہ اچانک افراتفری میں اس کی ٹیکسی کے نیچے آکر مرتے مرتے بچی۔ چندو نے فوراً سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ پانی پلایا اور پانچ سو روپے سے اس کی مٹھی گرم کردی تاکہ وہ اپنی ٹوٹ پھوٹ ڈاکٹر سے صحیح کروالے لیکن لیلاوتی کو تو خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ پیسے سیدھے اس کے بٹوے میں چلے گئے۔ اس روز سے چندو اسے بہت اچھا لگنے لگا اور اس نے فوراً چندو کو اپنا بیٹا بنالیا اور اسے اپنے گھر آنے کا نیوتا بھی دے ڈالا۔

چندو کے لیے لیلاوتی نے گھر کا دروازہ کھولا تو اس کی بیٹی سریتا نے دل کی کھڑکی کھول دی اور چندو اس میں درانہ وار داخل ہوکر سریتا کے من کے سنگھاسن پر براجمان ہوگیا۔ سریتا بھی کومل، چھیل چھبیلی اور سبک نین نقش کی مالک تھی۔ یہ سانولی سلونی الھڑ ناری چندو کے دل کو ایسی بھائی کہ اس نے فوراً اپنی ماں بہن کو راضی کر کے لگن منڈپ سجالیا۔ لیلاوتی زمانہ ساز عورت تھی۔ اسے یقین تھا کہ چندو نے صرف سریتا کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے ساتھ اس نے وہ گھر بھی دیکھا جس میں دونوں ماں بیٹی رہائش پذیر تھیں۔ لیلاوتی نے اپنے چار ملنے والوں میں یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ اس کا آنجہانی شوہر مرنے سے پہلے یہ گھر اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کرگیا ہے۔ جب یہ بات چندو کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ سورگ کی اس سندری کے ساتھ لاکھوں کا گھر بھی ہاتھ لگ رہا تھا۔ اس نے شادی میں دیر نہیں لگائی۔ یوں چندو منہ بولے بیٹے سے لیلاوتی کا جنوائی راجا بن گیا۔

سریتا اور چندو کے لیے ہر دن ہولی اور ہر رات دیوالی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ وہ خواب خرگوش سے اس وقت جاگا جب سریتا کے چاچے تائے کی اولادیں گھر میں اپنا اپنا حصہ مانگنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چندو کو پتنگے لگ گئے۔ اس نے ساس کو بے بھاؤ کی سنائی۔ ایسی ایسی رنگ برنگی بولیوں سے نوازا کہ لیلاوتی اور سریتا کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ مکان فروخت ہونے کے بعد جو چھوٹی سی رقم ہاتھ لگی تھی، اس میں اس نے کچھ اپنا پیسا شامل کر کے دہلی کے نواحی علاقے مہرولی میں آدھا پلاٹ خرید کر اپنا کچا پکا گھر بنالیا تھا۔ جو اگر بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ اس چھوٹے سے مکان میں وہ اپنی ماں، ایک چھوٹی بہن سرلا اور اپنی بیوی سریتا اور ساس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ لیلاوتی کو بھی وہ محض اس لیے برداشت کررہا تھا کہ لیلاوتی کے ہاتھ میں ہر مہینے اپنے مرحوم شوہر کی پنشن آتی تھی۔ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ساس سے میٹھا میٹھا بولتا۔ اس روز بیوی اور ساس کے لیے اس کے منہ سے کوئی گالی نکلتی اور نہ کوئی سخت بات۔ اس دن وہ وقت سے پہلے بیدار ہوکر پہلے اپنی ٹیکسی کی صفائی کرتا اور پھر ساس کے پیر چھو کر اس کا آشیرواد لیتا اور بڑے مان سمان کے ساتھ ساس کو اپنے برابر بٹھا کر ٹیکسی کو مخاطب کر کے کہتا۔

''چل میری گلبدن۔'' لیلاوتی بینک جاکر انگوٹھا لگا کر جیسے ہی پیسا حاصل کرتی، چندو اسی وقت اس کے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیر کر رقم اپنی جیب میں رکھتا اور پھر اس کے مہینے بھر کے لیے بس اتنا جیب خرچ دیتا کہ وہ بمشکل اپنا پان تمباکو پورا کر پاتی۔ سریتا کے ہاتھ تو دمڑی بھی نہیں لگتی لیکن دونوں ماں بیٹی کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی کیونکہ چندو تن کے جوڑے سے سریتا کو بیاہ کر لایا تھا۔ اس لیے چندو پوری دیدہ دلیری کے ساتھ ساس کی پنشن پر قبضہ کرتا اور پھر ان دونوں پر ہی غراتا۔ ہاں البتہ چندو کی ماں اور بہن اسے سمجھاتے کہ وہ ان دونوں کے ساتھ اچھا نہیں کررہا ہے لیکن چندو اپنی ماں اور بہن کو بھی ایسی جھاڑ پلاتا کہ ان کے حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی۔ ماں کو اس کی بیماریاں، دواؤں اور ڈاکٹر کی لمبی چوڑی فیس کا طعنہ دیتا اور سرلا کو کہتا۔

''تیری شادی کر کے تجھے بھی تو گھر سے نکالنا ہے۔ تیرے گونے میں دینے کے لیے بھی تو پیسا چاہیے مجھے۔ یا تجھے بھی سریتا کی طرح خالی ہاتھ رخصت کردوں۔ ہر کوئی چندو کی طرح جی دار نہیں ہوتا جو بغیر دان دہیج کے لڑکی کو اپنا لے۔''

اس کی طعن آمیز باتوں سے جہاں لیلاوتی اور سریتا کا جگر چھلنی ہوتا، وہیں اس کی اپنی ماں اور بہن بھی چپ

ہوجاتیں کیونکہ حقیقت بھی یہی تھی کہ گھر کے تمام اخراجات کا دارومدار صرف اور صرف چندو کے کاندھوں پر تھا۔ وہ ساری رات ٹیکسی چلاتا اور پو پھٹے گھر لوٹتا اور پھر تھکا ہارا یوں سوتا کہ اس کے سرہانے ڈھول بھی پیٹا جائے تو اس کی آنکھ نہ کھلے۔

ہر شادی شدہ جوڑے کی طرح اس نے اور سریتا نے بھی اولاد کے سپنے دیکھے تھے۔ ننھی منی قلقاریوں کو سننے کے لیے ان کے کان ترس گئے تھے لیکن سریتا کی گود ہری نہ ہوسکی۔ اسی اثنا میں اس نے اچھا سا بر دیکھ کر سرلا کی شادی کردی۔ سرلا کی شادی کے بعد اس کی ماں پرلوک سدھاری اور پھر فوراً بعد لیلاوتی کا بھی انتم سمے آگیا۔ گھر چھوٹا سا ہی سہی لیکن جب اس میں رہنے والے ہی کم ہوگئے تو گھر یوں بھائیں بھائیں کرنے لگا جیسے ویران بیاباں۔ گھر کی خموشی دونوں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اولاد کی کمی کو وہ دونوں اب کچھ زیادہ شدت سے محسوس کررہے تھے۔ سریتا کے دل میں تو یہ خوف سما گیا تھا کہ کہیں چندو اولاد کے لیے دوسری شادی نہ کرلے۔ تمام ڈاکٹروں اور وید حکیم سے مایوس ہونے کے بعد وہ مندروں اور سادھو سنتوں کے پاس پھیرے لگانے لگی۔ تیرتھ یاترا بھی کرڈالی لیکن سوکھی ڈالی ہری نہ ہوسکی۔

اس کی پرارتھنائیں جاری تھیں اور پھر اوپر والے کو اس پر ایسا ٹوٹ کر رحم آیا کہ وہ اور چندو خوشی سے نہال ہوگئے۔ پہلے پہل تو چندو کو یقین ہی نہیں آیا لیکن دس جماعتیں اس نے بھی پڑھی تھیں۔ سریتا کی میڈیکل رپورٹ دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ ودھاتا کو اس پر اور سریتا پر دیا آگئی۔ اس نے اسی خوشی میں سارے محلے میں بھگوان کا پرساد اور مٹھائی بانٹی اور پھر حسب معمول شام ہوتے ہی اپنی ''گلبدن'' کو لے کر نکل کھڑا ہوا۔ دہلی کی چوڑی چکلی سڑکوں پر گلبدن فراٹے بھرتی رہی۔ مہرولی سے کناٹ پلیس، نظام الدین، قرول باغ، چاندنی چوک، پالیکا بازار، سارے مقامات اور اسٹاپ گلبدن کے بھی دیکھے بھالے تھے اور چندو کے بھی۔ پسنجروں سے کرائے وصول کرنے کے بعد اس نے اپنی ساری رقم گنی۔ ایک طمانیت بھری اور پرسکون سانس لی اور گھر واپس ہونے کے لیے ٹیکسی اسٹارٹ.... کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خوبصورت عورت اس کی ٹیکسی کے قریب آئی اور نہایت شیریں اور شائستہ انداز میں گویا ہوئی۔

''ٹیکسی خالی ہے؟'' عورت کا نرم و نازک لہجہ اور اس کی سندرتا دیکھ کر چندو دم بخود رہ گیا۔ لفظ ''نہیں'' اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ لعاب دہن نگلتے ہوئے اس نے بغیر زبان ہلائے گردن کے اشارے سے عورت کو پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور ٹیکسی اسٹارٹ کردی۔

راستے میں مطلوبہ مقام معلوم کیا۔ جس علاقے میں اسے جانا تھا اس علاقے میں مکمل سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ٹیکسی سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ عورت کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق اس نے ٹیکسی ایک عالیشان بنگلے کے سامنے روک دی۔ عورت نے اپنا بھاری بھرکم پرس اور ہاتھ میں پکڑا اٹیچی بکس اٹھایا اور پھر اپنی ریشمین قیمتی ساڑی کا آنچل سنبھالتی ہوئی ٹیکسی سے اتری اور کرایہ دینے کے لیے پرس کی زپ کھولی لیکن معاً اس نے اپنا ہاتھ روک کر مستفسرانہ انداز میں چندو کی طرف دیکھا اور اپنی ترنم ریز آواز میں سوال کیا۔

''ٹیکسی والے...... کیا نام ہے تمہارا؟''

چندو نے نہایت مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ ''جی چندو نام ہے میرا۔''

''ہوں......'' عورت نے ہنکاری بھری اور پھر بولی۔ ''اگر میری واپسی تک ٹھہر سکتے ہو تو منہ مانگا کرایہ دوں گی۔ بلکہ تمہاری مانگ اور سوچ سے بھی زیادہ دوں گی۔''

چندو کا من جھوم اٹھا۔ آج کی کمائی بھی اور دنوں کی بہ نسبت زیادہ ہوئی تھی اور آج ہی یہ شری متی بھی اس پر مہربان ہورہی تھی۔ اسے لگا یہ سب اوپر والے کی کرپا سے ہورہا ہے۔ جو ننھا مہمان اس کے گھر آرہا ہے، اس کے دم قدم سے بھی اس پر مہربان ہورہی ہے۔ اس نے بغیر سوچے ''ہاں'' کہہ دیا۔ عورت جھپاکے کے ساتھ گیٹ کھول کر اندر چلی گئی۔ چندو اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور مدھم سروں میں گنگنانے لگا۔ ''کیسی حسین آج بہاروں کی رات ہے۔'' اپنے گائے ہوئے گانے سے وہ خود ہی لطف اندوز ہورہا تھا کہ اچانک بنگلے کے اندر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز ابھری۔ چندو کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ آواز اسی عورت کی ہے جس نے یہاں اسے روک رکھا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا پھر ہمت کرکے ٹیکسی سے اترا اور اندر داخل ہوگیا۔

راہداری طے کرنے کے بعد اس کمرے کے قریب جاکر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا جس کی کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ صرف اسی کمرے میں روشنی تھی۔ باقی پورا بنگلا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ چندو نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگادی اور پھر اس کی آنکھوں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ سب اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

اس کا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سر تا پا پسینے میں نہا گیا تھا۔ اپنے منہ سے نکلنے والی چیخ کو بہ دقت تمام اس نے روکا اور اپنے تھرتھراتے ہوئے وجود کو لے کر ایک تاریک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بہت قریب سے کوئی گزرا۔ پھر گیٹ کھولنے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی۔ جانے والے نے گیٹ بند کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ گاڑی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بنگلے سے نکلی اور ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

چندو نے کافی دیر سے روکی ہوئی سانس خارج کی اور اطراف میں نظریں ڈالتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے کے اندر کا منظر انتہائی دہشت ناک تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سرایت کر گئی اور وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہاں اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا لیکن آدمی حاضر دماغ اور موقع شناس تھا۔ جو کام اسے کرنا تھا، وہ کر کے جس طرح خاموشی سے آیا تھا، اسی طرح نکل گیا۔ یہ رات اس کے جیون میں حقیقتاً بہاریں لے کر آئی تھی۔ اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس کی گلبدن اب مہرولی کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا سریتا آج بھی بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولے گی کیونکہ اس کی میٹھی نیند میں خلل جو پڑتا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر مسلسل کھٹ کھٹ کی آواز سے سریتا کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے بستر پر سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سال خوردہ سی تپائی پر رکھی ہوئی گھسی پٹی ٹائم پیس پر نظر ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں منمنائی۔ ''چندو تجھ سے بھگوان سمجھے۔ سارا دن کھٹیا توڑتا ہے اور رات ہوتے ہی روزی روٹی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ خود تو دن میں اپنی نیند پوری کر لیتا ہے لیکن مجھ ابھاگن پر تو آرام حرام ہے۔''

''یہ کہتے ہوئے اس نے طوعاً و کرہاً دروازہ کھولا لیکن چندو کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ روزانہ کی طرح اس کے چہرے پر نہ تھکن کے آثار تھے اور نہ اضمحلال اور پریشانی کا نام ونشان تھا۔ آنکھوں سے خوف ضرور مترشح تھا لیکن چہرہ ایک انجانے جذبے کے تحت دمک رہا تھا۔ ہاتھ میں دبے ہوئے اٹیچی کیس کو سینے سے لگائے وہ سریتا کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ سریتا ''ارے ...... ارے'' کرتی رہ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور دوڑ کر اٹیچی کو الماری میں رکھ کر اسے لاک کر دیا۔ سریتا اب بھی کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ کچی نیند میں سے اٹھی تھی۔ بس اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک طویل جمائی لے کر وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔''

''چندو ہاتھ منہ دھولو۔ میں بھوجن لگاتی ہوں۔'' چندو نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے اسے کھانے کے لیے منع کیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''وہی اپنی شکل کی طرح دال بھجیا بنائی ہوگی۔ کل میں تجھے ''دہلی میٹ کارنر'' لے چلوں گا۔ کچھ تو زبان کا سواد بدلے گا۔'' اس کی اس بات پر سریتا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ چندو اسے اسی وقت باہر لے جاتا تھا، جب کوئی موٹی اسامی کرائے کے علاوہ بھی تگڑی رقم اس کے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ اس نے وضاحت طلب نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چندو! کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ یہ اٹیچی جو تو نے ابھی الماری میں رکھی ہے، لگتا ہے کوئی تیری ٹیکسی میں بھول گیا ہے اور تو اپنا مال سمجھ کر گھر لے آیا۔ تب ہی اتنا خوش ہے اور اسی لیے میری دعوت کر رہا ہے۔''

چندو غرایا۔ ''آئندہ تیری زبان پر اٹیچی کا ذکر نہ آنے پائے۔ ورنہ تیرا وہ حشر کروں گا کہ دنیا دیکھے گی اور کسی سکھی سہیلی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میرا کہانہ مانا تو تجھ سے ہر سمبندھ ختم کر کے دیس نکالا کر دوں گا۔ تجھے باہر کھانا کھلانے اس لیے لے جا رہا تھا کہ آج تو نے مجھے شبھ شبھ سنا کر میرا دل جیت لیا۔ اپنے آنے والے بچے کی خوشی میں تجھے کھانا کھلانے لے جا رہا ہوں ...... سمجھی؟'' سریتا نے سہمی سہمی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور اپنے بستر پر لیٹ گئی لیکن آنکھوں کا مرکز وہی الماری تھی جس میں چندو نے اٹیچی رکھی تھی۔

☆☆☆

چندو روزانہ گھر سے نکلنے سے پہلے الماری کا لاک چیک کرتا۔ الماری کی چابی اپنی جیب میں رکھتا اور پھر باہر کی راہ لیتا۔ آج کل تواتر سے ہاکر سے اخبار خرید کر بھی پڑھ رہا تھا۔ سریتا اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ کسی دن الماری کی چابی اس کے ہاتھ لگے تو وہ اٹیچی کھول کر دیکھے لیکن چندو اس معاملے میں انتہائی گھاگ تھا مگر ایک دن سریتا کو میلے کپڑے دھونے کے لیے دیے تو پتلون کی جیب سے چابی نکالنا بھول گیا۔ سریتا کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے ترنت الماری کھولی اور اٹیچی نکال کر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اٹیچی مقفل تھی۔ وہ الٹ پلٹ کر کے اس کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ بالوں میں سے اپنا ہیئر پن کھینچا اور کی

ہول میں ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اٹیچی پر جھکی ہوئی اپنے کام میں منہمک تھی کہ اچانک اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چندو اس کے سر پر کھڑا خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سریتا ایک لمحے کے لیے کانپ سی گئی۔ حلق خشک ہوگیا۔ چندو آگے بڑھا اور مشتعل لہجے میں بولا۔

''تو باز نہیں آئے گی۔ تجھے چین نہیں آئے گا۔ جب تک دیکھ نہیں لے گی۔ آ...... آج میں تجھے دکھاتا ہوں کہ اس میں کیا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے اپنے ہونٹ سی لینا۔ ورنہ پل میں سارے سمبندھ توڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔''

سریتا نے وحشی ہرنی کی طرح گردن ہلائی اور وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن چندو نے اپنی ٹانگ سے اس کا راستہ روکا اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''جا کہاں رہی ہے۔ رک اور دیکھ کہ اس میں کیا ہے۔ تو تو اپنی ماں کے گھر سے کچھ نہیں لائی تھی لیکن میری آنے والی اولاد دیکھ کتنی بھاگیوان ہے۔ اس کے سنسار میں قدم رکھنے سے پہلے میرے گھر میں دھن برسنے لگا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے شرٹ کی جیب سے چابی نکالی اور اس کا لاک کھولا۔ ایک زبردست کھٹکے کے ساتھ اٹیچی کھل گئی۔ چندو نے جب مکمل طور پر کھولا تو سریتا کے دیدے باہر کی طرف ابل پڑے۔ سونے کے ٹھوس زیورات اور بسکٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے۔ اس کے علاوہ نقد رقم کی کئی گڈیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ سریتا سانس لینا ہی بھول گئی۔ یہ سب دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ بدقت تمام اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے اور تجھے کہاں سے ملا؟''

چندو نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب اوپر والے کی کرپا ہے۔ اس کے دینے کے انداز نرالے ہیں۔ بس اب ہمیشہ کے لیے منہ پر قفل ڈال لینا۔ مجھ سے بھی اب اس بارے میں کوئی سوال مت کرنا۔ بس یہ سمجھ لے کہ نہ تو نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ نہ میں نے کچھ دکھایا نہ بتایا۔ اگر میری مرضی کے خلاف گئی تو......'' اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے سریتا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تو کیسی باتیں کررہا ہے۔ کیا میری مت ماری گئی ہے جو میں باہر جاکر ڈھنڈورا پیٹوں گی مگر چندو چور دروازے سے آیا ہوا دھن جس طرح آتا ہے، اسی طرح جاتا ہے۔ آگے تو جانے اور بھگوان جانے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے وہاں سے کھسک گئی۔ چندو نے جلدی سے اٹیچی بند کی اور اسے پھر سے الماری میں رکھ کر الماری کو مقفل کردیا۔ اس وقت وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ ذہن میں ایک ہنگامہ بپا تھا کہ اس بلیک منی کو وائٹ میں کس طرح تبدیل کیا جائے۔ دور دور تک کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اوپر والا اس پر کچھ ایسا مہربان ہوا کہ نہ صرف راستے کھلتے چلے گئے بلکہ منزل خود چل کر اس کے پاس چلی آئی۔ ان ہی دنوں مہاراشٹر کے ایک دیہی علاقے سے اسے اپنے چچا کے دیہانت کی خبر ملی۔ چندو کے اس چچا نے شادی نہیں کی تھی۔ چندو اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر ہمیشہ اس بات کا چرچا کیا کرتا تھا کہ اس کا یہ چچا کروڑوں کی دولت کا مالک ہے اور اس کے مرنے کے بعد سب کچھ اس کے ہاتھ لگنے والا ہے۔ اب بلی کے بھاگوں چھینکا اس طرح ٹوٹا کہ اپنے کنوارے چچا کا کریا کرم کرنے کے بعد اس نے جی جان سے اس بات کی تشہیر کی کہ اسے اپنے سورگ باشی چچا کی کافی دولت ہاتھ لگی ہے۔

اٹیچی میں ملنے والی دولت کی ساری کالک دھل گئی۔ سب اجلا اجلا ہوگیا اور اس کے ساتھ چندو کے نصیب بھی ایسے جگمگائے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ اسی دوران سریتا نے ایک بچی کو جنم دیا۔ چندو ہواؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اپنے نام کی نسبت سے اس نے بیٹی کا نام چاندنی رکھا تھا۔ چاندنی نے آنکھیں کھولتے ہی دولت کی ریل پیل دیکھی۔ چندو بیٹی کی آنکھ بھی میلی نہ ہونے دیتا۔ بیوی اور بیٹی کو اس نے سونے میں پیلا اور چاندی میں سفید کردیا تھا۔ اب وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ اس کی ٹیکسیاں اور بسیں دہلی اور اس کے قرب و جوار میں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ اپنی کمپنی کا نام اس نے اکلوتی لاڈلی بیٹی کے نام پر ''چاندنی ٹرانسپورٹ'' رکھا تھا۔ اس کی دولت سالوں اور مہینوں کے حساب سے نہیں بلکہ ہفتوں اور دنوں کے حساب بڑھ رہی تھی اور وہ چندو ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ سیٹھ چندو بن گیا تھا۔

اب سریتا سوکھی سہمی گھریلو عورت نہیں بلکہ مسز سریتا چندو مل تھی۔ چاندنی کا بچپن سونے کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ خوشیاں یوں برس رہی تھیں جیسے ساون کی جھڑی لگتی ہے۔ چھوٹے سے مکان میں جیون بسر کرنے والا یہ کنبہ اب دہلی کے ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ گھر کے ہر فرد کے لیے علیحدہ علیحدہ گاڑی مخصوص تھی۔ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کے لیے ملازموں کی ایک فوج تھی

جو مالکوں کا حکم بجا لانے کے لیے ہر گھڑی تیار رہتی۔ اسٹیٹس بدلتے ہی چندو اور سریتا کا حلقۂ احباب بھی بدل گیا۔ اب وہ اپر کلاس لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کچھ اسی طرح چاندنی کے ساتھ بھی تھا۔ وہ کسی غریب یا کمتر سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس گھر کے نوکروں کو بھی اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی۔ ماں باپ اس کی ہر حرکت پر دل و جان سے نثار تھے۔

☆☆☆

دن اور رات ایک دوسرے کے عقب میں تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ چاندنی کا شباب چودھویں کے چاند کی یاد دلا رہا تھا۔ اس کے ساحرانہ حسن کو جو دیکھتا، وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کچھ قدرتی حسن کچھ دولت کی فراوانی، ایسا ٹوٹ کے روپ برسا کہ جب کالج میں قدم رکھا تو نوجوان لڑکے ہی نہیں بلکہ معمر پروفیسرز صاحبان کو بھی اپنی گزری جوانی یاد آ گئی لیکن چاندنی ادائے بے نیازی سے ان کے پاس سے یوں گزرتی جیسے وہ لوگ بے جان پتھر کے مجسمے ہوں۔ سہیلیاں اور بوائے فرینڈز کا انتخاب بھی کرتی تو پہلے ان کا ڈیٹا ضرور چیک کرتی۔ اس کے فرینڈ سرکل کا ہر فرد اگر کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور تھا۔ بڑے اور اونچے گھرانوں کے لوگ اسے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن سب کو مایوسی ہاتھ لگی کیونکہ چندو اور سریتا اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

چاندنی بذاتِ خود بھی علم کی شیدائی تھی۔ ہر سال ٹاپ کرتی تھی۔ شادی بیاہ کے الجھاوے میں پھنسنے کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھی لیکن انسان لاکھ مقدر کا سکندر سہی ہوتا وہی ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔ اس کی اکڑی ہوئی گردن کا تناؤ اس روز ختم ہوا جس روز اشیش نے اسے منہ نہیں لگایا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا کی اس بھیڑ میں وہ بھی ایک عام سی لڑکی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور سندرتا کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس کے من میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور وہ سرتا پا اس میں جل کر راکھ ہو گئی۔ اشیش سے ملنے اور اسے پانے کا جذبہ دل ہی دل میں پروان چڑھنے لگا۔ اشیش سے اس کی ملاقات اپنی سہیلی پریا کی سالگرہ میں ہوئی تھی۔ جب پریا نے اشیش سے اس کا تعارف کروایا تو اس نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی لیکن جب سنگیت منچ پر اشیش نے اپنی آواز کا جادو جگایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین کی گردش تھم گئی ہو۔ دریا اور سمندر کا پانی اپنی جگہ ساکت ہو گیا ہو۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن سے اشیش کی آوازیں آنے لگیں۔ اب پریا کے قریب آ کر اس نے اشیش کے بارے میں جانکاری چاہی تو پریا نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بنورانی خیر تو ہے۔ کہیں یہ گائک آپ کا دل تو نہیں لے اڑا۔''

چاندنی نے ایک جھینپی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

پریا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے جواباً کہا۔ ''میں تمہاری بچپن کی ہم جولی ہوں۔ یوں ہی تو آج تک تم نے کسی کے بارے میں نہیں پوچھا۔'' چاندنی کی شرمگیں آنکھیں کچھ اور جھک گئیں اور وہ لاجواب ہو گئی۔ پریا اسے دوبارہ اشیش کے پاس لے گئی۔ دورانِ گفتگو میں ہی اشیش نے اسے بتایا کہ وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں ہے اور اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ رہتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے جب اپنے رہائشی علاقے کا نام لیا تو چاندنی سانس لینا ہی بھول گئی۔ اسے پتا تھا کہ وہاں انتہائی غریب اور مزدور پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بستیوں سے تو وہ اپنی کار لے کر گزرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی لیکن جسے وہ اپنے من مندر کا دیوتا بنانا چاہ رہی تھی، وہ ان ہی بستیوں کا پروردہ تھا۔ وہ دل تھام کر رہ گئی۔ پہلی بار دل مچلا بھی تو کس کے لیے جس کے پاس نہ کوٹھی تھی، نہ کار۔ پہلے پہل تو اس نے اپنے اس ضدی اور ہٹ دھرم دل کو منانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار اسے اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی کیونکہ دل ناداں بار بار اشیش سے ملنے کی تمنا کر رہا تھا۔

اپنی قیمتی کار لے کر وہ اپنی کوٹھی سے نکل کھڑی ہوئی۔ وہاں جا کر اسے اپنی کار ایک جگہ روکنا پڑی کیونکہ اشیش کے گھر تک پہنچنے کے لیے جو تنگ گلی جا رہی تھی، کار وہاں سے گزر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پائے نازک پتھریلے راستے سے گزرنے کے بعد اشیش کے دروازے تک پہنچ ہی گئے۔ اشیش اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''آپ یہاں؟'' چاندنی نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''جی میں...... لیکن آپ مجھے دیکھ کر یوں گھبرا کیوں گئے۔ کیا میرا آنا اچھا نہیں لگا؟''

اشیش نے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آپ کو دیکھ کر مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے...... سناؤں؟''

اس نے اجازت طلب نظروں سے چاندنی کو دیکھا۔ چاندنی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے نہایت لگاوٹ سے جواب دیا۔

''اشیش صاحب! میں غالب کا صرف ایک شعر سننے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ آج تو آپ کو غالب کی پوری غزل سنانی ہوگی۔''

اشیش نے وضاحت طلب انداز میں اسے دیکھا اور مستفسر ہوا۔ ''کونسی غزل؟''

چاندنی نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ ''اے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔'' اشیش کے دل کی دھڑکنیں زیروزبر ہوگئیں۔ دونوں پر سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ اب کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اشیش نے چاندنی کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور چاندنی کو اپنے خستہ حال صوفے پر بٹھادیا۔ چاندنی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی راج کمار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تختِ شاہی پر بٹھا دیا ہو۔ اشیش کے ہاتھ کا لمس پا کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اشیش کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اشیش نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''چاندنی! سیلف پور کنٹرول۔ اندر دادی ہیں۔''

چاندنی ہوش میں آگئی۔ اشیش سے جڑی اسے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ اس لیے دادی بھی اسے بہت اچھی لگیں۔ اس کے گھر میں بزرگ نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ اس لیے دادی کا وجود اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھا۔ دادی کے مشفقانہ انداز نے اس کا دل جیت لیا۔ اس روز وہ گھر لوٹی تو اس کے ہونٹوں پر ایک گیت مچل رہا تھا۔ چندو اور سریتا بھی اسے دیکھ کر چونکے ضرور لیکن کچھ کہا نہیں۔ چاندنی اپنے بیڈ روم میں جا کر اپنے پُرتعیش بیڈ پر لیٹ کر مستقبل کے سپنے دیکھنے لگی جہاں صرف وہ تھی اور اشیش تھا۔

☆☆☆

چندو اور سریتا بیٹی کے انداز و اطوار دیکھ کر دل ہی دل میں سہمے جا رہے تھے۔ غیر معمولی سج دھج کے ساتھ وہ کسی دوست یا سہیلی کے گھر جانے کے لیے کہہ کر نکلتی۔ ماں یا باپ سے اجازت بھی لیتی۔ لیکن کئی بار اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آ گیا۔ اب دونوں نے اس پر سختی شروع کردی تھی۔ چندو نے اپنے ذرائع سے پتا چلایا تو ساری بات کھل کر سامنے آگئی۔ ماں باپ نے اپنے طور پر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ دنیا کی اونچ نیچ، پستی اور بلندی کا فرق بتایا۔ تنگدستی اور غربت کتنی بُری بلا اور بیماری ہے، امیری اور غریبی کی کیا تفریق ہے...... بیٹی پر اچھی طرح واضح کیا لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ ''شادی کروں گی تو اشیش سے ورنہ زندگی بھر کنواری رہوں گی۔''

دونوں میاں بیوی کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ سختی نرمی، پیار محبت سے سمجھایا۔ دھمکی دھونس سے بھی کام لیا لیکن عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اسی اثنا میں چندو کے ایک دوست نے چاندنی کے لیے ایک رشتہ دکھایا۔ لڑکا کوئی خاص پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن ایک مل اونر کا بیٹا تھا۔ باپ کافی عرصے پہلے مر چکا تھا۔ ماں اور بہن اس کے لیے لڑکی تلاش کر رہے تھے۔ چندو کا دوست دونوں ماں بیٹی کو چندو کی کوٹھی پر لے آیا۔ دونوں ماں بیٹی چاندنی کو دیکھتے ہی فدا ہوگئیں اور فوراً اس کا ہاتھ مانگ لیا۔ چندو اور سریتا بھی فوراً تیار ہوگئے کیونکہ ٹکر کے لوگ تھے۔ سارے شہر میں واہ واہ ہوجاتی کہ سیٹھ چندومل نے اپنی بیٹی کی شادی کتنے اونچے گھرانے میں کی ہے۔

چاندنی کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ روئی گڑگڑائی، بہت سر پٹخا۔ بیٹی کی آہ وزاری دیکھ کر سریتا کی ممتا تو پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اکلوتی نازوں سے پلی بیٹی تھی فوراً شوہر کے سر ہوگئی کہ مل اونر کا بیٹا جس کا نام سدرشن تھا، لاکھ امیر کبیر سہی لیکن جب ہماری چاندنی کو پسند ہی نہیں ہے تو پھر ایسے بیاہ سے فائدہ۔ ہماری بچی ہمیشہ روتی رہے گی۔ نہ بابا نہ، مجھے نہیں کرنا ہے ابھی اپنی بیٹی کی شادی۔ بس سدرشن کی ماں بہن آئیں تو انہیں صاف انکار کردینا۔ بیوی کی گریہ وزاری دیکھ کر چندو کی پدرانہ محبت نے بھی جوش مارا۔ لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا۔ ''ابھی فی الحال انکار اور اقرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں رشتوں کو میں اچھی طرح دیکھوں گا، پرکھوں گا پھر فیصلہ کروں گا۔''

بات کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی اور سب کچھ راہِ راست پر آ گیا لیکن چاندنی کے قدم پھر بہکنے لگے۔ یونیورسٹی کے بہانے نکلتی اور اشیش کے گھر پہنچ جاتی۔ اس کی اس حرکت سے اشیش بھی پریشان ہوجاتا۔ سمجھا بجھا کر اسے واپس جانے کے لیے مجبور کرتا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ ان دونوں میں جو طبقاتی حد بندی ہے، اسے وہ کبھی نہیں پار کرسکے گا۔ وہ بھی اپنی جگہ سولی پر لٹکا ہوا تھا کیونکہ چاندنی کو وہ بھی دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا لیکن اسے اپنی مجبوریوں کا بھی احساس تھا۔ چاندنی آج پھر شام ہوتے ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ چندو اور سریتا بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک رات کے گیارہ بجے

اس کی گاڑی پورچ میں رکی تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اونچی آواز میں باز پرس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹی کی ڈھٹائی اور سرکشی سے اچھی طرح واقف تھے۔ دونوں نے فی الفور اس وقت تو خون کا گھونٹ پی لیا لیکن باہمی مشاورت سے دونوں میاں بیوی نے یہ طے کیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے، بہت جلد کرنا ہے۔ اگر اس معاملے میں تاخیر کی تو سانپ نکل جائے گا اور وہ فقط لکیر کو پیٹتے رہیں گے۔

دونوں کا دھیرج اور صبر جواب دے چکا تھا۔ بیٹی کے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے چندو نے فوراً عملی قدم اٹھایا۔ وہ دوسری صبح سریتا کو کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ آج وہ اشیش سے ملاقات کر کے اس کا منہ اپنی دولت سے بند کر دے گا۔ سکوں کی جھنکار اور نوٹوں کی سرسراہٹ سن کر ہی وہ باؤلا ہو جائے گا اور جیسے ہی چاندنی اس کے حصارِ محبت سے آزاد ہو گی، وہ فوراً اس کی شادی سدرشن سے کر دے گا۔ اسی سلسلے میں اسے آج سدرشن اور اس کی ماں سے بھی ملاقات کرنی تھی۔

چندو اس وقت کافی دل گرفتہ، ملول اور مضطرب تھا۔ اس کی منزل اشیش کا گھر تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے علاقے میں داخل ہوا، اس کے اعصاب پر تشنج ساطاری ہو گیا۔ دل ہی دل میں بیٹی کو صلواتیں سنائے بغیر نہ رہ سکا۔ گاڑی روک کر آس پاس کے لوگوں سے اشیش کا پتا پوچھتے پوچھتے وہ اس کے دروازے پر پہنچ ہی گیا۔ لوگ اس کی گاڑی کو اور اسے متجس اور حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چندو کو دستک دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی کیونکہ محلے کے چھوٹے بچوں نے پہلے ہی اشیش کو خبردار کر دیا تھا.....

''اشیش بھیا! تمہارے گھر ایک گاڑی والے بہت بڑے صاحب آئے ہیں۔''

اشیش کو کسی بات کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چندو پر نظر پڑتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔ چندو نے فوراً بھانپ لیا کہ یہی اشیش ہے۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اطراف میں بھی نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ یہاں آکر سخت کوفت محسوس کر رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تک رہے تھے لیکن خاموش تھے۔ چندو ہلکا سا کھنکھارا تو اشیش یوں چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے چندو کو اندر چلنے کی پیشکش کی۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ صوفہ چیئر پر بیٹھتے ہوئے چندو نے طائرانہ نظر در و دیوار پر ڈالی تو دیوار پر لگی

ایک تصویر کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ تصویر پر کاغذ کے پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ چندو بغیر پلکیں جھپکائے تصویر کو تک رہا تھا اور اشیش چندو کو تک رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا مہمان تو تصویر پر سے نظریں ہی نہیں ہٹا پا رہا تو اس بار اس نے ہلکا سا کھنکھار کر خود ہی بولنا شروع کیا۔ وہ دھیمی اور غمگین آواز میں گویا ہوا۔

''انکل! یہ میری سورگ باشی ماں ہے۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تب ہی ان کا دیہانت ہو چکا تھا۔''

اوہ...... اچھا ...... اچھا...... کہتے ہوئے چندو اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنی توجہ تصویر پر سے ہٹاتے ہوئے اشیش سے استفسار کیا۔

''تمہارے علاوہ گھر میں کون کون ہے؟'' اشیش نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے فوراً کہا۔

''جی میں اور میری دادی ہیں۔ میں ابھی دادی ماں کو بلا کر لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھا اور متصل کمرے میں چلا گیا۔ چندو کی نظریں پھر تصویر پر جا کر ٹک گئیں۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی ان گنت لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد ہی اشیش اپنی دادی کو لے کر وارد ہوا۔ بوڑھی ضعیف خاتون کو اشیش سہارا دے کر لایا تھا کیونکہ ان دنوں وہ بیمار تھیں۔ نمستے، نمسکار کے بعد چندو ان سے کرید کرید کر ان کے ماضی کے بارے میں استفسار کرتا رہا اور پرانے وقتوں کی سادہ لوح عورت نہایت سادگی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔

اشیش نے کچن میں جا کر چندو کی خاطر تواضع کے لیے چائے پانی کا انتظام کیا اور میز سجا دی۔ دادی اور چندو میں کیا باتیں ہوئیں، وہ بالکل بے خبر تھا۔ چندو یہاں آیا تھا صرف چند لمحوں کے لیے لیکن وہ اشیش کی دادی کے ساتھ محوِ گفتگو ہوا تو اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ چائے پی کر اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''اب میں چلوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دادی کے پیر چھوئے اور اشیش سے ہاتھ ملا کر نکل گیا۔ تنگ اور پیچیدہ گلیوں کو عبور کر کے وہ اپنی چمچماتی کار کے قریب پہنچا تو محلے کے ننگ دھڑنگ بچوں کا ازدحام اس کی کار کو گھیرے ہوئے تھا۔ وہاں سے نکل کر چندو گھر جانا چاہتا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے ارادہ بدل دیا اور اپنی گاڑی کا رخ سدرشن کی کوٹھی کی طرف موڑ دیا۔ اس کی گاڑی جب کوٹھی کے پورچ میں جا کر رکی تو اس کے سواگت کے لیے سدرشن کے علاوہ اس کی ماں اور بہن بھی موجود تھیں۔ سدرشن بھی نہایت نفیس

سوٹ میں ملبوس ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی سج دھج بتا رہی تھی کہ وہ کہیں باہر جا رہا تھا لیکن سیٹھ چندو مل کی اچانک آمد نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چندو نے حسب عادت اچٹتی ہوئی نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔ یہاں پر بھی ایک بڑے سے پورٹریٹ پر جا کر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ بے ساختہ چونکتے ہوئے اس نے اشیش کی ماں سے پوچھا۔

''بہن جی! یہ کس کا پورٹریٹ ہے؟''

اشیش کی ماں کملا دیوی نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! یہی تو ہیں میرے شوہر اور اشیش کے ڈیڈی۔ انہیں کینسر جیسا موذی مرض کھا گیا۔ بس اب تو یہ دو بچے ہی ان کی نشانی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی پُرنم آنکھوں کو اپنی ساڑی کے آنچل سے پونچھنے لگی۔

اس تصویر کو دیکھنے کے بعد چندو وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس آرام دہ اور بیش قیمت صوفے پر کسی نے کانٹے بچھا دیے ہوں۔ گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کملا دیوی نے اسے یوں اٹھتے دیکھ کر فوراً کہا۔

''ہائے بھائی صاحب! بغیر جل پان کیے تو میں ہرگز آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ پہلی بار آپ کے شبھ قدم ہمارے گھر آئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹی کو ٹہوکا دیا۔ ''راگنی! جلدی سے دوڑ کر شمبھو کاکا سے کہو کہ انکل ناشتا ہمارے ساتھ ہی کریں گے۔''

چندو نے سختی سے انکار کرتے ہوئے اپنے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ تینوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب ان کے چہرے اداس اور لٹکے ہوئے تھے۔ چندو تیز رفتاری سے وہاں سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی کوٹھی سے نکل گئی۔ اب بھی اس کی منزل اس کا اپنا گھر نہیں بلکہ اس وقت اس کی گاڑی اس کے ایک دوست کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹا دوست سے گفت و شنید کر کے جب وہ وہاں سے نکلا تو اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون کی پرچھائیاں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری بے قراری اور بے چینی ختم ہو گئی ہو اور اس نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کر لیا ہو۔ اب وہ انتہائی مطمئن انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

اپنے بھاری بھرکم وجود کو لے کر سریتا صوفے پر نیم دراز تھی۔ آنکھوں سے الجھنیں اور تفکرات جھانک رہے تھے۔ چندو نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی کو آواز دی۔ شوہر کی آواز پر وہ یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ پتا نہیں آج اسے اور اس کی بیٹی کو کیا کچھ سننے کو ملے لیکن شوہر کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر ایک پُرسکون سانس لی۔ باپ کی آواز سن کر چاندنی بھی چونک گئی۔ ماں اسے پہلے ہی خبردار کر چکی تھی کہ آج فیصلے کا دن ہے اور اس کا باپ سیٹھ چندو مل دونوں لڑکوں سے ملاقات کر کے فوراً شادی کا مہورت نکال کر آئے گا۔ آنے والا وقت کیا دکھائے گا یہ سوچ سوچ کر چاندنی کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کا باپ سونے چاندی کا دلدادہ اور روپے پیسے کا متوالا ہے۔ اگر دولت غلاظت میں بھی پڑی ہے تو وہ اسے دانتوں سے پکڑ کر اٹھا لے گا۔ چھوڑے گا نہیں۔ اس لیے اس کا ووٹ یقیناً سدرشن کو ہی پڑے گا۔ جبکہ وہ سدرشن کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

اپنے بیڈ سے اٹھ کر وہ اسی ادھیڑ بن میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی تو دیکھا کہ چندو بیوی کے ساتھ نشست گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ بھی دبے قدموں چلتی ہوئی کمرے کی عقبی کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کا پٹ ہلکا سا کھول کر جھری سے کان لگا دیے۔ گھر کے اس حصے میں کسی کی آوک جاوک بھی نہیں تھی اس لیے نوکر چاکر کی نظروں میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اب وہ بے خوف و خطر ہو کر ماں باپ کی کھسر پھسر سننے لگی۔ دونوں پہلے پہل تو آہستہ آہستہ سرگوشیانہ انداز میں بولتے رہے اس لیے چاندنی کے پلے کچھ نہ پڑا لیکن بتدریج ان دونوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب وہ صاف طور پر ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کی ماں شوہر کے بالکل قریب بیٹھی تھی اور مسلسل سوالات کی یلغار کر رہی تھی۔ کبھی اشیش کے بارے میں پوچھتی تو کبھی سدرشن کے بارے میں لیکن چندو کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ وہ خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ چاندنی کو اس وقت باپ کی خاموشی بہت کھل رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سکوت، یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ اس وقت وہ انتہائی اذیت سے گزر رہی تھی۔ بے تاب دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر چندو کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجی۔

''سریتا! تجھے وہ رات یاد ہے جب میں سونے کے

زیورات اور نقد رقم سے بھری ہوئی ایک اٹیچی لے کر گھر میں داخل ہوا تھا؟'' سریتا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ''ہاں'' کہا اور بولی۔

''چندو وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ وہیں سے تو ہمارے جیون میں بدلاؤ آیا تھا۔ تو نے سچ کہا تھا کہ دینے والے کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔'' چندو نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز انداز میں کہا۔

''سریتا! صرف دینے کے انداز نہیں اوپر والے کے لینے کے انداز اس سے زیادہ نرالے اور انوکھے ہوتے ہیں۔''

سریتا نے متعجب نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

چندو نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''آج میں تجھے ایک ایسی سرگزشت ایسی کتھا سنانے جارہا ہوں کہ آئندہ تجھے مجھ سے کوئی استفسار کوئی سوال نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ دولت کس کی تھی، کس طرح ہمارے پاس آئی اور اب کس طرح حقدار تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سب کاریگری اس کرتار کی ہے۔ جس نے اس سارے سنسار کو پیدا کیا ہے۔ تو نے بھی درست ہی کہا تھا کہ دولت جس راستے سے آئی ہے، اسی راستے سے چلی جائے گی۔''

سریتا نے ہڑبڑا کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا ...... کیا...... اصل مالک کو پتا چل گیا کہ اس کے دھن سے بھری اٹیچی ہمارے پاس ہے۔ ہائے بھگوان! اب کیا ہوگا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آج تم دونوں لڑکوں میں سے کسی کا انتخاب کر کے آئے ہو گے اور ہم جلدی سے اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے چین کی سانس لیں گے لیکن تم نے تو کہانی ہی دوسری چھیڑ دی۔''

چندو کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ صوفے کے کشن کا سہارا لے کر وہ اور پھیل کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جلائی اور ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کے مرغولوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

''بس اب درمیان میں کچھ نہ بولنا۔ میں بولوں گا اور تو سنے گی۔ اٹیچی میں ملنے والا دھن، میرے کاروبار کے ذریعے اس دھن کی بڑھوتری، ہماری بیٹی چاندنی اور اس کی شادی اور یہ دونوں لڑکے اشیش اور سدرشن ...... سب ایک ہی کڑی کے حصے ہیں۔ قصہ دراصل کچھ یوں ہے کہ اس رات ایک سندری جو بالکل پریوں کے مافق تھی، میری ٹیکسی میں بیٹھی اور منزل پر پہنچنے پر ٹھہرنے کے لیے کہہ کر ایک سنسان اور غیر روشن بنگلے میں داخل ہوئی۔ چند لمحوں بعد مجھے اس عورت کی چیخ سنائی دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس ویران بنگلے میں داخل ہوگیا۔ بنگلا تو تاریک تھا لیکن جس کمرے میں روشنی تھی، میں نے ادھر کا رخ کیا اور دروازے کی جھری سے اپنی آنکھیں اور کان لگا دیے۔ اندر کا منظر مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ اس حسینہ نازنین کے سامنے سفید شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس ایک ہینڈسم شخص کھڑا ہوا تھا۔ عمر کوئی تیس بتیس کے قریب ہوگی۔ وہ اس عورت سے مخاطب تھا اور انتہائی درشت لہجے میں کہہ رہا تھا...... جب تک میری ڈیمانڈ نہیں پوری کرو گی میں تمہارے فوٹو گراف اور خطوط نہیں دوں گا۔ عورت لرزیدہ آواز میں اس سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی۔ اٹیچی کھول کر اسے رام کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی تجوری سے فی الحال اتنا ہی نکال سکی ہے۔ باقی وہ بعد میں دے دے گی۔ لیکن اس شخص کے سینے میں دل کی جگہ شاید پتھر تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں پسیج رہا تھا۔ عورت بلبلا کر اپنے ننھے منے بچے کی دہائی دے رہی تھی کہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر آئی ہے اور اس کا شوہر انتہائی شریف اور باوفا انسان ہے۔ تم میرے ہنستے بستے گھر کو نہ خراب کرو۔ اس شخص نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا اور کہا...... مسز امریتا اگر وال! بہت سستی چھوٹ رہی ہو۔ میرے خبری نے تو میرے کان میں سرگوشی کی ہے کہ سیٹھ اگر وال کروڑ پتی آدمی ہے۔ پھر کیوں کنجوسی کر رہی ہو۔ تیری نازک کلائی... اسی لیے تو مروڑی تھی کہ سیٹھ کی ساری دولت کا تخمینہ تجھے یاد آجائے لیکن تو تو یوں چیخنے لگی جیسے تو نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ بھول گئی اپنے محبوب کو اپنے پریمی کو جس کی ایک نظر کے لیے تو ترستی تھی۔ کالج کی ساری لڑکیاں تجھ پر رشک کرتی تھیں کہ راجن گپتا تجھے پسند کرتا ہے اور تو بھی اپنے بھاگ پر ناز کرتی تھی۔ کیا سب برین واش کر دیا؟ مجھ سے بڑا دھن وان ہے نا تیرا پتی۔ اس کا دھن سمپتی دیکھ کر تیرے ماتا پتا نے مجھے ٹھکرایا۔

''امریتا ناگن کی طرح پھنکاری اور انگارے چباتے ہوئے بولی ...... جھوٹ کہہ رہے ہو تم۔ میرے ڈیڈی نے تمہارے بارے میں چھان بین کی تو پتا چلا کہ تم انتہائی بیڈ کریکٹر کے انسان ہو۔ عورت، جوا اور شراب کے رسیا۔ محنت مشقت اور کمانا دھمانا تم سے ہوتا نہیں ہے اور اپنے پرکھوں کی دولت پر عیاشی کرتے پھرتے ہو۔ میرے ڈیڈی کو جو تمہارے بارے میں رپورٹ ملی تھی، وہ غلط بھی نہیں تھی۔ بھگوان کا شکر ہے کہ میری شادی تم سے نہیں ہوئی۔ ورنہ ساری عمر روتے روتے ہی گزر جاتی۔ تم تو میرے شوہر

کے چرنوں کی دھول بھی نہیں ہو۔ کہاں وہ کہاں تم ...... توبہ...... چھی...... میں بھی کتنی مورکھ اور نادان تھی۔ جو تجھ جیسے لوفر کو اپنا ہار سنگھار مان کر اپنا سب کچھ دان کرنا چاہتی تھی۔ تیری پوجا کرتی تھی اگر تو مجھے بلیک میل کر کے اپنا اصلی روپ نہ دکھاتا تو ساری زندگی برہا کی آگ میں جلتی رہتی اور اپنے ماتا پتا کو کوستی رہتی۔ میرے باپ نے تو مجھے ایک سکھی سنسار دیا ہے۔ میں اپنی گھر گرہستی میں بہت خوش ہوں۔ اشیش کی پیدائش کے بعد ہماری خوشیاں اور بڑھ گئی ہیں لیکن تجھ جیسے لٹیرے نے میرا جیون نرک بنا رکھا ہے۔ ایک عرصے سے میں اپنے شوہر کی محنت کی کمائی تیری نذر کررہی ہوں۔ اس کے ساتھ بے وفائی کررہی ہوں۔ اب یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔ تو ایک پیٹ پھٹا راکھشس ہے۔

''غصے کی شدت سے اس کی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ خوبصورت آنکھیں چھم چھم برس رہی تھیں۔ گلابی گال سرخ ہوگئے تھے۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد اس نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنا چہرہ چھپا کر آواز کے ساتھ رونے لگی۔ راجن نامی وہ شخص اب بھی ڈھٹائی سے اس سے رقم بڑھانے کا مطالبہ کررہا تھا۔ امریتا نے مشتعل اور کٹیلے لہجے میں کہا۔ اب تک تو اپنی عزت اور اپنا گھر بچانے کے لیے میں تجھے بہت کچھ دیتی رہی ہوں لیکن ابھی اسی لمحے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ تو ایسا ناگ ہے جو مسلسل دودھ پیتا رہے گا اور مجھے ڈستا رہے گا۔ اس لیے آج اس قصے کو میں ختم کردیتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بڑا سا پرس کھولا اور اس میں سے نیلا جھلملاتا ہوا خنجر نکالا جس کا پھل بجلی کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کررہا تھا۔ نرم و نازک ہاتھوں میں خنجر ایک لمحے کے لیے کپکپایا لیکن پھر اس نے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور راجن گپتا کی طرف بڑھی اور چاہا کہ اس پر وار کرے لیکن راجن نے پوری طاقت سے اس کے ہاتھ سے خنجر چھینا اور اس پر یوں جھپٹا جیسے شکاری اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ اور...... اور...... پھر اچانک وہ سب ہوگیا جسے سوچ کر آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سندرتا کی وہ مورت ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی تھی۔ اس کی ساکت اور بے نور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس کے ملکوتی حسن کو دیکھ کر اپنی سدھ بدھ بھول گیا تھا لیکن اس کی لاش اور گاڑھا گاڑھا سرخ خون دیکھ کر اپنے ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہوگیا۔

چھوٹی سی بات

☆ بدصورت چہرہ بدصورت دماغ سے بہت بہتر ہے۔

☆ وقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنا ماضی، حال، مستقبل دیکھ سکتا ہے۔

☆ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے جنہیں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔

☆ خوش اخلاقی پر کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کا وقار بڑھا دیتی ہے۔

☆ آسمان اس پرندے کا نہیں جس کے پر بڑے ہوں، آسمان اس پرندے کا ہوتا ہے جس میں قوتِ پرواز ہے۔

☆ بارش چیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے دھو نہیں سکتی۔

مرسلہ: وزیر محمد خان ۔ بٹل ہزارہ

میں ٹکٹکی لگائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب راجن گپتا بالکل میرے قریب سے گزرا۔ وہ خود بھی اتنا حواس باختہ تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس بلڈنگ میں اس کے اور امریتا کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ حتیٰ کہ دولت سے بھری اس اٹیچی کو بھی اٹھانا بھول گیا جس کے کارن اس نے اتنا بڑا پاپ کیا۔ جب وہ گاڑی لے کر نکل گیا، تب میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گہنے اور کرنسی سے بھری ہوئی وہ اٹیچی اٹھائی اور گلبدن کو فراٹے سے بھگاتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا۔ تو مجھ سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی لیکن میں نے یہ راز تجھ پر آشکار نہیں کیا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ تو اگر منہ سے بھاپ بھی نکالتی تو بات پھیلتے دیر نہیں لگتی اور پھر پولیس مجھے دھر لیتی۔ امریتا مرڈر کیس کا اس وقت میڈیا میں خوب چرچا تھا۔ پولیس قاتل کی بو سونگھتی پھر رہی تھی۔ امریتا کا شوہر مہیش اگروال کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ کافی اثر رسوخ والا اور بااثر آدمی تھا، اگر پولیس ذرا سا بھی سراغ پالیتی تو کھینچا تانی میری بھی ہوتی۔ اس وقت ہمارے گھر میں... ٹی وی تو تھا نہیں اس لیے میں روزانہ اخبار خرید کر اس کیس کی تفصیل پڑھا کرتا تھا۔ بہرحال پولیس کے ہاتھ راجن گپتا کی گردن تک نہیں پہنچ سکے کیونکہ وہ بنگلا راجن گپتا کے ایک دوست کا تھا جو ان دنوں ملک سے باہر تھا۔ اس لیے چند

مہینوں اس کیس کا غلغلہ رہا پھر اس کے بعد گزرتے ہوئے وقت نے اس کیس کی فائل کاغذات کے ڈھیر تلے دبادی۔ معاملہ جہاں سے شروع ہوا تھا، وہیں جا کر تھم گیا۔ ساری بات ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔

''میں نے سارے زیور گہنوں کو خفیہ طریقے سے پگھلا کر اور پھر اسے فروخت کر کے اپنے نئے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ کیش کو بھی مارکیٹ میں آہستہ آہستہ لایا۔ ان ہی دنوں کھام گاؤں والے چاچا کا دیہانت ہوگیا۔ یہ میرے لیے گولڈن چانس تھا۔ میں نے سب کے سامنے اور دوست احباب میں اس بات کی تشہیر کی کہ میرا چاچا چونکہ کنوارا تھا اس لیے اس کی ساری دھن دولت کا میں اکلوتا وارث ہوں۔ لوگ میرے نصیب پر رشک کرنے لگے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ چاچا گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان اور ایکڑ دو ایکڑ زمین چھوڑ کر مرا تھا۔ ہمارے دھن وان بننے کا سارا دارومدار مہیش اگروال اور امریتا اگروال کی دولت پر تھا۔ اگر اس رات راجن گپتا بھاگتے وقت وہ اٹیچی اٹھالیتا تو شاید آج بھی ہم مہرولی کے اس چھوٹے سے مکان میں بیٹھے ہوتے۔ میں آج بھی ٹیکسی چلا رہا ہوتا اور ہماری چاندنی جو عشق محبت کے گیت الاپ رہی ہے، وہ بھی روزی روٹی کے چکر میں کہیں چھوٹی موٹی ملازمت کر رہی ہوتی لیکن بھگوان کی دیا سے اگروال خاندان کا پیسا ہمیں ایسا راس آیا کہ کاروبار میں دن بدن ترقی ہوتی چلی گئی۔ گزرے ہوئے کل کی پرچھائیں بھی ہم نے اپنی بیٹی پر نہیں پڑنے دی۔ جیون کے سارے سکھ ہمارے اور ہماری بیٹی کے قدموں میں آن گرے تھے لیکن آج مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اوپر والے نے مجھے صرف اس پیسے کا رکھوالا بنایا تھا۔ مجھ سے کٹھن محنت بھی اس لیے کروائی کہ اس دولت کی بڑھوتری ہوتی رہے اور سمے آنے پر حقدار تک اس کا حق پہنچادوں۔ آج جب میں اشیش کے گھر میں داخل ہوا تو برسوں بعد پھر وہی چہرہ میرے سامنے تھا۔ دیوار پر اسی عورت کی تصویر لٹک رہی تھی۔ یعنی امریتا اگروال کی جو میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوئی تھی۔ جب اشیش نے بتایا کہ یہ تصویر اس کی ماں کی ہے تو میری بولتی بند ہوگئی۔ چیک اور کیش یہ سوچ کر لے گیا تھا کہ اپنی دولت میں اشیش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کردوں گا اور وہ خودبخود میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ اصل ادھیکاری تو میرے سامنے کھڑا ہے۔ کنگال تو دراصل میں خود ہوں۔ میرے پاس تو صرف بیٹی ہے۔ باقی ساری دولت تو اشیش کی ہے۔ پھر بتا میں اسے کیا دیتا اور کیا بولتا۔ اس کی بوڑھی دادی سے کرید کرید کر اگروال پریوار کے ماضی کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ وہ انتہائی معصوم اور بھولی بھالی پرانے وقتوں کی عورت ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ اپنے دکھ درد بیان کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں یہ بات عیاں کر دی کہ اشیش جب بہت چھوٹا تھا، کسی نے اس کی بہو کو قتل کر دیا تھا۔ قتل کا معما آج تک حل نہ ہوسکا۔ یہی غم اس کے بیٹے مہیش اگروال کو چاٹ گیا۔ اس کے مرتے ہی گردشِ دوراں نے ان کے گھر کا رخ کر لیا۔ مہیش کا بزنس، کوٹھی اور بے شمار دولت اس کا بزنس پارٹنر ہڑپ کر گیا۔ اشیش اور اس کی دادی نے بہت سخت دن گزارے ہیں لیکن اشیش کی دادی نے ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے پوتے کو پڑھایا لکھایا۔ اسے اچھے سنسکار دیے۔ بہت ہونہار اور بھلا لڑکا ہے۔ بہت جلد میڈیکل کی پڑھائی مکمل ہوجائے گی۔ آگے کے لیے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ گیت سنگیت کا بھی دیوانہ ہے کیونکہ اس کی آواز بڑی مدھر اور لوچ دار ہے۔ اس لیے شوبز والے بھی اسے بار بار کال کررہے ہیں۔''

بولتے بولتے چندو سانس لینے کے لیے رکا اور دبی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے پھر گفتگو کا سلسلہ ہموار کیا اور بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''سریتا! نیلی چھتری والے کی لیلا دیکھ، کیسے ادبدا اور عجیب وغریب کھیل ہیں اس کے، بس میں تو یہی کہوں گا کہ عجب تیری کاریگری رے کرتار، سمجھ نہ آئے مایا تیری بدلے رنگ ہزار۔''

سریتا کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ لحہ بہ لحہ اس کا اضطراب اور بے قراری بڑھ رہی تھی۔ چندو دم لینے کے لیے رکا تو اس کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ''ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟''

چندو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گونج دار آواز میں جواب دیا۔ ''ہاں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ تجھے اس دورنگی دنیا کی نیرنگیاں دکھاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگیا۔ سریتا کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ شوق اور دلچسپی سے ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ اس لیے بے چین تھی کہ چندو پھر زبان کھولے۔ چندو اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے پھر سے اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دیتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا اور بولا۔

''اب تجھے تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہوں۔ تجھے پتا ہے نا کہ میں ذرا من موجی قسم کا آدمی ہوں۔ جو من میں

سماجاتی ہے وہ ضرور کر کے رہتا ہوں۔ بس دل نے صدا دی کہ چلتے چلتے سدرشن کی فیملی کے بھی درشن کرلوں۔ یہ سوچ کر گاڑی ''سدرشن بھون'' کی طرف موڑ دی۔ بڑی عالیشان کوٹھی ہے۔ سارا گھرانا مجھے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ اور سجاؤ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں چاندنی اور سدرشن کے بیاہ کی تاریخ پکی کرنے آیا ہوں لیکن میں نے فوراً ان کی غلط فہمی دور کر دی کہ میں تو یوں ہی گھومتے پھرتے ادھر آ نکلا ہوں۔ بہرحال ان لوگوں نے بھرپور طریقے سے میرا سواگت کیا۔ کشاں کشاں ڈرائنگ روم میں لے کر گئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی معاً میری نگاہ سامنے دیوار پر لگے پورٹریٹ کی جانب اٹھی اور اٹھی ہی رہ گئی۔ سانس سینے میں ہی اٹک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے قاتل راجن گپتا کا پورٹریٹ تھا۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے لڑکھڑاتی آواز میں استفسار کیا...... یہ کون مہاشے ہیں جن کا پورٹریٹ اتنے آدرسمان کے ساتھ آپ نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھا ہے؟ بہت کچھ سمجھ تو میں بھی گیا تھا لیکن جان کر انجان بن کر سوال داغ دیا۔ سدرشن کی ماں کملا دیوی نے اپنی پُرنم آنکھوں کو ساڑی کے آنچل سے رگڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا...... بھائی صاحب یہی تو ہیں سدرشن کے سورگ باشی پتا راجن گپتا۔ کینسر کا مرض ایسا لگا کہ ان کی جان ہی لے کر ٹلا۔ اب تو بس ان کی نشانی میرے یہ دو بچے ہیں۔ اس نے سدرشن اور اپنی بیٹی راگنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اب بھی اس پورٹریٹ کو گھورے جا رہا تھا۔ بالآخر کملا دیوی میرا انہماک اور محویت دیکھ کر سمجھ گئیں کہ میں راجن گپتا کو جانتا ہوں۔ وہ مستفسر ہوئی...... بھائی صاحب کیا آپ میرے آنجہانی پتی سے مل چکے ہیں۔ میں بری طرح ٹپٹا گیا۔ دل و دماغ کے پردۂ تصور پر صرف ایک تصویر چل رہی تھی۔ امریتا کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش اور راجن گپتا کا خونخوار چہرہ اور خون آلود خنجر۔ میرا سارا وجود ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھا۔ بدقت تمام میں نے زبان کھولی اور بولا...... شاید کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا ہے۔ دراصل اس عمر میں یادداشت بھی تو ساتھ نہیں دیتی ہے۔ کملا دیوی فوراً بولی...... جی ہاں درست کہہ رہے ہیں آپ۔ ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن مجھے وہاں سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ اس لیے میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ سب بے چین ہو گئے۔ کملا دیوی نے بوکھلا کر کہا...... ارے بھائی صاحب! آپ ابھی تو آئے ہیں، پہلی بار آپ کے شبھ قدم ہمارے گھر آئے ہیں۔ بغیر آؤ بھگت کے ہم آپ کو کبھی نہیں جانے دیں گے۔ پھر اس نے پاس بیٹھی ہوئی بیٹی کو ٹہوکا دیتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا...... راگنی! شاموکاکا سے کہو کہ انکل ہمارے ساتھ ہی ناشتا کریں گے لیکن لڑکی کے اٹھنے سے پہلے ہی میں کھڑا ہو گیا اور بغیر کسی تاخیر کے فوراً باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ان سبھوں کی آنکھوں میں نہ صرف حیرانی بلکہ مایوسی بھی تھی۔ چہرے بری طرح لٹک گئے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے جرنلسٹ دوست اجیت کپور کے گھر پہنچا۔ شہر میں کس جگہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو چکا ہے اسے سب خبر ہوتی ہے۔ سدرشن کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو اس نے سارا ڈیٹا میرے سامنے رکھ دیا۔ بیٹا پورا پورا باپ پر گیا ہے۔ سر سے پیر تک قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک نمبر کا نکما اور نکھٹو ہے۔ بیٹی بھی آرام طلب اور نت نئے فیشن کی دلدادہ ہے۔ اپنے سارے مسائل کا حل ان کے پاس یہ ہے کہ سدرشن کی کسی دولت مند گھرانے میں شادی ہو جائے تاکہ ان کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔ اسی لیے وہ ہمارے گھر رشتہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔''

سریتا پتھر کی بت بنی ساری کتھا سن رہی تھی۔ شوہر کے خاموش ہوتے ہی وہ چونکی اور ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ''ہائے چندو! حالات اور واقعات نے کیسا تری کون (مثلث) بنایا ہے اور کس طرح اصل حقدار کو سامنے لا کر مجرم اور پاپی کے خاندان کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ اگر آج حقیقت کا پتا نہیں چلتا تو یقیناً تم نہ میری سنتے نہ اپنی بیٹی کی مانتے اور سدرشن کے خاندان پر اپنی بیٹی اور دولت کی بلی چڑھا دیتے۔ کتنا بڑا انیائے کر رہے تھے تم اپنی بیٹی کے ساتھ۔ وہ شاید تمہیں معاف کر دیتی لیکن بھگوان تمہیں کبھی نہ معاف کرتا۔ بہرحال اب تو آئینے کی طرح ہر بات صاف و شفاف ہے۔ پھر اب کیا فیصلہ کیا ہے؟''

چندو نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے ایک طویل انگڑائی لی اور مطمئن لہجے میں بولا۔ ''ارے پگلی! ہم کیا اور ہمارے فیصلے کیا۔ یہ سنجوگ یہ فیصلے تو اوپر والا ہی کرتا ہے جس کا مال ہے ہمیں اسے ہی لوٹانا ہے۔ بلکہ ہم تو بیاج میں اسے اپنی سندر، سوشیل اور انمول بیٹی بھی دے رہے ہیں۔''

باپ کی زبانی ساری کہانی اور خصوصاً آخری جملے سن کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ قسمت کے ستارے یوں بھی مسکراتے ہیں، اسے معلوم نہ تھا۔

سوانگ

جمال دستی

انسانی دماغ جہاں حقیقت میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے وہاں انسان کو محض خیالات کے گھوڑے پر بٹھا کر انتہائی بلندیوں پر بھی لے جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نفسیاتی مریض نے ایک دلچسپ سوانگ بھرا اور لوگوں کو حیران کردیا۔

روپ بدلتے لوگ اور حالات بدلتے لمحات کا انوکھا انداز

ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرین ویلنٹائن جب اسپتال کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسی لمحے سنہرے بالوں والی ایک نوجوان عورت کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس عورت نے سفید رنگ کا لیب کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے نیم ٹیگ پر ڈاکٹر ٹی فشر لکھا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سر ہلا دیے۔

مارگریٹ اور اس کا پانچ سالہ بیٹا چارلی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا نوعمر بیٹا ڈیرک اسپتال کے بیڈ

پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

''ارے مس ویلنٹائن!'' مارگریٹ نے اس پر نگاہ پڑتے ہی حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیا عمدہ سرپرائز ہے۔''

''مریض کا کیا حال ہے؟'' فرین ویلنٹائن نے ڈیرک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' ڈیرک نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔ ''بس ڈیڈی مجھے میری موٹر سائیکل بدستور اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دیں گے تو بہت اچھا رہے گا۔''

''تمہاری خواہش اور تمہارے لیے گڈلک!'' فرین یہ کہہ کر اس کے چھوٹے بھائی کی طرف گھوم گئی۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی، چارلی۔ بعض اوقات اسپتال کی انتظامیہ چھوٹے بچوں کی اسپتال میں آمد کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرلیتی ہے۔''

''ڈاکٹر فشر نے ہمیں چارلی کے اپنے بھائی کی عیادت کے لیے آنے کی اجازت دے رکھی ہے۔'' مارگریٹ نے بتایا۔

''یہاں کمرے میں آتے ہوئے میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔'' فرین نے کہا۔ ''اسے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔''

''وہ بڑے غضب کی شے ہے۔'' ڈیرک نے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''کیا وہ انستھیسیا لوجسٹ ہے؟'' فرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بغیر کسی دوا کے مریض کو بے ہوش کردیتی ہے؟''

''آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں کہ میرے کہنے کا کیا مطلب تھا!'' ڈیرک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر وہ دونوں ہنس دیے۔

''زیادہ خوش فہمی میں مبتلا مت ہو، ینگ مین۔'' ڈیرک کی ماں مارگریٹ نے کہا۔ ''اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی موجود تھی۔''

''میں نے تو نہیں دیکھی۔''

''وہ اس لیے کہ تم اس کی نیلی آنکھوں کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ میری نگاہ اس کی انگوٹھی پر اس وقت پڑی تھی جب اس نے سرنج تمہارے بازو میں داخل کی تھی اور تمہارا خون نکال رہی تھی۔''

''کیا اور بھی ٹیسٹ ہونے ہیں؟'' فرین نے پوچھا۔

مارگریٹ نے اثبات میں سرہلادیا۔ ''ہمیں بتایا گیا ہے کہ شاید کل تک وہ ڈیرک کو اسپتال سے ریلیز کردیں گے۔''

''میرا خیال تھا کہ اس قسم کے کام عام طور پر نرسیں کیا کرتی ہیں...... جیسے انجکشن لگانا، ٹیسٹ کے لیے خون لینا، دوا پلانا وغیرہ وغیرہ!''

''ڈاکٹر فشر نے بتایا کہ وہ یہ کام خود کیا کرتی ہے۔ جب ہم نے اسے دیکھا تو وہ دونوں مرتبہ تنہا ہی آئی تھی۔''

یہ سن کر فرین اپنی ٹھوڑی کھجانے لگی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔''

مارگریٹ نے اس بات پر شانے اچکادیے۔ ''اس کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ البتہ وہ عمدہ ڈاکٹر لگتی ہے۔''

''لیکن اسے صحیح سنائی نہیں دیتا۔'' کمسن چارلی نے تبصرہ کیا۔

فرین یہ سن کر پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟''

''وہ میرے ٹیڈی بیئر پر کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے اس کا نام پکارا لیکن اس نے میری آواز نہیں سنی۔ مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک وہ چلی نہیں گئی۔ تب میرے ٹیڈی بیئر کو اس سے چھٹکارا ملا۔''

فرین نے جھک کر چارلی کے ٹیڈی بیئر کا بغور جائزہ لیا جو اس نے اپنے ہاتھوں میں دبوچا ہوا تھا۔ ''اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ اب تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

چارلی نے سنجیدگی سے اثبات میں سرہلادیا۔ ''جی میڈم! بس ذرا سا پچک گیا ہے۔ وہ سپر پاور کا حامل ہے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' فرین نے چارلی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور سیدھی کھڑی ہوگئی۔ پھر ان لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے کمرے سے باہر آگئی۔

کوریڈور میں پہنچ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اپنی بیٹی لوسی کو فون کیا جو کاؤنٹی شیرف بھی تھی۔

پندرہ منٹ بعد لوسی بھی وہاں آن پہنچی۔

''میں اس طرح وارد ہونے پر معذرت چاہتی ہوں۔'' لوسی نے مارگریٹ سے کہا پھر اس کے بیٹے سے بولی۔ ''تمہاری ٹانگ کیسی ہے، ڈیرک؟''

''اب تو بہت بہتر ہے، شیرف!''

''ماما! کیا آپ ایک منٹ کے لیے باہر آسکتی ہیں؟'' لوسی نے فرین سے کہا۔

باہر کوریڈور میں پہنچ کر لوسی نے اپنی ماں سے کہا۔

''آپ نے فون پر مجھے جو کچھ بتایا تھا، کیا اس بارے میں آپ پُریقین ہیں؟''

''میرا یقین پختہ ہے جبھی تو میں نے اس معاملے کو چیک کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔'' فرین نے جواب دیا۔ ''میرے خیال سے ہمارا قدم نرسوں کے اسٹیشن کی طرف ہونا چاہیے۔''

ان دونوں نے پہلے فلور نرس سے بات کی جس نے انہیں پرسونیل آفس سے رابطہ کرنے کو کہا۔

وہاں انہیں ڈاکٹر ٹیری فشر کی تصویر دکھائی گئی۔ تصویر میں نظر آنے والی عورت درمیانی عمر کی تھی۔ اس کے بال اور آنکھیں دونوں سیاہ رنگ کے تھے۔

دس منٹ بعد مختلف ہالز میں گشت کرتے ہوئے انہیں سنہرے بالوں والی ڈاکٹر فشر دکھائی دے گئی۔ فرین نے تو اسے پہلے ہی دیکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔

منٹوں ہی میں سچ سامنے آ گیا۔

شیرف لوسی ویلنٹائن سنہری زلفوں والی عورت کو اپنے ہمراہ لے گئی۔ فرین واپس ڈیرک کے کمرے میں آ گئی اور ان لوگوں پر حقیقت آشکار کر دی۔

''تو وہ ایک بہروپیا تھی؟'' مارگریٹ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''حقیقت میں وہ یہاں اسپتال کی ایک مریضہ ہے...... نفسیاتی وارڈ کی مریضہ۔'' فرین نے کہا۔ ''اس نے شیرف کے روبرو اعتراف کیا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایک ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔''

''کیا کسی ڈاکٹر کا سوانگ بھرنا جرم نہیں ہے؟''

''یقیناً جرم ہے۔ جبھی تو شیرف اسے اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔'' فرین نے جواب دیا۔

''وہ اسپتال میں ہر کسی کو بے وقوف بنانے میں کس طرح کامیاب ہوئی؟''

''ویل، حقیقی ڈاکٹر فشر نئی ہے اور فی الحال چھٹی پر ہے۔ اس عورت نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے وارڈ کے فلور سے چپکے سے کھسک کر باہر آ گئی تھی اور اسے اسٹاف کے لاکرز میں ڈاکٹر فشر کا لیب کوٹ رکھا ہوا مل گیا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر فشر کا لیب کوٹ پہن کر راؤنڈ کرتی رہی جیسے کہ وہ جانتی ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے۔''

پھر فرین، ڈیرک کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''جب اس نے تمہیں سرنج کی سوئی چبھوئی تھی تو تمہیں تکلیف ہوئی تھی؟''

''بہت زیادہ۔'' ڈیرک نے جواب دیا۔

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اصلی ڈاکٹر نہیں ہے؟'' مارگریٹ نے فرین سے پوچھا۔

''پہلے تو میں اس بارے میں پُریقین نہیں تھی۔ پہلا شبہ تو چارلی کی بات پر ہوا تھا۔''

''کس بات پر؟''

''یہی کہ چارلی کے اس کا نام پکارنے پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس کا اصلی نام نہیں تھا!''

''تو میں نے اسے پکڑوانے میں مدد کی ہے؟'' ننھے چارلی نے پوچھا۔

''ویل...... کیا تمہیں معلوم ہے کہ کسی شبہے کی تصدیق کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''نہیں میڈم۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہاں، تم نے اسے پکڑوانے میں مدد کی ہے!''

ننھا چارلی یہ سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

مارگریٹ بدستور اچنبھے میں تھی۔ اس کی تیوریوں پر ابھی تک بل پڑے ہوئے تھے۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑی۔ ''تمہیں سب سے پہلے اس پر شبہ کس بات پر ہوا تھا؟''

''مجھے تمہاری بات پر شبہ ہوا تھا!''

''میں نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی جو تمہیں اس پر شک ہو گیا تھا؟'' مارگریٹ نے حیرت سے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ جب وہ عورت سرنج سے ڈیرک کا خون لے رہی تھی تو تم نے اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی دیکھی تھی...... یاد ہے؟''

''ہاں...... تو پھر؟''

''ایک اصلی ڈاکٹر یا نرس اس قسم کے کام کرتے ہوئے ہاتھوں میں ڈسپوزیبل دستانے لازمی پہنے رکھتا ہے اور دستانوں کی موجودگی میں انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔'' فرین نے وضاحت کی۔

مارگریٹ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی تم بہت ہوشیار اور ذہین ہو، فرین!''

فرین نے اس ستائش پر ننھے چارلی کی طرف دیکھا اور اسے آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ''سپر پاور کا حامل صرف تمہارا ٹیڈی بیئر ہی نہیں ہے اور لوگ بھی ہیں۔''

اور پھر کمرے میں ان سب کے قہقہے گونجنے لگے۔

ذرا سی بات

ناہید سلطانہ اختر

بات اگرچہ ذرا سی ہی تھی مگر... رسوائی نے اس کا جہاں تک پیچھا کیا اتنا اس کا قصور نہ تھا جبکہ... ظلم ڈھانے والے بھلا کب یہ سوچتے ہیں کہ ہماری ذرا سی غلط روش سے کسی کے گھر میں آگ لگ سکتی ہے اور جب کسی کو عین بہاروں میں کانٹوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا جائے تو... تا زیست ان کانٹوں کی چبھن اس کے تعاقب میں دوڑے چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ظالم یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کی رسّی اگر ڈھیلی ہے تو وہ وقت ان کی توبہ کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے لیکن افسوس... کیسی توبہ اور کس کا تائب ہونا... جب قسمت میں یہ نیکی نہ لکھی ہو تو طرح طرح کی بیماریاں اور آزمائشیں انہیں اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ حتیٰ کہ وہ انہی اذیتوں میں مبتلا رہ کر اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں... وہ بھی خوب صورت خواب آنکھوں میں سجائے پیا دیس اتری تھی مگر ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دے کر دھتکار دی گئی کیونکہ وہ ایک بدکردار عورت بنادی گئی تھی... جبکہ نیک کردار لوگ بھی زندگی میں کبھی سکون نہ پاسکے۔

انتہائی معمولی بات اور زیست کی کٹھن راہوں پر مشکل امتحانات سے

گزرنے والی ایک عورت کے صبر کی داستان

وہ ایک خط!

گمنام اور بے رحمانہ خط!

اس ایک تحریر کی چند سطروں نے شاہینہ کی بیاضِ زندگی کے تمام جلی اور روشن حروف پر سیاہی پھیر دی تھی۔

وہ ایک خط جس کا حرف حرف جھوٹ کی زہرناکی میں ڈوبا ہوا تھا، اس کی زندگی کی تمام سچائیوں کو نگل گیا تھا۔

بے وقری کا دکھ اس نے تنہا نہیں جھیلا تھا۔ اس کی بیٹی علینہ نے بھی اس دکھ کی اذیت سہی تھی!

اس چند سطری تحریر کو لکھنے والا کوئی بہت ہی پاپی اور بے ضمیر شخص تھا جس نے ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچا کہ اس کی جلائی یہ دیا سلائی کسی کی پوری زندگی کو بھسم کرسکتی تھی۔ لکھنے والے نے تو شاید اسے کھیل ہی سمجھا تھا مگر اس کھیل نے شاہینہ کو جیتے جی برزخ میں ڈال دیا تھا!

☆☆☆

شبِ عروسی گزر گئی تھی۔

شاہینہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی بستر سے اٹھ بیٹھی تھی۔ نماز کی بروقت ادائیگی کم عمری سے اس کا معمول رہی تھی۔ امی نے اپنے تمام بچوں کو پنج وقتہ نماز کا پابند رکھا تھا۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے ہی وہ ہولے ہولے سب کو نام بہ نام پکارنا شروع کردیتیں۔ ''اٹھ جاؤ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔'' فجر کی اذان کے ساتھ ہی یہ امی کا ان سب کے لیے گویا مشترکہ اعلامیہ ہوتا۔ آگے پیچھے سب اٹھ جاتے اور یوں گھر میں فجر کی اذان کے ساتھ ہی چہل پہل ہوجاتی۔ وضو کے بعد لڑکے ابا کے ساتھ محلے کی مسجد کا رخ کرتے۔ لڑکیاں امی کے ساتھ اپنے اپنے مصلے پر کھڑی ہوجاتیں۔ مصلے بٹے ہوئے تھے۔ نیلا مخملیں امی کا، سبز مسجد نبوی کی شبیہ والا سبینہ آپا کا، چاکلیٹی پھول بوٹوں کے حاشیے والا شاہینہ کا اور کاہی سادہ محراب والا روبینہ کا۔ ابا صرف فجر کی نماز باقاعدگی اور نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے باقی تو جیسے استغفر اللہ انہیں معاف تھیں۔ امی باوجود کوشش کے انہیں باقی چار نمازوں کا پابند نہ کرسکی تھیں۔

''صبح لگوالی ہے حاضری۔'' وہ کہتے۔

غنیمت تھا کہ وہ ایک وقت تو حاضری لگوالیتے تھے۔ ورنہ وہ نہایت دنیادار سے آدمی تھے۔ لڑکپن میں اپنے دوستوں کے بہکائے میں آکر گھر سے بھاگ لینے کے بعد وہ زمانے کی بہت سی آلائشوں کا شکار ہوگئے تھے۔ امی سے ان کی شادی ایک حادثہ ہی کہی جاسکتی تھی ورنہ کہاں ایک دیندار گھرانا اور کہاں دنیاوی آلائشوں میں الجھا ایک نوجوان جس کے بارے میں رشتہ کروانے والوں نے امی کے گھر والوں سے یہ غلط بیانی کی تھی کہ سینتالیس کے فسادات میں وہ اپنے گھر والوں سے بچھڑنے کے بعد رُل کھل کر بڑا ہوا تھا۔ نانا جنہیں پانچ جوان بیٹیوں کے فرض سے سبکدوشی کی عجلت تھی، زیادہ چھان بین میں نہ پڑے۔ رشتہ بتانے والے کی بات کا اعتبار کیا اور امی کو سادگی سے ابا کے عقد میں دے دیا۔

ابا کے جوہر تو شادی کے بعد بتدریج کھلے!

مگر شاباش تھی امی کو جو زبان پہ حرفِ شکایت لائے بغیر ساری زندگی ابا کے ساتھ گزار گئیں۔ بھوک بھی سہی، ابا کی مار بھی جو ہمیشہ ہی بلاوجہ بلاسبب ہوتی۔ ابا پیٹ کے ایسے ہلکے تھے کہ برسوں بعد جاکر تو اپنے خاندان کے بارے میں بتایا جو دور افتادہ ایک شہر میں شرفاء کا خاندان تھا۔ امی کا ان لوگوں سے رابطہ ہوا تو انہوں نے امی کو بڑی تکریم دی مگر ابا کی شخصیت میں جو بگاڑ اور فساد غلط صحبت سے آچکا تھا، وہ مرتے دم تک ان کے ساتھ رہا۔ صحبت نے پورا اثر دکھایا تھا مگر اولاد کچھ باپ کی طرف سے خاندانی اثر سے اور کچھ امی کی تربیت کے طفیل ابا سے بالکل مختلف نکلی۔ شریف، دیندار اور ان آلائشوں سے قطعی طور پر مبرّا جن میں ابا گرفتار تھے۔ بیٹے چاروں نہایت سعادت مند، محنتی اور ایماندار...... بیٹیاں نیک، حیا پرور اور گھر دار۔

چاروں بھائیوں نے مل جل کر کاروبار کر رکھا تھا جس میں اللہ نے ان کی نیک نیتی اور ایمانداری اور امی کی دعاؤں کے سبب بہت برکت دی تھی۔ جتنی تنگدستی امی نے شوہر کے غیر ذمے دارانہ رویے کے باعث دیکھی تھی، بیٹوں کے کاروبار کے باعث اب اتنی ہی خوشحالی تھی گھر میں۔ دو بیٹوں کی شادی ہوچکی تھی، سبینہ آپا امی کے خاندان ہی میں بیاہی گئی تھیں۔

شاہینہ کے لیے ایک غیر خاندان سے رشتہ آیا۔ لڑکے کی دو بہنیں تھیں دونوں شادی شدہ۔ بھائی اکلوتا تھا، بہت پہلے والدین کے انتقال کے بعد بھائی دونوں بہنوں کو باوجود یہ کہ دونوں ہی اس سے بڑی تھیں، سرپرست بن کر ان کے گھر بار کا کیا تھا۔ اپنا گھر تھا، سرکاری نوکری تھی۔ کوئی بڑا عہدہ نہ تھا مگر عزت سے گزارہ ممکن تھا۔ رشتہ امی کی ایک جاننے والی کے توسط سے آیا اور اس نے لڑکے کی شرافت اور اس کے گھرانے

کی نجابت کی ایسی پُرتاثیر تصویر کشی کی کہ شاہینہ کے گھر والوں کا دل ٹھک گیا۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا، بھائیوں نے امی سے صلاح چاہی۔ امی نے اپنی شادی کے نتیجے میں اپنے بڑوں کے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ اولاد کے رشتے ناتے کرتے ہوئے مال دولت نہیں، دینداری اور خاندان دیکھا جائے اور اس سلسلے میں اچھی طرح چھان بین کرلی جائے۔ شاہینہ کے لیے آنے والے رشتے کے بارے میں بھائیوں نے جہاں جہاں سے پوچھ گچھ کی، یہی پتا چلا کہ شریف خاندان ہے۔ لڑکے میں کوئی اخلاقی عیب نہیں۔ مالی طور پر بہت مستحکم نہ سہی تو کمزور بھی نہیں، گھر آنے والی لڑکی کو خوش رکھ سکتا ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد اسی نے دو بڑی بہنوں کو ان کے گھر بار کا کیا تھا، نوجوانی ہی میں کاندھوں پر آپڑنے والی ذمے داریوں کے باعث مزاج تحکمانہ ہونے کی خبر بھی ملی مگر یہ کوئی عیب نہ تھا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے تو یہی اتفاق ہوا کہ مرد کا تحکم مزاج ہونا کوئی بری بات نہیں، مرد دبنگ ہی اچھا لگتا ہے۔

لہٰذا ہاں ہوگئی۔

شادی کی تاریخ ٹھہرنے کے بعد شاہینہ کے اپنے گھر میں دو ڈھائی ماہ تک شادی کی تیاریوں کا وہ غلغلہ رہا کہ ہر دن پر روزِ عید اور ہر رات پر شب برات کا گمان ہوتا۔ امی، بہنیں، بھائی سب نہایت مسرور تھے۔ شادی کی تیاریوں میں بھائیوں کی فیاضی دیدنی تھی، جہیز کی تیاری کے لیے انہوں نے ماں بہنوں کو پیسے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ہر روز خریداری ہوتی، ہر روز قریبی رشتے دار گھر آتے جاتے اور رات گئے تک گھر میں جگار ہتی۔ کبھی خالہ زاد بہنیں رہنے کو آجاتیں، کبھی ماموں زاد بہنیں ہاتھ بٹانے کو آجاتیں۔ کبھی تایا کی بیٹیاں گھر کی رونق بڑھانے آجاتیں، کبھی پھوپی زاد بہنیں جہیز کی تیاریاں دیکھنے آجاتیں۔ شادی کی تقریب کے لیے شہر کے ایک بڑے اور مہنگے میرج ہال کی بکنگ کروالی گئی تھی ... شادی کی ضیافت میں شامل کھانوں میں بھائیوں نے خاصے تنوع کا اہتمام سوچ رکھا تھا۔ پیسا ہو اور دل کھلا تو اسے خرچ کرنے کی تدبیریں خود ہی سوجھنے لگتی ہیں۔

شاہینہ کا جہیز دیکھنے والوں کی آنکھیں گرما گیا۔ جس نے دیکھا تعریف کی اور یہی کہا۔ ''بھائی ہوں تو ایسے......''

شادی نہایت شان سے ہوئی۔

پچھلی رات شاہینہ کے لیے خوشیوں بھری رات تھی، میکے والوں کی دعاؤں اور آنسوؤں کی رم جھم میں رخصت ہو کر سسرال پہنچنے پر اس کی نندوں اور دیگر سسرالی رشتے داروں نے کتنے ہی شگون پورے کیے۔ سسرال کی دہلیز پر اس کے پاؤں دودھ سے دھلوائے گئے۔ جس محبت اور وقار سے اس کے میکے والوں نے اسے وداع کیا تھا۔ اس نے سسرال میں بھی اس کی قدر و منزلت بڑھا دی تھی۔

شاہینہ خوش تھی۔ ساجد اسے خاصا ذمے دار سا آدمی لگا تھا، گزشتہ شب اسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آنے کے بعد وہ تادیر مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا۔ بطور شگون اس کے ساتھ بھجوایا جانے والا کھانا رشتے داروں کے ہاں بھجوانے، بہنوں، ان کے بچوں اور شادی میں شرکت کے لیے دور دراز علاقوں سے آئے مہمانوں کے لیے آرام کا بندوبست کرنے کے بعد ہی وہ کمرائے عروسی میں آیا تھا۔

''اکیلا مرد ہوں اس لیے سارے کام مجھ ہی کو دیکھنے پڑتے ہیں۔'' کمرے میں دیر سے آنے پر اس کے لہجے میں عذر خواہی تھی۔

شاہینہ سے اس نے کوئی لمبے چوڑے وعدے وعید نہیں کیے بس اتنا کہا۔ ''میری پوری کوشش ہوگی کہ تم اس گھر میں خوش رہ سکو۔''

شاہینہ جس کا بچپن امی کو نہایت سخت زندگی گزارتے ہوئے دیکھتے گزرا تھا، بڑی صابر اور کم گو سی لڑکی تھی۔ اسے ساجد کا یہ سادہ سا عہد بھی خدا کی عنایت لگی۔

صبح فجر کے وقت اس کے اٹھتے ہی وہ بھی جاگ گیا۔

''کیا ہوا؟''

''نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔ ''میں گیزر آن کرتا ہوں۔''

اسے اچھا لگا کہ کل تک غیر ایک شخص کے لیے وہ اتنی اہم ہوگئی تھی کہ اس کے نیند سے بیدار ہوتے ہی وہ بھی جاگ گیا تھا اور اب اس کے لیے گرم پانی کا بندوبست کرنے کو گیزر آن کرنے اٹھ گیا تھا۔

نہا دھو کر اس نے کمرائے عروسی کے ایک گوشے ہی میں نماز ادا کی۔ وہ دو کپ چائے بنا لایا۔ ایک اس کے لیے دوسرا اپنے لیے۔

''چائے کے ساتھ کچھ لوگی؟''

''نہیں۔''

''ویسے میں دیسی، انگریزی ہر طرح کا ناشتا بھی

بنا سکتا ہوں۔"

"ناشتا امی کے ہاں سے آئے گا۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"ریت ہے...... پہلے دن ناشتا میکے سے آتا ہے۔"

"یاد آیا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں بھی لے کر گیا تھا اپنی بہنوں کے گھر مگر...... تمہارے گھر والے تکلیف نہ کریں تو اچھا ہے۔"

"منع کر سکتے ہیں تو کر دیں۔"

"نئی نئی سسرال ہے، بُرا نہ مان جائیں۔"

"سنا تو یہ تھا کہ آپ کسی کے اچھا یا بُرا ماننے کی پروا نہیں کرتے۔" شاہینہ نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جب اصول کی بات ہو...... یہ روایت کا معاملہ ہے۔"

ساجد کی بہنیں، ان کے بچے اور دوسرے مہمان جاگے تو وہ دونوں بہت سی باتیں کر چکے تھے۔

امی کے ہاں سے خاصا پُر تکلف ناشتا وافر مقدار میں بھجوایا گیا تھا۔ مزید اہتمام کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تاہم ساجد مہمانوں کی خاطر داری میں لگا رہا۔ ناشتے کے بعد دُلہا دلہن کو تھوڑی سی دیر کو تخلیہ میسر آیا پھر شام کو دعوتِ ولیمہ کا ہلہلا مچ گیا۔ دعوتِ ولیمہ میرج ہال میں ہونا تھی مگر انتظامات کی نگرانی خود ساجد ہی نے کرنا تھی۔ شاہینہ کو بیوٹی پارلر بھی پہنچانا تھا۔ وہاں اس کی آراستگی کے بعد گھر پھر گھر سے میرج ہال۔

"میں دیکھ رہی ہوں سارے کام آپ ہی کو کرنا پڑ رہے ہیں۔" شاہینہ نے اس سے آہستگی سے کہا۔

"میرے کام ہیں تو میں ہی کروں گا نا۔" وہ اس کی ولیمے کی بھاری بھرکم پوشاک اور زیورات کے ڈبوں سے بھرا تھیلا اٹھاتے ہوئے بولا۔

شاہینہ نے تو ابا کو کبھی بھی ایسی ذمے داری کا مظاہرہ کرتے نہ دیکھا تھا بلکہ وہ تو اپنے گھر میں مہمان ہی بنے رہتے تھے۔ پانی بھی پینا ہوتا تو امی کو آواز لگاتے۔

"زرینہ! ایک گلاس پانی تو پلانا۔"

جب تک جیے امی ان کی بندیِ بے دام بنی رہیں۔ گاڑھے مسالے میں بھنے گوشت کے پارچے، گرما گرم پھلکے، کھڑے چاول، ٹھنڈا پانی...... امی ان کے لیے ہر روز ایک نیا کھانا بناتیں۔ کھانے کی ترکیبوں کی ایک کتاب منگوا کر رکھ لی تھی انہوں نے گھر میں، اسی میں سے دیکھ دیکھ کر نت نئی ترکیبیں آزماتیں۔ شاہینہ کو کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ اسی کو کیا سبینہ آپا اور روبینہ کو بھی...... امی کی تربیت نے انہیں عمدہ کھانا پکانا سکھا دیا تھا۔ امی کہتی تھیں۔ "مرد کے دل کو جانے والا راستہ اس کے معدے سے ہو کر جاتا ہے۔"

"ہمارے ابا کا معدہ بہت پکا ہے۔ دل کو جانے والا راستہ بلاک رکھتا ہے۔" بھائی مذاقاً کہتے۔

"شرم نہیں آتی باپ کے لیے ایسی بات کرتے ہو۔" امی آنکھیں دکھاتیں۔

"ارے میری پیاری، میری سادی ماں...... تم جیسی بیوی تو اللہ ہر مرد کو دے۔" بھائیوں میں سے کوئی امی کو پیار سے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنا سر بصد عقیدت ان کے شانے یا بازو سے لگا دیتا۔

"خوشامدی ٹٹو۔" امی پیار سے ہاتھ جڑتیں۔

"ارے تمہاری نہیں تو پھر کس کی خوشامد کریں گے۔ کیا ابا کی جو کبھی منہ بھی نہیں لگاتے۔"

"ارے بیٹا! ان کی اپنی زندگی اپنوں سے بچھڑ کر ایسی ہی گزری ہے نا...... ان بے چارے کو پتا ہی نہیں محبت کیا ہوتی ہے۔"

"معاف کرنا امی، آپ نے تو ساری زندگی انہی سے محبت کی...... بس چلتا تو مجسمہ بنا کر پوجنا شروع کر دیتیں۔"

"ہاں، گناہ نہ ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتی۔" امی اعتراف کرتیں۔

اسی لیے ابا کی موت کے بعد امی دنوں یا مہینوں نہیں برسوں اداس رہیں بلکہ اب بھی تھیں۔ جہاں ابا کا ذکر ہوتا ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی مغفرت کی دعا کرتیں۔ ایسی شوہر پرست عورت مرد کو قسمت سے ملتی ہے جو شوہر کی سختیاں جھیل کر بھی اس کی زندگی میں اس کی خیر کی اور موت کے بعد مغفرت کی دعائیں مانگے جو بلا سبب شوہر کی مار کھا کر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی ہو۔

شام کو تقریبِ ولیمہ میں بھی ساجد دُلہا بن کر دلہن کے پہلو میں بیٹھا رہنے کے بجائے میزبان بنا مہمانوں کی پذیرائی میں مصروف رہا۔ شاہینہ کے گھر والوں کی اس نے غیر معمولی گرمجوشی سے خاطر داری کی۔ کھانے کے دوران ایک ٹانگ سے کھڑا ویٹرز کو خود ہدایات دیتا رہا تاہم گاہے بگاہے وہ اسٹیج پر بیٹھی شاہینہ کے پاس بھی حاضری دیتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں شاہینہ کے لیے غیر معمولی وارفتگی تھی،

محبت تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کسی بچے کو اپنا من پسند کھلونا پا کر اسے بار بار دیکھنے اور اپنے سے جدا نہ کرنے کی ہوتی ہے!

دعوتِ ولیمہ نصف شب تک جاری رہی، گھر لوٹتے لوٹتے ڈھائی بج گئے۔ دونوں بہنوں، بہنوئیوں اور ان کے بچوں کے علاوہ باقی سب مہمان میرج ہال ہی سے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ بہنیں، ان کے شوہر اور بچے بھی بس چوتھی کی دعوت تک مہمان تھے پھر انہیں بھی اپنے اپنے گھر چلے جانا تھا۔

شاہینہ کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے کمرائے عروسی تک پہنچا کر وہ پھر باہر چلا گیا تھا۔ ''میں ذرا دیکھ لوں کہ سب لوگ آرام سے لیٹ گئے ہیں کہ نہیں۔'' اس کی مراد بہنوں، ان کے شوہروں اور ان کے بچوں سے تھی۔ شاہینہ کا تھکن سے برا حال تھا۔ انتظار کا یارانہ تھا۔ زیورات، میک اپ اور ولیمے کا بھاری جوڑا اتار کر اس نے ہلکا سا جوڑا پہنا اور کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ کمرا اس کے بدن سے اٹھتی ابٹن اور حنا کی مہک، جہیز میں ملی شینل فائیو پرفیوم اور مسہری کے چہار اطراف تنی گلاب کی لڑیوں کی باسی پڑتی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ وہ خوش تھی۔ دعوتِ ولیمہ میں ساجد نے اس کے گھر والوں کو کتنی تکریم دی تھی۔ بار بار امی کے پاس آ کر بڑی سعادت مندی سے ان کے پاس ذرا ہی دیر کو سہی، بیٹھتا رہا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ اس کا رویہ نہایت گرمجوشی کا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں محبت اور وارفتگی ہلکورے لیتی رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ راہوارِ زندگی اس مقام پر آ ٹھہرا تھا جو کسی بھی لڑکی کی من چاہی منزل ہوتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ نہایت مطمئن تھی۔ تھکن سے چور بدن کے ساتھ وہ بستر پر لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ جہیز میں ملے کوریا کے ڈبل پلائی نرم و ملائم کمبل نے ایسی حدت بہم پہنچائی کہ وہ گرد و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

تسکین بخش حدت ایک جھٹکے سے کمبل اس کے اوپر سے کھینچے جانے سے ٹھنڈک میں بدلی تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساجد مسہری کے نزدیک کھڑا نہایت غیظ و غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہوا۔ وہ نگاہیں جو شام بھر اسے محبت، گرمجوشی، وارفتگی اور للچاہٹ سے دیکھتی رہی تھیں یکایک اتنے غیظ و غضب بلکہ نفرت میں کیونکر ڈوب سکتی تھیں بھلا!

دھوکا نہیں حقیقت تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے ایک کاغذ مسہری پر پھینکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''کیا ہے؟'' اس نے مسہری پر پڑے کاغذ کو یوں دیکھا جیسے وہ کاغذ نہیں کوئی بلا تھی جو اچانک ہی اس کے بسترِ عروسی پر وارد ہو گئی تھی۔

''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ غرایا۔ اس کے بگڑے تیور کسی طوفان کا پیش خیمہ دکھائی دیتے تھے۔

''کچھ پتا تو چلے۔'' وہ بھونچکا تھی۔

''پڑھو اسے اور شرم ہو تو ڈوب مرو۔'' وہ جو کل رات سے ابھی کچھ دیر پہلے کمرائے عروسی سے باہر جانے تک اسے پسندیدگی اور محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا، اب اسے نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی انگلی بستر پر پڑے کاغذ کی جانب اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شاہینہ نے بستر پر پڑا کاغذ اٹھایا اور ساجد کو اندیشہ بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کاغذ اپنی نگاہوں کے روبرو کر لیا۔ ایسا کیا تھا اس مڑے تڑے سے کاغذ میں جس نے اس کے نئے نویلے شوہر کو اس قدر برافروختہ کر دیا تھا۔

نہایت خوش خط اور پختہ تحریر تھی۔ شاہینہ جوں جوں اس کاغذ پر درج عبارت پڑھتی گئی، اس کی سانس کی لے دھیمی ہوتی چلی گئی۔

لکھنے والے نے ساجد کو بنام مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ساجد صاحب۔ السلام علیکم۔

سمجھ میں نہیں آتا آپ کو شادی کی مبارک باد دی جائے یا غلط لوگوں میں آپ جیسے شریف آدمی کے پھنس جانے پر آپ سے اظہارِ ہمدردی کیا جائے۔

جس گھر میں آپ نے شادی کی ہے، ایک نیچ گھرانا ہے۔ ان لوگوں کا ماضی نہایت شرمناک ہے۔ افسوس کہ آپ ان کے اجلے لباس، چکنی چپڑی باتوں اور پیسے کی ریل پیل سے دھوکا کھا گئے۔ سارا حرام کا پیسا ہے۔ انہوں نے دنیا کے دکھانے کو کاروبار کر رکھے ہیں مگر یہ کالے دھندوں والے لوگ ہیں۔ ان کے مرد بھی خراب ہیں اور عورتیں بھی۔

جس لڑکی سے آپ نے شادی کی ہے، وہ بھی اچھے کردار کی نہیں ہے۔ ہم بہن بیٹیوں والے لوگ ہیں، کیا

بتائیں کہ اس لڑکی کے لچھن کیا ہیں۔ کس کس کے ساتھ اسے گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ اللہ معافی! دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑکی آپ سے وفا نہیں کرے گی۔

ویسے آپ کو رشتہ کرنے سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں چھان بین ضرور کرلینی چاہیے تھی۔ خیر اب بھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ آپ مرد ہیں، برے لوگوں سے جتنی جلدی ممکن ہو اپنی جان چھڑائیں اور عزت بچائیں۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اپنی شناخت ظاہر کرنے سے قاصر ہوں۔ راہِ اللہ آپ کو یہ معلومات دے رہا ہوں، امید ہے کم لکھے کو زیادہ سمجھیں گے۔ ان لوگوں سے جان نہ چھڑائی تو ان کی اصلیت ظاہر ہونے پر آپ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

والسلام

خیر اندیش!''

شروع تا آخر مکمل تحریر پڑھنے کے بعد شاہینہ نے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''یہ آپ کو کس نے دیا؟''

''مجھے کسی نے نہیں دیا۔'' وہ جھینکا۔ ''نعیم بھائی کو گیٹ کے پاس پڑا ملا ہے۔''

نعیم، ساجد کے بڑے بہنوئی کا نام تھا۔

''اور انہوں نے اسے پڑھ بھی لیا ہے۔'' ساجد نے شاہینہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔''

''تو سچ کیا ہے؟'' وہ اس کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ کر اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے غرایا۔

وہ دم بخود اس کا منہ دیکھنے لگی۔

سچ کیا تھا، وہ خود جانتی تھی۔ وہ سب لوگ جانتے تھے جو اسے اور اس کے گھر والوں کو جانتے تھے۔ یہ سچ تھا کہ ابا کچھ اچھے آدمی نہیں تھے مگر اس کی ماں تو ایک نیک صفت اور شوہر پرست عورت تھی جس نے ایک بے رحم اور غیر ذمے دار مرد کے ساتھ نہایت صبر و شکر اور قناعت کے ساتھ زندگی نباہی تھی۔ اسی صبر و شکر اور قناعت کا ثمر تھا شاید کہ اللہ نے اسے نیک اور سعادت مند اولاد سے نوازا تھا۔ بیٹے باپ کے برعکس نہایت متحمل مزاج اور فرض شناس...... بیٹیاں ماں کی طرح نیک طینت اور گھردار۔ قدرت نے ہاتھ تھام لیا تھا۔ بیٹوں نے زیرو سے معاشی زندگی شروع کی تھی۔ مسلسل لگن، محنت اور دیانت سے ہیرو بن گئے تھے۔ خاندان بھر میں ان کی شرافت اور سعادت مندی کی مثالیں دی جاتیں۔ ماں ہی نہیں اس باپ کے سامنے بھی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے جس نے کبھی ان کی پروا ہی نہ کی تھی۔ سعادت مند اولاد کے طفیل اب اس گھر میں خوشحالی تھی۔ فراوانی تھی جسے دیکھ کر اپنوں میں سے بعض خوش ہونے والے تھے تو بعض حاسدین بھی تھے۔

بھائیوں میں اعظم سب سے بڑا تھا پھر عاصم، اس کے بعد ہاشم آخر میں دائم۔ تین بہنوں میں سبینہ آپا سب سے بڑی تھیں پھر شاہینہ اور اس کے بعد روبینہ۔

اعظم اور عاصم کی شادی ہوچکی تھی۔ دونوں بہوئیں غیر خاندانوں سے آئی تھیں۔ امی کی خواہش تو یہی تھی کہ اپنے خاندان کی لڑکیاں ان کے گھر آتیں، رشتے بھی طے کردیے تھے، دونوں بیٹوں کے لیے بہن کی بیٹیاں مگر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بدخواہوں کی بدخواہی کی وجہ سے رشتے جڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ گئے۔ امی تو کہتی تھیں حاسدوں کی نظر لگ گئی جو نہ صرف بنتے رشتے ٹوٹے بلکہ اصل رشتوں میں بھی ایسی دراڑ پڑی کہ خالہ کے گھرانے سے تعلقات نہایت کشیدہ ہوگئے۔ اعظم اور عاصم کی شادی خاندان سے باہر غیر لوگوں میں کرنا پڑی۔ دونوں کی بیویاں عیش کررہی تھیں۔

اپنی زندگی کے تلخ اور تکلیف دہ تجربے کے پیشِ نظر امی نے بیٹوں کے ساتھ تینوں بیٹیوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اور اپنے پیروں پر کھڑا کردینا ضروری سمجھا تھا۔ لڑکی کے مقدر کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ امی نے بھی سوچا تھا بھلا کہ ان کا مقسوم ایسے آدمی سے جڑے گا۔ عورت تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہو تو ویسی صعوبت تو نہیں اٹھاتی جیسی خود امی نے ابا جیسے بدکماؤ، غیر ذمے دار اور صرف اپنی ذات کے حصار میں جکڑے خود غرض شوہر کے ساتھ کاٹی تھی۔ ساری زندگی بال بچوں کی بنیادی ضرورتوں سے بھی انہوں نے لاتعلقی برتی تھی۔

سبینہ آپا نے بی اے، بی ایڈ کے بعد ایک اسکول میں ملازمت کرلی تھی۔ ان کی شادی دور پار کے مگر اپنے ہی رشتے داروں میں ہوئی تھی شادی کے بعد ان کے میاں نے ان کی ملازمت چھڑوادی تھی۔ اب آپا گھر اور بچے سنبھالتیں اور بس۔

شاہینہ نے بھی بی اے کے بعد بی ایڈ کیا تھا اور ایک سرکاری اسکول میں نوکری کرلی تھی۔ نہایت سادگی پسند، کم گو اور امی کی طرح صابر و شاکر تھی۔ کوئی زیادتی کرتا تو چپ

چاپ سہہ جاتی۔ بیمار پڑتی تو.... آہ نہ کراہ۔ امی کہتیں۔
"شاہینہ کی بیماری کا پتا تو اس وقت چلتا ہے جب چپ چاپ بستر پر پڑ جاتی ہے۔" شاہینہ کو اکثر لڑکیوں کی طرح زیادہ بولنے کی عادت بھی نہ تھی۔ زیادہ گھومنے پھرنے کی شوقین بھی نہ تھی۔ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی اس کا یہی معمول رہا تھا۔ نوکری کے بعد اسکول بس کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ ڈرائیور گھر کے گیٹ سے اسے اٹھاتا اور واپسی پر گیٹ کے سامنے ہی ڈراپ کرتا۔ اسکول میں اس کی ساتھی لڑکیاں کبھی کبھار اکٹھے شاپنگ کا پروگرام بناتیں تو اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دیتیں مگر وہ معذرت کر لیتی۔ شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی جاتی۔ اس کے اسکول کی ساتھی کہتیں۔ "کیسی عجیب لڑکی ہو تم...... شاپنگ بھی گھر والوں کے ساتھ...... یار بندے کو کچھ پرسنل چیزیں بھی تو خریدنا ہوتی ہیں۔"

"سبینہ آپا لا دیتی ہیں۔" وہ جواباً کہتی۔

"بہت پھپھڑ ہو!"

"بس عادت ہے...... مجھے بازاروں میں زیادہ گھومنا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔" وہ مسکرا کر کہتی۔

"دیکھیں گے...... جب شادی ہو جائے گی تو میاں جی کے کپڑے بھی تم ہی کو خریدنے پڑا کریں گے۔"

"میں ایسے میاں جی سے شادی ہی نہیں کروں گی۔" وہ کہتی۔

"دیکھیں گے۔"

خاندان میں شاہینہ کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ باہر رشتہ کرنا پڑا۔ اس کی شادی ابا کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد ہوئی تھی۔ بھائیوں نے اسے نہایت دھوم دھام اور عزت ووقار سے اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ سارا خاندان اس کی شادی میں شریک ہوا سوائے خالہ کے گھرانے کے جن سے اعظم اور عاصم کے رشتے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کشیدگی ہو گئی تھی۔ امی نے اسے اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کیا تھا مگر زندگی کے اس نئے سفر کے دوسرے ہی دن ناؤ منجدھار میں ڈولنے لگی تھی۔

"اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور ان سے کہو تمہیں آ کر لے جائیں۔" اس کا شریک سفر کہہ رہا تھا۔

"نہیں!" وہ کانپ کر رہ گئی۔

"میں گندگی اور ذلت کا یہ ٹوکرا ساری زندگی اپنے سر پر رکھ کر نہیں چلنا چاہتا۔" ساجد نے اسے نہایت حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کمرے کے کھلے دروازے میں ساجد کی دونوں بہنیں پہلو بہ پہلو آ کھڑی ہوئی تھیں۔ شاہینہ نے انہیں مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے بھائی تک آ پہنچیں۔

"جب یہ کہہ رہا ہے اپنے گھر والوں کو بلا لو تو بلا لو۔" ان میں سے ایک نے شاہینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب سو چکے ہوں گے۔" وہ سراسیمہ ہو رہی تھی۔

"صبح تک انتظار کر لو ساجد۔" دوسری بہن نے بھائی سے کہا۔

"نہیں ...... میں انتظار نہیں کر سکتا...... ساری زندگی سر اٹھا کر چلا ہوں۔ تمہارے شوہر نے یہ خط پڑھ لیا ہے۔ وہ اوروں کو بھی بتائیں گے...... میں لوگوں سے نظریں چرا کر نہیں جی سکتا۔" ساجد کے لہجے میں غم وغصہ جھلک رہا تھا۔

شاہینہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"سنا نہیں میں نے کیا کہا۔" ساجد نے آنکھیں نکالیں۔ "اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹو۔"

"پلیز!" شاہینہ گڑگڑائی۔

"پلیز ولیز کچھ نہیں۔" ساجد نے چٹکی بجائی۔ "جاؤ یہاں سے...... تمہارے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔"

"امی صدمے سے مر جائیں گی۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"انہیں مر ہی جانا چاہیے۔" ساجد نے نہایت بے رحمی سے کہا۔

اتنے بے رحم تو ابا بھی نہ تھے جنہیں اپنے پرائے بھی ظالم کہتے تھے۔

"آپ سمجھائیں نا انہیں۔" شاہینہ نے بے چارگی سے دونوں نندوں کو دیکھا۔

"آپا صحیح کہہ رہی ہیں، صبح تک انتظار کر لو ساجد۔" پہلی بہن نے دوسری کی بات دہرائی۔

"کوئی انتظار نہیں...... آپ دونوں کو معلوم ہے میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو کر لیتا ہوں...... میں نے اسے طلاق دی۔" اس نے اپنی انگلی شاہینہ کی طرف اٹھائی۔

شاہینہ کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

شاہینہ نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کا دل

جیسے ساکت ہونے لگا تھا۔

''نہیں ...... پلیز نہیں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی اور ایک ہی جست میں بستر سے اتر کر اس کے قدموں میں جاگری۔ ''آپ کو اللہ کا واسطہ۔'' وہ اس کے قدموں میں پڑی دونوں ہاتھ جوڑے سر کو عقبی رخ پر جھکائے اسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''شاہینہ بیگم! میں نے تمہیں تین طلاقیں دیں۔'' وہ رعونت سے بولا۔

شاہینہ کو یوں لگا جیسے وہ گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں ڈوب گئی تھی...... موت شاید اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتی ہوگی!

''امی...... امی جی...... امی جی......'' وہ ہر تکلیف، ہر دکھ بٹا لینے والی ماں کو پکار رہی تھی۔

''اس کے گھر والوں کو فون کریں اور کہیں لے جائیں اسے۔'' ساجد کی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

صرف ایک رات!

ایک رات سہاگن رہ کر وہ مطلقہ بھی ہوگئی تھی...... بنا کسی خطا کے...... بغیر کسی غلطی کے!

اذیت سی اذیت تھی!

وہ اس اذیت کا کرب سہہ نہیں پا رہی تھی۔

ایک روز قبل ایجاب و قبول کے دو بول اس کا مقسوم ایک غیر شخص سے نتھی کر گئے تھے اور ایک دن بعد ہی اس شخص نے ایک ہی جملے کی تین مرتبہ تکرار سے اس بندھن کو یکایک نہایت بے رحمی سے توڑ دیا تھا!

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بکھرا جھوٹ اژدھے کی طرح اس کی ساری زندگی کو نگل گیا تھا۔

☆☆☆

قیامت تنہا اسی پر نہ ٹوٹی تھی، پورے گھرانے پر! شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ امی، بہن، بھائی، بھاوجیں سب دم بخود تھے۔ اپنے دکھ سے زیادہ یہ فکر مارے دے رہی تھی کہ دنیا کو منہ کیونکر دکھائیں گے۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے، کہتے کا منہ کس نے پکڑا ہے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں...... کون یقین کرے گا اس بات کا کہ کسی دشمن کے گمنام خط نے یہ فساد پھیلایا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی دن کون طلاق دیتا ہے بیوی کو جب تک کوئی بہت ہی بڑی بات نہ ہو۔

امی غش پہ غش کھا رہی تھیں۔ بھائی رنج و الم کی تصویر بنے، سر پکڑے، ہارے ہوئے جواریوں کی طرح بیٹھے تھے۔ بھاوجیں جلے پاؤں کی بلی بنی کبھی ایک تو کبھی دوسرے کمرے میں پھر رہی تھیں۔ چھوٹی بہن ہراساں شاہینہ کا منہ تک رہی تھی۔ شاہینہ کے آنسو نہ تھم رہے تھے۔ کسی بیوہ کی طرح اجاڑ اور سوگوار وہ نیم جان سی بیٹھی تھی۔ ابھی تو اس کے بدن میں ابٹن کی مہک اور ہاتھوں سے حنا کی خوشبو بھی باسی نہ ہوئی تھی۔ ابھی تو اس کے بالوں میں موتیا کے گجروں کی خوشبو بسی تھی۔ ہنستے بستے گھر پر اچانک یہ کیسی افتاد آ پڑی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ کنواری ہی بیٹھی رہتی۔ گاہے بگاہے امی کے منہ سے بے اختیار نکلنے والی درد انگیز کراہ شاہینہ سمیت گھر کے دیگر افراد کے رنج و ملال میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

اپنے بدخواہ اور دشمن کی تلاش میں ان سب کا دھیان بار بار خالہ کے گھرانے کی طرف جا رہا تھا جن سے اعظم اور عاصم کے رشتوں کے ٹوٹنے پر کشیدگی ہوئی تھی۔

''ارے ظالمو! میری بچی کا گھر بگڑوانے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ تمہارے اپنے گھر میں بہنیں، بیٹیاں ہیں۔'' امی ململا رہی تھیں۔

شاہینہ کو اپنی ذلت کا دکھ مارے دے رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے کس قدر بے ہودہ اور رکیک الزام لگایا تھا اس پر۔ غیر مردوں کے ساتھ گھومنا پھرنا تو کجا وہ تو خاندان کے مردوں سے بھی فاصلہ رکھتی تھی۔ وہ دل گرفتہ تھی کہ یہ جھوٹا، گھناؤنا اور گھٹیا الزام نہ جانے زندگی کے کس موڑ تک اس کا تعاقب کرے گا۔

مہر کی رقم زیادہ نہ تھی۔ دو دن بعد تحریری طلاق نامہ بھی وصول ہوگیا۔ مہر کی رقم اور جہیز بھی واپس بھجوا دیا گیا۔ شاہینہ کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ سسرال میں آباد ہونے سے پہلے ہی وہ برباد ہوگئی تھی۔ اپنے پرایوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا رکھی تھیں۔ پیٹھ پیچھے جتنے منہ تھے اتنی باتیں!

''ارے بھئی کوئی بڑی بات ہوگی ورنہ ایک رات کی دلہن کو کون یوں فارغ کرتا ہے۔''

''خط کا تو بہانہ لگتا ہے۔ بات کچھ اور ہی ہے۔''

''ضرور کچھ ایسا ویسا ہی ہوگا جو شوہر نے دوسرے ہی دن چلتا کیا۔''

''ایک گمنام خط پر اتنا بڑا قدم کون اٹھاتا ہے بھلا...... آخر لڑکے والوں کی بھی تو جگ ہنسائی ہوئی ہوگی...... بے سبب اپنے آپ کو تماشا کون بناتا ہے۔''

تماشا تو شاہینہ بنی ہوئی تھی۔ عزیزوں، رشتے

داروں، دوستوں، ملنے جلنے والوں سبھی کو پتا چل گیا تھا حتیٰ کہ اس کے اسکول بھی خبر جا پہنچی۔ اسکول میں اس کی ساتھی تو اس گمان میں تھیں کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دعوتیں کھانے اور سیر سپاٹے کرنے میں مصروف ہوگی۔ یہ خبر پہنچی تو اس کی ایک ہم پیالہ، ہم نوالہ ساتھی نورین نے اسے فون کیا۔ دوبارہ اسکول نہ جانا ہوتا تو شاید شاہینہ اس کی کال ریسیو ہی نہ کرتی مگر اب تو نوکری جاری رکھنے کے لیے اسے بہرحال اسکول جانا تھا۔

''کیا حال ہے شاہینہ؟'' نورین کے لہجے میں احتیاط تھی۔

''زندہ ہوں۔''

''برامت منانا...... ایک خبر سنی ہے۔''

شاہینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''صبر کرو۔''

''نہیں آتا صبر نورین...... نہیں آتا۔''

''یار! ہم لوگ تو اسٹاف روم میں بات کررہے تھے کہ...... ایک گمنام خط پر تو کوئی بھی سمجھدار آدمی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاتا...... یا تو وہ شخص سائیکو تھا یا پھر...... کوئی ایسی بات تھی جو اسے لگ گئی۔''

''تم تو مجھے اتنے عرصے سے جانتی ہو نورین۔'' شاہینہ کو صفائی دینی پڑی۔

''ہاں ہاں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا...... اچھا خیر...... اسٹاف میں سے کچھ لوگ تم سے ملنے کے لیے تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔''

''آجائیں۔'' اس نے بادل ناخواستہ کہا۔

وہی ساتھی جو چند دن قبل ہی زرق برق کپڑوں میں ملبوس اس کی شادی کی تقریب میں آئی تھیں، پرسہ دینے والے انداز میں اس سے ملنے آئیں۔ ان کی نگاہوں میں تاسف اور ہمدردی کے ساتھ معنی خیزی بھی تھی۔

''اسکول کب آؤ گی؟'' ایک ساتھی نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک اور ساتھی نے پہلی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو یہ عدت میں ہوں گی۔''

''اپنی ارنڈ لیو کیوں ضائع کررہی ہو...... پچھلی چھٹی کینسل کراؤ اور عدت لیو کے لیے اپلائی کردو...... عدت کے لیے خصوصی چھٹی ملتی ہے۔'' ایک کہنہ مشق ساتھی نے مشورہ دیا۔

''مسز ابراہیم! شوہر کی ڈیتھ کی صورت میں تو عدت لیو ملتی ہے، کیا...... ڈیوورس کی صورت میں بھی؟'' مشورہ دینے والی ساتھی سے ایک دوسری ساتھی نے پوچھا۔

''یقین سے تو نہیں کہہ سکتی مگر میرا خیال ہے ملتی ہوگی...... شاہینہ! تم خود یا تمہارے گھر سے کوئی اسکول فون کرکے میڈم یا پھر آفس کلرک سے معلوم کرلے۔'' مسز ابراہیم بولیں۔

''اوکے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کاش! بدنامی کے اس داغ کے بجائے اسے بیوگی کی عدت گزارنی ہوتی!

☆☆☆

ستم بالائے ستم وہ امید سے ہوگئی۔ عورت پہلی بار ماں بننے جارہی ہو تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں رہتے۔ ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے۔ ماں بننے کا خیال اسے سرخ روئی بخشتا ہے مگر وہ تو شرم سے زمین میں گڑی جاتی تھی اور تو اور گھر میں اپنے خونی رشتوں سے نظریں نہ ملاپاتی۔ بھاوجوں سے اپنا بدن اور نگاہیں چراتی۔ دل ہی دل میں سوچتی لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ وہ میکے میں کچھ الٹا سیدھا کرکے سسرال گئی تھی تبھی تو شوہر نے دوسرے ہی دن چلتا کیا۔ عدت کا دورانیہ بھی طویل ہوگیا تھا، شریعت کے مطابق وضع حمل تک۔

اس کا خدشہ بے جا نہ تھا، اس کے امید سے ہونے کی خبر پر اپنے پرایوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوچکی تھیں۔

''ائے کچھ سنا...... شاہینہ ماں بننے والی ہے۔''

''گڑبڑ لگتی ہے۔''

''پکی پکی۔''

''اب پتا چلا کہ شوہر نے دوسرے دن ہی میکے کیوں چلتا کیا...... بھئی پتا چل گیا ہوگا نا اسے۔''

''توبہ توبہ! دکھنے میں کیسی معصوم اور شریف لگتی تھی۔''

''شوہر کوئی مرد بچہ تھا جس نے دوسرے کا گند اپنے سر پر اٹھانے کے بجائے دوسرے ہی دن فارغ کردیا۔''

گھر میں بھاوجیں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتیں۔ ایک روز سینہ آپا میکے آئیں تو امی سے بولیں۔ ''آپ کے داماد بھی چرکے لگانے سے چوکتے نہیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' امی نے تشویش سے پوچھا۔

''میں نے انہیں شاہینہ کے پریگننٹ ہونے کا بتایا تو کہنے لگے کیا تمہاری بہن یہ تحفہ لینے ہی گئی تھی ایک دن کے لیے سسرال۔''

امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کیا کریں

بیٹا...... کسی سے کچھ کہنے سننے کے نہیں رہے ہم لوگ...... مجھے تو روبینہ کی فکر ستائے جاتی ہے۔ اتنی بدنامی اور رسوائی کے بعد کون رشتہ لینے آئے گا ہمارے گھر۔''

''امی! شاہینہ ایسی کب ہے۔''

''یہ تو تم کہہ رہی ہو اور میں جانتی ہوں...... اپنا ایمان دوسروں کے دل میں ڈالنا بہت مشکل ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ۔''

شاہینہ پر ماں بہنوں کا یہی اعتماد تھا جو اس کڑے وقت میں اس کا سہارا اور تسلی کا موجب بنا ہوا تھا۔ امی کی موجودگی نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جب جب وہ یاس و ناامیدی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگتی، امی کا وجود اس کے لیے روشنی کا مینار بن جاتا۔

اس کی ناگہاں بربادی امی کے لیے ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن گئی تھی۔ انہیں اپنی بہن اور اس کے بچوں سے جن سے ان کا نہایت قربت کا رشتہ تھا، شدید نفرت ہوگئی تھی۔ انہیں سو فیصد شک اپنی بہن کے گھرانے پر تھا۔

''خدا انہیں بھی ان کی بیٹیوں کی طرف سے ایسے ہی بے کل کرے جیسے انہوں نے مجھ بیوہ کو کیا ہے۔'' امی کلپ کلپ کر کوستیں۔

اگرچہ خالہ اور ان کے سارے گھرانے کا یہ کہنا تھا کہ ان کا بہن کے گھرانے سے رنجش اور اختلاف اپنی جگہ لیکن شاہینہ کا گھر برباد کرنے کی مکروہ حرکت ان کے گھرانے سے کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا مگر امی اور دیگر اہلِ خانہ کو یقین تھا کہ یہ حرکت انہی میں سے کسی کی تھی بلکہ وہ سب تو نہایت وثوق سے کہتے تھے کہ اس گمنام مکتوب کی تحریر ہو بہو خالہ کی بڑی بیٹی کی تحریر لگتی تھی۔ خالہ کے گھر تک شاہینہ کے گھر والوں کی اس قسم کی باتیں مشترکہ جاننے والوں کے توسط سے پہنچتی رہتی تھیں۔

خالہ جن کا اپنی بہن کے گھر سے تعلق تقریباً ٹوٹ ہی چکا تھا اپنے گھرانے پر شک کیے جانے کی خبریں سن کر نہایت دل گرفتگی سے کہتیں۔ ''اگر میں نے یا میرے کسی بچے نے شاہینہ کے گھر میں آگ لگائی ہو تو خدا میرے اپنے آگے بھی ایسا ہی لائے۔''

واللہ اعلم بالصواب!

شاہینہ کے گھر والوں کے دل سے شک کسی صورت رفع نہ ہونے پاتا۔ امی قسم کھا بیٹھی تھیں کہ جیتے جی ان دشمنوں کا منہ ہرگز نہ دیکھیں گی جنہوں نے محض شاہینہ کا گھر ہی نہیں بگاڑا تھا، ان کے سارے گھرانے کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ زندگی میں دکھ، سکھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوشی اور غم ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں شاہینہ کی بربادی کا دکھ ایسا دکھ تھا کہ اس سے ملنے والی کلفت کو بڑی سے بڑی راحت بھی دل سے محو نہ کر پاتی!

☆☆☆

شومیٔ قسمت شاہینہ کے ہاں ولادت قبل از وقت ہی ہوگئی۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بنی تھی۔ بچی کی قبل از وقت ولادت نے بھی لوگوں کو منہ جوڑ کر باتیں بنانے کا موقع فراہم کیا۔

ساجد کو بچی کی ولادت کی خبر بھجوائی گئی تو اس نے نہایت سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ شاہینہ کی آنکھیں لگی رہیں۔ اسے یقین تھا ساجد بچی کو دیکھنے ضرور آئے گا، آخر اس کی اولاد تھی۔ اس کا اپنا خون...... اپنی اولاد سے کون بے رخی برتتا ہے۔ ابا، امی کے معاملے میں کیسے ہی ظالم سہی، بچوں سے انہیں بہت محبت تھی۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے تھے۔

ساجد نے انتہائی سنگدلی دکھائی۔ وہ نہ صرف بچی کو دیکھنے نہیں آیا بلکہ اس نے کہا۔ ''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، اسے میرا نام بھی نہ دیا جائے۔''

شاہینہ ڈٹ گئی۔ یہ اس کا نہیں اس کی بیٹی کی عزت کا معاملہ تھا۔

''وہ آئے یا نہ آئے...... بچی اسی کی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے باپ کا نام نہ دیا جائے۔'' شاہینہ نے کہا۔

ساجد کے رشتے داروں میں سے بھی کوئی بچی کو دیکھنے نہیں آیا۔ اسپتال سے بچی کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ لیتے ہوئے ولدیت کے خانے میں ساجد کا نام ہی لکھوایا گیا۔

شاہینہ کو اب نہ لوگوں کی استہزائیہ نگاہوں کی پروا تھی نہ ان کی الٹی سیدھی باتوں کی۔ اسے علینہ کی صورت جینے کا بہانہ مل گیا تھا۔ اس بچی کی خاطر وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔ کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔

☆☆☆

چھٹی ختم ہونے کے بعد شاہینہ نے دوبارہ اسکول جانا شروع کردیا۔ ابتدائی چند دن کٹھن تھے۔ بچی کو گھر میں چھوڑ کر اسکول جانا اور وہاں اکثر ساتھیوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا یقیناً مشکل تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ دونوں باتوں کی عادی ہوگئی۔ بچی کو اپنے گھر والوں کے آسرے پر گھر میں چھوڑ کر جانے اور ساتھیوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا

سامنا کرنے کی بھی! اس کی عدم موجودگی میں امی علینہ کا پورا خیال رکھتیں۔ انہوں نے ایک نہیں سات بچے پالے تھے۔ شاہینہ کو بچی کی پرورش کے سلسلے میں امی پر خود اپنے سے زیادہ بھروسا تھا۔ امی کے ہوتے اسے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کے لیے بچی کو ڈاکٹروں کے ہاں لیے پھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کتنے بہت سے ٹوٹکے اور دیسی علاج معلوم تھے امی کو جو شاہینہ کو علینہ کے سلسلے میں بہت سی پریشانیوں سے بچائے رکھتے۔ شاہینہ امی کے لیے شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے اکثر کہتی۔ ''یہ تو آپ کی بیٹی ہے امی جی۔''

''خدا تمہارا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے...... تم تو اس کی ماں بھی ہو باپ بھی۔'' امی کے لہجے میں موہوم سا دکھ ہوتا۔

شاہینہ کا دل دکھتا کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی علینہ بن باپ کے پل رہی تھی۔ گو شاہینہ کا دل رکھنے کو امی، بھائی، بہنیں سبھی علینہ سے پیار کرتے مگر اس ننھی سی جان کی زندگی میں جو بڑی محرومی تھی سو تھی اور اس کمی کو کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ شاہینہ اکثر سوچتی علینہ جب بڑی ہو کر اپنے باپ کے بارے میں جاننا چاہے گی تو وہ اسے کیا بتائے گی اور کیونکر بتائے گی!

قسمت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے کبھی کبھی انسان کے ساتھ اور انسان شاید قسمت سے بھی بڑھ کر عجیب کھیل کھیل جاتے ہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ!

کاش اس گمنام خط کو تحریر کرنے والے بدخواہ کو اپنے فعل کی بہیمیت کا اندازہ ہوتا۔ ایک نہیں اس نے دو زندگیاں تباہ کی تھیں۔ شاہینہ کی اور علینہ کی بھی، بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اس نے شاہینہ کے پورے گھرانے کو ہی روگ لگا دیا تھا۔ بھائی، بہنوں کی ہر خوشی اس احساس سے ادھوری رہتی کہ ان کی ایک بہن اجڑی ہوئی بیٹھی تھی جسے دوبارہ آباد کرنے کے لیے انہیں ایک پل صراط سے گزرنا پڑتا۔ لوگ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ طلاق کب ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ شاہینہ کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش میں ایک پنڈورا بکس کھل جانا تھا۔ شاہینہ خود بھی اس پنڈورا بکس کو مقفل ہی رکھنا چاہتی تھی۔ علینہ کے بعد تو وہ دوبارہ شادی کے خیال کو بھی اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی اب صرف علینہ کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

☆☆☆

لوگ ایک دوسرے سے لاتعلقی برتنے پر آئیں تو فاصلہ غیر اہم ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی ایک ہی گھر کی چھت تلے اجنبی بن کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ خونی رشتوں میں منسلک افراد ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی خبر نہیں پاتے۔ اپنے، غیر بن جاتے ہیں اور دوست، دشمن۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے نہ ساجد نے پلٹ کر بیٹی کی خبر لی نہ شاہینہ کو ساجد کی کوئی خبر ملی۔ کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ دوسری شادی کی تھی یا نہیں؟ کچھ پتا نہ تھا۔ تاہم شاہینہ کو اس کی شقی القلبی پر ضرور حیرت ہوتی۔ اگر قریبی رشتوں میں خون واقعی جوش مارتا ہے تو کیا ساجد کا خون بیٹی کے لیے کبھی جوش نہ مارتا ہوگا! کبھی اسے اپنی اولاد کا خیال نہ آتا ہوگا! شاہینہ کا اپنا تو یہ حال تھا کہ علینہ اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام بن گئی تھی۔ نوکری مجبوری تھی، اسکول جانا پڑتا لیکن چھٹی ہوتے ہی وہ علینہ کی خاطر گھر دوڑتی۔ کسی روز کسی وجہ سے چھٹی کے بعد اسکول میں کچھ وقت ٹھہرنا پڑ جاتا تو اسے سخت گراں گزرتا۔ زیادہ دیر ہوتی تو امی کو فون کر کے علینہ کے بارے میں پوچھتی۔

''ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔'' امی اطمینان دلاتیں۔ ''پریشان نہ ہوا کرو۔ جب تک میں بیٹھی ہوں اللہ کی مہربانی سے تمہیں اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

امی واقعی بہت بڑا سہارا تھیں۔ علینہ کو اپنے دوسرے بچوں کی اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھتیں۔ اپنے کسی بندے کے لیے دوسرے بندوں کے دل میں محبت اللہ ہی ڈالتا ہے۔ کسی بندے کو ایک محبت سے محروم کرتا ہے تو دوسری محبت کو اس پر سایہ فگن کر دیتا ہے۔ جیسے علینہ کو باپ کی محبت سے محرومی کے بعد امی کی محبت کی چھاؤں میں دے دیا تھا اور امی کی اعلیٰ ظرفی کہ اپنا کوئی احسان نہ جتاتیں، یہی کہتیں۔ ''مجھے تو اللہ نے علینہ کی شکل میں ایک کھلونا دے دیا ہے دل بہلانے کو۔''

امی کی اس بات پر گھر میں موجود ان کی دونوں بہوئیں چیں بہ جبیں ہوتیں اور آپس میں دل کے پھپھولے پھوڑتیں۔ ''بڑی بی کو بیٹوں کے بچوں پر تو اتنا لاڈ نہیں آتا۔'' حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ امی پوتے پوتیوں سے بھی پیار کرتی تھیں۔ علینہ پر انہیں پیار کے ساتھ ترس بھی آتا تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کے پل رہی تھی۔ ایسے بھی شقی القلب ہوتے ہیں لوگ کہ اپنی اولاد کی پلٹ کر خیر خبر ہی نہ لیں۔ شک کا اپنا فساد مگر دل کی گواہی بھی تو کچھ کہتی ہے۔ امی اکثر سوچتیں بلکہ ایک دو مرتبہ انہوں نے شاہینہ سے بھی کہا۔ ''کیا اس بدبخت کے دل میں اپنی اولاد

سے محبت کی لہر کبھی کروٹ نہ لیتی ہوگی؟‘‘

’’علینہ کا اس سے کوئی رشتہ نہیں امی...... علینہ صرف میری بیٹی ہے۔‘‘ شاہینہ دکھی دل سے کہتی۔

امی کو اب باقی دو بیٹوں اور روبینہ کے رشتوں کی بھی فکر لگی تھی۔ بیٹوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ارادے کی دیر ہوتی ہے، اپنے معیار کی یا معیار سے کم لڑکی مل ہی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ لڑکی کے لیے اچھا بر ملنے کا ہوتا ہے۔ اچھا تو ساجد بھی تھا۔ رشتہ کرانے والی نے وہ تعریفیں کی تھیں کہ خدا کی پناہ مگر ایسی اچھائی کو لے کر انسان چاٹے کیا کہ جس نے ایک شریف گھرانے کو اپنی انانیت پسندی سے ایسا گھاؤ لگایا تھا کہ تکلیف جاتی نہ تھی۔ امی بظاہر ہنستی بھی تھیں بولتی بھی تھیں۔ زندگی کے سارے ہی معمولات جاری تھے مگر شاہینہ کی طرف سے ان کے دل کو جو زخم لگا تھا، وہ مسلسل ٹیسیں دیے جاتا تھا۔ شاہینہ کو دیکھتیں تو کلیجا منہ کو آتا۔ ’’کیسے کاٹے گی یہ پہاڑ سی جوانی۔‘‘ امی کے دل کو یہ فکر چاٹے جاتی۔

اپنی اس فکر کا اظہار شاہینہ پر کرتیں تو وہ کہتی۔ ’’آپ میری فکر نہ کیا کریں...... میرے پاس علینہ ہے۔‘‘

’’بیٹیاں سدا تھوڑی پاس رہتی ہیں۔ انہیں دوسرے گھر بھی جانا ہوتا ہے۔‘‘ امی کہتیں۔

’’میں علینہ کی شادی ایسے لڑکے سے کروں گی جو گھر داماد بن کر رہے۔‘‘ شاہینہ کہتی۔

’’برسوں کا سفر ہے...... ابھی تو علینہ بچی ہے۔ کب بڑی ہوگی، کب اس کی شادی کا موقع آئے گا اور...... اس وقت تک؟‘‘ امی مجسم سوال بن جاتیں۔ پھر دل گرفتگی سے کہتیں۔ ’’عورت اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی۔‘‘

’’آپ ہیں نا امی میرے ساتھ۔‘‘

’’میں بھلا کب تک؟ ایک دن تو جانا ہے۔‘‘

’’ایسی باتیں نہ کیا کریں۔‘‘

’’حقیقت سے آنکھیں تو نہیں چرائی جاسکتیں...... میرے بعد کیا ہوگا تمہارا؟‘‘ امی کو فکر ستاتی۔

’’فکر کیوں کرتی ہیں...... اول تو اللہ میرے اور علینہ کے سروں پر آپ کا سایہ قائم دائم رکھے...... پھر بھائی ہیں نا امی...... ماشاءاللہ چار چار۔‘‘

’’اللہ انہیں جیتا رکھے...... بیٹوں کی سعادت مندی سے مجھے کوئی گلہ نہیں مگر ان کی بیویوں کا مجھے بھروسا نہیں ...... جب تک میں ہوں، تب تک خاموش ہیں۔ میں نہ رہی تو رنگ دکھائیں گی۔‘‘

امی دیکھتی تھیں، شادی شدہ بیٹے علینہ سے لاڈ کرتے

توان کی بیویوں کے ماتھوں پر بل پڑنے لگتے تھے۔

''اللہ مالک ہے امی۔''

''ہاں، وہ تو ہے ہی سب کا مالک...... ایک وہی تو ہے جس پر انسان کا بھروسا کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہی سہارا دیتا ہے انسان کو۔''

واقعی! وہی سہارا دیتا ہے انسان کو...... ورنہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ شاہینہ جیسی لڑکی کے تو پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ اسی نے سہارا دیا، اسی نے حوصلہ بخشا جو وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوئی...... ورنہ شروع میں اس کا کیا حال تھا، وہی جانتی تھی۔ دل، دماغ، قویٰ سب جیسے مفلوج ہی تو ہو گئے تھے۔ بہرحال اب وہ جی رہی تھی...... علینہ کے لیے!

☆☆☆

علینہ بڑی ہونے لگی۔ ہاشم کی شادی اعظم کی سسرال کی ایک لڑکی سے ہوگئی۔ شاہینہ کی شادی کے تلخ تجربے کے بعد امی انجان لوگوں میں رشتے ناتے کرتے ہوئے ڈرنے لگی تھیں۔ اعظم کے سسرال والے غیر ضرور تھے مگر انجان نہیں۔ روبینہ کا رشتہ بھی امی جانے بوجھے لوگوں ہی میں کرنا چاہتی تھیں۔ حالانکہ جانے بوجھے لوگوں میں رشتے جوڑنے پر یہ ضمانت تو نہیں ہوتی کہ حالات آپ کی مرضی کے موافق رہیں گے۔ قریبی رشتوں میں بچوں کی شادیاں کرنے والے بھی بعض اوقات بری طرح ڈسے جاتے ہیں۔

ہاشم کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد گھر کی اکائی میں دراڑ پڑنے لگی۔ نخریلی سی لڑکی تھی۔ علیٰحدہ گھر لے کر صرف اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ امی نے بھاری دل کے ساتھ ہاشم کو علیحدہ رہنے کی اجازت دے دی۔ جب دوسرے کا ساتھ رہنے کو دل نہ چاہے تو مارا مار ساتھ رہنے پر مجبور کرنے سے فائدہ! ویسے بھی گھر اب چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ شاہینہ، علینہ اور روبینہ امی کے ساتھ ان کے کمرے ہی میں رہتیں۔

علینہ جیسے بچے بچیاں جنہیں اوائلِ عمر ہی میں کسی محرومی، کسی جذباتی سانحے کا سامنا ہو جائے، عموماً اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت زیادہ حساس اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ بہت سی باتیں اپنے بڑوں کے بتائے بغیر خود ہی سمجھ جاتے ہیں...... تمام جزئیات سمیت نہ سہی کنایتاً سہی۔ علینہ سمجھدار بچی تھی کسی کے بتائے بغیر ہی یہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی ایسی بات تھی جو اس کی ماں اور ننھیال والے بھولے سے بھی اس کے باپ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ وہ اگر مر گیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا، کبھی تو گھر میں اس کا نام لیا جاتا، کبھی تو اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک روز اس نے امی سے پوچھا۔ ''نانو! شانی، مانو اور روشی کے بابا کی طرح میرے بابا اس گھر میں کیوں نہیں رہتے؟''

شانی، مانو اور روشی پیار کے نام تھے اعظم اور عاصم کے بچوں کے۔

امی پہلے تو علینہ کے اس سوال پر دھک رہ گئیں پھر انہوں نے اسے آہستہ سے سمجھایا۔ ''بیٹا تمہارا باپ ظالم آدمی تھا۔ اس نے تمہاری ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا...... وہ اتنا بے رحم تھا کہ تمہاری پیدائش کے بعد ایک دفعہ بھی تمہیں دیکھنے نہیں آیا۔''

اس کے بعد علینہ نے کبھی کسی سے اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا...... اپنی ماں سے بھی نہیں...... باپ کا لفظ اس کی زندگی سے گویا خارج ہو گیا تھا۔ شاہینہ حیران ہوتی کہ چھوٹی سی بچی میں اتنی سمجھ، اتنا شعور کیونکر آ گیا تھا۔ اس کی اپنی ہمت نہ ہوتی علینہ سے اس موضوع پر بات کرنے کی...... کیا پوچھتی کیا بتاتی اسے!

☆☆☆

وقت اچھا ہو یا بُرا، تھمتا نہیں چلتا جاتا ہے۔

شاہینہ کو یہ لگتا جیسے کل ہی کی تو بات تھی جب علینہ اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اب علینہ اسکول بھی جانے لگی تھی۔ روبینہ کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ علینہ کی دیکھ بھال میں روبینہ نے جس طرح امی کا ساتھ دیا تھا، شاہینہ اس پر روبینہ کی ہمیشہ ممنون رہتی تھی۔ امی کے بچوں میں بس اب دائم ہی رہ گیا تھا جس کی شادی ہونی تھی۔ امی کو بلڈ پریشر کا عارضہ تو برسوں سے تھا، اب دیگر عوارض بھی لاحق ہو گئے تھے۔ آئے دن بیمار پڑ جاتیں۔ شاہینہ کو ان کی بیماری کی جو فکر ہوتی سو ہوتی خوف زیادہ آتا۔ خدانخواستہ امی نہ ہوئیں تو وہ اور علینہ کیا کریں گی؟ کس کے سہارے زندگی گزاریں گی؟ اللہ کے بعد امی ان دونوں کے لیے بہت بڑی سپورٹ تھیں۔ امی کو خود بھی احساس تھا کہ وہ اپنی طبعی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزار چکی تھیں۔ اب تو جو وقت مل رہا تھا، اللہ کی مہربانی تھی اور شاید شاہینہ اور علینہ کے لیے۔ اس لیے امی اب کبھی کبھار دبی زبان سے شاہینہ سے کہنے لگی تھیں۔ ''کوئی شریف آدمی مل جائے تو ہاتھ تھام لو۔''

''ملا تو تھا ایک شریف آدمی امی جی۔'' شاہینہ تلخی سے کہتی اور اب یہ بات وہ علینہ کے سامنے بھی کہنے سے نہ چوکتی۔ چھپانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے

ساری بات معلوم ہونا ہی تھی اور جب اس قصے میں اس کی اپنی کوئی خطا، کوئی دوش ہی نہ تھا تو وہ علینہ کے سامنے چور کیوں بنی رہتی۔

امی کی صحت دن بہ دن گرتی چلی گئی۔ دائم کے لیے ایک لڑکی پسند کر لی گئی تھی۔ بات بھی ہوگئی تھی مگر شادی کے لیے دائم دو سال کی مہلت چاہتا تھا۔ شاہینہ نے امی کے گھر کے نزدیک ہی ایک رہائشی اسکیم میں دو کمروں کا ایک فلیٹ بک کرا لیا تھا۔ اپنے گھر کی چھت بہت بڑی عافیت ہوتی ہے۔ امی کے گھر میں بھائیوں کے ساتھ اس وقت تک تو گزارہ ہو رہا تھا جب تک امی بیٹھی تھیں، بعد میں جانے کیا حالات ہوتے۔ بھاوجیں تو اب بھی ناک بھوں چڑھانے سے نہ چوکتی تھیں۔ بھائی اچھے اور ماں کے فرمانبردار نہ ہوتے تو شاید اتنا عرصہ اس گھر میں اس کا اور علینہ کا رہنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

شاہینہ اندر سے بہت دکھی، ٹوٹی ہوئی، پارہ پارہ تھی۔ گھر ٹوٹنے سے بڑا المیہ عورت کے لیے کوئی اور نہیں ہوتا اور وہ بھی اس طرح سے! اکثر وہ دل فگار منظر اس کی چشم تصور میں آ کھڑا ہوتا۔ شادی کا دوسرا دن، خوشبوؤں میں بسا کمرائے عروسی اور صرف ایک دن قبل جڑنے والا رشتہ ایک گمنام خط کی بنیاد پر لخت لخت! تعلیم کے بل بوتے پر وہ اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہوئی ہوتی تو اس سانحے کے بعد کیا کرتی! کیا بھائی بھاوجوں کی دستِ نگر بن کر زندگی گزارتی۔

اور اس گمنام خط لکھنے والے کی آج تک شناخت نہ ہو سکی تھی، بس قیاس اور اندازے ہی تھے۔ امی نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ جیتے جی ان لوگوں کے منہ نہ دیکھیں گی جن پر اس قبیح فعل کا انہیں اور گھر والوں کو شبہ تھا!

☆☆☆

ہوا بھی یہی!

امی نے مرتے دم تک ان لوگوں کا منہ نہیں دیکھا۔ حالانکہ شاہینہ کی طلاق کے بعد رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کے ذریعے یہ بات خالہ کے گھرانے تک بھی پہنچ گئی تھی کہ شاہینہ کی سسرال میں اس گمنام خط کا شبہ بہن اور ان کے بچوں کو انہی کے گھرانے پر تھا مگر وہ قسم اٹھا کر کہتی تھیں کہ ان کی طرف سے ایسی ذلیل حرکت کسی نے نہیں کی۔ خالہ تو یہاں تک کہتی تھیں کہ اگر ان کے گھرانے سے کسی نے ایسی حرکت کی ہو تو مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہو انہیں۔ اب اس سے بڑی یقین دہانی اور کیا ہو سکتی تھی۔ خالہ کہتیں۔ ''بہن کے اور میرے بچوں کے رشتے نہ ہو سکنا اور بات ہے مگر میں یا میرے بچے اتنے کمینے نہیں کہ اپنی بیٹی جیسی بھانجی کے گھر میں آگ لگاؤں۔''

مگر امی کو بہن کی بات کا جیتے جی کبھی اعتبار نہ آ سکا۔ یہی حال باقی گھر والوں کا اور خود شاہینہ کا بھی تھا۔ ''ان کے سوا اور کس سے ہے ہماری دشمنی۔'' وہ سب کہتے۔

امی یہی گمان اپنے دل میں لیے اس دنیا سے گئیں کہ شاہینہ کا گھر ان کی بہن اور ان کے بچوں نے بگاڑا تھا۔ انہوں نے بچوں کو خالہ کے گھرانے سے کبھی تعلق بحال نہ کرنے کی قسم دے رکھی تھی۔ سو دونوں گھرانوں میں سخت قسم کی قطع تعلقی تھی۔ خالہ اور ان کے گھر والے امی کے مرنے پر بھی نہیں آئے۔

بسا اوقات کیسی کیسی باتوں پر وہ انمول رشتے ٹوٹ جاتے ہیں جن کا نعم البدل ممکن نہیں ہوتا۔

ساجد سے اپنے یک روزہ رشتے کے بارے میں شاہینہ اکثر نہایت ملال سے سوچتی۔ ''ایسا ناپائیدار رشتہ کہ آناً فاناً ختم ہوگیا۔''

مگر اس رشتے کا ثمر ہی تو علینہ تھی جس کے سامنے شاہینہ کو ہر رشتہ ہیچ لگتا تھا۔ عجیب تعلق تھا...... دل سے جڑا ...... روح میں اترا...... علینہ اسے اپنی دوست، ہمدرد، ہمراز سبھی کچھ محسوس ہوتی ...... اس نے سوچ رکھا تھا کہ علینہ سے چھپائے گی نہیں۔ مناسب وقت پر اسے سب کچھ بتا دے گی ...... وہ سب کچھ جو حقیقت تھی ...... وہ کرب ناک حقیقت جو دیمک کی طرح اس کی زندگی کو اندر سے چاٹ گئی تھی...... چاٹ رہی تھی!

☆☆☆

امی کے بعد شاہینہ کو اس گھر سے جس میں وہ اتنے برس رہتی آئی تھی، غیریت کا احساس ہونے لگا تھا۔ بھائی اچھے تھے، امی کے بعد بھی اس کا اور علینہ کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھتے مگر بھاوجوں کے تیور کچھ اور ہی کہنے لگے تھے۔ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر علینہ کو بھی کبھی اس بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرتیں کہ شاہینہ کو رنج ہوتا۔ جی چاہتا علینہ کو لے کر کہیں اور چلی جائے...... مگر کہاں...... اکیلی عورت اور بڑی ہوتی ایک بچی کا ساتھ...... شہر کے حالات خراب...... زمانہ بُرا...... امی ٹھیک کہتی تھیں۔ اکیلی عورت کے لیے زندگی گزارنا آسان نہیں۔ بھائیوں کے ساتھ رہنے میں کچھ کلفتیں تھیں تو کچھ آسانیاں بھی۔ سب سے بڑی بات تو وہ تحفظ تھا جو اسے اس گھر سے علیٰحدہ رہنے کی صورت میں کہیں اور نہ حاصل ہو سکتا

تھا۔ دوپہر کو علینہ کی اسکول وین خود شاہینہ کے گھر پہنچنے سے پہلے آجاتی۔ اسے اطمینان رہتا کہ علینہ گھر میں اکیلی نہیں ہوگی۔ پھر اس کی نوکری تھی۔ ملازمت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ملازم کی مجبوریوں سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔ کبھی چھٹی کے بعد کوئی اضافی ڈیوٹی لگ جاتی، کبھی میٹنگ دیر تک چلتی۔ کبھی ڈائریکٹوریٹ جانا ہوتا، کبھی کسی کولیگ کے ہاں خوشی غمی میں جانا پڑجاتا۔ بھائیوں سے علیحدہ ہوکر رہنے کی صورت میں زندگی کے ان تمام لازم معمولات سے کیونکر عہدہ برآ ہوسکتی تھی وہ۔ سو عافیت بھائیوں کے ساتھ رہنے اور بھاوجوں کے ناروا طرزِ عمل کو برداشت کرنے ہی میں تھی!

☆☆☆

علینہ کالج میں تھی جب شاہینہ نے اسے پہلی بار اپنی زبان سے اس سانحے کی تفصیل بتائی جس نے محض اس کی زندگی ہی تباہ نہیں کی تھی، علینہ کو بھی باپ کے زندہ ہوتے ہوئے باپ سے محروم کردیا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی اور سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ نے کچھ نہیں کیا؟''

''کیا کرتی؟''

''شوٹ کردینا چاہیے تھا اسے۔''

''کسے؟'' شاہینہ نے ہڑبڑا کر بیٹی کو دیکھا۔

''اسی کو جس نے آپ کی زندگی برباد کی۔''

''وہ تو تمہارا باپ تھا بیٹے۔''

''تو کیا ہوا...... ایسے باپ کا مرجانا بہتر ہے۔''

شاہینہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس نے تو اتنے برس اس خوف میں گزار دیے تھے کہ اپنے باپ کی طرح کہیں علینہ بھی اس سے اپنا رشتہ ختم کرنے نہ کھڑی ہوجائے جو بہرحال میاں بیوی کے رشتے کی طرح نازک، بودا اور بے یقین تو نہیں تھا مگر دوری پیدا ہوجانا بھی بعید از قیاس نہ تھا۔

''ایک بات بتاؤ۔'' شاہینہ نے علینہ سے کہا۔

''جی امی...... پوچھیے۔''

''تمہارا کبھی جی نہیں چاہتا اپنے باپ سے ملنے یا اسے دیکھنے کو؟''

''کس باپ کی بات کررہی ہیں امی...... اس کی جس نے مجھے اپنا نام ہی دینے سے انکار کردیا...... اس کا صاف مطلب تو یہی ہے نا کہ اس نے مجھے اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں کیا۔''

''تسلیم کرے یا نہ کرے، ہو تو تم اسی کی اولاد۔''

''چھوڑیں امی! کوئی اور بات کریں۔''

''میری طرف دیکھو۔''

علینہ چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ بھی نہیں پوچھوگی کہ وہ کون ہے؟...... کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟'' شاہینہ نے کہا۔

''جس شخص سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں، اس کے بارے میں، میں یہ سب کچھ کیوں پوچھوں۔''

''بیٹا! تمہیں دلچسپی ہو یا نہ ہو...... معلوم ہونا چاہیے۔''

''کیوں! کیوں معلوم ہونا چاہیے؟''

''تم ساری زندگی میرے پاس تھوڑی رہوگی...... دوسرے گھر بھی جانا ہے...... وہ لوگ پوچھیں گے تم سے تمہارے باپ کے بارے میں...... انہیں بتانے کے لیے تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''کہہ دوں گی میرا باپ میری پیدائش سے پہلے ہی مرگیا تھا۔'' علینہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''مرے ہوؤں کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہیں لوگ۔''

''اوہو امی! آپ ابھی سے کیوں فکرمند ہورہی ہیں؟ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔''

''مجھے تمہاری ابھی سے فکر رہنے لگی ہے۔ دعا کرتی ہوں تمہارے لیے اچھے لوگ ملیں...... میری بدبختی کا سایہ بھی نہ پڑے تم پر۔'' شاہینہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

علینہ نے اپنے دوپٹے کے پلو میں ماں کے آنسو جذب کرلیے۔ اسے ماں سے پیار تو تھا ہی۔ جس طور اسے زندگی گزارتے دیکھا تھا، اس سے اس کے دل میں ماں کی قدرومنزلت دوچند ہوگئی تھی۔ کمال کا صبروبرداشت تھا اس میں۔ علینہ کی ممانیاں کبھی کبھی ایسی چبھتی ہوئی باتیں کہہ جاتی تھیں جنہیں سن کر اس کی ماں کا غصے میں آجانا لازم ہوتا لیکن ایسے موقعوں پر بھی علینہ نے ماں کو بہت متحمل دیکھا تھا۔ بڑی سے بڑی رنجیدہ کرنے والی بات کو بھی وہ خاموشی سے پی جاتی بلکہ کبھی کبھی علینہ کو طیش آجاتا تھا۔ ''امی! آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''جواب دینے سے کیا ہوگا...... بات اور بڑھے گی...... ان کا تو یہ گھر ہے، ہماری مجبوری ہے کہ ہم یہاں رہ رہے ہیں۔''

''کب تک برداشت کریں گی آپ؟''

''جب تک یہاں رہنا ہے۔''
''اور یہاں کب تک رہنا ہے؟''
''جب تک ہمارا اپنا گھر نہیں ہوتا۔''
شاہینہ کو فلیٹ کا قبضہ مل جانے کے بعد علینہ ایسے موقعوں پر کہتی۔ ''اب تو ہمارا اپنا گھر بھی ہے امی...... آپ نے اسے کرائے پر کیوں چڑھا دیا؟''
''یہاں ہم محفوظ ہیں بیٹا۔''
''اپنے گھر میں تو ہم زیادہ محفوظ ہوتے امی۔''
''نہیں بیٹا...... کوئی مرد نہیں ہے ہمارے ساتھ...... عورت کی حفاظت کے لیے کسی مرد کا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے...... تمہیں ساتھ لے کر میں اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی۔''
''جب ہم دونوں وہاں ہوں گے تو گھر اکیلا کیسے ہوگا؟''
''مجھے باہر بھی تو آنا جانا پڑتا ہے۔ تمہیں اکیلے چھوڑ نہیں سکتی اور ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ یہاں پر اطمینان تو ہوتا ہے کہ تم گھر میں اکیلی نہیں ہو۔ لوگ ہیں تمہارا خیال رکھنے کو۔''
''میں بچی نہیں ہوں اب...... اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔''
''اب ہی تو تمہارا زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے میرے بچے۔''

☆☆☆

علینہ یونیورسٹی میں تھی۔ شاہینہ کی خواہش تھی کہ اس کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کی شادی ہوجائے۔ بھاوجوں اور اب تو ان کے بچوں کے رنگ ڈھنگ بھی اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ شاہینہ کی شادی سے قبل بھائیوں کے گھر سے علیحدہ ہوجاتی۔ اس گھر میں دوسرے درجے کی شہری کی حیثیت سے رہتے ہوئے وہ علینہ کی شادی کا معاملہ اس خود مختاری اور احترام کے ساتھ نہ نمٹا سکتی تھی جو علینہ کی زندگی کے اس اہم ترین معاملے کا حق تھا۔ یہاں تو وہ اس کے لیے کوئی اچھی چیز بھی خرید لاتی تو کچھ اس نوعیت کے تبصرے اور طنزیہ فقرے شروع ہوجاتے۔
''علینہ! تمہاری اماں کو تو فضول خرچی کا شوق ہے۔'' ایک بھاوج کہتی۔
''ہاں بھئی کہیں اور جو نہیں خرچ کرنا پڑتا...... نہ کھانے پینے کا خرچہ نہ بجلی، گیس کا بل...... نہ کسی کو لینا دینا۔'' دوسری بھاوج فرماتیں۔
''میاں صاحب تو پیسا ہاتھ میں تھما کے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ کہاں کہاں اور کتنا خرچہ کرنا پڑتا ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔'' دائم کی بیوی بھی پیچھے نہ رہتی۔
''ایک بیٹی کے تو آدمی سونخرے اٹھالے جب چار چھ بچے ہوں تو پتا چلتا ہے۔''
علینہ کے استعمال میں کوئی اچھی چیز دیکھ کر کزنز بھی اس کا دل برا کرنے میں پیچھے نہ رہتیں۔
''علینہ! یہ کلر تمہیں بالکل سوٹ نہیں کر رہا ہے۔''
''کیا ضرورت تھی اتنا مہنگا جوتا خریدنے کی...... اتنے پیسوں میں تو اتوار بازار سے اپنے اور آنٹی کے لیے کئی چپلیں خرید لیتیں۔''
''جو خوبصورت ہوں وہ برانڈڈ کاسمیٹکس کے بغیر بھی اچھے لگتے ہیں۔''
یونیورسٹی کے پہلے سمسٹر میں جب علینہ کی کلاس ایک تفریحی دورے پر جارہی تھی، ایک کزن نے کہا۔ ''کیا ضرورت ہے تفریحی دورے پر جانے کی...... واپسی میں دیر ہوگئی تو تمہاری کلاس فیلوز کے تو اماں ابا پک کرنے آئیں گے، تمہارے لیے شاہینہ آنٹی بے چاری کہاں اکیلی خوار ہوتی پھریں گی۔''
دوسری کزن بولی۔ ''ہاں علینہ...... جب تم لوگ واپسی پر یونیورسٹی پہنچو گے اور آنٹی اکیلی تمہیں لینے آئیں گی تو تمہاری فرینڈز یہ بھی تو پوچھیں گی کہ تمہارے ابو کیوں نہیں آئے تمہیں لینے۔''
اس قسم کی باتیں شاہینہ کا دل بھی دکھاتی تھیں، علینہ کو بھی رنجیدہ کرتی تھیں۔ سو شاہینہ اس نوع کے ماحول میں رہتے ہوئے علینہ کی شادی بحسن وخوبی ہوجانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی حالت دودھ کے جلے کی سی تھی جو چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا نوحہ اس کے سامنے تھا۔ کوئی بات نہیں تھی تو بھی برا چاہنے والوں کی چند سطروں نے اس کی زندگی خاکستر کر کے رکھ دی تھی۔ علینہ کے معاملے میں تو یہی بہت خوفناک ایشو تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنا نام ہی دینے سے انکار کردیا تھا اور یہ بات خاندان کے سب لوگوں کو معلوم تھی۔ شاہینہ فکر مند ہوتی کہ جب علینہ کی شادی کا مرحلہ آئے گا تو وہ پیام دینے والوں کو اس کے باپ کے بارے میں کیا بتائے گی۔ وہ جانتی تھی کوئی بھی غلط بیانی اور پردہ پوشی اس سلسلے میں ناروا ہوگی۔ جھوٹ جلد یا بدیر کھل ہی جاتا ہے۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران علینہ کی اپنے ایک ہم

جماعت سے ایسی ذہنی ہم آہنگی ہوئی کہ آخری سیمسٹر میں وہ اپنا رشتہ دینے کو اپنے والدین کو لانے کے لیے بضد ہوگیا۔

حالات نے شاہینہ اور علینہ کو ایک دوسرے کا دوست، ہمراز اور غمگسار بنا دیا تھا۔ علینہ اپنی کوئی بات ماں سے راز نہ رکھتی تھی۔ راحیل سے اس کی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کا معاملہ بھی اس کے علم میں تھا۔ چنانچہ جب راحیل اپنے والدین کو علینہ کے گھر والوں سے ملوانے پر بضد ہوا تو شاہینہ نے علینہ سے کہا۔ ''دیکھو بیٹا! یہ وہ وقت ہے جس سے میں تمام زندگی ڈرتی رہی ہوں۔ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی نہیں ہے۔ جو میرے ساتھ تمہارے باپ نے کیا وہ تمہارے علم میں ہے۔ راحیل اور اس کے والدین ہی نہیں جو بھی تمہارا رشتہ لے کر آئے گا تمہارے باپ کے بارے میں ضرور جاننا چاہے گا۔''

''کہہ دیجیے گا مر گیا۔''

''اتنا آسان نہیں ہے یہ کہہ دینا...... جھوٹ کے پاؤں ہوتے ہیں اور لوگ بال کی کھال نکالنا جانتے ہیں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے انکار کردوں گی۔''

''یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہے؟''

''کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی کرنی ہے...... تمہیں رسک لینا ہوگا۔'' شاہینہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

''کیسا رسک امی؟''

''تمہاری عمر میں مجھے اپنی ڈائری میں عمدہ اشعار اور دل کو چھو لینے والے اقوال اور نثر پارے نوٹ کر لینے کا شوق تھا۔ پتا نہیں وہ کوئی نظم تھی یا نثر پارہ لیکن اس کا مفہوم آج برسوں بعد بھی میرے دل کو لگتا ہے۔'' شاہینہ نے توقف کیا۔ علینہ جو انہماک سے سن رہی تھی اس کے توقف پر کچھ بے چین سی ہوئی۔ شاہینہ جیسے اپنی یادداشت کے جھروکوں سے جھانک رہی تھی۔ ''اگر تم کسی کو چاہتے ہو تو خود کو اس کے بارے میں ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر اسے آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ تمہارا ہے تو کہیں بھی جائے، پلٹ کر تمہاری ہی طرف آئے گا اور اگر نہ آئے تو اپنے دل کو اس یقین پر ٹھہرالو کہ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔''

علینہ ٹکٹکی باندھے ماں کو دیکھ رہی تھی، اس کی بات سن رہی تھی۔

''سمجھ میں آئی میری بات؟'' شاہینہ نے پیار سے علینہ کا سر چھوا۔

''بات واقعی بہت خوبصورت ہے امی لیکن......''

''لیکن؟''

''میں...... یہ نہیں سمجھ پائی کہ......''

''کہ؟''

''کہ یہ میرے اور راحیل کے معاملے میں کیسے اپلی منٹ کی جانی چاہیے۔'' علینہ نے الجھی الجھی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''میرے بچے۔'' شاہینہ نے علینہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ دیکھنا ہو کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ کتنا مخلص اور سچا ہے تو اس پر اپنی تمام کمزوریاں کھول دو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ مخلص ہے اور صحیح معنوں میں تمہیں چاہتا ہے تو وہ تمہاری کمزوریوں سے آگاہ ہو کر زیادہ کھلے دل سے تمہیں قبول کرے گا۔''

''لیکن امی! ہر ایک کو تو اپنی کمزوریاں نہیں بتائی جاتیں۔'' علینہ نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو...... ہر ایک کو اپنی کمزوری بتا کر انسان خود کو مزید کمزور کر لیتا ہے لیکن جب کسی کو آزمانا مقصود ہو تو یہ رسک لینا پڑتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے میں......'' علینہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی مگر ماں ہونے کے ناتے شاہینہ اس کی ادھوری بات کو پوری طرح سمجھ گئی۔

''ہاں، میرا وہی مطلب ہے جو تم سمجھی ہو۔'' شاہینہ نے کہا۔ ''پہلے تم دونوں اپنے آپ کو اچھی طرح ٹٹولو کہ کیا واقعی تم دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے سنجیدہ ہو کہ زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ چاہتے ہو...... جذباتی فیصلے پائیدار نہیں ہوتے۔''

''امی! ہماری عمر کے لوگ تو جذباتی فیصلے ہی کرتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں...... میں نے دیکھا ہے، آج کی نوجوان نسل اپنے بڑوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہے...... وجہ شاید یہ ہے کہ انہیں فہم و شعور دینے کے ان گنت ذرائع موجود ہیں۔ لہٰذا آج کے بچے اپنے بڑوں کے مقابلے میں زیادہ سوچ سمجھ کر فیصلے کرتے ہیں۔''

''اچھا چلیے، یہ فیصلہ ہوجانے کے بعد کہ راحیل کا فیصلہ جذباتی نہیں...... پھر؟''

''تمہیں اپنے بارے میں بھی یہ یقین کرنا ضروری ہے۔''

''او کے...... پھر؟''

''پھر اسے بتا دو۔''

''کیا؟'' علینہ بے ساختہ چونکی۔

''وہی جو میں نے تمہیں، تمہارے باپ کے بارے میں بتایا ہے۔''

''بہت مشکل ہے امی۔'' علینہ گھبرا کر بولی۔

''بتانا تو پڑے گا...... ہم نہیں بتائیں گے تو لوگ بتائیں گے...... اور جب لوگ بتائیں گے تو بات بگڑے گی...... اس کا اعتبار جائے گا...... وہ ہرٹ ہوگا اور جواباً وہ تمہیں ہرٹ کرے گا...... بعد کے رونے سے بہتر ہے میرے بچے کہ پہلے رو کر صبر کرلیا جائے۔''

''امی! بہت مشکل ہے۔''

''لیکن اس مشکل سے گزرنا ضروری ہے اور اس مشکل سے گزر کر ہی یہ پتا چلے گا کہ وہ تمہارے بارے میں کس حد تک سنجیدہ اور مخلص ہے۔''

''اور اگر وہ پیچھے ہٹ گیا تو؟''

''تو سمجھ لینا کہ اسی میں بہتری تھی۔''

''ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو۔''

''آپ اس سے مل کر خود بتا دیں اسے یہ سب کچھ۔''

''میرے سامنے شاید وہ اس طرح کھل کر ری ایکٹ نہ کرسکے جیسے تمہارے سامنے...... تمہیں اس کا ری ایکشن دیکھنا چاہیے کہ وہ شاکڈ ہوتا ہے یا...... تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔''

''اگر وہ شاکڈ ہوا اور اس نے یہ بات یونیورسٹی میں پھیلا دی تو؟''

''یہی تو اس کی آزمائش ہوگی۔''

''نہیں امی...... میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔''

''کبھی تو لینا ہی پڑے گا...... میں نے زندگی سے دو باتیں سیکھی ہیں...... خطرے سے ڈرنے سے بہتر ہے اس کا سامنا کرنا...... برسوں میں اسی بات سے ڈرتی رہی ہوں کہ جب تمہاری شادی کا مرحلہ آئے گا تو ان لوگوں کو جہاں تمہارا رشتہ ہو رہا ہوگا، میں تمہارے باپ کے بارے میں کیا بتاؤں گی لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ خواہ کچھ بھی ہو، میں کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی...... حقیقت نہیں چھپاؤں گی...... جو بات ہے وہ بتا دوں گی...... تمہاری شادی نہ ہونا اس عذاب سے بہتر ہے جو شادی کے بعد بات کھلنے پر ملے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں...... بائی دی وے دوسری بات کیا سیکھی آپ نے زندگی سے؟''

''دوسری بات!'' شاہینہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ ''ہم ساری زندگی اپنے زخموں کو سینے سے لگائے ان کی دکھن چپ چاپ سہتے رہتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے دوسروں پر ظاہر ہوجانے کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم سے بھی بڑی بڑی کمزوریوں اور دکھوں والے لوگ بیٹھے ہیں زندگی کی راہ میں...... تو پھر خود کو کیوں چھپایا جائے...... کیوں خود کو راندۂ درگاہ سمجھا جائے۔''

''آپ بہت بہادر ہیں امی۔'' علینہ نے ماں کو محبت اور احترام سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھی نہیں بیٹا...... وقت اور حالات نے ہمت دی ہے...... میں یہ ہمت اور حوصلہ تمہیں ٹرانسفر کرنا چاہتی ہوں...... تم راحیل سے بات کرو...... دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔''

''کوشش کروں گی امی۔''

''کوشش نہیں، تمہیں بات کرنی ہے...... خوش قسمتی کی دستک والا قصہ سنا ہے تم نے؟''

''نہیں۔''

''کہتے ہیں قسمت کا مارا ایک کاہل الوجود شخص اپنے گھر میں بیٹھا اپنی قسمت کو روتے ہوئے اچھے دنوں کا انتظار کررہا تھا۔ اچانک اس کے گھر کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ کاہل تو تھا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کے بجائے دوسری دستک سننے کا انتظار کیا۔ جب دوبارہ دستک نہ سنائی دی تو بیٹھے ہی بیٹھے پوچھا کون؟ باہر سے جواب آیا خدا حافظ...... خوش قسمتی دوبارہ دستک نہیں دیتی۔''

''واہ امی واہ! آپ کو بھی کیسے کیسے قصے، کیسی کیسی باتیں یاد ہیں۔'' علینہ نے مسکراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

''زندگی کی عطا ہے میرے بچے۔'' شاہینہ نے جو ایک جوان بیٹی کی ماں اور جہاندیدہ عورت تھی، کہا۔

☆☆☆

اللہ راستے یوں ہی آسان کیا کرتا ہے۔

راحیل کا ردعمل علینہ کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اس نے تو راحیل کو ڈرتے ڈرتے اس تلخ حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ اسے نفرت، تضحیک یا حقارت سے دیکھنے کے بجائے نہایت محبت اور احترام سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آئی ایم سوپی علینہ کہ میں نے اپنے لیے تم جیسی لڑکی کو پسند کیا۔''

علینہ نے اسے بے یقینی سے دیکھا...... کیا وہ سچ کہہ

رہا تھا!

"تم اگر چاہتیں تو یہ بات مجھ سے چھپا بھی سکتی تھیں لیکن میں خوش ہوں کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔"

"امی کہتی ہیں رشتوں کی بنیاد سچ پر ہونی چاہیے۔" علینہ نے کہا۔

"میں نے ہمیشہ تمہاری زبان سے تمہاری امی ہی کا ذکر سنا، ابو کا کبھی نہیں اس لیے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تمہارے والد ہیں ہی نہیں، آج پتا چلا کہ تمہاری زندگی میں امی ہی سب کچھ ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے آج ہی ان سے ملوں۔"

"امی بے چاری بہت مجبوریوں میں گھری رہی ہیں ساری زندگی...... میں اور امی نانو کے گھر میں رہتے ہیں۔ نانو زندہ نہیں ہیں۔ ماموں اچھے ہیں مگر ممانیاں مجھے اور امی کو ڈی گریڈ کرنے کی تلاش میں رہتی ہیں۔ ہمارا اپنا فلیٹ ہے جو امی نے کرائے پر اٹھا رکھا ہے۔ میں تمہیں نانو کے گھر میں تو امی سے نہیں ملوا سکتی۔"

"کوئی بات نہیں...... کہیں اور مل لیں گے...... لیکن یار ممی ڈیڈی کو تو لانا ہوگا نا تمہاری نانو کے گھر۔"

"امی کو بتادوں گی...... وہ جو مناسب سمجھیں گی کریں گی۔"

"تم تو راضی ہونا؟"

"تبھی تو پہلی بار کسی کو اپنی زندگی کے اس دکھ سے آگاہ کیا ہے۔"

"تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ علینہ...... میں نے اپنی ممی سے تمہارا ذکر تو کر رکھا ہے، آج انہیں اپنے اس فیصلے سے بھی آگاہ کر دیتا ہوں کہ شادی کروں گا تو صرف اسی لڑکی سے جس کا نام علینہ ہے۔"

"ارے تو کیا تم نے اپنے پیرنٹس سے بات کیے بغیر ہی میری ساری ہسٹری سن لی؟"

"تم ان کی فکر نہ کرو...... میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میری ہر بات مانتے ہیں اور ممی کو تو میری شادی کا اتنا ارمان ہے کہ اگر ان کا بس چلتا تو میرے پیدا ہوتے ہی مجھے دُلہا بنا دیتیں۔"

علینہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆☆☆

شاہینہ نے اب بھائیوں کے گھر سے اپنے فلیٹ میں منتقل ہو جانا ضروری سمجھا۔ بھائیوں کے گھر میں اس کی اور علینہ کی حیثیت نہایت غیر اہم سی تھی۔ اپنے گھر میں رہنے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ فرد اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتا ہے۔ خود مختار اور عزت کی زندگی۔ یہاں تو کبھی شاہینہ کی کوئی کولیگ یا علینہ کی دوست گھر آ جاتی تو اس کی خاطر مدارات بھاوجوں اور ان کے بچوں کی نظروں میں کھٹکنے لگتی تھی۔ منہ بننے لگتے تھے۔ راحیل اور اس کے گھر والوں کی اچھی خاطر مدارات کے لیے شاہینہ کا اپنے گھر میں ہونا ضروری تھا۔ اس نے بھائیوں کو اعتماد میں لیا، انہیں اپنے گھر میں رہنے کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ کرایہ داروں سے اپنا فلیٹ خالی کرایا اور اس دوران راحیل کے گھر والوں سے اپنی ملاقات کو موقوف رکھا۔

بھائیوں کا گھر چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں منتقل ہونے سے قبل اسے گھر کی صورت دینے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اپنے گھر میں منتقل ہونے پر شاہینہ سے زیادہ علینہ خوش تھی۔

"امی! یقین نہیں آتا کہ یہ چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ ہمارا ہے۔" وہ ماں سے کہتی۔

"فلیٹ نہیں گھر۔"

گھر کی آرائش میں دونوں ہی کی دلچسپی دیدنی تھی۔ ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنایا گیا، دوسرے کو دونوں کا مشترکہ بیڈ روم۔ لاؤنج کو عام استعمال اور کھانے کی میز ڈالنے کے لیے آراستہ کیا گیا۔ شاہینہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ اپنے گھر میں آزاد اور خودمختار زندگی گزارنے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ یہ تمام دورانیہ علینہ کے لیے راحیل کی دلچسپی اور سنجیدگی کو پرکھنے کے لیے بھی نہایت کارگر ثابت ہوا۔

"امی! راحیل اپنے پیرنٹس کو آپ سے ملوانے کے لیے بہت بے چین ہے۔" علینہ روز ہی شاہینہ سے کہتی۔

"اس سے کہو صبر سے کام لے۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی یہ بات کہی ہے اس سے۔"

"پھر؟"

"وہ پھر یہی کہتا ہے اپنی امی سے پوچھ کر بتاؤ، میں اپنے پیرنٹس کو کب لاؤں۔"

"اس سے کہو تھوڑا انتظار کرلے۔"

"امی! آپ اس کی ممی سے بات کرلیں۔"

"نہیں بیٹا! ان سے بات کی اور انہوں نے کہا ہم آ رہے ہیں تو انکار نہیں کر سکوں گی میں...... بس ذرا گھر سیٹ ہو جائے پھر بلا لیں گے۔"

گھر کی آرائش مکمل ہوتے ہی شاہینہ نے گرین سگنل دے دیا۔ ویک اینڈ پر راحیل اور اس کے والدین آ پہنچے

مختصر سا کنبہ اور افرادِ کنبہ نہایت مہذب سے لوگ تھے۔ راحیل کی والدہ مشرقی شعار کی کم گو سی خاتون اور والد باتونی، خوش مزاج مگر نہایت منکسر۔

''بہن! ہم سادہ سے لوگ ہیں۔ اللہ نے ہمیں ہماری ضرورت کی ہر نعمت عطا کر رکھی ہے۔ اللہ کی مہربانی سے بیٹا ہمارے گھر میں ہے، بس ایک بیٹی چاہیے۔ خاندان میں میری طرف بھی اور اس کی امی کی طرف کے گھرانوں میں بھی بیٹیاں موجود ہیں مگر ہم نے راحیل سے کہہ رکھا تھا کہ زندگی تم نے گزارنی ہے لہٰذا اگر خاندان کی بچیوں میں یا خاندان سے باہر بھی کوئی لڑکی پسند آجائے تو بے تکلف ہمیں بتا دینا۔ ہم پہلے تمہاری پسند ہی کو ترجیح دیں گے۔ اس نے اپنی ماں کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا...... بس اسی لیے میں اور میری بیوی سوالی بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔'' راحیل کے والد نے اپنی آمد کا مدعا اختصاراً مگر اتنے متاثر کن انداز میں بیان کیا کہ شاہینہ کا دل اللہ کی شکر گزاری کے احساس سے بھر آیا۔ خدا جانے کون سی نیکی تھی اس کی یا جنتی ماں کی کوئی دعا لگ گئی تھی کہ اتنے مہذب، منکسر اور خوشحال والدین اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس کی بیٹی کا رشتہ لینے اس کے گھر آپہنچے تھے۔ پہلی منزل پر واقع اپنے چھوٹے سے فلیٹ کی کھڑکی سے شاہینہ نیچے پارکنگ لاٹ میں کھڑی ان کی نئے ماڈل کی لشکارے مارتی گاڑی دیکھ چکی تھی۔ راحیل اور اس کے والدین کے ملبوسات، طرزِ نشست اور بات چیت سے عیاں تھا کہ وہ خاندانی لوگ تھے۔

گفتگو کے دوران راحیل کے والد نے اپنے حسب نسب اور قریبی رشتے داروں کا ذکر کیا تو ان کی نجابت کی تصدیق ہوگئی۔

پہلی ہی نشست میں راحیل اور اس کے والدین پر شاہینہ کا دل ٹھک گیا۔

''بس اب تھوڑے ہی دن ہیں اس کی گریجویشن مکمل ہونے میں۔'' راحیل کے والد نے بیٹے کو پدری شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری اور اس کی ماں کی خواہش ہے کہ گریجویشن مکمل ہوتے ہی ہم اس کی شادی کر دیں۔''

''ایسا ہے بھائی......'' شاہینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''بہن! آپ راحیل کی نوکری کی فکر مت کیجیے گا...... میرا اپنا بزنس ہے، یہی سنبھالے گا۔ میں تو اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔'' راحیل کے والد نے شاہینہ کا تذبذب دیکھ کر قطع کلامی کی۔

''نہیں نہیں بھائی...... مجھے نوکری کی فکر نہیں...... میں بڑی قناعت پسند سی عورت ہوں اور یہی بات میں نے علینہ کو بھی سکھائی ہے۔ روزی دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے اور ہماری تمام ضرورتوں سے آگاہ ہے۔'' شاہینہ نے کہا۔

''بالکل بالکل۔'' راحیل کے والد نے گرمجوشی سے تائید کی۔

''میرے اور علینہ کے سرپرست میرے بھائی ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ لوگوں کی ان سے بھی ملاقات ہوجائے تاکہ ان کو گلہ نہ ہو۔''

''بہت مناسب۔''

شاہینہ نے پہلو بدلا اور نگاہیں فرش کے رخ پر کرتے ہوئے نہایت حزم و احتیاط سے بولی۔ ''آپ لوگوں نے علینہ کے والد کے بارے میں سوال نہیں کیا؟''

علینہ نے ہڑبڑا کر ماں کو دیکھا۔ یہ کیا بات کر رہی تھیں وہ!

''ضرورت نہیں سمجھی بہن۔ راحیل کو ہم نے بچپن سے یہ تربیت دی کہ بات جو بھی ہو جیسی بھی ہو، والدین سے مت چھپاؤ...... آگے خیر ہی خیر ہے...... لہٰذا یہ اپنی ہر بات بڑے اعتماد کے ساتھ ہم دونوں سے شیئر کرتا ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، یہ دنیا ہے یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ الحمدللہ مجھے اللہ نے یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ میں لوگوں سے مل کر ایک ہی ملاقات میں اندر باہر سارا حال پڑھ لیتا ہوں...... میں آپ سے مل کر مطمئن ہوا ہوں۔ مجھے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے بس اتنا کافی ہے کہ آپ علینہ بیٹی کی والدہ ہیں...... آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔''

شدتِ جذبات سے شاہینہ کا تمام وجود لرز رہا تھا۔ کہانیوں، افسانوں اور فلموں میں تو ایسی سچویشنز ہوتی ہیں مگر حقیقی زندگی میں یہ صورتِ حال اسے شدید جذباتی کیفیت سے دوچار کر گئی تھی۔ علینہ اس کے پاس آبیٹھی۔

''میں...... میں نہیں چاہتی...... کہ...... میری بدبختی کا سایہ بھی میری بچی پر پڑے۔'' شاہینہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''اللہ پر بھروسا رکھیں بہن...... بدبخت تو وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو اپنے گھر لا کر انہیں ستاتے اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔'' راحیل کے والد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''انشاء اللہ آپ کی بچی ہماری بیٹی بن کر رہے گی۔''

شاہینہ کا دل بیک وقت نا قابلِ بیان خوشی اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا!

☆☆☆

راحیل اور اس کے والدین کے ساتھ اگلی نشست میں جو شاہینہ کے اپنے ہی گھر میں ہوئی، شاہینہ کے بھائی اور بھاوجیں بھی موجود تھے۔ بھائیوں کے ساتھ بھاوجوں کو شامل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ بعد میں باتیں نہ بنائیں، گو باتیں پھر بھی بنائی گئیں جو شاہینہ کے کانوں تک بھی پہنچیں مگر راحیل اور اس کے والدین کی طرف سے ملے اعتماد کے باوجود شاہینہ ان باتوں سے پریشان تو ضرور ہوئی مگر قدرے کم۔ دل ہی دل میں وہ اللہ سے دعا گو تھی کہ علینہ کو اس کی اپنی بدنصیبی کی آنچ بھی نہ پہنچے۔

دوسری نشست میں راحیل اور اس کے والدین سے ملاقات اور بھائیوں کے اطمینان کے بعد شاہینہ نے راحیل سے علینہ کے رشتے کے لیے ہامی بھرلی۔

''بہن! اگر آپ اتفاق کریں تو منگنی کے بجائے بچوں کا نکاح کر دیا جائے یا پھر آپ کے حسبِ سہولت بچی کو رخصت کرالیں گے۔'' راحیل کے والد نے کہا۔

''میں اپنے بھائیوں سے مشورہ کرلوں؟'' شاہینہ نے جواب دیا۔

''ضرور۔''

بھائیوں کو اعتراض نہ ہوا مگر خاندان میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

''ارے دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ شاہینہ کی بیٹی نے لڑکے کو پھنسالیا ہوگا۔'' سینہ گزٹ کی یہ سرخی خاندان بھر میں عام ہو رہی تھی۔

''اللہ جانے شاہینہ نے لڑکے والوں کو کیا جھوٹی سچی سنائی ہوگی۔''

''اچھا! اسی لیے شاہینہ بیٹی کو لے کر بھائیوں سے الگ ہوئی تھی۔''

''جب لڑکے والوں کو اصلیت پتا چلے گی تو دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔''

نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ راحیل کے والد نے شاہینہ سے کہا۔ ''آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، تقریب کا سارا انتظام ہم خود کریں گے۔''

''نہیں بھائی! آپ لوگ میرے مہمان ہوں گے۔ انتظام میں کروں گی۔'' شاہینہ نے کہا۔

''میں نے آپ کو بہن کہا ہے۔ بھائی کے ہوتے بہن کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت۔''

شاہینہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ راحیل کے والدین اسی دنیا کے باسی تھے یا کسی اور دنیا سے آئے تھے۔ احساسِ تشکر سے دورانِ نماز بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔

''شکر ہے پیارے رب۔''

''شکر ہے میرے مولا۔''

وہ خوفزدہ بھی تھی۔ چپکے چپکے خدا سے دعا کرتی کہ کسی بدخواہ کو کوئی شرارت نہ سوجھے اور اگر سوجھے بھی تو خدا راحیل اور اس کے والدین کو بدگمانی سے محفوظ رکھے۔

تقریب کے انتظامات راحیل کے والد ہی نے کیے۔ مقامی ہوٹل میں نکاح کی تقریب ہوئی۔ شاہینہ اپنے ہی لوگوں کے چہروں پر دکھاوے کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں طنز، رشک اور حسد ڈولتے دیکھ رہی تھی۔ ان کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ ''دیکھنا کیا انجام ہوتا ہے۔''

شاہینہ حسنِ انجام کی دعا کر رہی تھی! امی کہا کرتی تھیں پرداروں کے پر بے پروں کا خدا...... وہ بے پر ہی تو تھی...... ساجد نے اس کے بال و پر اس بے دردی سے کاٹے تھے کہ وہ طاقتِ پرواز سے محروم ہو کر عمیق گہرائیوں میں جا گری تھی۔ خدا ہی تھا جس نے اسے ان عمیق گہرائیوں سے دوبارہ اٹھایا تھا۔ علینہ جس کے مستقبل کے لیے وہ دن رات فکر مند رہا کرتی تھی، اس کے لیے رب انسانوں کو فرشتے بنادے گا، شاہینہ نے سوچا بھی نہ تھا!

☆☆☆

راحیل اور علینہ کا آخری سمسٹر مکمل ہوتے ہی راحیل کے گھر والوں نے رخصتی کا تقاضا کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جہیز میں ایک سوئی بھی نہیں لے کر جائیں گے۔

''علینہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے اسی کا ہے۔'' شاہینہ نے کہا۔

''راحیل بھی ہمارا ایک ہی بیٹا ہے بہن۔ ہمیں اللہ نے جو بھی دیا ہے، اس کا اور اس کی بیوی اور بچوں ہی کا ہے...... گھر میں زیادہ سامان جمع کرنے سے کیا فائدہ۔''

''بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کروں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔''

''لوگوں کی پروانہ کریں بہن...... ایک کان سے سنیں دوسرے سے نکال دیں۔ زندگی ہماری ہے...... ہم نے جینی ہے...... ہماری مرضی جس طرح سے چاہیں جئیں۔''

شاہینہ جس کو بتاتی، وہ حیران ہوتا اور اس کے دل میں شک کا بیج بونے کی کوشش کرتا۔ ''اچھی طرح اطمینان کرلو...... ابھی بھی وقت ہے، بیٹی تمہارے اپنے گھر میں ہے...... کہیں فراڈ نہ ہوں یہ لوگ۔''

''لگتے تو نہیں۔''

''معاف کرنا، لگتے تو تمہارے سسرال والے بھی نہیں تھے۔''

''اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے جو یہ ویسے ہوں۔'' شاہینہ سہم کر سوچتی۔

برات، ولیمہ سارے انتظامات راحیل کے والد ہی نے کیے۔

''بار الٰہ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں!'' شاہینہ حیران ہو، ہو کر سوچتی۔

انتہائی حیران کن اور شاہینہ کو سرتا پا لرزا دینے والے لمحے وہ تھے جب راحیل کے والد نے کہا۔ ''بہن! علینہ بیٹی کے والد کا ایڈریس دے سکتی ہیں آپ مجھے؟''

شاہینہ کو یوں لگا جیسے قیامت کہیں قریب ہی تھی۔

کیا دوسرا فتنہ ہونے جا رہا تھا!

''کیوں بھائی؟'' شاہینہ کو اپنی ہی آواز یکسر اجنبی محسوس ہوئی۔

''میں انہیں شادی کا کارڈ بھجوانا چاہتا ہوں۔''

''اس شخص نے علینہ کے حوالے سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رکھا بھائی۔'' شاہینہ دلگیر لہجے میں بولی۔

''ہم تو اپنے حصے کا کام کر دیں۔''

''معاف کیجیے گا بھائی...... جس بچی کو اس نے اپنا نام ہی دینے سے انکار کر دیا اس کی شادی سے کیا دلچسپی ہوگی بھلا اسے۔''

''پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ کارڈ اسے پہنچے۔''

سمدھیانہ تھا۔ شاہینہ زیادہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجبوراً ساجد کا پتا بتانا پڑا۔ خدا جانے وہ اب وہاں رہتا بھی ہوگا کہ نہیں۔ بعد میں راحیل نے علینہ کو بتایا کہ اس کے والد دعوت نامہ پہنچانے کے لیے خود گئے تھے مگر ساجد نے شاہینہ کے کہنے کے مطابق دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی بلکہ علینہ سے اپنا رشتہ ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''ہر انسان کی زندگی میں پہلا مرد اس کا باپ ہی ہوتا ہے راحیل مگر میں تو ایسے کسی رشتے سے واقف ہی نہیں۔'' علینہ نے دکھ سے کہا۔

راحیل کے والد کو بھی ساجد کے رویے پر بہت افسوس تھا۔

''بہن! اس شخص میں تو مجھے مروت نام کو نہیں دکھائی دی۔ آپ کے اور علینہ کے ساتھ تو اس نے جو کیا سو کیا، میں تو اس کے گھر مہمان کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس نے مجھے گھر کے اندر لے جا کر بٹھانے تک کی تکلیف گوارا نہیں کی...... وہ تو مجھے نہایت بدتمیز اور جاہل آدمی لگتا ہے۔''

راحیل کے والد نے شاہینہ کو بتایا۔

''جاہل تو نہیں ہے بھائی...... ایم کام کر رکھا ہے۔''

''بعض پڑھے لکھے بھی تو جاہل ہوتے ہیں بہن۔''

راحیل کے والد غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ گزشتہ برسوں جوں جوں شاہینہ کے تجربۂ حیات میں اضافہ ہوا تھا، اسے یقین آ گیا تھا کہ ساجد ایک پڑھا لکھا جاہل تھا جس نے ایک گمنام خط کی چند سطروں پر نہ صرف اس کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ خود اپنا گھر بھی برباد کیا تھا۔ اس بے وقوف اور جذباتی شخص کو اتنا تو چاہیے تھا کہ اس خط کے مندرجات کی توثیق کرتا۔ جرم ثابت ہوئے بغیر تو کوئی عدالت بھی سزا کا فیصلہ نہیں سناتی!

علینہ کی شادی ہوگئی اور نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام انتظامات راحیل کے والد نے کیے۔ شاہینہ کے لیے یہ خواب جیسی صورتِ حال تھی۔ شاید یہ اس کے صبر کا انعام تھا جو اس کی اولاد کو مل رہا تھا۔ امی کہا کرتی تھیں، انسان کے نیک اور بد اعمال کے اثرات اس کی تین نسلوں تک جاتے ہیں۔

علینہ سسرال چلی گئی اور خوش باش بھی رہنے لگی مگر شاہینہ کے دل کو نہ جانے کیوں دھڑکا سا لگا رہتا کہ کہیں کوئی بدخواہ اس کے گھر کو تیلی نہ دکھا دے۔ علینہ اس کے اس خدشے سے لاعلم نہ تھی، سو وہ اس سے کہتی۔ ''امی! آپ پریشان نہ ہوا کریں...... ایسا کچھ نہیں ہوگا...... راحیل اور ان کے ممی ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔''

''بیٹا! اسی سے تو ڈر لگتا ہے کہ ہمارے اپنے نہیں پھر بھی اتنے ہمدرد، اتنے اچھے کیوں ہیں۔''

''میری ماں! آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک غلط انسان کے غلط رویے نے انسانوں پر آپ کا اعتماد درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اب آپ کو انسانوں کا اعتبار کرتے مشکل ہوتی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔''

''اعتبار بحال کر لیں۔''

''تم اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کرنے لگی ہو؟''

''جب سے میں بڑی ہوئی ہوں۔'' علینہ مسکرائی۔

''ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھیں۔''

''سچ سچ بتانا۔''

''میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے آپ سے۔''

''کبھی باپ کا خیال آتا ہے تمہیں؟''

''ہاں۔''

علینہ کا جواب شاہینہ کو دم بخود کردینے کو کافی تھا۔

''کمی محسوس کرتی ہو اس کی؟''

''نیور!''

شاہینہ نے چونک کر اسے دیکھا کہ اس کے دو مختصر جوابوں میں اتنا تضاد کیوں تھا!

علینہ نے اپنی بانہیں ماں کے گلے میں حمائل کردیں اور اس کا رخسار محبت اور احترام سے چوم کر بولی۔ ''میں نے کبھی اپنی زندگی میں اس شخص کی کمی محسوس نہیں کی امی...... ہاں البتہ یہ ضرور سوچا کہ وہ کیسا بے رحم آدمی تھا جس نے میری اتنی اچھی ماں کی زندگی برباد کردی۔''

شاہینہ نے ممتا بھری نظروں سے علینہ کو دیکھا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ''تم نہ ہوتیں تو واقعی میری زندگی برباد ہوگئی ہوتی میرے بچے! تم نے مجھے جینے کی امنگ دی...... تم نے مجھے جینا سکھایا، تم میرے لیے زندگی کا دوسرا نام بن گئیں میری جان۔''

علینہ فرطِ محبت میں ماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

علینہ کے لیے اتنے اچھے لوگوں کا مل جانا ہی شاہینہ کے لیے کچھ کم حیرانی کی بات تھی کہ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس سے بھی زیادہ حیران کن بات ہوئی۔ علینہ نے اسے بتایا۔ ''راحیل کے ڈیڈی آپ کے سابقہ شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کروانے جارہے ہیں میری طرف سے۔''

''کیسا مقدمہ؟'' شاہینہ نے اسے ہڑبڑا کر دیکھا۔

''ایزی! ایزی میری ماں۔'' علینہ نے ماں کو گھبراتے دیکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اعترافِ خطا کا مقدمہ۔''

''کیا مطلب؟'' شاہینہ چونکی۔

''راحیل کے ڈیڈی کہتے ہیں اسے عدالت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم اس کی بیٹی ہو۔''

''بیٹا رشتوں کی ڈور تو دل سے بندھی ہوتی ہے...... جب کوئی شخص اولاد سے اپنا رشتہ ماننے پر ہی آمادہ نہ ہو تو

خواهشات

خواہشات انسان پر غلبہ پالیں تو انسان سیدھے رستوں کی پہچان کھودیتا اور غلط راستوں پر چلنے والوں کو فقط رسوائی اور جگ ہنسائی ملتی ہے۔

ظالم امتحان

کوئی مانے یا نہ مانے، ہم یہی کہیں گے کہ بچہ پیدائش کے وقت صرف اس لیے روتا ہے کہ اب اسے اس ظالم دنیا میں نازل ہونے کی پاداش میں کئی امتحان دینے پڑیں گے۔ تعلیمی امتحان غالباً واحد مصیبت ہے جو بتا کر آتی ہے۔ جوں جوں امتحان کا وقت قریب آتا جاتا ہے، نبض کی رفتار تیز اور سانسیں اکھڑنا شروع ہوجاتی ہیں جیسے وقتِ نزع آن پہنچا ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت کا ٹائم ٹیبل نہیں دیا ورنہ بندہ ہر وقت الٹی گنتی گنتا رہتا۔ موت تو خیر سب کو آنی ہے مگر جینے کا کیا کیجیے جس میں ہر گھڑی امتحان ہو۔ ویسے بھی روز جینا روز مرنا خاصا مشکل کام ہے۔ امتحان کے دنوں میں ان لوگوں پر خاص غصہ آرہا ہوتا ہے جو گدھے گھوڑے سب بیچ کر سورہے ہوتے ہیں۔ یہ غصہ رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہوجاتا ہے اور پھر حسرت یوں شعر میں ڈھل جاتی ہے۔

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے

گھبراؤ نہیں

ایک آدمی پریشانی کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب غضب ہوگیا میری بیوی نے غلطی سے پیٹرول پی لیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ سارے گھر کے اندر دوڑتی پھر رہی ہے۔ پلیز کچھ کیجیے۔''

''گھبراؤ نہیں......'' ڈاکٹر نہایت اطمینان سے بولا۔ ''مکان کے سب دروازے بند کردو جب پیٹرول ختم ہوجائے گا تو خود بخود رک جائے گی۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

عدالت اس پر لاٹھیاں تھوڑی برسائے گی منوانے کے لیے۔''

''مقدمہ دائر ہوجائے پھر آپ دیکھتی جایئے۔''

''ویسے مجھے تمہارے سسرال والوں پر حیرانی ہوتی ہے۔''

''کیوں؟ حیرانی کس لیے؟''

''سب کچھ جاننے کے بعد بھی انہوں نے خوش دلی سے رشتہ کیا۔ شادی کے تمام مصارف چڑچاکیے بغیر خود اٹھائے۔ پھر تمہارے باپ کو شادی میں انوائٹ کرنے جاپہنچے اور اب......!''

''امی! وہ بہت ڈیسنٹ آدمی ہیں...... بہت کھلے دل کے...... ہر ایک کے کام آنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے اللہ نے ان کے کاروبار میں اتنی برکت دی ہے۔ میں راحیل سے کہتی ہوں تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں اللہ میاں نے اتنے اچھے باپ دیے ہیں۔''

''بے شک...... راحیل کی ماں بھی اچھی ہیں بیٹا۔''

''وہ تو بولتی کم ہیں، سنتی زیادہ ہیں امی ...... ہیرا خاتون ہیں۔''

☆☆☆

ساجد کے خلاف علینہ کی طرف سے مقدمہ دائر کرنے سے قبل راحیل کے والد نے شاہینہ کو بھی اعتماد میں لیا۔

''بھائی! میری تو زندگی جیسے تیسے گزر گئی...... علینہ کو خدا نے آپ کے جیسے فرشتہ صفت لوگ دے دیے...... اب اس کی پہچان راحیل ہے اور آپ کا خاندان...... اس شخص نے تو اپنی اولاد کو اس وقت اولاد نہیں سمجھا جب علینہ کو اس کی ضرورت تھی، اب کیا سمجھے گا۔''

''اس کا تو باپ بھی سمجھے گا۔'' راحیل کے والد نے نہایت وثوق سے کہا۔

''لیکن اب اس کا فائدہ کیا...... میری زندگی لوگوں سے نظریں جھکا کر اور علینہ کی باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کی رہ کر گزر رہی گئی۔''

''غلط گزری...... آپ جیسی پڑھی لکھی اور سمجھدار خاتون کو تو ایسے بے رحم آدمی کو اسی وقت کورٹ میں گھسیٹ لینا چاہیے تھا...... میں سمجھتا ہوں کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی زندگی سے کھیلے...... میں اسے کھیلنا ہی سمجھتا ہوں...... بغیر کسی بڑی وجہ کے ایک بے قصور عورت کو طلاق دے دینا کہاں کی مردانگی ہے...... میں تو ایسے مردوں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتا ہوں...... معاشرے کو ایسے جانوروں کو لگام دینے کی ضرورت ہے بہن...... میں نے وکیل صاحب سے ڈسکس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کورٹ میں آپ کو بھی آنا پڑسکتا ہے۔''

''مجھے!'' شاہینہ چونکی۔

''جی۔''

''میرے اپنے لوگ ہنسیں گے بھائی۔''

''یہی تو اصل مسئلہ ہے...... لوگوں کے ہنسنے کی فکر میں ہم اکثر اپنی ساری زندگی روتے ہوئے گزار دیتے ہیں...... لوگوں کی پروا کیوں بہن۔''

''اپنی عزت کی وجہ سے۔''

''انسان اپنی عزت، اپنے وقار کے لیے ہی تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تاکہ انصاف ملے، عزت بحال ہو...... مجھے تو زیادتی کرنے والوں کی گردن دبوچنے میں مزہ آتا ہے بہن...... الحمدللہ ہمیشہ سرخرو ہوا ہوں...... علینہ اب آپ ہی کی نہیں میری بھی بیٹی ہے، میرے خاندان کی عزت ہے...... میں چاہتا ہوں وہ اور اس کے بچے نظریں جھکا کر نہیں سر اٹھا کر جئیں...... بس آپ دعا کریں کہ ہم جس نیت، مقصد اور مشن کے ساتھ عدالت میں جارہے ہیں خدا ہمیں اس میں سرخرو کرے۔''

شاہینہ کو احساس ہوا کہ راحیل کے والد کا یہ غیر متوقع اور غیر معمولی اقدام اس لیے تھا کہ ان کے بیٹے کی اولاد پر کوئی انگشت نمائی نہ کرے لیکن کیا ضمانت تھی اس امر کی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہی ہوجائیں گے!

☆☆☆

علینہ کی جانب سے باپ کے خلاف مقدمہ دائر کردیا گیا۔ عدالت نے ساجد کی طلبی کا پروانہ جاری کردیا۔ ساجد نے پروانہ طلبی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس جیسے گھمنڈی مگر بودے لوگوں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے۔ وہ عدالت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جہاں والدین کے انتقال کے بعد دو بہنوں کا کفیل بن کر ان کے مزاج میں خودسری اور نام نہاد مطلق العنانی نفوذ کرجاتی ہے۔ وہ عدالتی معاملات کو بھی اپنی خودسری کے تابع سمجھتے ہیں۔

عدالت کی جانب سے بار بار پروانۂ طلبی جاری ہونے کے باوجود عدالتی حکم کی تعمیل نہ ہونے پر عدالت نے ساجد کے نام پروانۂ طلبی اخبار میں شائع کرادیا۔ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ عدالت میں اس نے شاہینہ اور اس کے خاندان کے خلاف وہ موشگافیاں کیں کہ شاہینہ،

راحیل اور اس کے گھر والوں کے سامنے شرم سے زمین میں گڑ گئی لیکن راحیل کے والد نے کہا۔ ''پریشان نہ ہوں بہن...... عدالت میں یہی ہوتا ہے۔ مجرم اپنا جرم چھپانے کو اپنے وکیل کے ذریعے وہ وہ باتیں کرتا ہے جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ہمیں اور آپ کو پریشان نہیں ہونا، ڈٹے رہنا ہے بس۔''

شاہینہ کے اپنے خاندان والے معترض ہو رہے تھے۔ ''یہ شاہینہ کو کیا سوجھی برسوں بعد...... بیٹی کو اللہ نے عزت سے اس کے گھر بار کا کر دیا تھا...... چاہیے تھا کہ شکر ادا کرتی اور باقی زندگی اللہ اللہ کرتی۔ بیٹی کو عدالت میں کھڑا کر دیا، یہ بھی نہ سوچا کہ غلاظت میں پتھر پھینکو تو چھینٹے اپنے ہی دامن پر پڑتے ہیں۔ جو بات دبی تھی دبی ہی رہنے دیتی...... اور حیرت تو علینہ کے سسرال والوں پر ہے۔ وہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر رہے ہیں۔ غلاظت کا ٹوکرا سر پر اٹھا ہی لیا تھا تو اسے مضبوطی سے پکڑے رہتے۔ یہ کیا کہ بہو عدالت میں تماشا کرنے پہنچی تو اسے فارغ کرنے کے بجائے خود بھی تماشا بننے کو اس کے ساتھ جا کھڑے ہوئے...... ارے علینہ کے سسرالی بھی بس کوئی ایسے ویسے ہی ہیں۔''

ساجد نے عدالت میں بھی علینہ سے اپنا رشتہ تسلیم نہ کرنے کا موقف اختیار کیا بلکہ شاہینہ پر بھری عدالت میں یہ الزام لگایا کہ اس سے شادی کے وقت وہ حاملہ تھی تبھی تو شادی کے سات ماہ بعد ہی ماں بن گئی تھی۔ شاہینہ، راحیل کے والد کے اصرار پر عدالت میں آ تو گئی تھی مگر اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ساجد عدالت میں یہی نکتہ اٹھائے گا۔ وہ جج کے روبرو بھرائی ہوئی آواز میں اپنی مدافعت میں اتنا ہی کہہ سکی۔ ''جج صاحب! میں طلاق کے حادثے سے اتنی پریشان تھی کہ میرا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی رہنے لگا تھا اور یہی بچی کی قبل از وقت ولادت کا سبب بنا۔''

''یہ جھوٹ ہے...... اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''یہ جھوٹ نہیں ہے...... میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں یہ سچ ہے...... حقیقت ہے۔'' شاہینہ بھری عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''جج صاحب!'' علینہ نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''میری اس عدالت سے گزارش ہے کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کرا لیا جائے۔''

راحیل کے والد عدالت میں علینہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ علینہ نے عدالت میں وہی کہا تھا جو انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

کرسیِ انصاف پر بیٹھے جج نے علینہ کو دیکھا۔

''جج صاحب! میری ماں بائیس سال سے صلیب پر لٹکی ہوئی ہے، اسے اس صلیب سے اتارنے میں مدد کیجیے۔'' علینہ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر جج کے سامنے کرتے ہوئے نہایت جذباتی لہجے میں کہا۔ یہ الفاظ اسے راحیل کے والد سے نہیں اپنے دل سے ملے تھے۔

عدالت نے مدعیہ اور مدعا علیہ کے ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم جاری کر دیا!

☆☆☆

مجاز اتھارٹی نے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ عدالت میں جمع کرا دی۔

عدالت نے مقدمے کا فیصلہ علینہ کے حق میں جاری کر دیا۔

علینہ جیت گئی تھی۔

گو اس کی جیت کا اس کے پتھر دل باپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جس سرد مہری سے عدالت میں آیا تھا، اسی سرد مہری سے واپس بھی گیا۔ شاہینہ سے کوئی معذرت، علینہ سے باپ ہونے کے ناتے محبت کا اظہار کیے بغیر! کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں...... پتھر دل اور انسانی جذبات سے عاری اور ان کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

بہرحال شاہینہ سرخرو ہو گئی تھی...... علینہ کے سامنے...... اس کے شوہر اور سسرال والوں کے سامنے...... اپنے خاندان والوں کے سامنے...... اور معاشرے کے سامنے! اس کی سرخروئی ساجد ہی کے نہیں، اس گمنام خط لکھنے والے دشمن کے خلاف بھی تھی جس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی تحریر کردہ چند سطروں سے ایک بے قصور اور بے گناہ عورت کس اذیت اور درد کا شکار ہو سکتی تھی۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی...... ماں کی دعا...... قسمت کی بات...... اس کے صبر کا ثمر اور علینہ کی محرومی کا انعام کہ راحیل اور اس کے فرشتہ صفت والدین سے ناتا جڑ گیا تھا ورنہ......!

ورنہ سے آگے بے شمار اندیشے تھے۔ ان گنت خطرے...... اندھی گھاٹیاں اور مہیب سناٹے!

شاہینہ کے خاندان والے ہر لڑکی کا نصیب علینہ کی قسمت کی طرح کھلنے کی تمنا کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی رنجش اور صدمے میں انسان ان دوستوں

اور بہی خواہوں کو اپنا دشمن اور بدخواہ قرار دے بیٹھتا ہے جو انتہائی حالات میں بھی دشمنی اور بدخواہی کا نہیں سوچتے۔

امی اپنی موت تک اسی بدگمانی میں رہیں کہ وہ گمنام خط جس نے شاہینہ کا گھر اجاڑا، ان کی بہن کے گھر سے لکھا گیا تھا۔ عدالت میں علینہ کے جائز استحقاق کا مقدمہ جیتنے اور اپنی سرخروئی کے بعد بھی یہی بدگمانی شاہینہ کے دل میں بھی گھر کیے رہی۔

لیکن جس طرح خون چھپا نہیں رہتا، اسی طرح دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے ہاتھ بھی جلد یا بدیر ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ وہ ہاتھ بھی عریاں ہو کر سامنے آ گئے جنہوں نے شاہینہ کے لیے گڑھا کھودا تھا...... خالہ کے گھر والے نہیں!...... مگر وہ بھی اپنے ہی تھے!

اصل مجرم دنیا سے جا چکے تھے مگر شریک مجرم جو ایک پیچیدہ بیماری کا شکار ہو چکا تھا اپنی بیماری کو گناہوں کی سزا سمجھتے ہوئے اپنے برسوں پرانے ایک جرم کا اعتراف کرنے شاہینہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''شاہینہ باجی! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ میرا قصور اتنا تھا کہ ان کے کہنے پر آپ کے گھر میں وہ خط میں نے گیٹ سے اندر ڈالا تھا لیکن اس گناہ کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی ہے کہ جس ہاتھ سے میں نے آپ جیسی نیک بی بی کے خلاف یہ حرکت کی، وہ اتنا ناکارہ ہو چکا ہے کہ میں اس ہاتھ کو ہلا تک نہیں سکتا۔ کھانا بھی مجھے الٹے ہاتھ سے کھانا پڑتا ہے۔''

شریکِ جرم کو جو شاہینہ کا اپنا ہی دور پار کا رشتے دار تھا، اپنے سامنے گڑگڑاتے، معافی مانگتے اور اشکِ ندامت بہاتے دیکھ کر شاہینہ دم بخود تھی۔ کتنی عجیب بات تھی جن پر بھولے سے بھی شبہ نہ کیا جا سکتا تھا، وہ مجرم نکلے تھے اور جن پر برسوں شبہ کیا جاتا رہا، بددعائیں دی جاتی رہیں، ان کی خاموشی ان کی بے گناہی ثابت ہوئی تھی۔ خالہ سے تو معذرت بھی ممکن نہ تھی...... وہ کب کی مر چکی تھیں!

''لیکن ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟'' شاہینہ نے جو صدمے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھی، اقبالِ جرم کرنے والے شخص سے اصل مجرموں کی اس حرکت کی وجہ جاننا چاہی۔

''انہیں اس بات کی خلش تھی کہ آپ لوگوں نے انہیں رشتے دار ہونے کے باوجود ولیمے میں کیوں نہیں بلایا، صرف برات کی دعوت کیوں دی۔''

''کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں......'' صدمے سے شاہینہ کی حالت سکتے جیسے ہو گئی تھی...... اسے قطعاً سمجھ نہیں آ سکا کہ کہنے والا کیا کہنا چاہ رہا تھا...... بھلا اتنی سی بات اور اتنا بڑا طوفان کیسے برپا کر سکتی ہے۔

شاہینہ کو تو اپنی شادی کی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ ولیمے میں ساجد نے ان کی طرف سے صرف پچاس افراد کو مدعو کیا تھا اور شاہینہ کو یاد تھا کہ اس حد کی پابندی کرنے کے لیے اس کے گھر والوں کو ولیمے کے مہمانوں کا انتخاب کرنے کے لیے کتنی سوچ بچار کرنا پڑی تھی۔ بہت سے قرابت دار بھی ولیمے میں نہ بلائے جا سکے تھے۔

''صرف...... اتنی سی بات!'' شاہینہ نے حیرت اور رنج سے کہا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اگر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ نہ گئی ہوتی تو یقیناً زمین پر گر چکی ہوتی...... مگر کہنے والے کے پاس ابھی ایک اور روح فرسا... خبر باقی تھی۔

''آپ کے نزدیک یقیناً یہ اتنی سی بات ہے مگر جن کے لیے آپ کے گھر والوں کا... آپ کا رشتہ دینے سے انکار کر دینا برداشت نہ ہوا ان کے لیے یہ انتہائی بے عزتی کی بات تھی، آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے آپ کا رشتہ مانگا تھا اور آپ کی والدہ نے انکار کر دیا تھا۔''

''ہاں...... مگر تعلیم کی کمی بنیادی وجہ تھی جبکہ ساجد نے ایم کام کیا ہوا تھا۔ صرف یہ وجہ تھی۔''

''اور صرف یہ وجہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکی، اوپر سے انہیں ولیمے میں نہ بلانے والی بات بھی اسی بات کا حوالہ لگی کہ اسی وجہ سے انہیں اتنی عزت نہ دی گئی اور پھر.... انہوں نے......''

''واقعی......؟''

''قسم اللہ کی صرف یہی بات تھی۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اتنی چھوٹی سی بات!'' شاہینہ کا بس نہ تھا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگتی۔

اتنی چھوٹی سی بات اس کی زندگی کی تمام خوشیوں کو نگل گئی تھی!

انسانوں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی سوچے سمجھے بنا دوسروں کی پوری زندگی اپنے دل کی نہایت معمولی اور بے معنی رنجش کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں!